پبلشر و پرنٹر ... کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن - مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

بادشاہ گر

جون ایلیا

جانے کس ستم ظریف نے کب اور کہاں نوکرشاہی کا لفظ ایجاد و اختراع کیا تھا۔ اس ستم ظریف موجد اور مخترع کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ لفظ یا وہ دو لفظی مرکب شہنشاہوں، شاہوں اور حکمرانوں اور شاہوں پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو جائے گا اور سکہ چاہے کسی بھی بادشاہ کا چلے اور شاہی چاہے کسی بھی خاندان کی ہو مگر ''حکومت'' نوکرشاہی کے قبضے ہی میں رہے گی۔

جسے اس بات پر شک ہو اور جو اس بیان پر یقین کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہو، وہ تاریخ اٹھائے اور وزیروں اور ''امیروں'' کا جاہ و جلال اور اوج کمال دیکھے۔ یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی ہیں کہ ان کے تزک و احتشام کے سامنے ہارون الرشید کا اہتمام اور انصرام ماند پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آخرکار جعفر برمکی کا سر قلم کرا کے اور اس کے باپ یحییٰ برمکی کو تباہی کا نشانہ بنا کر ہی ہارون ان دونوں باپ بیٹوں سے نجات پاتا ہے اور حقیقی معنوں میں ''خلیفہ ہارون رشید'' کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔

ابوالفضل اور فیضی ہیں کہ ان کے اثر رسوخ کے آگے مہابلی اکبر کے نورعین شہزادہ سلیم کی ایک نہیں چلتی، یہاں تک کہ اسے ابوالفضل سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے قاتل کے خنجر آبدار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم یحییٰ برمکی، جعفر برمکی اور ابوالفضل اور فیضی کے علمی مرتبے کے منکر نہیں ہیں اور ان کی عظمت مسلم ہے۔ ہم تو صرف نوکرشاہی کے تعلق سے ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

سیدان بادشاہ گر ہیں کہ جسے چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ انہی کے اشارے سے زندگی کے چراغ گل ہوتے ہیں اور انہی کے اشارے سے شہزادے آزاد زندگی کا سانس لیتے ہیں۔

ہم چند صدیوں ہی کی تاریخ کو کیوں دیکھیں۔ دو ہزار، تین ہزار اور چار پانچ ہزار برس پہلے کے دور پر نظر ڈالیں۔ فراعنہ ہوں یا قیصر و کسریٰ کے پُرجلال دربار، ہر جگہ اور ہر بارگاہِ عالی میں وزیران با تدبیر اور امیران با توقیر اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والی نوکرشاہی کی حکومت نظر آئے گی۔ ٹکسالوں میں سکہ شاہوں کے نام کا ڈھلتا ہے اور سلطنت میں حکم ان کی نوکرشاہی کا چلتا ہے۔

شہنشاہی اور نوکرشاہی کی ناک میں اگر نکیل ڈالی تو وہ جمہوریت نے ڈالی لیکن یہ وہیں ممکن ہو سکا جہاں واقعی عوام کی مرضی اور منشا سے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں اور جن کی ناخوشی اور برہمی سے ایوان ہائے حکومت اور اورنگ ہائے سلطنت لرزہ براندام ہوتے ہیں۔

ہم نے یہ ملک جمہوریت کے نام پر بنایا تھا لیکن نوکرشاہی سے تعلق رکھنے والے ایک ''غلام'' نے اس جمہوریت کا گلا ایسا گھونٹا کہ پھر وہ ڈھنگ سے پنپ نہ پائی۔ اب ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس نے نوکرشاہی کو بے لگام کر دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اہلکار جسے چاہے نہال کر دے اور جسے چاہے اسے عبرت ناک زوال کا نمونہ بنا دے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کی حرمت کو چاہے تار تار کر ڈالے۔ کوئی بھی نہیں ہے جو ان کی دست برد سے محفوظ ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بھی شخصیت اور آبرومندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ایسی صورتِ حال، ایسی وحشت ناک اور دہشت ناک صورتِ حال کسی بھی جمہوری حکومت کو راس نہیں آتی۔ راس آ ہی نہیں سکتی اور کوئی بھی منتخب حکمران دوبارہ عوام کے دربار میں بار نہیں پاتا۔ اس لیے اپنے حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ نوکرشاہی کو اپنے قابو میں لائیں، اس کے تابع مہمل بن کے نہ رہیں۔ اسی میں حکمرانوں کی بقا ہے اور اسی میں عوام کی بہبود ہے۔

یہاں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نوکرشاہی کوئی قومی پس منظر نہیں رکھتی۔ یہ تو انگریزی سامراج کا ''کرم پرورانہ'' تحفہ ہے جس سے ہمیں نوازا گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو عوام کا طبق الٹنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ اس گروہ کو اس کی حد میں رکھا جائے اور اسے آزاد اور جمہوری معاشرے کے آداب سکھائے جائیں۔ یہی ملک اور قوم کے لیے نسخۂ نجات ہے۔

☆☆☆

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

جنوری 2016ء...... نئے سال کا ابھرتا سورج عوام کی تقدیر کا ایک اور ورق پلٹ رہا ہے۔ اہالیانِ وطن کو سالِ نو مبارک ہو۔ گزشتہ دنوں نئے حوصلوں اور نئے ولولوں میں بلدیاتی انتخابات کا تکمیل بھی تمام ہوا اور منتخب قیادت کی ذمے داریوں میں اضافہ ہوگیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان ذمے داریوں کی ادائیگی ایمانداری سے ہوتی ہے یا ہمیشہ کی طرح جھوٹے وعدوں اور سہانے سپنوں سے ہی قوم کو بہلایا جاتا رہے گا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ جن کی خاطر عوام ووٹ دیتے ہیں وہ امیدیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ ویسے تو گزشتہ کئی سالوں سے ملکی افق پر سیاسی حوالے سے بس ایک جمود سا طاری ہے۔ کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اگر اقتدار واقعی دلوں پر راج کرنے کا نام ہے تو سیاست میں ایسا اقتدار خال خال ہی نصیب ہوا ہے البتہ بنیادی مسائل اور وسائل کی کمی کا رونا ہنوز جاری ہے۔ پرچے کی تیاری کے دوران پاک بھارت تعلقات پر ملاقات اور شکوے شکایات کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں قبل از وقت کوئی رائے نہیں دی جاسکتی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ البتہ یہ ضرور سوچا جاسکتا ہے کہ بنیے کا بیٹا بنا کچھ دیکھے گر نہیں سکتا۔ خوف زدہ حالات، بے اعتباری کے تاثر اور الزامات کی بھرمار سے معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں، اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ پاکستان کے اندرونی حالات پر ایک پُرفکر نظر ڈالی جائے تو کئی جگہوں پر خلا نظر آتا ہے...... اگر ملک میں قانون کی حکمرانی...... شہری حقوق کی پاسداری اور انسانیت آجائے تو اس کرۂ ارض پر وطنِ عزیز جیسا کوئی خطہ نہیں ہے۔ پاکستان آج بھی دنیا میں سرخرو ہوسکتا ہے مگر...... پہلے ہمیں اپنے رویّوں اور نظام میں تبدیلی لانا ہوگی مگر نظام کسی فردِ واحد کا نہیں بلکہ کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے ایک پوری زنجیر کی درستگی کا نام ہے۔ اتنی سنجیدہ گفتگو کے بعد باری آتی ہے اپنی محفل کی جو منتظر ہے اپنے خطوط کی، تو چلیے جناب......

✠ سعدیہ بخاری، ضلع اٹک سے رونقِ محفل ہیں ''انکل معراج اور عذرا رسول کو بیٹے کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے اور انکل معراج کو صحتِ کاملہ دے (آمین) اب سسپنس پر تبصرہ ہوجائے...... دسمبر کا سسپنس 18 نومبر کو ملا۔ گزشتہ سال کی طرح سال 2015ء بھی حادثات و واقعات کے ساتھ گزر گیا اور ہمیشہ کی طرح اچھے کی امید میں نئے سفر کی طرف گامزن ہے۔ پشاور آرمی اسکول کے سانحے کو بھی ایک برس بیت چلا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے لیکن کچھ حادثے بھلائے نہیں بھولتے۔ اللہ ان تمام بچوں کے والدین کو صبر اور ہمت عطا فرمائے جو اس واقعے میں شہید ہوئے (آمین) دسمبر کا سرورق موسم سرما کے عین مطابق تھا پیاری سی حسینہ چہرے پہ مسکان اور آنکھوں میں سپنے سجائے شاید نئے سال کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی دانائی کی باتیں پڑھیں۔ ایسے الفاظ و مفہوم جو سمجھ میں آئیں نہ آئیں لیکن جنہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اداریے میں ایڈیٹر کا سیاسی تجزیہ بھی خوب رہا۔ سیاسی موسم سارا سال ہی گرم رہا۔ ضمنی و بلدیاتی الیکشن کی... وجہ سے سیاستدانوں کی باسی ہانڈی میں بھی ابال رہا۔ عوام کا درد دل میں جاگ اٹھا اور حکومت کی جانب سے مخصوص شہروں میں امدادی پیکیجز کا اعلان بھی کردیا گیا۔ خطوط کی محفل موسم ہی کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی نظر آئی۔ ٹاپ پر ایم عمران جونانی اپنے خوب صورت انداز بیاں میں تبصرہ کررہے تھے۔ صفدر معاویہ طویل ترین خط کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہے۔ ان کا تبصرہ پڑھتے ہوئے شاید ایڈیٹر کی قینچی گم گئی تھی۔ (نہیں کچھ زنگ آلود ہوگئی تھی) محمد خواجہ مدنی آپ حساس طبیعت کے لگتے ہیں اور حساس لوگ عموماً غمگین ہی رہتے ہیں۔ سینئر ترین قاری مسز صدیقی پرانی یادوں کو دہرائی بہت اچھی لگیں۔ پلیز آپ متواتر خط لکھا کریں۔ بہت سے جانے پہچانے نام اور نیو کمرز اپنے خیالات کے ساتھ محفل کو رونق بخشتے اچھے لگے۔ ماہا ایمان اور زویا اعجاز کی کمی بری طرح کھل رہی ہے۔ کہانیوں کا آغاز کیا۔ نیک نام سے سلیم کی گمشدگی نے ملک صاحب کو بہت دوڑایا لیکن آخرکار مجرم بچ نہ پایا۔ سلیم بے چارے کو محبت کرنے کی سزا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے کی صورت میں ملی۔ چندا کی ماں جیسے کردار ہر گلی محلے میں نظر آتے ہیں۔ آخری صفحات کی قرض کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عمر عبداللہ نے انسانی رشتوں کی نفسیات عمدگی سے بیان کی جہاں نازلی نے اپنی کم ذہنی استعداد کی بنا پر اپنے خونی رشتوں کی خودغرضی کو محبت اور خلوص سمجھا، وہیں ابرار کو اپنی ماں، بہنوں کی کچی محبت دکھاوا اور خودغرضی نظر آئی۔ شیش محل، اسما قادری کے مخصوص دلچسپ انداز میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے خصوصاً قیام پاکستان سے پہلے کا پس منظر، ہر کردار کے بالتفصیل ذکر نے بھی بور نہ کیا۔ جولیٹ اور فاروق

کے خوب صورت کردار کے ساتھ ساتھ ربن دادا کا کردار بھی بہت جاندار ہے۔ تاریخی کہانی خدنگ عثمانی، اختتام پذیر ہوئی۔ سلطان سلیم کی اولوالعزمی اور فتوحات قابل رشک تھیں پر اس کا معمولی معمولی باتوں پر اپنے وفاداروں کو ذلیل کرنا اور سر کٹوا دینا اسے ظالم و جابر حکمران ثابت کرتا ہے۔ مترجم کہانیوں میں نظام انصاف سسپنس سے بھرپور رہی پر انجام عام سا تھا۔ عموماً کاشف زبیر سنسنی خیز اختتام والی اسٹوریز ہی منتخب کرتے ہیں۔ کہانی مزے کی رہی۔ امریکا جیسے ترقی یافتہ معاشرے میں پاکستان جیسے خود ساختہ عدالتی نظام کا ہونا اچنبھے کی بات ہے۔ روایت پسند میں مسٹر تھارپ تو بہت ہی کائیاں بڑھا نکلا۔ مٹی کا چہرہ، میں سراغ رساں اودن برنس نے بیٹھے بیٹھے قتل کا کیس حل کرلیا۔ بے جا تعریف، ہلکے پھلکے مزاح پر مبنی تحریر پیٹریشیا کا دوسروں کی حوصلہ افزائی کے لیے بے جا تعریف کا کلیہ آخر ایک مجرم کو پکڑانے کا باعث بنا۔ ہٹ لسٹ میں ریمنڈ کی نفرت اور انتقام کا نشانہ اس کی بیوی کے بجائے بے گناہ کیرول بنی۔ صرف اس کی بیوی سے مشابہت کی بنا پر۔ انتقام کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ طبع زاد کہانیوں میں ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک حساس موضوع لائے ایک طرف زلزلے کی تباہ کاری دوسری طرف اس سے جڑا ہمارے اعمال کا فلسفہ ابھی کچھ دن پہلے آنے والا 22 اکتوبر کا ہولناک زلزلہ بھی 10 اکتوبر 2005ء کا سیکوئل تھا۔ جس کی شدت اور دورانیہ وہی تھا پر یہ کسی معجزے سے کم نہیں کہ ہولناکی اور تباہی اس کے مقابلے میں برائے نام تھی۔ یہ بھی قدرت کا شاید کوئی اشارہ تھا کہ حضرت انسان اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ مغل اعظم کی شرارت نے خاصا محظوظ کیا۔ اسلامی تاریخ ہمیشہ کی طرح اللہ کے نیک بندے کے دلچسپ روحانی واقعات سے بھرپور تھی۔''

✠ **مرحا گل**، ورابن کلاں سے تبصرہ کررہی ہیں ''اس دفعہ سسپنس آنے سے پہلے سسپنس ہی رہا۔ 19 کو سسپنس ملا۔ سسپنس دیکھتے ہی سسپنس اور بھی بڑھ گیا۔ (کمال ہے بھئی) دلکش رنگوں سے مزین سسپنس کا کلر فل شمارہ ملا تو ارد گرد رنگ ہی بکھر گئے۔ سرورق سے لے کر پس ورق تک نہایت دیدہ زیب اور دلفریب سے خوش کن احساس نے مسحور رکھا۔ سرورق سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے فہرست کا جائزہ لیا۔ جہاں ہمارا پسندیدہ رائٹرز طمطراق سے براجمان ہیں۔ فہرست سے سیدھے محفل کا رخ کیا اور اپنی چشم بے تاب سے خود کو تلاشا۔ تلاش تیسرے صفحے پر جاکے تیسرے تبصرے پر تمام ہوئی تو اطمینان بھری سانس لینے کے بعد اداریے سے مستفید ہوئے۔ ٹاپ آف دی لسٹ ایم عمران تھے۔ نیا نام ہے ہمارے لیے تبصرہ ٹاپ پر تھا اس لیے بازی لے گیا، مبارکباد۔ محمد صفدر معاویہ آپ آرمی میں ہیں ''سیلیوٹ''۔ اتنی سخت جاب کے باوجود آپ اتنے لمبے اور زبردست تبصرے لکھتے ہیں کمال ہے ویلڈن۔ مسز صدیقی کی ڈائجسٹ سے اتنی دلی وابستگی دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ صنفِ نازک کی کمی بے حد کھلی کیوں بھئی؟ کہاں چھپی ہوئی ہیں سب۔ صرف مابدولت کا تبصرہ تھا اور مسز صدیقی تمام صنف مخالف پر اپنا تبصرہ یادگار بنا گئیں۔ (جانے کیوں یہ صنف نازک اچانک غائب ہو جاتی ہیں...... بھئی اتنی غیر حاضری اچھی نہیں ہوتی) سب سے پہلے شیش محل کو رونق بخشی۔ جہاں فاروق کی ہمت کی داد دینی پڑے گی وہاں عارف کی بے حسی و خود غرضی پر افسوس ہوا۔ جولیٹ کو خدا صبر دے اور ہمت دے حالات سے لڑنے کی۔ ربن دادا اینڈ گولو شیدو کا کردار پسند ہے۔ اس کے بعد ماروی پر حاضری دی۔ پلیز اس اسٹوری کو اتنا کیوں لمبا کررہے ہیں۔ نیک نام صفدر صاحب کی سپر کہانی تھی۔ فضل کریم آخر بندے دا پتر بن ہی گیا۔ یہ ملک صاحب ہر دفعہ کامیاب ہوتے ہیں یا صرف کامیاب قصہ دیتے ہیں ناکام نہیں؟ مٹی کا چہرہ ثمر عباس کی ایک مختصر مگر ذہانت سے بھرپور تحریر بھی اودن کو داد دینی پڑے گی۔ جہاں بات کہانیوں کی تعریف کی ہو رہی ہو وہاں کہانیوں کے بے تاج بادشاہ ذہین قلم کار پُراثر الفاظ، سحر انگیز باتیں، کرشمے دکھاتے دلوں کو دھوکانے والے طاہر جاوید مغل کا ذکر نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا...... جی جناب بات ہو رہی ہے شرارت کی۔ ایک معصوم کی شرارت جو ان کے لیے انعام بن گئی وہاں انجم کی ذہانت بھی کام کر گئی۔ دوسری مرتبہ بھی فیضان ان کے کام آیا۔ کیا زبردست تحریر تھی۔ کنکریٹ کی قبر ایک تھرا دینے والی تحریر تھی۔ اس دفعہ مریم کے خان کی کمی محسوس ہوئی۔ آخری صفحات پر کوئی تحریر لے آئیں، زبردست سی۔ طاہر مغل صاحب سے ایک فرمائش چھوٹی سی اپنی کوئی چھوٹی سی اسٹوری میں اپنی بیٹی کا نام دیں، ہیروئن کے طور پر کتنا کھلتا ہوا نام ہے ''صبا'' جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا۔ (آپ کی فرمائش طاہر صاحب تک پہنچادی گئی ہے) عمر عبداللہ کی قرض معاشرے کو اجاگر کرنے والی تحریر تھی۔ وہ معاشرہ جو کالی بھیڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ صبیحہ اور نازلی کے رویے کا افسوس ہوا پھر ان دیکھے لوگوں میں رشتہ کرنے کا انجام اللہ معاف کرے۔ سپر ہٹ تحریر تھی۔ ہر کردار اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ تھا۔ عمر عبداللہ نام دیکھا، کیا نیا ہے یا عرصے بعد انٹری دی ہے۔ (جی جناب کم کم لکھتے ہیں لیکن لکھتے ہیں) دسمبر کی شاعری سے ہمیں بے حد لگاؤ ہے۔ صفدر معاویہ کا شعر پسند آیا۔ معراج محبوب صاحب آپ نے ہماری ڈائری سے ہماری پسند کا شعر کیوں چرایا۔ ہماری جانب سے آل ٹیم کو ہیپی نیو ایئر خدا تعالیٰ اس سال کے 365 دن یوں گزارے کہ ہر پل ہمیں خوشی محسوس ہو۔ آمین۔ لگتا ہی نہیں کہ سال پورا ہو گیا ابھی کل ہی کی تو بات لگتی ہے جب جنوری 2015ء کے شمارے ملے تھے اور اب سال کا آخری شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سال کے دامن میں پچھلے سالوں کی طرح کچھ خوشیاں کچھ آنسو...... تھوڑے سے دکھ کرب۔ کہیں مسکراہٹ کے موتی، بے شمار گنگناتے لمحات ملتے ہیں۔'' (آپ کے خیالات سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیا سال امن و سلامتی والا بنا دے۔ آمین)

✠ **طاہرہ گلزار، پشاور** سے محفل میں حاضر ہوئی ہیں ’’14 نومبر کو میرے ہردلعزیز دوست رضوان سلطان تنولی نے کہا کہ تمہارا خط تو B List میں بھی نہیں ہے تو غصہ بھی بہت آیا۔ (بھئی غصہ کرنے کے بجائے خط جلد پوسٹ کر دیا کریں اور ہاں ذرا صاف رائٹنگ میں لکھا کریں) سسپنس تو میرا تینوں ڈائجسٹوں میں سب سے زیادہ ہردلعزیز اور سوئٹ محبوب ڈائجسٹ ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ مرتے وقت دم نکلتے وقت بھی ان تینوں سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں سے کوئی نہ کوئی ہاتھ میں ہوگا۔ (اس محبت کا شکریہ) اس بار تو خوشگوار حیرت بھی ہوئی کہ پہلی دفعہ 17 نومبر کو شام 5 بجے اپنا سوئٹ سوئٹ محبوب سسپنس ملا۔ پورے 4 سے 5 دن پہلے ملا۔ سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ اس بار تو اسماء قادری اور نواب انکل کے علاوہ کہانیوں کی فہرست میں اپنے فیورٹ رائٹرز کاشف زبیر اور طاہر جاوید مغل اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کو دیکھ کے دل باغ باغ ہوگیا اور ادارے کی ذمے داری نبھانے کے ساتھ ساتھ ثمر عباس ایک بار پھر اپنی کہانی مٹی کا چہرہ لے کر حاضر تھے۔ جون ایلیا کے ’’کہیں کا نہیں‘‘ اتنے غور سے اور دکھی دل سے پڑھا کہ واقعی ہم پاکستانی تو اب کہیں کے بھی نہیں رہے۔ آخر ہمارا انجام کیا ہوگا۔ اداریہ پڑھ کے بہت ہنسی آئی کہ انکل اب بھی ان حکمرانوں اور عوام سے کسی اچھائی کی امید رکھے ہوئے ہیں۔ (امید ہمیشہ اچھے کی رکھنی چاہیے) واہ پہلے نمبر پہ میرا بھائی میرے سرگزشت کا بہترین تبصرہ نگار ایم عمران جونانی پہلی دفعہ پہلے نمبر پہ حاضر ہے۔ مبارکاں بھائی۔ جونانی بھائی اتنی محبت اور عزت آپ نے دی کہ ہم تو شرمندہ ہو گئے۔ بھائی آپ خود بہت اچھے ہیں۔ دوسرے نمبر پہ میرے بھائی محمد صفدر معاویہ... شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ بڑی تعمیری باتیں کر رہے تھے۔ فلک شیر ملک صاحب کا بہت مختصر لیکن معیاری تبصرہ بہت پسند آیا۔ مسز صدیقی اتنا شاندار خط سسپنس کی محبت میں بہت اچھا لگا۔ چودھری محمد یعقوب صاحب سسپنس سے آپ کی محبت ہمیں اچھی لگی۔ قدرت اللہ نیازی بھائی بہت اچھے انسان ہیں لیکن معلوم نہیں کہ اپنی اس بہن سے کس بات پہ خفا ہیں۔ اسما قادری شیش محل کی اس شاندار قسط کے ساتھ موجود تھیں۔ کیا منظر نگاری کیا ڈرامائی انداز، فاروق اسپتال میں پڑے رہے۔ جولی بیچاری زخم خوردہ لیکن عارف نے اپنا گھٹیا پن دکھا دیا۔ محبت کرنے والے تو قربانی دیتے ہیں۔ سب کے... فیورٹ رائٹر نواب انکل کی تحریر ماروی بہت زبردست ایکشن زندہ باد۔ میرے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل اپنی تحریر شرارت کے ساتھ موجود تھے۔ بہت ہی لاجواب اور سبق آموز تحریر تھی۔ بہت زبردست طریقے سے ڈاکو پکڑے گئے۔ خدنگ حقانی آخر اختتام کو پہنچ گئی۔ سیتاپوری ایسی منظر نگاری کرتے ہیں کہ بندہ پڑھتے پڑھتے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر کی تعریف میں کچھ کہنا میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں صرف ادارے سے ایک التجا ہے کہ پیغمبروں والا سلسلہ نئے نوجوانوں کی راہنمائی کے لیے دوبارہ شروع کریں۔ (انشاء اللہ جلد شروع ہوگا) فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی ایک اور لازوال تحریر نظام انصاف مغربی معاشرے کی مکمل عکاسی کرتے ہوئے اس میں بتایا گیا کہ خود کو تہذیب کے علمبردار کہنے والوں کے اپنے اندر کتنا کالا دھن ہوتا ہے۔ مٹی کا چہرہ ثمر عباس کی ایک زبردست تحریر جو مغربی معاشرے کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ایک بار پھر اتنا حساس موضوع کنکریٹ کی قبر لائے۔ کاش کہ سیٹھ رزاق جیسے تمام لوگ اچھے بن جائیں لیکن بہت مشکل ہے۔ سلیم انور کی تحریر بے جا تعریف، ہائے کیا کریں بے جا تعریف کر بھی نہیں سکتے اور تعریف کیے بنا رہ بھی نہیں سکتے۔ اچھی تحریر ہے۔ تنویر ریاض کی تحریر روایت پسند جو کہ مغربی کہانی ہے لیکن ہمارے معاشرے کے مرد مستر تھارپ سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ واہ اس بار تو ملک صفدر حیات ایک بار پھر جلوہ گر ہیں، معروفیت کے باعث کہانی ابھی پوری نہیں پڑھ سکی۔ خط جو پھر لیٹ ہو جاتا۔ باقی کترنیں اچھی ہیں۔ شاعری کچھ خاص نہیں لگی۔ پرانے تبصرہ نگاروں سے درخواست ہے کہ واپس آجائیں۔ ادارے والوں سے درخواست ہے کہ آخری صفحات کے لیے احمد اقبال اور ڈاکٹر صاحب یعنی عبدالرب بھٹی صاحب سے کہانی لکھوائی جائے۔‘‘ (آمد کا بہت شکریہ...... آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہیں)

✠ **محمد زبیر ساگر، گوجرہ** سے چلے آرہے ہیں ’’اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ سسپنس اور اس کے پورے اسٹاف کو لمبی عمر دے اور اس ڈائجسٹ کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے۔ یہ میری دلی دعا ہے۔ انشاء اللہ۔ سسپنس کئی سالوں سے پڑھ رہا ہوں مگر خط بہت کم لکھے ہیں کیونکہ خط لکھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ دسمبر کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے اور خوب صورت ٹائٹل دلکش سسپنس کسی دن ہماری جان ہی لے لے گا۔ سلسلے وار کہانیاں ماروی اور شیش محل بہت خوب صورت سلسلے ہیں۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ سسپنس کے لیے اتنا کہوں گا کہ ہم سسپنس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ (بہت شکریہ تبصرہ کرنے کا مگر...... اتنا مختصر؟...... واقعی وقت کی قلت معلوم ہوتی ہے)

✠ **مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص** سے محفل میں شریک ہیں ’’جون ایلیا صاحب بہت خوب کہیں کا نہیں زبردست۔ بلدیہ کے الیکشن بڑے ہی زور و شور سے عوام کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہے تو بہت کچھ لیکن سمجھائے کون۔ آگے آگے دیکھتے ہیں اللہ کراچی پر اور کراچی والوں پر اپنا خاص کرم کرے۔ آمین۔ کیا خوب کہا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آپ کے خط میں پڑھنے کو ملے صفدر معاویہ صاحب اور عمران جونانی صاحب کی اچھی تحریر کے اچھے انداز۔ مسز صدیقی، کراچی سے بہت خوب رقم طراز ہیں۔ کہانیوں میں الیاس صاحب کی تحریر اچھی رہی۔ کاشف زبیر نے بھی بدلیسی کہانی کو اپنے انداز میں اچھا لکھا۔ ماروی بڑے خوب صورت انداز سے آگے آگے رواں دواں ہے۔ ہٹ لسٹ کا بھی جواب نہیں۔ اسما قادری کا شیش محل ابھی تک تو دلچسپ اور حیرت

انگیز۔ آگے چل کر کہانی کیا رخ لیتی ہے۔ ملک صاحب نے بڑی جانفشانی سے گمشدہ سلیم کا سراغ لگایا اور اپنے کارناموں میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ عمر عبداللہ صاحب قرض آپ کا خوب رہا۔ بڑی ہی زبردست کہانی، برق رفتاری سے آگے بڑھی اور انجام پذیر ہوئی۔ تاریخی پس منظر میں کہانی لکھنے والوں سے میری ایک درخواست ہے۔ یوسف بن تاشفین، حیدر علی اور معظم علی پر بھی کچھ ہو جائے۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

✠ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے حاضر ہیں ''سرورق ہمیشہ کی طرح دیدہ زیب وخوب سے خوب تر کی مثال تھا۔ بلاشبہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں، معصوم چہرہ خوب صورتی میں بھی خوب صورت ترین تھا۔ اندر جون ایلیا کے انشائیہ میں زندگی اور زندگی کے نشیب وفراز پر حقیقت افزا باتیں۔ ناموں کی محفل میں ایم عمران کی شرکت اور پہلے ہی خط میں سربلندی۔ باقی نئے و پرانے بہت سارے دوست اپنی اپنی آرا سے آگاہ کر رہے تھے۔ الیاس سیتاپوری کی خدنگ عثمانی تمام ہوئی۔ زکریا کو آخر اس کی محبوبہ کا سایہ مل گیا جس بے قراری اور قریہ قریہ آبلہ پائی کے بعد اس کو خوشی کے لمحات میسر آئے۔ نظام انصاف، کاشف زبیر کی خوب صورت کہانی تھی۔ شیش محل، اسماء قادری کی بہترین کہانی بڑی دلچسپی اور لگن سے پڑھی جا رہی ہے۔ بے شک وہ قاری کی توجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کے قلم میں سلاست وروانی ہے۔ ہٹ لسٹ میں ریمنڈ نے جوش انتقام میں اپنی بیوی کے قتل میں دھوکے میں اپنی محبوبہ کو ہی قتل کر دیا۔ ملک صفدر حیات کی نیک نام بھی بہتر پیرائے میں لکھی گئی۔ اچھی کہانی تھی۔ زہریلی عورتیں بھی اچھی تھی۔ محفل شعر وسخن اور سنہری باتیں یعنی کترنیں بھی اچھے انداز میں لکھی ہوئی تھیں۔ مٹی کا چہرہ میں سراغ رساں نے ایک چھوٹے سے نکتے سے جرم کا پردہ چاک کر دیا۔ روایت پسند نے بھی اچھا تاثر دیا۔ طاہر جاوید مغل کی شرارت نے بھی مزہ دیا۔ ایک چھوٹی سی شرارت نے قسمت کے در وا کر دیے اور کاروبار میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی گئی۔ اللہ کے ولیوں کے تذکرے میں ضیا تسنیم بلگرامی کی شیخ ابوالرضا محمد کے حالات وواقعات سے آگاہی ہوئی۔ اللہ کے ولی اللہ سے ہی لو لگاتے ہیں، دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو ان کے قول وقرار کا بھی اللہ ضامن بن جاتا ہے کیونکہ وہ حق پر ہوتے ہیں اور حق کی ہی ترویج کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ ان کی ہر بات بھی اور ان کو دنیا میں سرخرو کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کے طلب گار نہیں ہوتے اس لیے دنیا ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ کنکریٹ کی قبر، ڈاکٹر شیر شاہ سید حقیقت سے قریب تر ہو کر لکھتے ہیں۔ جو عبرت انگیز کہانی کا انداز ہے۔ انسان کو سبق سکھانے والی کہانیاں لکھتے ہیں جو ایک عرصے تک یاد رہتی ہیں۔ بے جا تعریف بھی بہت پسند آئی۔ کسی کی ہمت افزا گفتگو دوسرے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے اور وہ بڑے سے بڑا کارنامہ دے دیتا ہے۔ آخری صفحات کی کہانی قرض، بہت عمدہ کہانی تھی۔ صحیح معنوں میں انسانیت میں وہی لوگ عظیم کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں جو کسی کے دکھ میں کام آئیں۔''

✠سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ''سرورق اداسی کا عنصر لیے ہوئے تھا کیونکہ حسینہ کی درد بھری نگاہیں نئے سال کو خوش آمدید تو کہہ رہی تھیں لیکن ساتھ میں کسی بچھڑے ساتھی کا انتظار بھی۔ اس دفعہ حسینہ کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ جون ایلیا کی کڑوی میٹھی باتیں اچھی لگیں۔ ایم عمران جونانی خوش نصیب ٹھہرے۔ تبصرہ اول آنے پر مبارک باد۔ آپ کا غائبانہ تعارف تو تھا ہی آج تبصرہ پڑھ کر اچھا لگا۔ دلنشین بلوچ، ماہا ایمان، تفسیر عباس بابر، سید محی الدین اشفاق، تصویر الحسن تمام دوست زندگی کے میلوں میں کھو گئے ہیں۔ جلدی سے آئیں آپ کے بغیر محفل ادھوری ہے۔ ہمیشہ کی طرح شیش محل سے اسٹارٹ کیا۔ جولیٹ کے مضبوط ارادے اچھے لگے۔ فاروق کا پتا چلے گا تو مزہ آئے گا۔ دلدار آغا کو تیسری ہیروئن کیتھرین کی آمد اچھی لگی۔ چاند بانو کا اس قسط میں ذکر ہی نہیں تھا۔ ماروی میں مراد کی ایک اور محبوبہ نکل آئی لوجی۔ آخری صفحات پر بہترین کہانی تھی۔ انزلہ پر بہت غصہ آیا، آذر نے ایڈز جیسی لعنت کا شکار ہو کر بھی دوسروں کی زندگی بچائی۔ ابرار جیسے کئی نوجوان اس لت کا شکار ہوتے ہیں۔ نیک نام کہانی اچھی تھی لیکن محبت کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ رائٹر نے اینڈ میں جو لکھا کہ سلیم کے والد کو جب پتا چلا کہ ان کا بیٹا کیا کارنامہ کر کے آیا ہے ان الفاظ سے تکلیف پہنچی۔ شرارت طاہر جاوید مغل نے اچھا لکھا بچوں کی شرارتیں اچھی ہوتی ہیں۔ بے جا تعریف ایک الگ کہانی پیٹریشیا کی خوشامد نے ایک مجرم کو گرفتار کروا دیا۔ خوش اخلاقی اچھی عادت ہے۔ کنکریٹ کی قبر، انسان جتنی دولت بنا لے رہنا دو گز کے گھر میں ہے۔ خدنگ عثمانی آخر ختم ہوگئی۔ زکریا کے آنسو دل پر لگے۔ کاشف زبیر نے بھی اچھا لکھا۔ ہٹ لسٹ اچھی کہانی تھی۔ محفل شعر وسخن میں محمد جاوید، ایم عمران جونانی، مرحا گل، رمنا گل کے شعر پسند آئے۔'' (بہت شکریہ تبصرہ کرنے کا......اسی طرح حاضری لگاتے رہیے)

✠زرین آفریدی، پٹھان کالونی، حیدرآباد سے تشریف لائی ہیں ''عجیب اتفاق کہ سال 2016ء کا پہلا شمارہ اور میرا پہلا تبصرہ۔ اللہ خیر شامل ہو جائے...... ورنہ میرا پورا سال خراب گزرنے کا خطرہ۔ (لیجیے جناب تبصرہ شامل ہے اب تو سال اچھا گزرے گا نا) 2015ء کا آخری رسالہ پورے بارہ مہینے کا نچوڑ، اس شمارے میں نظر آرہا ہے۔ گولڈن سلور کا امتزاج لیے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ دسمبر کا ڈائجسٹ 16 نومبر کو مل گیا۔ سب سے پہلے اپنے جون ایلیا کی زیارت کو گئے، لیکن یہ کیا انہوں نے تو ''کہیں کا نہیں رکھا'' زبردست۔ واقعی ساری دنیا کی قومیت رکھنے والے کہیں کے نہیں رہتے۔ ادارے کی مشکور ہوں کہ 2015ء کے جنوری تا دسمبر کے حالات وواقعات از سر نو ازبر کرا دیے۔ نوازش۔ رب کریم سے ہمیشہ اچھے کی امید رکھتے ہیں۔ وہ رحم کرنے والا ہے۔ محفل پر نظر ڈالی تو ایم عمران جنونی اوہ سوری جونانی کو صدارت پر قابض پایا، تبصرہ بہرحال اچھا تھا، مبارک ہو جناب۔ معراج انکل جی، صرف محمد صفدر معاویہ سسپنس توجہ سے نہیں

پڑھتے، ہم بھی بھرپور، توجہ اور لگن سے پڑھتے ہیں۔ ہاں جی! ہمیں بھی شاباشی دیں۔ (شاباش...... اور توجہ سے پڑھیں) فیض الحسن صاحب آپ طاہرہ گلزار کے بھائی ہو جو اپنے تبصرے میں سوائے شکوے کے کچھ نہیں لکھا۔ سید عبادت کاظمی آپ بے دھیانی میں سسپنس خرید لیتے ہیں تو دھیان میں کیا کچھ نہیں کرتے ہوں گے۔ مسز صدیقی، عظیم تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں، ہمارا ابھی اس ڈائجسٹ کے ساتھ برسوں کا ساتھ رہے گا۔ (انشاء اللہ) رانا حبیب الرحمان، روشنی رشید، شبانہ حسن ناز اور رضوان تنولی کو صدائیں دینے میں معروف نظر آئے۔ ارے بھائی نیا سال نئے لوگ نئے انداز جس کو آنا ہوگا خود آجائے گا، اس محفل کے دروازے تو سب پہ کھلے ہیں۔ بہرحال نصیب اپنا اپنا...... خدنگ عثمانی کا چوتھا اور آخری حصہ بے حد دلچسپ ثابت ہوا۔ سلیم شاہ کی محبت ولگاؤ کچھ عجیب وغریب انداز کی تھی۔ عمر عبداللہ شاید نئے رائٹر ہیں لیکن ان کے قلم کی طاقت وخوب صورتی قرض کی صورت میں واضح ہوگئی۔ سسپنس کے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ اس کہانی کے تمام کردار لاجواب تھے۔ سب نے اپنے اپنے حصے کا قرض اپنے انداز سے اتارا۔ ونڈرفل کہانی...... کنکریٹ کی قبر، ڈاکٹر شیر شاہ سید، حقیقت پر مبنی اثر انگیز اسٹوری لے کر آئے۔ وادی نیلم کا وہ ہوٹل واقعی ملبے کا ڈھیر ہوگیا تھا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ کاشف زبیر صاحب کی نظام انصاف، تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانی تھی۔ ریگ، لیانا اچھے کردار رہے۔ لیک ووڈ کے ٹاؤن کونسل کا قانون، پاکستان کے علاقہ غیر جیسا لگا۔ زہریلی عورتیں، جناب ابوزرتاب کی اچھی کاوش تھی۔ اس میں مصنف نے ہندو راجا و مہاراجاؤں کے کالے کرتوت واضح کیے۔ نواب صاحب کی ماروی کی یہ قسط پڑھ کر ایک مثال یاد آئی کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب اسا قادری صاحب کی شیش محل اور ماروی دونوں ایک دوسرے کی ٹکر پر جاری وساری ہیں۔ ملک صفدر حیات، نیک نام کے ساتھ سال کے اختتام پر حاضر تھے۔ واقعی یہ بات صحیح ہے کہ انسان کو نیک نام سے زیادہ نیک کام ہونا چاہیے۔ شرارت اور طاہر جاوید مغل جی، کیا کہنے جناب انجم امین کوان کے بیٹے نے بہن کے ساتھ جہیز چھاڑ کرنے سے کنگال ہونے سے بچالیا۔ ویلڈن۔ مراسلے خوب سے خوب تر ہوتے جارہے ہیں۔ سبق آمیز اور معیاری۔" (کمال ہے بھئی...... بہت اچھا لکھا آپ نے)

✠ **رمضان پاشا،** گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "اہل محفل سے معذرت کہ گزشتہ دو ماہ سے محفل میں شریک نہ ہوسکا۔ اس بار مطالعہ شیش محل سے کیا، یہ کہانی پڑھ کر ایسا لگا کہ ماروی کو پیچھے چھوڑ دے گی۔ ماروی کی گزشتہ قسطوں کے مقابلے میں یہ قسط بہت ہی ڈھیلی تھی۔ خوب لطف آیا۔ نظام انصاف امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایسا نظام انصاف رائج ہے تعجب ہے۔ مرکزی حکومت کے اہلکار کیا غفلت کی نیند میں ہیں۔ ہٹ لسٹ، بے چاری کیرول خوامخواہ ماری گئی۔ زہریلی عورتیں، کہانی بہت ہی تیکھی اور الجھاوے والی تھی، اختتام بھی معما بنا ہوا تھا، البتہ عنوان بڑا ہی کٹیلا تھا۔ نیک نام، ملک صفدر حیات کا کیس اس بار بہت دلچسپ تھا، بہت مزہ آیا۔ مٹی کا چہرہ، سراغ رساں ہوتو ایسا اوون جیسا، یعنی شرلاک ہومز کا دوسرا جنم۔ روایت پسند، روایت برقرار رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، تھارپ جیسا شخص ہی روایت نبھا سکتا ہے۔ کہانی عمدہ تھی۔ مغل صاحب کی شرارت بھی خوب تھی۔ کنکریٹ کی قبر، ڈاکٹر شیر شاہ صاحب نے ایک بار پھر دل میں لکیریں ڈال دیں۔ بے جا تعریف، بے جا تعریف کرنے کی عادت نے کیا خوب رنگ جمایا، کہانی اچھی تھی۔ قرض، پسند نہیں آئی۔ کترنیں خوب تھیں۔ اشعار کی محفل میں چودھری محمد یعقوب کا قطعہ دل کو بہت بھایا اور عتیق الرحمان، وارث علی کے شعر کا جواب نہیں۔" (تبصرے کا شکریہ)

✠ **محمد قاسم رحمان،** ہری پور، ہزارہ سے چلے آرہے ہیں "اکیس نومبر کو دسمبر کا سسپنس ملا تو ساری ٹینشنز نو دو گیارہ ہوگئیں۔ سسپنس ہمیشہ سے تنہائی میں بہترین دوست ثابت ہوا ہے اور اس معیاری جریدے کی وجہ سے ہمیں بھی رضوان سلطان تنولی، عبادت کاظمی، سید اکبر شاہ، چودھری عاصم اور عمران جونانی جیسے بہترین دوست ملے اور اس مرتبہ پھر ہمیں محفل دوستاں میں جلوہ افروز ہونا پڑا کیونکہ عبادت کاظمی کے سوا سب اس ناچیز کو بھول گئے ہیں۔ ٹائٹل گرل کے بیٹھنے کا پوز اور ہیئر اسٹائل زبردست رہا۔ جون ایلیا کے قیمتی وناور الفاظ پر نظر ثانی کرنے کے بعد آپ کا اداریہ پڑھا۔ سچائی ہمیشہ تلخ ہی ہوتی ہے۔ پیارے بھائی ایم عمران جونانی کا پہلا تبصرہ ہی صدارت پہ لگ گیا۔ کیوں نہ لگتا آخر کو سرگزشت کے منجھے ہوئے تبصرہ نگار ہیں۔ بہت مبارک باد۔ اور سالگرہ کی مبارک باد کیک؟ فیض الحسن صاحب اگر آپ کو پتا ہے کہ مختصر خط شائع نہیں ہوتے تو تھوڑی سی طوالت دے دیا کریں نا۔ عبادت کاظمی اتنا اداس ہونا ٹھیک نہیں کسی ایک بندے کے چلے جانے سے زندگی ختم نہیں ہوتی۔ کہانیوں کی ابتدا آخری صفحات سے کی۔ صبیحہ اور ثروت کی اپنی سگی بہن سے بے اعتنائی اور روکھے رویے پر دکھ ہوا۔ ہمارے معاشرے کا یہی تو المیہ ہے کہ جس چیز یا بندے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں اسے نظر انداز کرنا شروع کر دو۔ یہ کہانی حقیقی معنوں میں ہمارے معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ ویلڈن۔ بے جا تعریف ایک بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ واقعی ٹوٹے ہوئے دلوں کو تعریف کے چند الفاظ جوڑ سکتے ہیں۔ سنا ہے ماروی میں نیا اور دلچسپ ٹوئسٹ آنے والا ہے۔ ہم منتظر ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کے دل موہ لینے والے تصوف کے شہ پارے دل ودماغ کو معطر کر دیتے ہیں۔ ہٹ لسٹ میں جیک اور نینسی خوب چالاکی سے ریمنڈ کو ٹریپ کر کے نکل گئے۔ حسب معمول شیش محل کی یہ قسط زبردست ثابت ہوئی۔ ربن دادا نے بجو کو پچھاڑ کر دل خوش کر دیا۔ کاشف زبیر ہمیشہ کی طرح آئے اور چھا گئے۔ ثمر عباس کی مٹی کا چہرہ میں اوون برنس کی ذہانت نے حیران کر ڈالا۔ ڈاکٹر شیر شاہ ایک مرتبہ پھر درد میں ڈوبی ہوئی تحریر لے کر آئے۔ خدنگ عثمانی اختتام پذیر ہوئی۔ الیاس سیتاپوری کی تحریر پڑھتے ہوئے بندہ اپنے آپ کو ماضی میں پاتا ہے۔ محفل شعروسخن میں عبادت کاظمی، مرحا گل اور صفدر معاویہ کے اشعار بیسٹ رہے۔ کترنیں اس بار کم تھیں۔" (آپ کی توجہ کا شکریہ اچھا لگتا ہے جب آپ لوگ چھوٹی باتیں بھی ڈسکس کرتے ہیں)

✠ **اشفاق شاہین،** کراچی سے گزشتہ ماہ کے سسپنس پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں "کافی عرصے بعد اس بار شمارہ ایک دن کی

تاخیر سے ملا۔ سرورق اچھا تھا۔ اداریے میں جون ایلیا کی کڑوی باتیں دل دہلا رہی تھیں۔ محفل میں پہنچا، خود کا نام غیر حاضر تھا۔ عیدالاضحی پر پنجاب جانے کی وجہ سے اور کچھ دیگر معروفیات کی وجہ سے اس بار خط نہ لکھ سکا تھا۔ ظفر اللہ وزانچ سب سے پہلے اور کیا خوب آئے۔ ویلکم مہتاب، ثاقب کمال، علی عمران، نئے ستارے ہیں۔ صدا جگمگاتے رہو۔ عبادت کاظمی، جبار رومی اور نادر سیال کے خطوط و تبصرے بہت خوب رہے۔ زریان سلطان بروقت لکھو تو یہ شکایت نہ ہو۔ حنا عروج، اللہ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے اور آپ اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ خدنگ حثانی میں الیاس سیتاپوری نے ہمیں تاریخ کے کئی چھپے گوشوں کا نظارہ کروایا بہت اچھا لگا۔ پرکاری میں مریم کے خان نے الفاظ کی خوب پرکاری کی۔ اچھی لگی۔ شیش محل، جا تو بہت زبردست رہی ہے۔ جولی کے ساتھ برا ہوا۔ اب دیکھو فاروق کیسے پہلے اپنی دلدل سے نکلتا ہے اور پھر جولی کے لیے کچھ کرتا ہے۔ دلچسپ کہانی ہے گڈ۔ دشمن نمبرا، عید کی مناسبت سے بہترین ہنستا مسکراتا انتخاب تھا، اچھا لگا۔ سریلا پیغام بھی سسپنس بھرا تھا۔ مرزا امجد بیگ حسب معمول اپنے کرداروں میں خوب رنگ بھرتے نظر آئے۔ بہت خوب۔ طاہر جاوید مغل کا کرشمہ کمال کا تھا۔ ثمر عباس کا اعتراف بھی سوچنے پر مجبور کر گیا۔ اچھی لگی۔ ماروی میں عجیب موڑ آیا، ماروی کو طلاق، مراد کی شادی، نیجو کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہو گیا کہانی کا اور ماروی بھی لندن میں وہ بھی محبوب کے ساتھ۔ آخری صفحات کی کہانی گو کہ اچھی تھی لیکن زیادہ مزہ نہیں دے پائی۔ ٹائپ ذرا اور طرح کا تھا۔ محفل شعر وسخن میں رمشا رضوی، عالیہ رحیم اور عبادت کاظمی کا انتخاب خوب رہا۔" (حاضری میں طویل وقفہ صحت کے لیے مضر ہوتا ہے)

✠ عبدالغفور خان ساغری خٹک، اٹک سے شامل محفل ہیں "سسپنس اس ماہ 18 کو ملا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اسماء جی تعریف کے لائق ہیں کہانیوں میں یہ کہانی قارئین کی جانب سے قلم کار کے لیے نمبر 1 ہے۔ اس کے بعد زہریلی عورتیں پڑھی۔ اچھی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اشعار کی محفل میں ٹاپ کے اشعار ظفر اقبال، کمال انور، گل مروت اور راشد حبیب کے اشعار اچھے تھے۔ خطوط کی محفل میں ایم عمران کو صدارت مبارک ہو۔ مسز صدیقی آنٹی جی کی ہمت اور حوصلے کی داد کہ ابھی تک آپ جاسوسی گروپ کا ساتھ نبھا رہی ہیں۔ آنٹی جی یو آر گریٹ۔ اس سے ہمیں بھی پتا چلا ہے، جاسوسی گروپ کتنا پرانا ہے۔ تمام نئے دوستوں کو ویلکم۔" (مختصر سا نامہ اچھا ہے مگر اگلی بار شرکت بھرپور ہونی چاہیے)

✠ فلک شیر ملک، شاہ گڑھ سے تبصرہ کر رہے ہیں "دسمبر کا سسپنس اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ جس کی ہر ہر سطر خوب صورت لگی۔ جون ایلیا نے خوب کہا کہ ہم کہیں کے نہیں رہے۔ ہماری تہذیب، ہماری زبان حتیٰ کہ لباس بھی مغربی اقوام کی طرح ہو چکا ہے۔ پاکستان کو ختم کرنے کے لیے ایک لابی نہیں بلکہ کئی لابیاں سرگرم عمل ہیں۔ خزاں کی آمد آمد ہے اور کشمیری مسلمانوں اور ہندوستان میں مسلمانوں پر جو ظلم و تشدد ہو رہا ہے، ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ خطوط کی محفل میں محمد صفدر معاویہ صاحب سے سوری بولتا ہوں۔ اصل میں وہ طلحہ نامی ایک قاری تھا۔ بس آپ کا نام زبان پر چڑھ گیا۔ ایچ پیرس، مردان کا شکریہ، جنہوں نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کا بھی ممنون ہوں۔ ایم عمران جونانی اور محمد خواجہ کے تبصرے بڑے جاندار تھے۔ رانا حبیب الرحمٰن، اللہ آپ کو جلد آزادی نصیب فرمائے۔ خدنگ حثانی اپنے اختتام کو پہنچی۔ اینڈ اچھا تھا مذکریا کو نا امید دل گئی۔ نظام انصاف، ایک ایسی تحریر جس میں واضح کیا گیا کہ انصاف کے قوانین تو بنتے ہیں مگر نافذ العمل نہیں ہوتے۔ ریگ کا کردار پسند آیا اور اس کا جذبہ بھی۔ شیش محل، اچھی سمت رواں ہے۔ عارف ملکتہ جا رہا ہے۔ جولیٹ جدائی برداشت کر سکے گی یا نہیں، اللہ جانے۔ ہٹ لسٹ، ایک ایسے قتل کی داستان جس میں کیرول کو مارنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا گیا یعنی اوراق پر زہر لگایا گیا۔ اسٹوری اچھی تھی۔ ملک صفدر حیات کی نیک نام، زبردست رہی۔ بلقیس کے دیور فضل کریم نے سلیم کا قصہ تمام کر دیا اور اس گتھی کو جس طرح ملک صاحب نے سلجھایا واقعی قابل تعریف ہے۔ زہریلی عورتیں، میں بادشاہوں کو مارنے کا خطرناک طریقہ روشناس کرایا گیا۔ محفل شعر وسخن میں اچھا کلام تھا۔ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان کا شعر بہت پسند آیا۔ مٹی کا چہرہ، گزارہ تھی۔ ماروی میں اب دم خم نہیں رہا۔ روایت پسند، لالچی میئر تھارپ نے اپنی بیوی کی جان لے لی اور لوگوں کی نظر میں بھی اچھا بن گیا۔ انداز تحریر بہترین تھا۔ شرارت، خوب صورت انداز میں مغل صاحب نے یہ اسٹوری لکھی۔ جو کام پولیس نہ کر سکی وہ ایک بال چین اور بچے کی شرارت نے کر دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے ہمیشہ اچھا لکھا اور برگزیدہ بندوں کے بارے میں لکھا۔ شیخ ابوالرضا بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ کنکریٹ کی قبر، دس سال آٹھ اکتوبر 2005ء میں زلزلے کے احوال پڑھ کر وہ دن یاد آ گئے۔ اس وقت میں بذات خود وادی کشمیر میں موجود تھا اور یہ تباہی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ بے جا تعریف، کسی کی تعریف کرنا اچھی بات ہے مگر بے جا تعریف بھی کبھی کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ زبردست تحریر تھی۔ آخری تحریر قرض، معاشرتی برائیاں اور بیماریوں سے پردہ اٹھایا گیا۔ زبردست انداز تحریر تھا۔ آج کل بھی کچھ بہت اچھے لوگ ہیں جن کے دم سے دنیا قائم ہے۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔ خصوصاً ذیشان احمد طارق اور ریاض بٹ کے مراسلے اچھے تھے۔ قارئین کرام سے اپیل کہوں گا کہ تحریروں میں انگریزی نام اور انگریزی الفاظ بہت کم استعمال کریں۔" (بہت شکریہ آپ کی شرکت کا۔ آپ کے مخلصانہ مشورے نوٹ کر لیے گئے ہیں)

✠ ایم عمران جونانی، رنچھوڑ لائن، کراچی سے حاضر ہوئے ہیں "آپ کسی کو اس کا جائز مقام دیں، عزت دیں یہ عزت کئی گنا اضافے کے ساتھ آپ کی طرف لوٹ کر آئے گی۔ آپ نے ناچیز کو پہلے ہی خط کے ساتھ اتنی عزت دی، درمیان میں بریکٹس کے اندر اچھے جوابات بھی دیے، دل خوش ہو گیا۔ نومبر / دسمبر کی گلابی صبحیں، سنہری شامیں ہوں، باجرے کی روٹی دیسی گھی گڑ کھانے کا موسم اور ایسے میں

فرصت کے ساتھ سسپنس کا ساتھ ہو تو موجیں ہی ہو جائیں۔ اس ماہ شمارے کی سج دھج ہی نرالی ہے۔ کہیں راجستھان کے سونے ریگستانوں میں بنگالی ڈاکٹر آہیں بھر رہا ہے، کہیں بمبئی کے بھنڈی بازار میں ربن دادا مجو کو چیلنج کرکے اڈا چھین رہے تھے، کہیں ملک صفدر حیات ابلے انڈے چائے کے ساتھ کھانے اور گاجر کے حلوے سے معذرت کرتے ہوئے سلیم کی بازیابی کے لیے گھوڑے تانگے دوڑا رہے ہیں، غرضیکہ میلا سا لگا ہوا ہے۔ شیش محل کا اب باقاعدہ انتظار رہنے لگا ہے۔ ماہ بہ ماہ خوب صورتی اور روانی بڑھتی جارہی ہے۔ واقعات کی رفتار بھی مناسب ہے۔ ایک مرتبہ پھر یہی عرض کروں گا کہ اگر کرداروں کی میمیا زبان کے اوپر مزید تھوڑا کام کرلیا جائے تو یقیناً اور نکھار آئے گا۔ (آپ کی رائے نوٹ کرلی گئی ہے) نیک نام کی منظر نگاری کا جواب نہیں۔ حسام بٹ نے ایک مرتبہ پھر کمال کردیا۔ پنجاب کا دیہی ماحول نواحی بستیاں جی ٹی روڈ کے اطراف آباد گاؤں، گوجرانوالہ کی فیکٹریاں، ان کی نوعیت، لوگوں کا رہن سہن تمام جزئیات اس قدر باریک بینی سے بیان کی گئیں کہ بندہ خود کو اسی تانگے میں بیٹھا ایک شہر سے دوسرے شہر چکر لگاتا محسوس کررہا تھا۔ اب ذکر کروں گا اس تحریر کا جس کا سحر مدتوں تک مجھے جکڑے رکھے گا۔ ابوزرتاب کی زہریلی عورتیں کمال انداز میں لکھی گئی۔ ایک طرف برسوں پہلے کی کہانی ہے اور درمیان میں کہیں کہیں آج کی طرف واپسی۔ اسی انداز تحریر نے اصل میں ڈرامائی شکل اختیار کرلی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے PTV کے سنہرے دور کا کوئی لانگ پلے دیکھ رہا ہوں۔ انسانی تاریخ کے اوراق جب بھی کھنگالے جائیں، ظلم وستم اور انتقام کی عجیب عجیب ادائیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ محفل شعروسخن میں معراج عباسی اور نعمان اعجاز کا انتخاب پسند آیا۔ تنویر ریاض کی روایت پسند بس مناسب رہی۔ ترجمے میں روانی تو ہے لیکن مغربی کہانی کے انتخاب میں کوئی ایسی بات نہیں کہ انسان آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو۔ مغل صاحب نے شرارت جیسا مختصر تحفہ دیا، پڑھتے ہوئے اچھا وقت گزرا۔ واقعی اگر انسان صاف نیت کے ساتھ آگے بڑھے، سوچ سمجھ کر تھوڑا بہت رسک لے تو کامیابی دیر سویر ضرور ملتی ہے اور پہاڑ بھی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیٹھ عبدالرزاق ایسے بہت سے کردار ہمارے آس پاس موجود ہیں بس ذرا دیدہ بینا اور گہرا مشاہدہ درکار ہے۔ کنکریٹ کی قبروں کا پورا جال نظر آئے اگر انسان خود توبہ کرنے پر آمادہ ہو بھی جائے تو قوم کی جڑوں میں کرپشن کا زہر پھیلانے والے حرام خور کھمبے اسے آگے نہیں آنے دیتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے نہایت خوب صورتی سے اصلاحی رنگ میں کہانی کو قلم بند کیا۔ عمر عبداللہ کی قرض کا بھی رنگ ڈھنگ یہی ہے۔ کرداروں کے خوب صورت جوڑ اور حسین درحسین کہانی نے آخر تک پلک جھپکنے نہ دی۔ اب ذرا اجازت دیجیے، تسلی سے آپ کے خط پر بات کرنے کی...... سب سے پہلے تو اس ماہ کے وزیراعظم ایم صفدر معاویہ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارکباد۔ محمد خواجہ! آپ کا جملہ ''اندھیرا ہونے پر باہر نکل کر کسی کے ساتھ بیٹھو تو لگتا ہے ہر آدمی کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہے'' دل چھو گیا۔ ویسے لانڈھی کورنگی کے بارے میں میرے بھائی جیسے کوئیگ نے بھی ذکر کیا تھا کہ لوگ لوڈشیڈنگ کے وقت گھروں کے باہر تھڑوں پر بیٹھ جاتے ہیں، کیا منظر ہوتا ہوگا۔ عبدالغفار فردوس نے اپنے پتر کی شروعات سندر ہندی کے پریوگ سے کی۔ ایچ جبرس کا اندازِ بیان بہت پسند آیا۔ یہ خط صحیح معنی میں کرسی صدارت کا حقدار تھا۔ روبی انصاری نے اپنے گمشدہ ساتھیوں کو یاد کیا۔ اس کے علاوہ ایم صفدر معاویہ، مرحا گل، عبادت کاظمی، چودھری ایم یعقوب مقصدت نیازی اور غلام یاسین کے تبصرے بہت پسند آئے۔'' (آپ نے خوب صورت انداز میں تبصرہ کیا...... اچھا لگا)

✠ **محمد صفدر معاویہ**، تحصیل وضلع خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ''اس سال کا آخری شمارہ 14 کو مل گیا۔ سرورق کی ماڈل کو شاید دسمبر کے حساب سے اداس دکھایا گیا جیسے جمیل جیسی خاموش آنکھوں سے کہہ رہی ہو کہ لو پھر دسمبر آگیا۔ عمدہ سرورق جون ایلیا کا انشائیہ کہیں کا نہیں، میں شاید وہ یہ بتاتے نظر آئے کہ جب انسان اوروں کے طور طریقے اپناتا ہے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، اللہ پاک ہم سب کو تمام آفات سے محفوظ رکھے۔ زلزلے میں کافی نقصان ہوا۔ اللہ تعالیٰ تمام لواحقین کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا کرے۔ بہر حال اللہ چاہے تو بغیر کسی زلزلے کے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردے۔ عمارتوں کو زمین بوس کردے، بس انسان کو اپنے اعمال بہتر کرنا چاہئیں اور اللہ سے ہر وقت معافی کا طلب گار رہنا چاہیے۔ اپنی محفل میں آئے تو پہلی ہی کوشش میں بہت عمدہ تبصرہ کرنے والے ایم عمران جونانی کو کرسی صدارت پر براجمان دیکھا۔ مبارک ہو۔ سوئٹ برادر۔ میں تو ہر کتاب کو بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ محمد خواجہ بہت ہی عمدہ تبصرہ کرتے ہوئے رونق محفل بنے۔ مسز صدیقی یقین جانیے کہ مجھے بہت اچھا لگا آپ کا محفل میں آنا۔ آپ نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر اور اچھی صحت عطا کرے۔ آمین۔ نیازی بھائی بھی بہت عمدہ تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود اور نیازی بھائی میں پاکستان آرمی میں نہیں پاکستان ایئرفورس میں ہوں۔ تمام دوستوں کو نئے سال کی آمد پر مبارک باد اور خلوص دل سے سلام۔ کہانیوں میں ابتدا کی خدنگ عثمانی کی آخری قسط سے جہاں ایک بار پھر خوش قسمت رہے استاد ارسلان اور زکریا کہ سلطان قانصوہ کو حقیقت کا پتا چل جانے کے باوجود فیصلہ جنگ کے بعد تک ملتوی کردیا۔ سلطان سلیم نے پھر فتح کا جھنڈا گاڑا۔ اب کے سنان پاشا پر موت کا وار چل گیا۔ آخر میں ارسلان استاد جعفر چلپی اور زکریا کی قسمت مکمل ہوگئی۔ کاشف زبیر کے قلم سے عمدہ تحریر نظام انصاف ریگ کا کردار بہت عمدہ لگا اور ساتھ میں برا ہوا جارج کے ساتھ کہ اس نے برا کیا شیما کے ساتھ اور آخر کار اپنے انجام کو پہنچا۔ اسما قادری قسط نمبر 4 شیش محل یہ قسط بہت ہی عمدہ رہی۔ جہاں ربن دادا نے مجو کی بینڈ بجادی، وہیں فاروق اسپتال میں بھی ایکشن میں آگیا اور کیتھرائن کی عزت بچائی اور پھر بھابیہ نے ربن دادا سے منوہر کا قصہ ہی تمام کروادیا۔ عارف نے بڑا دکھ دیا جولیٹ کو پردہ بہت حوصلے والی نکلی۔ کب فاروق کو پتا چلے گا اور کب ہوگا نیا ایکشن۔ آخر میں لگتا ہے زمرد بائی اور چاند بانو کی آمد ہوئی کافی ایڈونچر ہوگا۔ علی اختر ہٹ لسٹ لے کر آئے جس میں ریمنڈ کی بے وقوفیوں نے اسے جیل کی سلاخوں میں پھنسا دیا۔ جینسی کے لیے زہر لگایا تھا کیرول کو دینے سے قبل اس زہر کو کیوں بھول گیا بے وقوف۔ ملک صفدر حیات نیک نامہ کے ساتھ۔ فضل کریم نے بہت برا کیا سلیم کے ساتھ اور آخر میں ملک صاحب کے رگڑے میں آگیا۔ ابوزرتاب زہریلی عورتوں کی صورت میں کافی پیچیدہ

تحریر لے کر آئے۔ گزارے لائق اچھی تھی۔ محفل شعروسخن اعلیٰ اشعار سے مزین رہی۔ ثمر عباس کی منی کا چہرہ بھی عمدہ رہی۔ ماروی کی یہ قسط بھی گزارے لائق رہی۔ جہاں اختتام کی طرف جانے کے بجائے کردار بڑھتے جارہے ہیں۔ مسٹر تھارپ اچھا روایت پسند تھا، بڈھا کھوسٹ تو بڑا چالاک نکلا۔ طاہر جاوید مغل کی شرارت بہت ہی عمدہ رہی۔ واقعی کبھی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بڑے نقصانات سے بچالیتی ہیں۔ شیخ ابوالرضا محمد کے بارے میں پڑھ کر دل کو سکون پہنچا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کنکریٹ کی قبر جب بندے کے اپنے اوپر مصیبت آتی ہے تو دوسروں کا احساس تب ہوتا ہے۔ دوسرے کھانے والے کب چاہتے کہ ان پر الزام آئے، اچھی تحریر تھی۔ سلیم انور کی بے جا تعریف میں، پیٹریشیا کی بے جا تعریف نے ڈاکو کو پاگل کردیا اور طیش میں آکر غلطی کی اور پکڑا گیا۔ آخری صفحات پر عمر عبداللہ قرض لے کر آئے جو آج کی نوجوان نسل کے لیے تحفۂ خاص تھی کہ جو بے راہ روی اختیار کر کے اس حالت میں پہنچے ہیں اپنی بداعمالیوں اور بداخلاقیوں کی وجہ سے ابرار، آذر اور ارسلان کو تو پھر بھی موقع مل گیا اپنی آخرت سنوارنے کا۔ کیا مجھ سمیت ہر انسان کو یہ موقع مل سکے گا یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے اسے سسپنس اور جاسوسی سے بہت محبت ہے۔ محمد آصف جام آف بھکر اس کا نام ہے۔ (بہت شکریہ محمد آصف آپ کی محبت کا) باقی کہانیاں بھی بیسٹ تھیں، مجموعی طور پر سال کا آخر شمارہ بہت بیسٹ رہا۔ آخر میں ادارہ اور تمام قارئین کو نئے سال کی آمد مبارک ہو۔'' (آپ کو بھی بے حد مبارکباد)

✠ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر، نئی منڈی سکھیکی سے تشریف لائے ہیں ''بڑی عجیب سی فیلنگ ہورہی ہے۔ 1977ء سے لے کر آج تک لمحہ بہ لمحہ جاسوسی اور سسپنس کا ساتھ دیتا آرہا ہوں۔ عمر کے اس حصے میں خط لکھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھوں۔ گمراہ، مفرور، مجاہد، موت کے سوداگر قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں اور آج کل شیش محل کا طوطی بولتا نظر آرہا ہے لیکن محی الدین نواب صاحب ماروی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کررہے ہیں۔ ماروی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے خالی پیٹ بوجھ اٹھانا۔ اتنی ناانصافی اچھی نہیں ہوتی۔ ویسے بھی آج کل کراچی میں بلدیاتی انتخاب ہونے جارہے ہیں، آپ کو ملے گا کیا۔ صفائی کے لیے آسمانوں سے فرشتے اتارے جائیں گے۔ ماحولیاتی آلودگی، جمہوریت کا حسن ہے۔'' (بہت شکریہ شریکِ محفل ہونے کا۔ کمال ہے اتنا لمبا عرصہ آپ نے خاموشی سے گزار دیا۔ آپ کی خاموش دوستی کا شکریہ)

✠ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے محفل میں شریک ہیں ''سرورق پر سوچوں میں گم حسینہ غیر مرئی نکتے پر نظریں جمائے اچھی لگی۔ فی زمانہ سسپنس ملتے ہی شیش محل کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ ایسی ہی سلسلہ وار تحاریر حقیقی معنوں میں سسپنس کی جان رہی ہیں۔ عارف کا طرزِ عمل تحریر پڑھتے ہوئے ظالمانہ لگا لیکن معاشرے کے مروجہ معیارات پر یہی طرزِ عمل پورا اترتا ہے۔ فاروق کی محبت کے کمالات کہ لاعلم ہوتے ہوئے بھی جولیٹ کے درد سے آشنا ہے۔ اختتام پر یقیناً چاند بانو فاروق سے ملاقات کے لیے آگئی ہے۔ ربن اور مجوکا ٹاکرا بھی خوب رہا۔ ماروی کئی ماہ بعد پڑھی۔ پلاسٹک سرجریاں دھڑا دھڑ ہوتی رہی ہیں کہ ہر چہرہ بدلا ہوا ہے۔ خواتین کا مراد پر مرمٹنا بھی اسی طرح جاری وساری ہے۔ کاشف زبیر کی نظام انصاف، ہمیشہ کی طرح پر اسراریت لیے ہوئے عمدہ تحریر تھی۔ میانے جارج کو خوب پھنسایا۔ ریگ کے لیے لیانا کا کردار خصوصی طور پر ڈالا گیا۔ ابوزرتاب کی زہریلی عورتیں نے بہت بور کیا۔ طاہر جاوید مغل کی شرارت میں ڈاکوؤں کے پکڑے جانے کے بعد مخبر کا راز بھی افشا ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کنکریٹ کی قبر موجودہ دور کے ایک معمول کے رجحان کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ سرکاری عمارات کی تعمیر میں کمیشن مافیا کی اجارہ داری کی وجہ سے حقیقتاً ایسی ہی کنکریٹ قبریں تیار ہورہی ہیں۔ آخری صفحات پر عمر عبداللہ کی قرض یقیناً داد کی مستحق ہے۔ رائٹر نے جس طرح بے راہ روی کے اسباب کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے قابلِ تحسین ہے۔ حکومت نے کچھ عرصہ تو اس مرض کی زور وشور سے تشہیر کی لیکن لگتا ہے بیرونی امداد روک لی گئی ہے اس مد میں اس لیے حکومت بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ خدنگ عثمانی نے چار مہینے اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور آخر کار اپنے آخری پڑاؤ پر پہنچ گئی ہے۔ مرحوم الیاس سیتاپوری نے ماضی کے ادوار کی خوب عکاسی کی۔ اچھی تفریح رہی۔ اب ذرا چلتے ہیں محفلِ خطوط میں جہاں ہمارے ایک انٹرنیٹ فرینڈ ایم عمران جونانی کرسی صدارت سے چمٹے نظر آرہے ہیں۔ سال کے آخری مہینے میں پہلا خط اور وہ بھی صدارت یافتہ مبارک ہو۔ پرکاری کے بارے میں ناتجربہ کاری نہیں ہے آپ کی بلکہ تحریر ہی ایسی تھی کہ قاتل کا بالکل آخر میں پتا چلا۔ فلک شیر ملک کی غلط فہمی یقیناً اب ختم ہوگئی ہوگی کہ معاویہ بھائی نے بھی وضاحت کردی۔ مرحا گل! آپ نے شاید نمائندۂ خاص صرف دیکھی ہے، پڑھی نہیں کہ آپ کو خاص نہیں لگی۔ مسز صدیقی کے خصوصی تبصرے برسوں کا ساتھ نے ماضی کی یادیں تازہ کردیں۔ اپنی ماضی کی یادیں۔ ہم نے تو شمارہ اس وقت لینا شروع کیا تھا جب 35 روپے کا ہوتا تھا۔ بہت اچھا لگا مسز صدیقی آپ کا تبصرہ پڑھ کر (درست کہا آپ نے) ایچ بھبرس! تفصیلی تبصرے کی مبارک باد ہو۔ تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا تبصرہ پسند آیا۔ عبدالجبار رومی انصاری! سرورق پر آپ کے شاعرانہ انداز کے تبصرے نے دل خوش کردیا۔ کترنوں کی مقدار کم تھی۔ اس بار محفل شعروسخن میں چند انتخاب بے حد اچھے تھے۔'' (بہت شکریہ عمدہ تبصرہ نگاری کا)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور۔ غلام یٰسین نوناری، چوک سرور شہید۔ اطہر حسین، کراچی۔ کمال انور، کراچی۔ اظہر علی، راولپنڈی۔ نوراللہ کوئٹہ۔ نوشاد احمد، حیدرآباد۔ مہوش، سرگودھا۔ ارشاد علی، میرپور خاص۔ مصباح خان پشاور۔

پارسائی کا خمار

الیاس سیتاپوری

پارسائی کا خمار ہو یا نارسائی کا غم... دونوں صورتوں میں بہت کم لوگ اپنی حدود کا پاس رکھتے ہیں اور نفس کا مارا انسان رفتہ رفتہ یہ ادراک بھی کھو دیتا ہے کہ وہ اپنی چادر سے کب اور کیوں باہر نکل رہا ہے۔ اس کی بے چین فطرت دہری شخصیت کا لبادہ اوڑھ کر خود کو محفوظ سمجھ لیتی ہے لیکن کب تک... ایک نہ ایک دن جب یہ راز فاش ہو جاتا ہے تو دلوں کو مسخر کرنے کا زعم رکھنے والے تاریخ میں اپنا شمار ان لوگوں میں کراتے ہیں جو نہ صرف نظروں سے گر جاتے ہیں بلکہ دلوں سے بھی اتر جاتے ہیں۔ وہ بھی ماضی کا ایک ایسا ہی کردار تھا جس کے قول و فعل کا تضاد اس کے فسادی نفس کا کھلا اظہار تھا۔ شاہوں کے قریب رہنے کی خواہش میں وہ اپنے انجام سے بے خبر اپنی منزل سے کس قدر دور ہو گیا تھا، اسے دیکھنے والے بے اختیار کہنے پر مجبور تھے کہ ”بے شک اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔“

ماضی کا [illegible] اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات
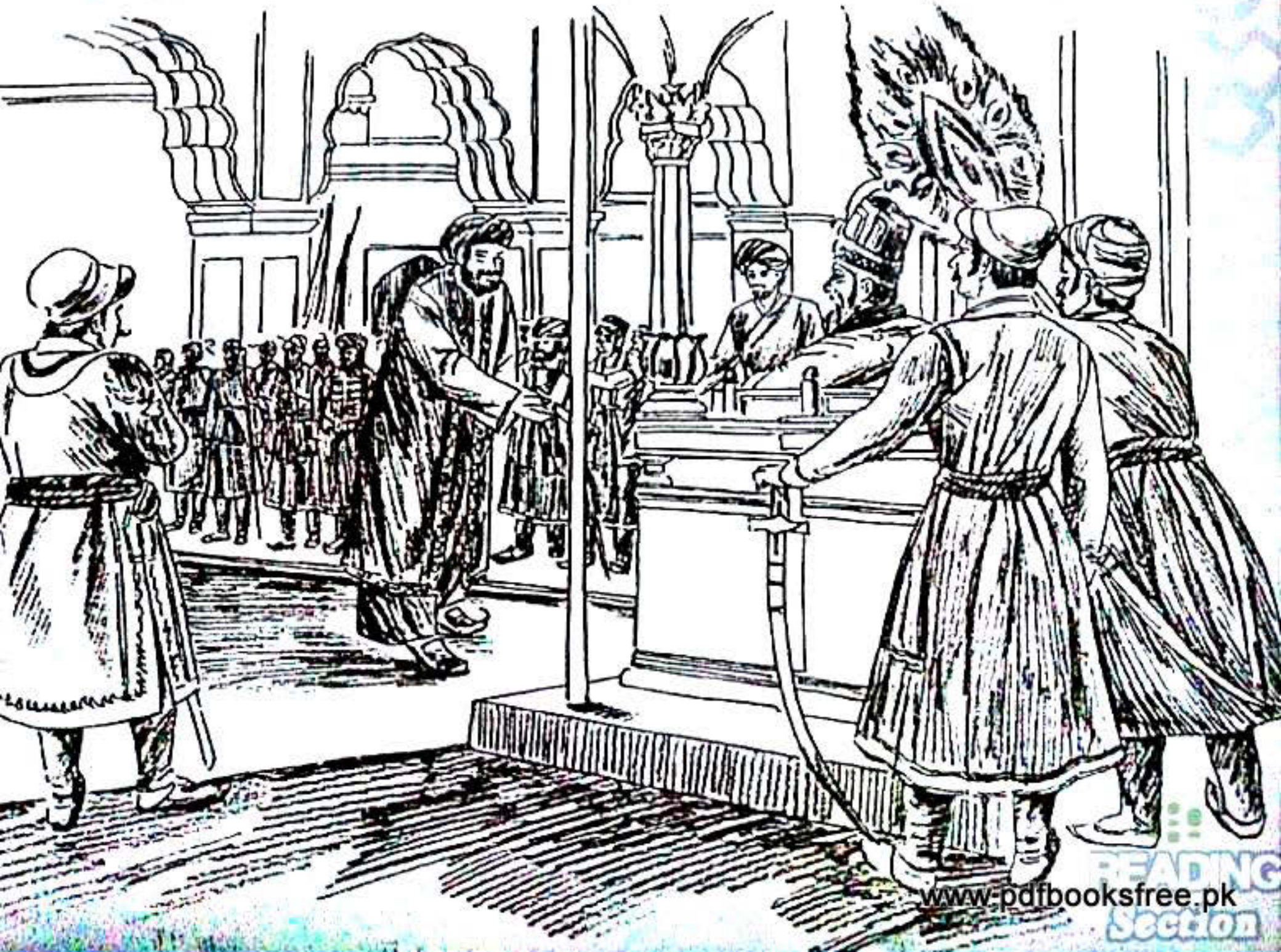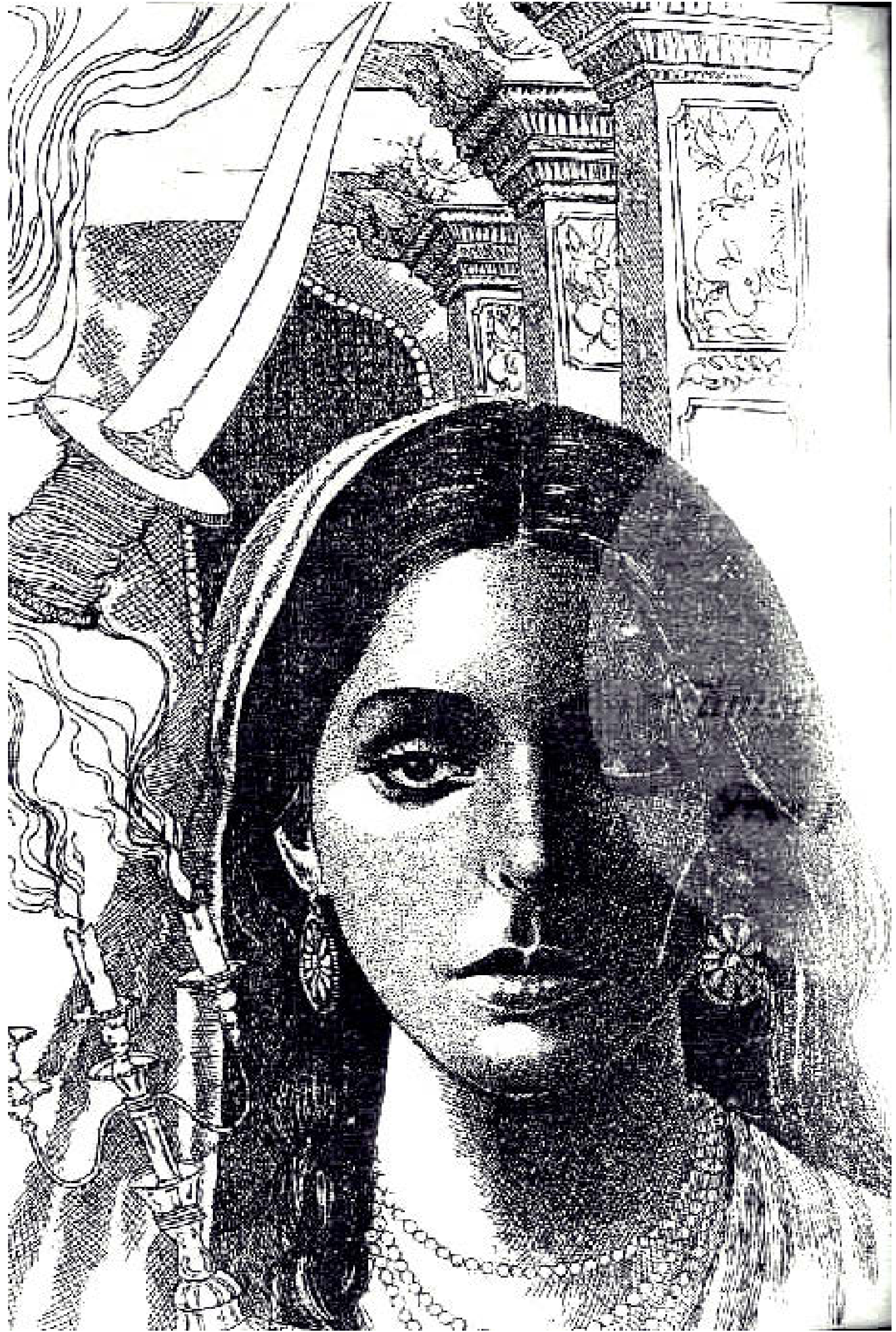
گجرات کے حکمرانوں نے احمد آباد کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس شہر کو اپنے عہد کا عروس البلاد بنا کر رکھ دیا۔ اس شہر کو دریائے سابرمتی کے کنارے احمد شاہ نے 815ھ میں آباد کیا تھا۔ قلعہ تعمیر ہوا، قلعے کے اندر شاہی محل اور دوسری شاندار عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ دربار شاہی سے متصل تین بڑے بڑے پختہ ایوان تعمیر کرائے گئے اور ان کا نام ترپولیہ رکھ دیا گیا۔ ان کی تعمیر اور استحکام میں گچ اور چونے سے کام لیا گیا تھا۔ شہر کے بازاروں کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بازار کی کسی بھی سڑک سے دس چھکڑے پہلو بہ پہلو نکل سکتے تھے۔ یہیں ایک جامع مسجد بھی تھی اور امرا اور دوسرے بڑے منصب داروں کے محلات اور مکانات بھی، یہ سب پختہ تھے لیکن عام لوگوں کی رہائش گاہیں مٹی کی بنی تھیں، اس شہر نے زمانے کے بڑے نشیب و فراز دیکھے تھے۔

یہاں کتنی ہی بغاوتیں ہوئیں اور کچل دی گئیں۔ باغیوں میں اپنے بھی تھے اور غیر بھی۔ گجرات کے ساتویں حکمران سلطان مظفر شاہ گجراتی کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے تین بیٹوں نے حکمرانی کے مزے لوٹے۔ سلطان سکندر، اس نے صرف تین ماہ سترہ دن حکومت کی، اس کے بعد اس کے بھائی سلطان محمود نے چار ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بھائی سلطان بہادر خان بادشاہ بن بیٹھا اور اس نے پندرہ سال تین ماہ حکومت کی۔ ان تینوں کے چوتھے بھائی لطیف نے کئی بار کوشش کی کہ وہ بھی سلطان یا بادشاہ کہلائے لیکن ناکام رہا۔ اس نے بغاوت کی اور گرفتار ہوا، شہزادہ لطیف تو بے نیل و مرام اور حکمرانی کی حسرت لیے رخصت ہو گیا مگر پسماندگان میں شہزادے محمود کو چھوڑ گیا۔ اس نے بھی اپنے چچا سلطان بہادر خان کے خلاف ناکام بغاوت کی اور اسیر ہو کر مالوے کے شہر برہان پور روانہ کر دیا گیا کیونکہ ان دنوں برہان پور پر سلطان بہادر خان کے بھانجے میراں محمد شاہ فاروقی کی حکومت تھی۔ میراں محمد شاہ فاروقی نے شہزادے محمود کو قلعے کے قید خانے میں ڈال دیا۔

سلطان بہادر خان اپنے بھائی شہزادہ لطیف مرحوم اور بھتیجے شہزادہ محمود سے اتنا برہم تھا کہ اس نے اپنی زندگی ہی میں وصیت کر دی کہ اس کے بعد اس کا بھتیجا محمود برسراقتدار نہیں آئے گا اور سلطان بہادر خان کا بھانجا اور والی برہان پور میراں محمد شاہ فاروقی کو نامزد کر دیا گیا لیکن من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال کے مصداق سلطان بہادر خان کی موت کے بعد اس کا بھانجا اور والیِ برہان پور، محمد شاہ فاروق، ابھی برہان پور سے نکلا بھی نہ تھا کہ موت نے پکڑ لیا اور احمد آباد کے امرا کو مجبوراً اسیر شہزادے محمود کا خیال آ گیا۔ ان امراء نے متفقہ طور پر اختیار خان نامی امیر کو برہان پور روانہ کر دیا اور اس کو یہ اختیار دیا کہ شہزادے محمود کو مرحوم میراں محمد شاہ فاروقی کے بھائی میراں مبارک سے چھڑا کر احمد آباد لے آئے لیکن برہان پور کے حکمراں نے شہزادے محمود کی حوالگی سے انکار کر دیا تو اختیار خان نے اس کو دھمکی دی اور صاف صاف بتا دیا کہ اگر شہزادے محمود کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو احمد پور کے امرا ایک لشکر جرار لے کر برہان پور پر حملہ آور ہو جائیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور اسیر شہزادے کو اپنے ساتھ لے کر احمد آباد واپس چلے جائیں گے۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور والی برہان پور نے شہزادے محمود کو اختیار خان کے حوالے کر دیا۔ گجراتی امرا نے شہزادے کو سلطان محمود ثانی کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔ چونکہ اس نئے حکمراں کو اختیار خان لے کر آیا تھا اس لیے اختیار خان کو مختار کل بنا دیا گیا، سلطان محمود ثانی اختیار خان کا احسان مند تھا اور یہ اس احسان کا معمولی صلہ تھا جو نئے بادشاہ نے ادا کیا تھا۔

دربار میں دریا خان اور عماد الملک نامی دو امیر اختیار خان کے اتنے خلاف ہوئے کہ دونوں نے سازش کر کے اختیار خان کو قتل کر دیا۔ نیا بادشاہ محمود ثانی اس کشمکش کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا، اس نے اپنے محسن کے قاتلوں کو سزا دینے کے بجائے عہدے اور مراتب سے نوازا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اس نازک مرحلے میں وہ امرا کی سازشوں میں کسی کا دشمن یا فریق بن گیا تو یہ چالاک امرا بڑی آسانی سے اس کے خلاف اقدامات کریں گے۔ چنانچہ اس نے اختیار خان کی موت کے بعد دریا خان کو وزیر اور عماد الملک کو امیر الامراء مقرر کر دیا۔

پھر کچھ عرصے بعد دریا خان اور عماد الملک کے درمیان رنجش چل گئی۔ بادشاہ پریشان تھا کہ وہ کس کی مخالفت اور کس کی حمایت کرے، ایک اور امیر عالم خان آگے بڑھا اور بادشاہ کو اعتماد میں لے کر دریا خان اور عماد الملک کو گجرات سے نکال باہر کیا۔ اب بادشاہ، عالم خان کا احسان مند تھا، جس نے اس کو دو موذی امیروں سے نجات دلائی تھی۔ بادشاہ نے عالم خان کو اپنا وزیر بنا لیا۔

اب سلطان محمود کسی قدر مطمئن اور بے فکر ہو گیا تھا، اس نے ملکی نظم و نسق چلانے کے لیے لائق اور تجربہ کار آدمیوں کو آگے بڑھایا اور خود ایسے منصوبوں پر غور کرنے

لگا جس سے اس کی بادشاہت اور امارت کا پُرشکوہ اظہار عرصے تک ہوتا رہے۔ اس نے حکم دیا کہ احمد آباد سے بارہ کوس دور ایک نیا شہر محمود آباد بسایا جائے۔ حکم کے ساتھ ہی شہر کی تعمیر کا کام تیزی سے شروع ہوگیا۔

رات کو ملک کی بہترین رقاصاؤں اور مغنیاؤں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، آلاتِ مے کش سجا دیے گئے اور خوشامدی اور باتوں سے سماں باندھ دینے والے مصاحبین نے بادشاہ کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ بادشاہ نے اپنی محفلِ طرب کو سنوارنے کے لیے بڑی فکر وکاوش سے کام لیا تھا۔ موٹے موٹے ستونوں پر مختلف رنگوں کے مخملوں کو لپیٹ دیا گیا تھا، نظروں کے سامنے چند گز کے فاصلے پر سبزہ زار تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے درختوں کی قطاریں بڑے سلیقے سے محوِ خواب تھیں۔ درختوں کی شاخوں اور پتوں پر کافوری شمعیں روشن تھیں گویا وہ درختوں پر اگ رہی ہوں۔ شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر آنے والی مدھم روشنی سے خوابیدگی کا تاثر قائم ہو رہا تھا۔

بادشاہ اس پرکیف ماحول میں از خود رفتہ ہو رہا تھا لیکن نئی نئی بادشاہت کی وجہ سے بادشاہ میں ابھی زیادہ بے حیائی نہیں آئی تھی اور وہ اپنے امراء سے خوف زدہ بھی تھا کیونکہ یہاں کسی امیر کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ بادشاہ نے اپنے امرا اور مصاحبین پر ایک سرسری نظر ڈالی اور رقاصاؤں کو حکم دیا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔

سازندوں نے ساز چھیڑے اور خوبرو رقاصاؤں نے گھنگرو چھنکائے پھر بادشاہ، مقربین اور مصاحبین کے روبرو شعلے لپکنے لگے۔ پتلی پتلی کمر والے نازک اندام یوں لہرائے گویا وہ محوِ پرواز ہوں اور محفل کے دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں گم ہو جائیں گے۔ ان کے جسم پر چپکے اور کسے ہوئے مخصوص لباس نے دلکش اور حسین اعضا کو چار چاند لگا دیے تھے۔ دورانِ رقص ان کی متحرک آنکھیں اور مسکراتے ہونٹ محفل پر بجلی گرا رہے تھے۔ یوں تو ہر رقاصہ لاجواب تھی لیکن ان میں ایک، دوسروں کے مقابلے میں غیر معمولی تھی اس کا سراپا اعضا میں بے مثل تناسب، بجلی کی طرح تیزی سے حرکت کرتا جسم، شوخ وشریر متحرک آنکھیں......

بادشاہ کی نظریں بار بار اس پر جاتیں اور رک جاتیں۔ مقربین اور مصاحبین بھی بادشاہ کی اضطراری کیفیت کا اندازہ لگا چکے تھے اور غیر معمولی رقاصہ بھی اپنی جگہ یہ سمجھ چکی تھی کہ اس نے اپنے حسن اور دلکش اداؤں سے بادشاہ کو مغلوب کرلیا ہے، وہ دل ہی دل میں بے حد خوش تھی کہ اس نے ایک بہت بڑا شکار کرلیا ہے۔ چند ثانیوں کے لیے اس نے سوچا کہ کہیں بادشاہ نیم زخمی شکار کی طرح نہ رہ جائے اور وہ خوش فہمی میں یہی سوچتی رہے کہ بادشاہ اس کے حسن اور اداؤں کا اسیر ہو چکا ہے اور بادشاہ نیم زخمی شکار کی طرح بچ کر نکل جائے۔ اس نے بادشاہ کو بالکل بے بس اور زخمی کر دینے کا ارادہ کرلیا تھا۔

وہ نرم ونازک حسین تتلی کی طرح تھرتھراتی ہوئی بادشاہ کے پاس چلی گئی اور اس کے چہرے کے سامنے جھک کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا۔ ”کیا یہ ناچیز بادشاہ کو خوش کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے؟“

بادشاہ نے گھبراہٹ میں کوئی جواب نہ دیا، گم صم نظریں چرانے لگا۔

ایک مصاحب نے رقاصہ سے کہا۔ ”تو نے اگر یہ محسوس کرلیا ہے کہ ہم سب کی جان اور مال کے مالک، بادشاہ کا تیری جانب رجحانِ خاص ہو رہا ہے تو یہ تیرا فرض تھا کہ بادشاہ کی ایما پاتے ہی آگے بڑھتی اور بادشاہ کو حظ وکیف سے سرشار کردیتی۔“

رقاصہ ناچتے ناچتے بادشاہ کے قدموں میں جا گری اور سیدھے ہاتھوں کی انگلیوں کو فرطِ جوش میں بوسہ دیا۔ بادشاہ نے اپنا پاؤں کھینچ لینا چاہا لیکن رقاصہ نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ دوسری رقاصاؤں کی توجہ بادشاہ کے پاؤں اور رقاصہ کے والہانہ برتاؤ کی طرف ہوئی تو اس سے ان کے رقص کا انہماک جاتا رہا، ان کے فن کا توازن برقرار نہ رہا اور وہ سب بڑے بے ڈھنگے پن سے اپنے رقص میں مشغول رہیں۔ دیکھنے والوں کو ہنسی آگئی۔ انہوں نے رقاصۂ خاص سے کہا۔ ”اے حسین تتلی! ہم سب یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو اپنی ہم پیشہ خواتین کی محسود قرار پا چکی ہے، ہوشیار باش، ہوشیار......“

بادشاہ نے رقاصہ کے کان میں وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ”او دل ربا رقاصہ! اہالیانِ محفل کا کچھ تو خیال کر، سب کی نظریں اور سب کی توجہ ہم دونوں پر ہے، میرا پاؤں چھوڑ دے تاکہ میں ندامت سے بچوں۔“

رقاصہ رو رہی تھی، سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”اے بادشاہ! میں نے اس پاؤں تک پہنچنے کے لیے عبادت بھی کی ہے اور ریاضت بھی اور بالآخر جب میں یہاں تک پہنچ چکی ہوں تو میں کسی کے کہنے سننے سے انہیں کس طرح چھوڑ دوں؟“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”رقص کے علاوہ بھی تجھ کو کچھ آتا ہے؟“

رقاصہ نے جواب دیا۔ "جی جہاں پناہ۔ میں مغنیہ بھی ہوں اور بزعمِ خود کہہ سکتی ہوں کہ جس طرح میں رقص میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اسی طرح میں مغنیہ بھی لاجواب ہوں۔"

بادشاہ اندر سے تڑپ اٹھا، پوچھا۔ "سچ؟ لیکن میں نے تیرا گانا تو ابھی تک سنا ہی نہیں۔"

رقاصہ نے عرض کیا۔ "اگر حضورِ والا گانے کی اجازت مرحمت فرمادیں تو یہ ہمارے حق میں ایک قسم کی نعمت ہوگی۔"

بادشاہ نے حاضرینِ محفل سے کہا۔ "میرے معزز مقربین و مصاحبین! اس عورت کا دعویٰ ہے کہ یہ جتنی اچھی رقاصہ ہے اس سے کہیں زیادہ اچھی مغنیہ بھی ہے، میں اس کو گانے کا حکم دے رہا ہوں۔"

حاضرینِ محفل سانس روک کر بیٹھ گئے، محوِ رقص لڑکیاں اور عورتیں جہاں تھیں، وہیں خاموش بیٹھ رہیں۔

بادشاہ نے رقاصہ سے کہا۔ "اے بے مثل حسین رقاصہ! میں تیرے گانے سے پہلے تیرا نام جان لینا چاہتا ہوں۔"

رقاصہ نے ایک ادائے خاص سے لجا کر جواب دیا۔ "بندی کو چاندنی کہتے ہیں۔ یوں حضور جس نام سے چاہیں مخاطب فرمائیں کیونکہ صحیح نام وہی ہوتا ہے جو کسی کو اس کے جسم وجاں کا مالک دیتا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو بہت باتونی معلوم ہوتی ہے اور میں یہ خامی بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو بہت جذباتی اور بے دھڑک عورت ہے اور اپنے جذبات کی رو میں بہنے کے دوران یہ بھی بھول جاتی ہے کہ تو کس سے اور کس طرح مخاطب ہے، تجھ کو حفظِ مراتب کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔"

ایک امیر نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے چاندنی کو ڈانٹ دیا۔ "چالاک لڑکی! اپنی زبان کو قابو میں رکھ اور جہاں پناہ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش نہ کر۔ بادشاہ کا دل خوش کر اور ہمیشہ کے لیے گمنامی میں چلی جا، کیونکہ بادشاہ ہمیشہ تازہ شے کی خواہش کرتے ہیں، انہیں باسی اور جھوٹی چیزوں سے رغبت نہیں ہوتی۔"

چاندنی اداس ہوگئی اور بادشاہ کو سرسری نظروں سے دیکھ کر گانے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ چاندنی نے ایک فراقیہ غزل شروع کردی۔ سازندوں نے اس کی آواز کے جادو میں غیر معمولی اضافہ کردیا۔ ہر کان اس کا معترف تھا کہ پہلے کبھی ایسی سریلی اور رسیلی آواز سننے میں نہیں آئی، دل اقرار کر رہے تھے کہ زندگی میں پہلی بار ایسی پرسوز آواز سنی تھی جس نے ان کے ہوش وحواس میں آگ لگا کر مضطرب اور حواس باختہ کردیا تھا۔ چاندنی ایک گھنٹے تک گاتی رہی، اس وقفے میں پوری محفل چاندنی کے اختیار میں چلی گئی تھی۔ دوسری رقاصائیں اور مغنیائیں اپنی باری کا انتظار کرتی رہیں مگر بادشاہ کی بے تابی اور وارفتگی کا یہ حال تھا کہ وہ چاندنی کو بار بار گانے کا حکم دے رہا تھا۔ اب حاضرینِ محفل کو اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا کہ چاندنی نے نئے بادشاہ کو مغلوب اور مفتوح کرلیا ہے اور شاید وہ دن دور نہیں ہے جب چاندنی کسی نئے نام اور خطاب کے ساتھ ملکۂ عالیہ بن چکی ہو۔

اس رات بادشاہ نے چاندنی کے علاوہ کسی پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ صبح سے ذرا پہلے جب محفل برخاست ہوئی تو بادشاہ چاندنی کو اپنے ساتھ لے کر محل میں چلا گیا اور امرا کو اس شش وپنج میں چھوڑ گیا کہ وہ چاندنی اور بادشاہ کے تعلق کے پیشِ نظر کون سا واضح لائحہ عمل اختیار کریں جو مستقبل میں ان کے حق میں مفید اور سودمند ثابت ہو۔ بعض امرا یہی چاہتے تھے کہ بادشاہ کو اس سے زیادہ چکروں میں پڑ کر حکومت اور سیاست سے لاتعلق رہنا چاہیے تاکہ امرا کی دال گلتی رہے اور وہ من مانی کرتے رہیں لیکن بعض امرا بادشاہ کو چاق وچوبند اور چست و چالاک دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ یہ امرا بادشاہ کے اقتدار کو زیادہ طول دینے کی آرزو رکھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ بادشاہوں کا برسرِ اقتدار رہنا خود بادشاہوں کے حق میں تو مفید ہوتا ہی ہے لیکن اس سے وہ امرا بھی ایک طویل مدت تک عزت وآبرو کی زندگی گزار لیتے ہیں۔

بادشاہ دو دن اور دو راتیں محل میں گزار کر تیسرے دن جب امرا کے سامنے آیا تو اس نے تمام امرا کو بہت خوش وخرم دیکھا، ان سب نے بادشاہ کو مبارک بادیں دیں اور دبے لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ بادشاہ کو کسی ایک لڑکی یا عورت کو اتنا وقت نہیں دینا چاہیے۔ چند امرا نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا کہ بادشاہ کے لیے عورتوں اور لڑکیوں کی کیا کمی، مگر گوہر شناس بادشاہ نے چاندنی کے انتخاب سے یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ اعلیٰ ذوق کا حامل انسان ہے۔ اس لیے بادشاہ اگر چاندنی کو ملکہ بنالے تو بادشاہت کو چار چاند لگ جائیں گے۔

لیکن بادشاہ خود عجلت میں کوئی ایسا ویسا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

چاندنی بھی ہار ماننے والی نہیں تھی، اس نے بادشاہ کو جی

پھر کریش کرادیے اور ایک بار بھی کوئی ایسی بات نہ کی جس سے بادشاہ یہ سمجھتا کہ چاندنی محل سرا میں اپنے لیے کسی خاص مقام کی خواہش رکھتی ہے، بادشاہ اس کے رقص و غنا کا عاشق تھا اور جب خلوتوں میں چاندنی کی گرم جوشیاں دیکھیں تو اس کی ان اداؤں نے بھی بادشاہ کو دیوانہ کردیا لیکن بادشاہ محمود شاہ کا اندازِ فکر دوسروں سے بہت زیادہ مختلف اور منفرد تھا، وہ چاندنی کو بہت زیادہ پسند کرنے کے باوجود اپنے عشق اور اضطراب کو چاندنی یا کسی اور پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور رہا چاندنی کو ملکہ عالیہ بنانے کا مسئلہ تو وہ فی الحال اس پر غور کرنے کو بھی تیار نہ تھا۔ بادشاہ اپنی دانست میں چاندنی سے تجاہل برت رہا تھا لیکن چاندنی نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے بادشاہ کے دل و دماغ میں سفر کررہی تھی۔

دو ماہ کے دوران بادشاہ نے چاندنی کو مغالطے میں رکھنے کے لیے کئی اور لڑکیوں اور عورتوں پر مہربانیاں کیں اور اپنے طرزِ عمل سے یہ جتانے کی کوشش کی کہ بادشاہ کی نظر میں چاندنی کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ دوسری طرف چاندنی بھی عاجز و مسکین بنی پڑی رہی اور اس حد تک معصومیت اور سادہ لوحی اختیار کی کہ بادشاہ چاندنی کو بھولپن، سادگی اور کم عقلی کا ایک شاندار پیکر سمجھنے لگا۔

بادشاہ شکار پر جانے لگا تو چاندنی نے اس سے درخواست کی۔ ''حضورِ والا! شکار پر تشریف لیے جارہے ہیں، خدا حضور کو حفظ و امان میں رکھے، اگر حضور والا اس مختصر عرصے کے لیے اس ناچیز کو بھی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں میں جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں تو بڑی کرم فرمائی اور ذرہ نوازی ہوگی۔''

بادشاہ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا تیرے کچھ رشتے دار بھی ہیں؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''کچھ کیا، سیکڑوں رشتے دار ہیں۔''

بادشاہ نے دریافت کیا۔ ''کہاں؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''اجمیر اور اس کے مضافات میں۔''

بادشاہ نے فکر و تشویش سے پوچھا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ اب تو میرے حرم سرا سے باہر نہیں نکلے گی تو، تو کیا کہے گی؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! جب تک میں آپ کے محل سرا اور مملکت میں ہوں، میں آپ کی مرضی اور حکم کے خلاف نہیں جاسکتی کیونکہ ایسا کرکے میں رہوں گی کہاں اور عزت کس طرح حاصل کروں گی۔''

بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چاندنی! میری خواہش ہے کہ تو میری عدم موجودگی میں بھی اسی محل سرا میں رہ۔ میں شکارگاہ میں دو تین ماہ سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا اور میں نے تو یہ فیصلہ بھی کرلیا ہے کہ شکارگاہ میں بھی میرا حرم میرے ساتھ رہے گا۔''

لیکن چاندنی نے پھر اصرار کیا۔ ''جہاں پناہ! میں حضور کی مرضی اور حکم کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتی لیکن میں بار بار بھی درخواست کروں گی کہ حضور اس ناچیز کو اس کے عزیزوں، رشتے داروں سے کم از کم ایک بار تو مل آنے دیجیے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''اگر میں تیری بات مان لوں تو کیا تو واپس آئے گی؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''اگر مجھ کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں بادشاہ کے دل و دماغ میں کہیں موجود ہوں تو ضرور واپس آؤں گی ورنہ پھر آؤں گی تو ضرور، لیکن واپس جانے کے لیے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن چاندنی ایسا نہیں ہوسکتا، میں تیرا دل بھی نہیں توڑوں گا اور تیری خواہش رد بھی نہیں کروں گا لیکن جانے سے پہلے تو مجھ سے یہ وعدہ ضرور کرے گی کہ تو واپس ضرور آئے گی۔ فی الحال میں تجھ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل و دماغ میں تیرے لیے ایک خاص جگہ ہے اور میں نے تجھ سے زیادہ کسی اور لڑکی کو ابھی تک نہیں چاہا۔''

چاندنی نے سر جھکا کر سوگواری سے بات کاٹ دی۔ بولی۔ ''لیکن حضور والا! آپ اس وقت جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کا پہلے کبھی تو اظہار کیا نہیں اور حضور کی اسی خاموشی اور اپنی ناقدری کے احساس ہی نے مجھ کو... دل برداشتہ کررکھا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ اس لیے میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں میں جانا چاہتی ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا پھر مجھے سوچنے کا موقع دے۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''آپ بادشاہ ہیں اور سوچے بغیر ہی کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں، مگر میرا فیصلہ اٹل ہے، اگر حضور نے مجھے اجازت نہ بھی دی، تب بھی جاؤں گی ضرور۔''

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''چاندنی! میں بادشاہ ہوں اور یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ میری مملکت کی حدود میں میری مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا چہ جائیکہ ایک کمزور عورت میرے محل سرا میں من مانی کرجائے، ناممکن، ناممکن۔''

چاندنی نے کہا۔ ''حضور کو میرے جسم اور اعمال پر قابو حاصل ہے لیکن میرے دل اور دماغ آزاد ہیں اور

آزاد رہیں گے، میں محل سرا میں رہ کر بھی ذہنی اور قلبی طور پر اپنے عزیزوں، رشتہ داروں میں چلی جاؤں گی اور یہ حضور کے بس سے باہر ہے کہ مجھے ایسا کرنے سے باز رکھ سکیں۔''

بادشاہ ہنس دیا اور مختصر لفظوں میں چاندنی کی حسِ لطیف اور حسنِ مذاق کی تعریف کی۔

بادشاہ اپنے امرا اور سپاہیوں کے ساتھ احمد آباد کے مشرقی جنگلوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ چاندنی اور کئی دوسری حسین عورتیں اور لڑکیاں بھی بادشاہ کے ساتھ تھیں، بادشاہ شکار کھیلنے جارہا تھا، شکار کو ہنکا کرلانے والے بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ داستانیں، حکایتیں اور مزے دار لطیفہ گوئی کرنے والوں نے بادشاہ کو ہر قدم پر شاد کام رکھا۔ اس کو اس پُرلطف اور شاندار ماحول میں اپنا وہ زمانہ بھی یاد آیا جب وہ برہان پور میں زندانی تھا۔ اسے زیرِ قدم راستے مانوس محسوس ہورہے تھے کیونکہ وہ اسی راستے سے احمد آباد میں داخل ہوا تھا اور جب وہ برہان پور سے چل کر یہ راستہ طے کررہا تھا تو اس کو ایک فیصد بھی یہ یقین نہیں تھا کہ وہ احمد آباد میں واقعی بادشاہ بن جائے گا بلکہ اس کو یہی یقین تھا کہ اختیار خان اس کو بادشاہت کی طمع دے کر احمد آباد لے جارہا ہے اور احمد آباد میں داخل ہوتے ہی اس کو ذلیل اور رسوا کرکے قتل کردیا جائے گا لیکن آج وہ بادشاہ کی حیثیت سے اپنے زیرِ فرمان لاؤ لشکر کے ساتھ رواں دواں تھا۔

شام کو بادشاہ نے قیام کا حکم دیا اور آناً فاناً خیموں کا شہر آباد ہوگیا۔ بادشاہ اور اس کے حرم کے خیمے درمیان میں تھے، بادشاہ کے بیس محافظ اس کے خیمے کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے تھے۔

بادشاہ نے مغرب کی نماز اپنے خیمے کے سامنے ایک چھوٹے سے میدان میں ادا کی اور خیموں کے چاروں طرف آگ جلادی گئی، طلایہ گرد خیموں کے چاروں طرف پہرا دینے لگے۔ بادشاہ نے عشا کی نماز کے بعد بے تکلف دربار لگایا اور اپنے امرا اور مصاحبین کو دعوت دی کہ وہ کسی بھی موضوع پر بادشاہ سے بے تکلفانہ اور آزادانہ بات چیت کرسکتے ہیں۔ چنانچہ بعض جرأت مند امرا اور مصاحبین نے بادشاہ سے عورت، مذہب، حکومت، وفاداری اور غداری پر خوب خوب باتیں کیں۔ ان میں چند مصاحب بالکل خاموش رہے اور انہوں نے نہ تو کسی کی تائید کی اور نہ ہی مخالفت کی۔ ان کی خاموشی، زیادہ بکواس کرنے والے امرا اور مصاحبین کو گراں گزری اور انہوں نے ان بے زبانوں کو اپنے حق میں کانٹا یا ہتک گرانی سمجھ کر رفع کرنے کی کوشش کی۔ ایک

چرب زبان امیر نے بادشاہ سے کہا۔ ''حضورِ والا! اس سفر میں دو چار غلط آدمی بھی آگئے ہیں اور یہ لوگ اپنے وجود سے ہم سب کو بدمزہ کررہے ہیں۔ اس لیے اگر حضور مناسب سمجھیں تو انہیں یہیں سے واپس فرمادیں۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ دو چار آدمی کون ہیں؟ ان کی نشاندہی کی جائے۔''

امیر نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! ان میں ایک تو برہان الدین ہے اور دوسرا برکت خان ہے۔ یہ دو تو بالکل ہمارے سامنے ہی موجود ہیں، بقیہ کے لیے حضور کو چند دن مرحمت فرمانا پڑیں گے تاکہ ان کی نشاندہی بھی کردی جائے۔''

بادشاہ نے ان دونوں امیروں کو اِدھر اُدھر تلاش کیا لیکن وہ موجود نہیں تھے۔ بادشاہ نے بہ آوازِ بلند حکم دیا۔ ''برہان الدین اور برکت خان کو اسی وقت حاضر کیا جائے۔''

ابھی حکم کو چند ثانیے ہی گزرے تھے کہ خدمت گاروں نے برہان الدین اور برکت خان کو بادشاہ کے روبرو کھڑا کردیا۔ درباری ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے لیکن ان دونوں کی جرأت اور بے باکی پر سبھی دنگ رہ گئے۔ برہان الدین بادشاہ کے روبرو جا کھڑا ہوا اور بادشاہ سے پوچھا۔ ''حضور نے ہمیں یاد فرمایا ہے؟''

بادشاہ نے ناگواری سے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''ہاں میں نے تجھے بلوایا تھا۔''

برہان الدین نے عرض کیا۔ ''ارشاد بندہ حاضر ہے۔''

بادشاہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں پوچھتا ہوں کہ جب سارے ہی امرا یہاں موجود تھے تو، تو کیوں غیر حاضر تھا؟''

برہان الدین نے بے باکی سے جواب دیا۔ ''بندۂ پرور! یہ غلام حضور سے بھی بڑے بادشاہ بلکہ بادشاہوں کے بادشاہ، شہنشاہ کے دربار میں کھڑا رسم بندگی اور اظہارِ بے چارگی میں مشغول تھا جب ادھر سے فرصت ملتی تو یہ ناچیز اس چھوٹے سے دربار میں بھی حاضر ہوجاتا۔''

اس جواب نے بادشاہ اور حاضرینِ دربار کو حیرت میں ڈال دیا۔ بادشاہ مرعوب ہوگیا۔ اس نے فوراً ہی دوسرے غیر حاضر امیر برکت خان کو مخاطب کیا۔ ''اور تو؟ تو کہاں غائب تھا؟''

برکت خان نے جواب دیا۔ ''ذرہ نواز! یہ غلام، شاہی خیمے کے چاروں طرف گھوم پھر کر خطرات کی بو سونگھ رہا تھا کیونکہ ایک جاں نثار اور وفادار غلام کا یہ فرض ہے کہ جب

اس کا آقا دین و دنیا سے بے نیاز ہو کر بزم آرا ہو تو جملہ حواس کو کام میں لا کر بادشاہ کی حفاظت کرے، درباری امرا اور مصاحبین کا اگر یہ کام ہے کہ بادشاہ کو خوش و خرم رکھیں تو مجھ جیسے جاں نثاروں کا یہ کام ہے کہ غافل آقا کی کھلے اور چھپے دشمن سے حفاظت کرے، اپنے بادشاہ کو محفوظ رکھے۔''

برکت خان کے جواب نے بھی بادشاہ کو بہت متاثر کیا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ''برکت خان! تیرے نزدیک وفاداری کی کیا تعریف ہو سکتی ہے اور یہ کہ ایک مثالی جاں نثار اور وفادار کو کیسا ہونا چاہیے؟''

برکت خان نے جواب دیا۔ ''وفاداری اور جاں نثاری وہ ہے جو قول اور فعل سے کی جائے اور غلام اپنی مرضی، خواہش اور خوشی کو اپنے آقا کی مرضی، خواہش اور خوشی کے تابع کر دے۔''

بادشاہ کو بغیر پیے ہی نشہ چڑھ رہا تھا، بے اختیار بولا۔ ''اور، کچھ اور؟''

برکت خان نے جواب دیا۔ ''اور یہ کہ اگر ضرورت پیش آئے تو غلام اپنے آقا کی خاطر اپنی عزیز ترین شے بھی قربان کر دے۔''

بادشاہ نے فرطِ جوش میں کہا۔ ''برکت خان! میں تجھے آزماؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ تو اس آزمائش میں پورا اترے گا۔''

ذرا سی دیر میں برکت خان نے برہان الدین کا اثر زائل کر دیا تھا، بادشاہ نے برکت خان کو اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں بیٹھا اور عرض کیا۔ ''اگر یہ ناچیز حضور کے پاس بیٹھ گیا تو لوگوں کی نظر میں آقا اور غلام میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا، اگر تو میرے پاس بیٹھ نہیں سکتا تو میری پشت پر کھڑا تو ہو سکتا ہے۔''

برکت خان نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے۔''

اور وہ بادشاہ کی پشت پر، بادشاہ سے پانچ قدم دور جا کھڑا ہوا۔

بادشاہ نے اعلان کیا۔ ''میں، محمود شاہ ثانی بن لطیف خان والی گجرات اپنے وفادار جاں نثار غلام برکت خان کو اعتماد خان کا خطاب دیتا ہوں، اب یہ میرے امرا میں شمار ہوگا، معززترین امیر اعتماد خان۔''

حاضرین نے جوش و خروش سے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

لیکن بادشاہ اور برکت خان نے ان آوازوں میں چھپے ہوئے حسد اور رقابت کو بھی محسوس کر لیا۔ ان نعرے لگانے والوں میں برہان الدین شامل نہیں تھا۔ بادشاہ کو یہ بات گراں گزری۔ اس نے برہان الدین کو ذرا قریب بلا کر سختی سے کہا۔ ''اپنی عبادت پر نازاں عابد! مجھے تو، تو سخت حاسد اور کینہ توز معلوم ہوتا ہے۔''

برہان الدین کے چہرے پر ناگواری کا ذرا سا بھی اثر نمودار نہ ہوا، بولا۔ ''حضور والا! ابھی ابھی برکت خان نے جاں نثاری اور وفاداری کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق میں نے اپنے معبود پر کسی کو ترجیح دینا گوارا نہیں کیا کیونکہ میں خود بھی ایک وفادار اور جاں نثار انسان ہوں، خدا کے بعد میں نے حضور کو اپنا آقا تسلیم کیا ہے چنانچہ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر رکھا ہے کہ جس طرح میں نے اپنے رب اور پروردگار کی بندگی اور اپنے خالق کی عبدیت کا یہ مفہوم لیا ہے کہ شب و روز کے ان اوقات میں، جبکہ مجھے اس کے دربار میں حاضری دینا پڑتی ہے، میں کسی بھی دربار اور سرکار کی پروا نہیں کروں گا۔ اسی طرح جب میں کسی ایسی آزمائش میں پڑوں گا جس میں ایک طرف تو اپنی زندگی، اپنی عزت، اپنا مفاد، اپنی خوشی اور اپنی لذت ہو اور دوسری طرف بادشاہ کی مرضی، بادشاہ کی خوشی اور بادشاہ کے حقوق ہوں تو میں اپنا سب کچھ بادشاہ کی خوشی اور مرضی پر قربان کر دوں گا۔''

بادشاہ حیران تھا کہ اس کے ملازمین میں کیسے کیسے وفادار اور جاں نثار موجود ہیں اور اسے ان کی خبر تک نہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر ان دو جیسے اسے چند امیر اور مل جائیں تو وہ بے خوف و خطر ایک طویل عرصے تک حکومت کر سکے گا اور دغاباز اور غدار امرا کی بہ آسانی سرکوبی کی جا سکے گی۔

بادشاہ نے برہان الدین کو اپنے قریب بلایا۔ ''برہان! میرے قریب آجا، تاکہ میں تجھے اچھی طرح دیکھ سکوں۔''

برہان الدین نے عاجزی اور انکساری سے کام نہیں لیا۔ وہ بادشاہ کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

بادشاہ نے کہا۔ ''میں نے تیری باتیں سنیں اور ان پر کسی حد تک یقین بھی کر لیا لیکن میں ان پر پوری طرح یقین اس وقت کروں گا جب تو اپنے قول پر عملاً پورا اتر جائے گا۔''

برہان نے عرض کیا۔ ''حضور والا! میں نے جو کچھ عرض کیا تھا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ کو اپنی باتوں پر یقین کرنے پر مجبور کروں، دعوے تو سبھی کرتے ہیں لیکن ان دعووں پر پورے بہت کم اترتے ہیں۔ میں زندگی بھر اسی کوشش میں رہوں گا کہ اس وقت جو کچھ کہا ہے اس پر

پورا اتروں اور شرمندگی سے بچا رہوں۔"

پورے دربار کو سانپ سونگھ گیا۔ بادشاہ نے اعلان کر دیا۔ "میں برہان الدین کے کردار اور اس کے تقویٰ سے بہت متاثر اور خوش ہوں، اس لیے میں اسے اپنے حرم سرا کا نگراں اور محافظ بناتا ہوں۔"

برہان الدین نے دبی آواز میں گزارش کی۔ "حضورِ والا! حرم سرا کی نگرانی اور حفاظت کرنا، بڑا نازک اور آزمائشی کام ہے، کیا حضور کوئی اور خدمت میرے لائق نہیں نکالیں گے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "برہان الدین! بہرحال میں نے تجھے بھی اپنے معزز ترین امرا میں شامل کرلیا ہے۔"

حاضرین دربار نے ایک بار پھر نعرہ تحسین بلند کیا اور ان آوازوں میں بھی حسد اور رقابت کی بو محسوس کی جاسکتی تھی۔

بادشاہ نے کچھ دیر بعد دربار برخاست کر دیا اور امرا اور مصاحبین اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے لیکن اس وقت ان کے دلوں پر بڑا بوجھ تھا اور وہ سب ان دونوں امیروں کو نیچا دکھانے اور بادشاہ کی نظروں سے گرانے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔

امرا کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے برہان الدین اور اعتماد خان کو اسی خیمے میں دوبارہ طلب کرلیا اور جب یہ دونوں بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوئے تو برہان الدین نے بات کرنے میں پہل کی۔ بولا۔ "حضور والا کی نوازش اور مرتبہ بخشی نے ہم دونوں کو جملہ امرا کی نظروں میں محسود بنا دیا ہے اور خدا نہ کرے، مگر اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ امرا بادشاہ سے بھی دشمنی کریں۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں تیری باتوں سے اتفاق کرتا ہوں لیکن میں تم دونوں سے بہت خوش ہوں اور یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں تنہا، اکیلا تھا لیکن خدا نے تم دونوں کو غیب سے میری مدد کے لیے بھیج دیا ہے۔ میں انسان نما بھیڑیوں میں گھرا ہوا تھا کہ خدا نے دو اصیل شیروں کو نازل فرما دیا۔ چنانچہ اب میں دوغلے اور مکار امیروں سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوں، میں مطمئن اور خوش ہوں۔ طمانیت اور آسودگی میرے دل و دماغ میں رچ بس گئی ہے۔"

اعتماد خان نے عرض کیا۔ "اس ناچیز کی تو یہ دعا ہے کہ خدا ایسا موقع پیدا فرمائے جب میں اپنے عمل سے اپنے قول کی تصدیق کرسکوں اور حضور کو چکنی چپڑی باتوں سے خوش نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو ایک گہرے اور بھاری بھرکم حکمراں کی طرح اپنے غدار اور مکار امرا سے بھی اسی طرح پیش آنا چاہیے جس طرح ہم دونوں سے پیش آرہے ہیں، ہاں ان سے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے نپٹنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

بادشاہ نے برہان الدین اور اعتماد خان کے تدبر اور عقلمندی کا بھی اعتراف کیا۔ وہ ان دونوں سے اتنا خوش اور اتنا متاثر تھا کہ ان دونوں کے سامنے چاندنی اور دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو لے آیا اور ان سے ان دونوں کی ــــ بے حد تعریف کی۔ اعتماد خان نے عورتوں کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور دونوں آنکھیں بند کرلیں لیکن برہان الدین نہایت اعتماد اور شان سے ان سب کے سامنے کھڑا رہا۔

چاندنی نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔ "خوش نصیب ہے وہ حکمراں جس کو اتنے وفادار اور عقلمند خدمت گار میسر آجائیں اور بہت زیادہ خوش قسمت ہے وہ بادشاہ جو انہیں پہچان بھی لے۔ کیونکہ اکثر بادشاہوں کو مردم شناسی کا جوہر نہیں ملا۔"

برہان الدین نے چاندنی کو شک سے دیکھا، بولا۔ "خاتون! آپ بجا فرما رہی ہیں۔"

بادشاہ نے چاندنی سے سوال کیا۔ "تو نے جو کچھ کہا، اس کی وضاحت بھی کردے کیونکہ تیری باتوں کا مخفی اشارہ کچھ کچھ سمجھ میں تو آگیا ہے لیکن اس کی تصدیق یا تردید خود تیری زبان سے جب تک نہ ہوجائے، میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔"

برہان الدین نے چاندنی کی طرف سے جواب دیا۔ "حضور والا! میری ناقص رائے میں یہ خاتون ہم دونوں کے علاوہ بھی کسی کو پہچاننا چاہتی ہے یعنی اس کا مافی الضمیر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بادشاہ نے کسی کو پہچاننے میں تغافل یا تساہل اختیار کر رکھا ہے۔"

چاندنی پھڑک گئی۔ برہان الدین کو داد دیتے ہوئے بولی۔ "بیشک، بیشک، میں یہی کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔"

بادشاہ مسکرایا، بولا۔ "چاندنی! میں تیرا مطلب سمجھ گیا، ان دو کے علاوہ تیسری تو ہے جس کو تیری بدگمانی کے مطابق شاید میں پہچان نہیں سکا لیکن یہ تیری خام خیالی ہے، میں تیرے خلوص، تیری محبت اور تیری وفاداری پر شبہ نہیں کرتا اور چونکہ تو خود بھی ایک عورت ہے اس لیے میں اپنی مذکورہ نفسی کمزوری کی وجہ سے تجھ کو ان دونوں وفادار امرا کی صف میں جگہ نہیں دے سکتا۔"

باتیں کرتے کرتے بادشاہ کی نظر اچانک اعتماد خان پر پڑ گئی جو منہ پھیرے سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''اعتماد خان! کیا بات ہے؟ تو نے یہ کیسی وضع اختیار کر رکھی ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''قبلۂ عالم! میں اس وقت تک اسی طرح بیٹھا رہوں گا جب تک کہ یہ لڑکیاں اور عورتیں یہاں موجود ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے، خوف محسوس ہوتا ہے۔''

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''خوف؟ کس قسم کا خوف ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''قبلۂ عالم! مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور میں اپنی اس کمزوری سے خوفزدہ ہوں۔''

بادشاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اعتماد خان! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آدمی کو اپنے آپ پر اعتماد رکھنا چاہیے اور میں جانتا ہوں کہ تجھ کو خود پر اعتماد ہے اور تو اس اعتماد کو مجروح نہیں کرے گا۔ میں نے اعتماد خان کا خطاب اسی لیے تو دیا ہے تجھے کہ تو قابلِ اعتماد اور مضبوط کردار کا نوجوان ہے۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''بندہ نواز! میں نے آپ کے اعتماد کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ہی اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے منہ پھیر لیا ہے اور سر جھکا لیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر میں بہکا اور کسی لغزش کا شکار ہوا تو میرے سامنے کوئی راہِ فرار نہ ہوگی اور مجھ کو خودکشی کر کے مرجانا پڑے گا۔''

بادشاہ نے برہان الدین کی طرف دیکھا۔ ''برہان الدین! اعتماد خان جو کچھ کہہ رہا ہے، کیا اس کی باتیں تیری سمجھ میں بھی آرہی ہیں؟''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''قبلۂ عالم! میں اعتماد خان کے خیالات اور احساسات کی قدر کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس کو وہمی اور کمزور ارادوں کا انسان سمجھنے پر مجبور ہوں جبکہ میں خود بھی باتیں نہیں کر سکتا اور نہ ہی اعتماد خان کی طرح اپنی آنکھیں بند کر کے منہ پھیر کر اور گردن ڈال کر بیٹھ سکتا ہوں کیونکہ مجھ کو خود پر اعتماد ہے اور میں بڑے مضبوط ارادوں کا انسان ہوں۔''

اعتماد خان نے تڑپ کر کہا۔ ''برہان الدین یہ دعویٰ نہ کر۔ میری طرح تو بھی اسی آدم کی اولاد ہے جس نے حوا کے ورغلانے پر اپنی زندگی کا پہلا گناہ کیا تھا، حوا کی بیٹیوں کے درمیان رہ کر آدم کے بیٹے کس طرح اپنے آپ پر قابو رکھ سکتے ہیں۔''

بادشاہ، چاندنی اور دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ان دونوں کی نوک جھوک سے بڑا مزہ آرہا تھا۔

بادشاہ کو اعتماد خان کی ادائیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کو اعتماد خان پر رحم آگیا، بولا۔ ''اعتماد خان! میں تیرے جذبوں کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں، تو اگر باہر جانا چاہتا ہے تو جا سکتا ہے، میں تجھ سے کسی اور وقت باتیں کرلوں گا۔''

اعتماد خان تیزی سے اٹھا۔ ''جہاں پناہ! میں آپ کا شکرگزار ہوں۔'' اور منہ پھیرے پھیرے فوراً ہی خیمے سے نکل گیا۔

برہان الدین کو یہ خیال اذیت پہنچا رہا تھا کہ بادشاہ اس بے وقوف نوجوان کے احمقانہ وسوسوں کو خوامخواہ اہمیت دے رہا ہے۔ بادشاہ نے اعتماد خان کے جانے کے بعد کہا۔ ''یہ عجیب و غریب نوجوان ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔''

برہان الدین نے اعتماد خان کا مذاق اڑایا۔ ''جہاں پناہ! مجھ کو تو اعتماد خان کی باتوں میں تصنع اور مبالغہ محسوس ہوتا ہے، یا تو یہ نوجوان انتہائی سادہ اور احمق ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو بڑا چالاک، مکار، عیار اور منافق نوجوان ہے اور اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''برہان الدین! ہوسکتا ہے تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہو لیکن جب تک یہ نوجوان تجربوں اور واقعوں سے کچھ ثابت نہ کردے، میں بدظنی یا بدگمانی کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''حضور بھی بجا فرماتے ہیں، بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے غلاموں کو جانچے پرکھے بغیر کچھ سے کچھ سمجھ لیں، ویسے میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص صدقِ دل اور خلوص سے صوم و صلوٰۃ کا پابند ہوجائے تو برائیاں اور گناہ اس سے دور بھاگیں گے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں اس لیے پارسائی کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہوں۔''

چاندنی نے عرض کیا۔ ''تو صوم و صلوٰۃ کا پابند ایک پارسا انسان ہے۔ اس لیے تیری بابت کچھ قبل از وقت کہنا بیکار ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اعتماد خان بھی غلط نہیں کہتا، اس نے جو کچھ کہا مبنی برحقیقت ہے۔''

برہان الدین، چاندنی سے بھی جل گیا، برا سا منہ بنا

کر بولا۔ ''خاتون! ایک زمانہ اس کی تصدیق کردے گا کہ میرا علم اور زہدوتقویٰ آپ سے زیادہ ہے۔ اس لیے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر یقین کیا جاسکتا ہے اور یقین کیا جائے گا لیکن میرے برعکس خاتون آپ جو کچھ بھی کہیں گی وہ زمانے کی نظروں میں غیر معتبر اور مشکوک ہوگا۔''

دوسری عورتوں اور لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نے بادشاہ کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ''عریشہ! کیا تو بھی کچھ کہنا چاہتی ہے؟''

عریشہ نے بڑی بڑی پلکوں کے نیچے بادام جیسی آنکھوں سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکائیں۔ ''حضور! اس مغرور سے فرمادیجیے کہ خدا کو تکبر ناپسند ہے، یہ بڑے بڑوں کو گرادیتا ہے، میرے جیسی کوئی بھی لڑکی اس بڑبولے کو مزہ چکھا سکتی ہے۔''

ابھی بادشاہ نے زبان بھی نہیں کھولی تھی کہ برہان الدین بول پڑا۔ ''لڑکی! تو بھی اپنے عشوہ و ناز اور حسن پر تکبر نہ کر، میں نے معلوم نہیں، کتنوں کو خوار اور نادم کردیا ہے۔''

بادشاہ ان باتوں سے اکتا گیا تھا، بولا۔ ''اب اس موضوع کو ترک کردینا چاہیے۔'' اس کے بعد چاندنی سے کہا۔ ''چاندنی! کیا تو جانتی ہے کہ میری متاع حیات کیا ہے؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''رقص و سرور۔ عیش و طرب!''

بادشاہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ ''تو نے بالکل صحیح کہا۔ اب میں اپنی سارے دن کی تکان دور کرنا چاہتا ہوں۔ نغمہ داستان کو اور بذلہ سنجوں کو حاضر کیا جائے تاکہ میں دل کی کدورت دور کرسکوں۔'' پھر برہان الدین سے کہا۔ ''اور تو یہیں میرے پاس ہی رہے گا۔ اعتماد خان کی طرح میں تجھ کو بھی بے حد پسند کرتا ہوں کیونکہ تو نے اپنے نفس کو زہدوتقویٰ سے قابو میں کررکھا ہے۔''

بادشاہ نے تالی بجائی۔ کئی خواجہ سرا خیمے میں داخل ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ ''بزم طرب برپا کی جائے۔''

اس مختصر فقرے نے آناً فاناً اہل نشاط کو بادشاہ کے خیمے میں پہنچادیا اور اس کے بعد جو رقص و موسیقی کا سماں بندھا تو اس ویرانے میں وہ دھوم مچی کہ آبادیاں رشک کریں۔

برہان الدین نے معذرت کی۔ ''بندہ پرور! افسوس کہ میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''برہان الدین! یہ کیوں؟''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''حضور والا کو علم ہے کہ میں لہوولعب اور رقص و طرب کا آدمی نہیں ہوں۔ میں ان چیزوں سے دور بھاگتا ہوں۔ رہی وفاداری اور جاں نثاری کی بات تو میں اس میں کسی سے بھی پیچھے نہ رہوں گا اور پھر یہ کہ ذرا دیر بعد مجھے تہجد بھی پڑھنا ہے۔''

بادشاہ نے ادب سے کھڑے ہوکر کہا۔ ''بسم اللہ، آپ جاسکتے ہیں، جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ آپ کے پیچھے تہجد پڑھوں لیکن فی الحال شیطان غالب ہے، خدا سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے سیدھی راہ پر ڈال دے۔''

برہان الدین چلا گیا اور بادشاہ کے دل و دماغ پر اپنے زہدوتقویٰ کا مزید رعب ڈال گیا۔ بادشاہ مطمئن تھا کہ جب تک اس کے پاس برہان الدین اور اعتماد خان جیسے لوگ موجود ہیں، اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

☆☆☆

بادشاہ کی اگلی منزل جنگل کا وہ کنارہ تھا، جہاں شیر تیندوے، چیتے اور گلام وغیرہ رہتے تھے۔ بادشاہ کے شہسواروں نے ایسی جگہ خیمے نصب کروائے جہاں سے جنگل کا منظر بہت صاف نظر آتا تھا۔ لیکن رات کی تاریکی میں اس جگہ وحشت برستی تھی۔ بادشاہ کے علاوہ گرد یہاں بھی خیموں کے چاروں طرف گھوم پھر کر پہرے داری کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ خیموں کے چاروں طرف آگ جلا دی گئی تھی تاکہ خونخوار درندے خیموں تک نہ آجائیں۔ بادشاہ کے بیس جاں نثار اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے آس پاس پھر رہے تھے، انہی میں اعتماد خان بھی شامل تھا۔

برہان الدین اپنے طور پر شاہی خدمات بجا لارہا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا، جو اس کو ساری آزمائشوں سے نجات دلادے۔ تیسرے پہر چند دیہاتی آئے اور انہوں نے درخواست کی کہ وہ بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔

برہان الدین ان دیہاتیوں کو ایک طرف لے گیا اور پوچھا۔ ''تم لوگ بادشاہ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ ''بادشاہ کو ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔''

برہان الدین نے کہا۔ ''میں بادشاہ کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے ذرّے کو آفتاب بنادیا۔ اب اگر تم لوگ بادشاہ سے محض اس لیے ملنا چاہتے ہو کہ تم لوگ بادشاہ کو کسی خطرے سے آگاہ کرکے اس سے انعام و اکرام حاصل کرو تو یہ میں بھی کرسکتا ہوں لیکن افسوس کہ اس وقت تک میں کچھ بھی نہ دوں گا جب تک یہ ثابت نہیں ہوجائے گا کہ تم نے جو کچھ کہا تھا، درست تھا۔''

دیہاتیوں نے آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھا

اور ایک نے کہا۔ ''جناب! بادشاہ نے جس جگہ خیمے نصب فرمائے ہیں، یہ بڑی مخدوش جگہ ہے۔ جنگلی درندے کسی بھی جگہ سے نمودار ہو کر حملہ آور ہو سکتے ہیں، بادشاہ کو یہ بات بتا دی جائے کہ اس پر کسی بھی وقت شیر، چیتا، تیندوا حملہ آور ہو سکتا ہے، دوسری بات یہ کہ اس جنگل کے آس پاس گاؤں میں سال بھر سے ہاہاکار مچی رہتی ہے اور اس جنگل کے درندے کسی نہ کسی گھر کو اجاڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ کو ان باتوں کا علم ضرور ہونا چاہیے۔''

برہان الدین نے دیہاتیوں کو انعام دے کر رخصت کر دیا اور خود بادشاہ کے پاس گیا اور کہا۔ ''حضور والا! میں نے آس پاس کے لوگوں سے بڑی چھان بین کی اور ان سے اس جگہ کی بابت بڑی معلومات یکجا کی ہیں تو پتا چلا ہے کہ جس جگہ ہمارے خیمے نصب ہیں وہ بڑی مخدوش جگہ ہے یہاں جنگل کے درندے چوری چھپے آتے ہیں اور نقصان پہنچا کر چلے جاتے ہیں چنانچہ حضور کے جاں نثاروں اور وفاداروں کو چاہیے کہ وہ ہر وقت مستعد اور چوکس رہیں۔ معلوم نہیں کس وقت ان کی ضرورت پیش آجائے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''ہم شکار کھیلنے آئے ہیں اس لیے درندوں سے ڈرنا کیسا۔ رہا یہ کہ درندے غافل پا کر ہم پر حملہ نہ کر دیں تو اتنے آدمیوں کی موجودگی میں مشکل ہی سے کوئی جانور حملے کی جرأت کر سکتا ہے۔''

دوسرے دن، صبح بادشاہ اپنے آدمیوں کے ساتھ جنگل میں گھس گیا اور تلاشِ بسیار کے بعد ایک ایسی جگہ پالی جو ایک پہاڑی کی طرح ابھری ہوئی تھی اور چھوٹی بڑی پتھریلی چٹانوں نے اسے جنگل سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ بادشاہ اس پہاڑی پر چڑھ گیا۔ بادشاہ کے شکاری ساتھی بھی اس کے آس پاس موجود رہے۔ ہنکوے پہاڑی کے نیچے ڈھول پیٹنے لگے اور شور و غل سے شکار کو پہاڑی کے سامنے والے حصے کی طرف بھگانے لگے۔

بادشاہ اور اس کے شکاری ساتھی بندوقوں، تیر کمانوں اور تلواروں سے لیس سانسیں روکے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

بادشاہ کی عدم موجودگی میں حرم کی حفاظت کا کام برہان الدین، اعتماد خان اور وہ بیس جیالے انجام دے رہے تھے جن کی شجاعت اور بہادری کے چرچے عام تھے اور جن کی وفاداری اور جاں نثاری شک و شبہے سے بالا تھی۔ یہاں برہان الدین اس فکر میں مبتلا تھا کہ کسی طرح اعتماد خان کو اپنے اعتماد میں لے لے کیونکہ اعتماد خان کو نظرانداز کر کے بادشاہ کے دل میں وہ جگہ نہیں بنا سکتا تھا، جس کی وہ آرزو رکھتا تھا۔

اعتماد خان ہر وقت چوکس اور مستعد شاہی خواتین اور حرم کے خیموں کے آس پاس گھومتا پھرتا رہا۔ برہان الدین نے چاندنی کے خیمے پر اعتماد خان سے ملاقات کی اور بڑی گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ اعتماد خان کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ برہان الدین نے پوچھا۔ ''اعتماد خان! خیریت تو ہے۔ تو پریشان پریشان سا نظر آرہا ہے، کوئی خاص بات؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''امیر برہان الدین! ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہنکوؤں کے شور و غل سے پریشان ہو کر ایک شیر شاہی خیموں کی طرف آگیا ہے، میں پریشان ہوں کہ کہیں وہ حرم کی طرف نہ آجائے، شاہی خدمت گار چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور بڑی تندہی سے شیر کو تلاش کر رہے ہیں۔ جب تک یہ شیر مل نہیں جاتا، ہماری پریشانیاں باقی رہیں گی۔''

برہان الدین نے ہنس کر کہا۔ ''تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، مجھ کو دافع بلا کی چند دعائیں یاد ہیں، میں انہیں پڑھ کر اسی وقت حرم کے خیموں کے چاروں طرف حصار کھینچ دوں گا۔ اگر شیر ادھر آ بھی گیا تو اس کی مجال نہ ہوگی کہ حصار کے پار قدم بھی رکھ سکے۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''بھائی برہان الدین! تم دعاؤں سے حصار کھینچو اور میں اپنے جیالے نوجوانوں کے ساتھ چوکیداری کرتا ہوں، ہمیں دونوں تدبیریں کرنا چاہئیں تاکہ اگر کوئی ایک خطا کر جائے تو دوسری اپنا کام کر جائے۔''

برہان الدین نے منہ بنایا۔ ''اعتماد خان! تو بڑا سادہ لوح انسان ہے تیری اور تیرے آدمیوں کی بہادری دھوکا دے سکتی ہے لیکن میری دعائیں کسی حال میں بھی بے اثر نہ ہوں گی۔ اگر تو اور تیرے ساتھی یہاں سے چلے بھی جائیں، تب بھی میرا حصار حرم کی کامیاب حفاظت کرے گا۔ چاہو تو اسی وقت تجربہ کر لو اور اپنے آدمیوں کو لے کر کہیں اور چلے جاؤ اور حرم کی حفاظت کا کام میرے ہی ذمے رہنے دو۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''بھائی برہان الدین! آپ کی دعاؤں کا اثر مسلم۔ لیکن میں اپنی خدمت نہیں چھوڑ سکتا اور یہیں حرم کے آس پاس ہی موجود رہوں گا۔''

شاہی خدمت گار شیر کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اعتماد خان نے اپنے آدمیوں کو سختی

سے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنی اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حرم کی حفاظت کریں گے۔

شیر کی آمد اور تلاش کی خبر حرم میں پہنچی تو سب عورتیں بہت پریشان ہوگئیں۔ وہ سب خیمے کے در پر جمع ہوگئیں اور جھانک جھانک کر صورتِ حال معلوم کرنے لگیں۔ چاندنی نے برہان الدین سے پوچھا۔ ''شیر کا کچھ پتا چلا؟''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''خاتون! آپ بالکل پریشان نہ ہوں، میں نے آپ کے خیمے کے گرد حصار کھینچ دیا ہے۔''

چاندنی نے کہا۔ ''برہان الدین! اعتماد خان کو بلا۔ میں اس سے پوچھوں گی کہ اس نے شیر سے بچنے کا کیا انتظام کیا ہے؟''

برہان الدین نے ہنس کر عرض کیا۔ ''میں اعتماد خان کو بلواتا ہوں لیکن وہ خواتین سے ڈرنے، شرمانے والا نوجوان آپ کے پاس آئے گا کس طرح اور باتیں کیونکر کرے گا؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''میں پردے کے پیچھے سے باتیں کرلوں گی۔''

اچانک شور اٹھا۔ ''وہ رہا شیر، وہ رہا شیر۔ مارو مارو جانے نہ پائے۔''

چاندنی اور دوسری خواتین اور لڑکیاں خیمے سے باہر نکل آئیں۔ برہان الدین گھبرا کر خیمے میں داخل ہوگیا۔ اس وقت اعتماد خان اپنے آدمیوں کے ساتھ خیمے کے در پر آگیا۔ اس نے شاہی حرم سے کہا۔ ''معزز خواتین! آپ اندر جائیں اور جب تک ہم یہاں موجود ہیں آپ ذرا بھی نہ ڈریں۔''

چاندنی اور اعتماد خان کی نظریں ملیں تو دونوں چکرا گئے۔ اعتماد خان نے منہ پھیر کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن چاندنی نے دوڑ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی۔ ''اعتماد خان! یہ وقت شرمانے، گھبرانے کا نہیں ہے، تم یہیں رہو گے۔''

اعتماد خان نے پوچھا۔ ''امیر برہان الدین کہاں چلے گئے؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''ہم ڈر کر خیمے سے باہر آگئے اور امیر برہان الدین خیمے کے اندر چلا گیا۔''

چند پیادے دوڑتے ہوئے آئے اور اعلان کیا۔ ''شیر شاہی خیمے میں چھپ گیا ہے۔''

اعتماد خان نے پوچھا۔ ''یہ محض شک ہے یا کسی نے اندر داخل ہوتے بھی دیکھا ہے؟''

ایک پیادے نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے شیر کو شاہی خیمے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔''

شاہی خیمہ حرم کے خیمے سے ملحق تھا۔ اب تو حرم کا اور برا حال ہوگیا اور ان سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اعتماد خان نے چیخ کر کہا۔ ''امیر برہان الدین! خیمے سے باہر آجاؤ، شیر شاہی خیمے میں داخل ہوچکا ہے اور اس کا امکان ہے کہ یہاں سے وہ حرم کے خیمے میں نہ داخل ہوجائے کہیں۔''

لیکن برہان الدین باہر نہیں نکلا۔

اعتماد خان نے حرم کو تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، ایک شیر کا مارنا ہی کیا، ابھی کام تمام کردیا جائے گا۔ اس نے اپنے بیس جاں نثاروں کو شاہی خیمے کے چاروں طرف کھڑا کردیا اور انہیں حکم دیا کہ مستعد اور چوکس رہیں اور جہاں اور جونہی شیر نظر آئے اس پر مردانہ وار حملہ کرکے اسے ہلاک کردیں۔ اس کے بعد پندرہ سولہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ شوروغل شروع کریں تاکہ شیر گھبرا کر خیمے سے باہر نکلے۔

چاندنی اور دوسری حرم نے اعتماد خان سے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے دور کسی اور خیمے میں پہنچا دیا جائے۔''

اعتماد خان نے ان سب کو تیس پینتیس سپاہیوں کے نرغے میں سلحدار کے خیمے میں بھیج دیا اور سپاہیوں کو تاکید کردی کہ وہ اس خیمے کی شجاعت اور ہوش مندی سے حفاظت کریں۔

اب اعتماد خان شاہی خیمے کی طرف متوجہ ہوا۔ شوروغل برپا تھا اور اعتماد خان اپنے جاں نثاروں سمیت شیر کی نکاسی کا منتظر تھا۔

اعتماد خان نے برہان الدین کو آواز دی۔ ''امیر برہان الدین! فوراً باہر آجاؤ۔ شیر ملحقہ شاہی خیمے میں موجود ہے۔''

اب شوروغل بہت بڑھ چکا تھا۔ شیر شاہی خیمے سے اچانک نکلا اور حرم میں داخل ہوگیا۔ اعتماد خان چیخا۔ ''امیر برہان الدین! ہوشیار، شیر سے ہوشیار۔''

وہ اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ حرم کے خالی خیمے میں داخل ہوگیا۔ برہان الدین کی چیخ سنائی دی۔ ''خدایا المدد۔ اللہ العالمین مدد۔''

اعتماد خان نے اندر داخل ہوتے ہی یہ دلدوز منظر دیکھا کہ برہان الدین ایک مسہری کے پیچھے دبکا ہوا ہے اور

شیر نے اس کا شانہ اپنے پنجے میں دبالیا ہے۔ اعتماد خان نے آگے بڑھ کر شیر پر وار کر دیا۔ تلوار کی نوک شیر کے پیٹ میں اتر گئی۔ شیر نے برہان الدین کو چھوڑ دیا اور پلٹ کر اعتماد خان پر جست لگائی۔ اعتماد خان بیٹھ گیا۔ شیر اس کے اوپر سے گزر کر خیمے کے پردے سے ٹکرایا۔ اعتماد خان کے دو ساتھی پھرتی سے شیر پر حملہ آور ہوئے اور ان کی تلواریں ایک ساتھ شیر کی گردن پر پڑیں۔ تیسرے ساتھی نے اپنا بھالا شیر کے پیٹ میں اتار دیا۔ اب شیر میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکتا۔ وہ گر کر تڑپنے لگا۔ اعتماد خان نے پے در پے وار کر کے شیر کا بالکل کام تمام کر دیا۔

برہان الدین مسہری کے پیچھے پڑا سسکیاں بھر رہا تھا۔ اعتماد خان نے برہان الدین کو سنبھالا اور زخمی حصے پر پٹی باندھ دی۔ ایک آدمی طبیب کو بلانے کے لیے چلا گیا، طبیب نے برہان الدین کی پٹی کی اور تسلی دے کر چلا گیا۔ برہان الدین کو اس کے خیمے میں پہنچا دیا گیا اور بادشاہ کے حرم کو شاہی خیمے میں لے جایا گیا۔ کیونکہ طے یہ پایا تھا کہ جب تک بادشاہ مردہ شیر کو دیکھ نہ لے، اسے حرم ہی میں پڑا رہنے دیا جائے۔

اعتماد خان اور اس کے ساتھیوں کی بہادری کا چرچا خیموں کی دنیا میں عام ہو گیا۔ جو موجود تھے بھاگ بھاگ کر دیکھنے کے لیے آنے لگے۔

اعتماد خان، برہان الدین کے پاس چلا گیا اور اس کو تسلی دی کہ زخموں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ طبیب نے کہا ہے کہ زخم ایک ہفتے میں مندمل ہو جائیں گے۔ برہان الدین نے اعتماد خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اعتماد خان نے محسوس کیا کہ برہان الدین کچھ کہنا چاہتا ہے۔ برہان الدین نے اعتماد خان کے ہاتھ کو ہونٹوں پر رکھ لیا اور بوسہ دے کر رخساروں پر پھیرنے لگا۔ رخساروں پر موجود گرم گرم آنسوؤں نے اعتماد خان کی ہتھیلی اور انگلیوں کو تر کر دیا۔

اعتماد خان نے پوچھا۔ ''برہان الدین! کیا بات ہے۔ تم رو کیوں رہے ہو؟''

برہان الدین نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ''اعتماد خان! میں تیرا شکر گزار ہوں۔ اس وقت اگر تو اپنے ساتھیوں سمیت خیمے میں داخل نہ ہوتا تو شیر میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔''

اعتماد خان نے ہنس کر کہا۔ ''اس میں شکر گزاری کی کیا بات ہے۔ امیر برہان! تم نے تو اپنے خیمے کے چاروں طرف حصار کھینچ دیا تھا اور مطمئن تھے کہ اب شیر اس خیمے میں داخل نہیں ہو سکے گا پھر یہ شیر خاص طور پر اسی خیمے میں تم پر ہی حملہ آور کیوں ہوا؟''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''اعتماد خان! میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ حصار کھینچنے میں کوئی کوتاہی ضرور ہو گئی ہو گی، جو کچھ ہو گیا، اب اس کا ذکر نہ کرو۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں ذکر نہ کروں تو نہیں کروں گا۔''

برہان الدین نے کہا۔ ''اور اعتماد خان! تو ایک وعدہ کر۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''بولو، میں وعدہ بعد میں کروں گا، پہلے تیری بات سن لوں۔''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''یہ جو کچھ اور جس طرح ہوا ہے، اس کا ذکر تو بادشاہ سے نہیں کرے گا ورنہ میری بڑی سبکی ہو گی۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں امیر برہان۔ میں تمہیں رسوا نہیں ہونے دوں گا۔''

برہان الدین نے ایک بار پھر اعتماد خان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''اعتماد خان تو عظیم ہے، شکریہ، تیرا بہت بہت شکریہ۔''

بادشاہ شکار سے واپس آیا اور شاہی حرم سرا میں مردہ شیر کو دیکھا تو اعتماد خان اور اس کے ساتھیوں کی تعریف کی اور کہا۔ ''اعتماد خان! میں خوش ہوں کہ تو میرے اعتماد پر پورا اترا۔''

اعتماد خان نے عرض کیا۔ ''جہاں پناہ! میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے جو کچھ کیا' وہ میرا فرض بھی تھا اور تقاضا بھی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''یہ برہان الدین کس طرح زخمی ہو گیا ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''اس سوال کا جواب امیر برہان ہی دے سکتے ہیں، میں کیا عرض کروں۔''

بادشاہ نے مردہ شیر کو اپنے خیمے کی دہلیز پر رکھوا دیا اور شاہی خواتین کے خیمے کی صفائی کرا کے حرم کو دوبارہ وہیں بھیج دیا۔ اس کے بعد اعتماد خان کو اپنے ساتھ لے کر برہان الدین کی عیادت کرنے چلا گیا۔ بادشاہ کو اپنے سامنے دیکھ کر برہان الدین اٹھنے لگا مگر بادشاہ نے اس کو لیٹے رہنے کا حکم دیا، پوچھا۔ ''برہان الدین! یہ کیا ہو گیا؟ تو کس طرح زخمی ہو گیا؟''

برہان الدین نے اعتماد خان کی طرف دیکھا۔

''بندہ پرور! کیا اس واقعے کی تفصیل اعتماد خان نے نہیں گوش گزار کی؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ امیر برہان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہی بیان کریں گے۔''

برہان الدین نے سکون کی سانس لی اور دم لے کر بولا۔ ''بادشاہ سلامت! بندے نے جیسے ہی یہ سنا کہ ایک شیر غلطی سے ادھر آ گیا ہے۔ میں اپنی تلوار لے کر شاہی خواتین کے خیمے کے اندر داخل ہوگیا اور ان سے خیمہ خالی کرالیا، میرے پیچھے ہی شیر بھی خیمے میں داخل ہوگیا۔ اس وقت میں ایک مسہری کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر وہیں سے شیر کو للکارا، اللہ کے نام کی برکت اور اس ناچیز کی آواز کی گھن گرج، شیر چندھیا کر میری طرف بڑھا۔ میں تو اس کے لیے تیار ہی تھا، شیر نے مجھ پر جست لگائی اور میں نے اپنا شانہ اس کے حوالے کر کے دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر زوردار مکا رسید کر دیا، مکا اتنا زوردار تھا کہ شیر بھی یاد کرتا ہوگا کہ کسی انسانی شیر سے واسطہ پڑا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ شیر کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر اسے اندھا کر دوں اور پھر اسے جس طرح چاہوں شکار کرلوں، لیکن میری اور شیر کی بدقسمتی کہ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اعتماد خان بھی خیمے میں داخل ہوگیا اور تھکے ہارے نیم مردہ شیر کو شکار کرلیا۔ ویسے یہ بات طے تھی کہ اگر اعتماد خان اپنے ساتھیوں کی مدد سے شیر کو ہلاک نہ کرتا، تب بھی میں تنہا اس کو مار چکا ہوتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ شیر کے خاتمے کے بعد میں اس سے کہیں زیادہ زخمی ہو چکا ہوتا جتنا اس وقت نظر آ رہا ہوں اور اس کا بھی امکان تھا کہ میں بھی شیر کے ساتھ ہی مر جاتا۔''

بادشاہ نے برہان الدین کی داستان شجاعت بڑی توجہ سے سنی اور اعتماد خان سے پوچھا۔ ''اعتماد خان! کیا برہان الدین صحیح کہہ رہا ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! جب میں خیمے میں داخل ہوا تھا تو میں نے شیر اور امیر برہان کو دست و گریبان دیکھا ضرور تھا، ہوسکتا ہے، امیر برہان نے شیر کی کنپٹی پر ایک آدھ گھونسا رسید بھی کر دیا ہو، لیکن یہ بات محلِ نظر ہے کہ اس کا شیر پر بھی کوئی اثر ہوا ہو۔''

برہان الدین نے اصرار کیا۔ ''اعتماد خان! میں ایک متقی مذہبی شخص ہوں۔ میں جھوٹ کو گناہ سمجھتا ہوں۔ تم یقین کرو کہ شیر کا برا حال میرے گھونسے ہی نے کر دیا تھا، اگر تم لوگ اندر نہ آ جاتے تو اس شیر کا میں تنہا ہی کام تمام کر دیتا۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''امیر برہان! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں مخالفت نہیں کروں گا اس لیے خاموش ہوں لیکن خدا کے لیے میرے ساتھیوں کی شجاعت اور مردانگی کو کم کر کے اپنی بہادری کا سکہ نہ بٹھاؤ۔'' پھر بادشاہ سے کہا۔ ''حضورِ والا! شیر کے شکار میں ہم سب نے اپنی اپنی حیثیت بھر حصہ لیا ہے۔ امیر برہان نے بھی بڑی بہادری دکھائی تھی۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''میں تم سب کی بہادری سے بہت خوش ہوں اور میں نے تم سب کے لیے امیران شیر کش کا خطاب پسند کیا ہے، امیر برہان الدین، اعتماد خان اور اعتماد خان کے بیس جاں نثار اور وفادار آج سے امیرانِ شیر کش ہیں اور ان کی خدمات ہمیشہ شاہی محل سے متعلق رہیں گی یعنی یہ سب میرے محافظ ہوں گے۔''

اعتماد خان نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور برہان کی آنکھوں سے مارے خوشی کے آنسو نکل آئے۔ بادشاہ نے اپنے دو طبیبوں کو برہان الدین کے خیمے ہی میں منتقل کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ اسے جلد از جلد صحت یاب کیا جائے۔

بادشاہ کئی ماہ سیر و شکار میں مشغول رہا۔ اس دوران برہان بھی صحت یاب ہو چکا تھا۔ جب چاندنی، عریشہ اور دوسری خواتین کو بادشاہ کی زبانی برہان الدین کی بہادری کا حال معلوم ہوا تو وہ امیر برہان کی بڑی عزت کرنے لگیں اور بادشاہ سے خواہش کی کہ امیر برہان کو شاہی حرم سرا کا محافظ بنا دیا جائے۔ بادشاہ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور دربار میں اعلان کر دیا کہ امیر برہان کو حرم سرا کے محافظ دستے کا امیر بنا دیا گیا ہے۔ برہان اس اعلان سے بہت خوش ہوا لیکن اعتماد خان اداس ہوگیا۔ برہان الدین نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ شاید اعتماد خان اس کی ترقی اور عزت افزائی سے خوش نہیں ہے۔

رات کے اندھیرے میں وہ اعتماد خان کے خیمے میں گیا۔ اس وقت اعتماد خان باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنے سامنے برہان الدین کو دیکھ کر ٹھٹکا اور پوچھا۔ ''برہان الدین! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''اعتماد خان! جیسا کہ تو جانتا ہے کہ میں ایک مذہبی اور بے ضرر انسان ہوں۔ میں نے اپنے لیے جو کچھ کیا، وہ میرا حق تھا اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی کو نقصان پہنچا کر فائدہ اٹھایا ہو۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''یہ تم اس قسم کی باتیں مجھ سے

کیوں کر رہے ہو؟ میں نے تو ایسی ویسی کوئی بات کہیں بھی اور کسی سے بھی نہیں کی۔''

برہان الدین نے افسوس ناک آواز میں کہا۔''بہت سی باتیں کہی نہیں جاتیں سمجھ لی جاتی ہیں۔''

اعتماد خان نے تلخی سے کہا۔''امیر برہان! جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ کوئی بات اپنے دل میں ہرگز نہ رکھو۔''

برہان الدین نے کہا۔''جب بادشاہ نے میری غیر معمولی بہادری کے عوض تم سب کو امیرانِ شیرکش کا خطاب دیا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور بہت خوش ہوا کہ چلو میرے طفیل بیس اکیس افراد کو بھی امیرانِ شیرکش کا خطاب مل گیا، کوئی حرج نہیں لیکن جب مجھ کو حرم سرا کے محافظوں کا امیر بنایا گیا تو میں نے تیرے چہرے پر اداسی اور مایوسی کے آثار دیکھے۔ چنانچہ مجھ کو تیرا یہ حسد پسند نہیں آیا۔''

اعتماد خان برہم ہوگیا۔''امیر برہان! تم مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں حاسد نہیں ہوں، میں اس لیے اداس ہوگیا ہوں کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور جب بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ تم شاہی حرم سرا کے محافظوں کے امیر بنا دیے گئے ہو تو میں تمہارے اس حشر سے خوفزدہ ہوگیا جو لڑکیوں اور خواتین کی قربت کی پاداش میں بالکل ممکن ہے۔''

برہان الدین بھی ایک دم برہم ہوگیا۔''اعتماد خان! عورتوں اور لڑکیوں سے تو اتنا خوفزدہ کیوں رہتا ہے؟ کیا تجھ کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے؟ تجھ کو اپنا نفس قابو میں رکھنا چاہیے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں، جوان بھی ہوں لیکن میں عورتوں سے نہیں ڈرتا۔ میں حسین عورتوں کو دیکھ کر دافع بلیات کی دعائیں پڑھ لیتا ہوں۔''

اعتماد خان نے کہا۔''امیر برہان! زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

امیر برہان نے کہا۔''اعتماد خان! تو فضول باتیں زیادہ کرتا ہے، میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک خداترس مذہبی انسان ہوں، مجھ سے تجھ کو یا کسی اور کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''

☆☆☆

کئی ماہ بعد بادشاہ احمد آباد میں داخل ہوا اور اپنے محل میں چلا گیا۔ بادشاہ کے محل کے پاس ہی اعتماد خان اور برہان الدین کو بھی محل مل گئے اور اب برہان الدین شاہی حرم سرا میں آنے جانے لگا۔ حرم سرا میں اس کی بہادری کا بڑا چرچا تھا اور جب حرم سرا کی خواتین اس کو ذوق وشوق اور

رشک سے دیکھتیں تو وہ پھولا نہ سماتا۔ اس دوران اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ مالوے کے خلجی حکمراں غیاث الدین نے اپنے حرم سے ایک پورا شہر آباد کر دیا تھا، جس میں پندرہ ہزار عورتیں رکھی گئی تھیں اور ان عورتوں کی ایک انتظامیہ بھی قائم کی گئی تھی۔ اس انوکھے اور عجیب وغریب حرم سرا کی وجہ سے غیاث الدین خلجی کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے اس لیے خلجی حکمراں کی تقلید اور اتباع میں بادشاہ کو بھی کوئی عجیب وغریب چیز وجود میں لانا چاہیے۔

بادشاہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ اس پر غور کرے گا۔

اسی دن امیر برہان کو چاندنی نے طلب کرلیا اور اس سے حرم سرا کی لڑکیوں اور خواتین کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ چاندنی کو بادشاہ سے ایک ہی شکایت تھی کہ وہ جس قدر و منزلت کی مستحق ہے، بادشاہ نے اس قدر و منزلت سے اس کو محروم کر رکھا ہے۔ چاندنی نے امیر برہان سے کہا کہ اگر وہ کسی طرح بادشاہ کو اس کا گرویدہ اور پرستار بنا دے تو وہ اس کا اتنا بڑا معاوضہ دے گی کہ امیر برہان زندگی بھر مزے کرے گا۔

امیر برہان سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ تامل کے بعد بولا۔ ''چاندنی! تو خوب جانتی ہے کہ میں لالچی شخص نہیں ہوں، میں ایک قناعت پسند متوکل انسان ہوں۔ تو نے بھاری بھرکم معاوضے کا لالچ دیا ہے لیکن کان کھول کر میری یہ بات سن لے کہ میں کسی لالچ کے بغیر تیرا یہ کام کردوں گا مگر آئندہ خبردار جو معاوضے یا صلے کی بات کی۔''

چاندنی نے خوش ہو کر کہا۔ ''ایک دوسرا کام بھی ہے۔ میں اپنے گھر اجمیر جانا چاہتی ہوں۔ بادشاہ سے جانے کی اجازت دلوادے۔''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''تیرا یہ کام بھی ہو جائے گا۔''

چاندنی نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔ برہان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''چاندنی! یہ عریشہ نظر نہیں آئی۔''

چاندنی چونک پڑی۔ بولی۔ ''عریشہ! امیر برہان مجھ کو اس لڑکی سے ڈر لگتا ہے۔ بادشاہ اس کی طرف بہت زیادہ مائل ہے۔''

امیر برہان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جانتا ہوں، چاندنی خوب جانتا ہوں، میں نے اسی لیے تو اس کا نام لیا، تو اس سے میری ملاقات کرادے میں اس پر کچھ دم کردوں گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ خود بادشاہ سے نفرت کرنے لگے گی۔''

چاندنی نے عرض کیا۔ ''لیکن میں تو یہ چاہتی ہوں کہ بادشاہ عریشہ سے نفرت کرنے لگے۔''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''چاندنی! ایسا ہی ہوگا۔ جیسا تو چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا۔''

چاندنی کو عریشہ سے ملانے میں اب بھی تامل تھا، دبے لفظوں میں بولی۔ ''امیر برہان! اگر یہ بات بادشاہ کو معلوم ہوگئی تو؟''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''چاندنی! تو اس کی فکر نہ کر۔ میں بادشاہ کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتا ہوں۔''

چاندنی نے کہا۔ ''امیر برہان! سچ بات تو یہ ہے کہ تیری بہادری نے عریشہ کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی زبان سے تو نہیں کہتی لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ بھی تجھ سے ملنا چاہتی ہے۔''

امیر برہان نے بے چینی سے کہا۔ ''پھر تامل کیوں؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''تامل یوں ہے کہ حرم کی کسی لڑکی یا عورت سے تیرا ملنا خود تیرے حق میں بہتر نہیں ہے، میں عریشہ کو تجھ سے ملوادوں گی اس کے لیے اصرار کی کوئی ضرورت نہیں۔''

امیر برہان نے چاندنی کی عقل کا ماتم کیا اور کہا۔ ''تو بہت خوفزدہ ہے چاندنی۔ میں عریشہ سے کسی بری نیت سے تو ملوں گا نہیں، عریشہ حسین ہے اور میں ہر حسین شے کو دیکھ کر درود پڑھنے لگتا ہوں کیونکہ مجھے اس کے حسن میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''امیر برہان! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے لیکن احتیاط بھی تو کوئی چیز ہے۔''

امیر برہان بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

جب برہان واپس جانے لگا تو چاندنی نے کہا۔ ''امیر برہان! میں آج تجھ سے پھر کسی وقت ملوں گی۔ امید ہے کہ تجھ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''چاندنی! میں ہر وقت ملنے کے لیے تیار ہوں۔''

ان دونوں کی باتیں چند خواتین سننے لگیں، چاندنی فوراً اٹھ گئی اور برہان نے اپنی راہ لی۔

رات کو نصف رات سے ذرا پہلے امیر برہان شاہی حرم سرا کے محافظوں سے ملا اور ان سے غیر متعلق باتیں کر کے محظوظ ہونے لگا۔ اس کے بعد وہ حرم سرا کے اندرونی پھاٹک تک چلا گیا اور پہرے پر متعین ایک عورت کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ بہت ہوشیاری سے اپنی خدمات انجام دے کیونکہ بادشاہ کسی بھی وقت کہیں بھی نمودار ہو سکتا ہے، اس کے بعد وہ چاندنی سے ملا اور اس سے دریافت کیا۔

''عریشہ کہاں ہے؟ اس سے کوئی بات ہوئی؟''

چاندنی نے افسردگی سے جواب دیا۔ ''عریشہ اور دو، دوسری لڑکیاں بادشاہ کی طلبی پر شاہی محل میں پہنچادی گئی ہیں وہ ساری رات بادشاہ کے پاس رہیں گی اور صبح سے ذرا دیر پہلے واپس بھیج دی جائیں گی۔''

امیر برہان نے حیرت سے پوچھا۔ ''مگر تو اداس کیوں ہے؟ کوئی خاص بات؟''

چاندنی نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''بادشاہ، عریشہ کو زیادہ پسند کرتا ہے اور مجھ سے دور دور رہتا ہے، امیر برہان! تو مجھے اجمیر بھجوادے، اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

امیر برہان نے ایک بار پھر تسلی دی۔ ''چاندنی! تو عجلت اور جذباتیت سے بچ۔ میں تجھے بہت جلد اجمیر بھجوا دوں گا اور عریشہ کو بادشاہ سے متنفر کرادوں گا۔''

چاندنی کو یقین نہیں تھا، بولی۔ ''یہ بھی دیکھ لوں گی۔''

امیر برہان نے کہا۔ ''رات کے پچھلے پہر جب عریشہ، بادشاہ سے مل کر واپس آئے گی۔ اس وقت میں اس سے ملنا چاہتا ہوں...... تیرا کیا خیال ہے؟''

چاندنی نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ نظروں نے برہان الدین کی تائید کردی۔ بعد میں چاندنی نے برہان الدین کے لیے وہ خطرہ مول لے لیا جو عام حالات میں کوئی بھی قبول نہیں کرسکتا تھا، اس نے برہان الدین کو اپنے کمرے میں چھپالیا اور ہدایت کی ''جب میں عریشہ کو اس کمرے میں لے آؤں اور اس کو بٹھا کر بہانہ کرکے نکل جاؤں تو، تو اندر سے نکل کر عریشہ کے پاس آجائے گا اور اس سے جو باتیں بھی کرنا چاہے، کرلے۔''

چاندنی نے برہان الدین کو اپنے توشک خانے میں چھپادیا اور عریشہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے چاروں طرف چاندنی کے ملبوسات کا ڈھیر لگا ہوا تھا، وہ ان کی خوشبو سونگھ سونگھ کر دیوانہ ہوا جارہا تھا۔ بہت جلد برہان الدین کو یہ احساس ہوگیا کہ آج شیطان پوری قوت سے اس پر غلبہ پانے کی کوشش کررہا ہے اور وہ اس کے مقابلے میں خود کو کمزور اور بے بس محسوس کررہا ہے۔ برہان خوفزدہ تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا اس لیے عریشہ سے ملاقات نہ کی جائے، مگر دل کے اندر ہی سے ایک دوسری آواز اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ موقع بڑی مشکل سے ملا ہے۔ اس کو ضائع نہ کر ورنہ پچھتائے گا اور اس دوسری آواز نے برہان الدین کو اپنا ہم خیال و ہم نوا بنالیا۔

وہ رات بھی طویل ہوگئی تھی۔ اس کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر چاندنی اس کے پاس پہنچی اور بتایا کہ اعتماد خان کسی ضرورت سے اس کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

برہان الدین نے نفرت وحقارت سے کہا۔ ''وہ مجھ کو تلاش کرنے والا کون ہے؟ بخدا اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو میں اس کو ایسی مصیبت میں پھنسادوں گا کہ زندگی بھر روتا رہے گا۔''

چاندنی نے آہستہ سے سمجھایا۔ ''امیر برہان! میں نے تجھے اپنے کمرے میں چھپا کر بہت بڑا خطرہ مول لے لیا ہے تو جوش وجذبات سے کام نہ لے ورنہ تیرے ساتھ میں بھی نقصان اٹھاجاؤں گی۔''

برہان الدین چپ ہوگیا۔ پھر پوچھا۔ ''چاندنی! میں یہاں کب تک پڑا رہوں گا؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''بس چند ساعت اور۔''

برہان الدین نے کہا۔ ''اچھا تو اب تو یہاں سے چلی جا اور اعتماد خان جیسوں پر نظر رکھ۔''

چاندنی چلی گئی۔ برہان الدین ایک بار پھر عریشہ کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار نے اس کا برا حال کردیا تھا۔ صبح سے تقریباً دو ساعت پہلے جب برہان الدین نے چاندنی اور عریشہ کی آوازیں سنیں تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور شیطان نے پھر سر اٹھایا۔ برہان الدین نے لاحول پڑھی اور زیرلب غصے میں کہا۔ ''او ملعون ابلیس! تو اپنی سی کر دیکھ، مگر میں تیرے قابو میں نہیں آؤں گا۔''

اتنے میں چاندنی نے عریشہ سے کہا۔ ''عریشہ! مجھے سوہضم کی شکایت ہوگئی ہے، تو بیٹھ، میں ابھی آتی ہوں۔''

برہان الدین نے ملبوسات کے بیچ سے سر نکالا اور عریشہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ عریشہ اس سے بہ مشکل بیس بائیس قدم دور بیٹھی تھی، اس کے سر پر جھاڑ لٹکی ہوئی تھی۔ جس کے مختلف رنگوں کے شیشوں میں سے چھن چھن کر روشنی نے سحری اثر پیدا کردیا تھا۔ اب برہان کے لیے صبر ناممکن ہوگیا تھا۔ وہ توشک خانے سے نکل کر ایک دم عریشہ کے روبرو جا کھڑا ہوا، عریشہ اس کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی، شاید اس کی چیخ بھی نکل جاتی لیکن عریشہ کی حاضر دماغی نے موقع کی نزاکت کا صحیح احساس کرلیا اور اس نے وحشت زدہ آواز میں پوچھا۔ ''امیر برہان! اس وقت آپ یہاں کیسے؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''محترم خاتون! میں نے جب سے تجھے دیکھا ہے، تیری صورت میرے دل کے

نہاں خانے میں محفوظ ہوگئی ہے اور میں جب چاہتا ہوں، سر جھکا کر دیکھ لیتا ہوں، تیرے حسن اور دلربائی نے مجھے صانع حقیقی کی مدح وثنا میں زیادہ مشغول کر دیا ہے۔ آج معلوم نہیں کیوں میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں تجھے اپنے مقابل، اپنے روبرو دیکھوں اور چونکہ میں اپنے دل کو پاک صاف رکھتا ہوں اور پارسائی کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتا اس لیے میرے رب نے میری مدد کی اور تجھ کو میرے روبرو کھڑا کر دیا۔ عریشہ! اگر تیرے کان ایسی قوتِ سماعت کے حامل ہوتے کہ وہ محسوسات کو سن لیتے تو انہیں بس ایک ہی آواز سنائی دیتی سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ اگر تو میرے دل پر ہاتھ رکھے اور اس کی دھڑکن سے نکلنے والی آوازیں سن سکے تو بھی آوازیں سنائی دیں گی۔"

عریشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس کی پریشانی اس کے چہرے بشرے سے ہویدا تھی۔

برہان نے زیادہ جرأت دکھائی اور عریشہ سے بجڑ کر بیٹھ گیا۔ عریشہ نے کھسکنا چاہا تو برہان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ "عریشہ! تو کس بات سے خوفزدہ ہے؟ میرا دل پاک ہے، میرے جذبے پاک ہیں۔ الحمدللہ کہ فاسد خیالات کا میرے دل میں دور دور تک اثر نہیں۔"

عریشہ نے محسوس کیا کہ برہان کی گرفت سخت ہوتی جارہی ہے۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر برہان زیادہ طاقتور تھا، اس نے عریشہ کے زانو پر اپنا سر رکھ دیا۔ "عریشہ! خدا کے لیے مجھ پر رحم کر۔ میں بادشاہ نہیں ہوں جو کثیف اور مادی جذبات رکھتا ہے اور جس کے نزدیک عورت کے حسن کا بس ایک ہی مقصد اور ایک مطلب ہوتا ہے۔ عریشہ! میں کوئی عام انسان نہیں ہوں، میں نے اپنے دل سے شہوانی جذبات کو نکال باہر کیا ہے اور ہر حسین شے میں اپنے محبوبِ حقیقی کو تلاش کرلیا کرتا ہوں۔"

عریشہ نے اضطراب سے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو مجھ کو ذرا دور سے دیکھ ورنہ اگر کسی نے اس حال میں دیکھ لیا تو ہم دونوں کی کھالیں کھینچ لی جائیں گی۔ اپنے تقوٰی اور اپنی زندگی پر رحم کر۔"

لیکن برہان نے اس کو گرا دیا اور اضطراری حالت میں کہا۔ "عریشہ! بخدا اس وقت میں جوشِ جنوں میں ہوں، میں عشق کے ہاتھوں عالمِ بالا میں پہنچ چکا ہوں اور اس وقت حالتِ اضطراری اور وفورِ شوق میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اسے کسی حال میں بھی آلودگی نہیں کہا جاسکتا۔"

عریشہ بڑی مصیبت میں پڑ گئی تھی۔ اس نے دھمکی دی۔ "برہان! اگر تو باز نہ آیا تو میں شور کر دوں گی اور تو ذلیل وخوار ہو کر کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔"

برہان نے جوش و سرمستی میں اپنا عمل جاری رکھا اور جواب دیا۔ "اگر تو شور کرے گی تو میرے ساتھ تو خود بھی ذلیل وخوار ہوجائے گی اور میں ایک بار پھر فسانۂ منصور کی یاد تازہ کر دوں گا۔ میں کہتا ہوں کہ تو مت گھبرا میرے جذبات پاک ہیں، تجھے دیکھ کر میں اپنے آپ میں نہیں رہا۔ میں بھی مجبور ہوں، تو بھی کچھ خیال نہ کر۔"

عریشہ رونے لگی۔ "امیر برہان! تو پاگل ہوگیا ہے، تو اپنے ہوش وحواس میں نہیں، تجھ پر شیطان غالب آچکا ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر اور اپنے آپ پر رحم کر۔"

برہان حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ چاندنی یا کسی اور کی پروا کیے بغیر عریشہ خاموش رہی، محض اس لیے کہ ان حالات میں جو سزا برہان کو ملے گی، وہی عریشہ بھگتے گی۔
برہان کیف و سرمستی میں مشاہدات وواردات عملی اور سفلی میں مشغول رہا۔ عریشہ نے روتے ہوئے کہا۔ "بدبخت دیندار! کیا اعتماد خان نے خدشہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ عورتوں کی قربت میں ضبط واحتیاط کا دعویٰ فضول بے معنی اور خود فریبی ہے، آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔"

برہان نے کوئی جواب نہیں دیا اور پوری توجہ انہماک اور جوش وخروش سے اس کو آلودہ کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد چاندنی واپس آئی اور اس کو اصل واقعہ معلوم ہوا تو وہ کانپ گئی اور برہان سے پوچھا۔ "امیر برہان! یہ تو نے کیا کر دیا۔"

عریشہ ایک طرف گھٹنوں میں سر دیے آنسو بہا رہی تھی۔

برہان کھویا کھویا سا تھا، بہکے بہکے انداز میں جواب دیا۔ "کیوں، کیا ہوگیا چاندنی؟ میں نے کیا کر دیا؟ کیا کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے؟"

چاندنی نے اس کے سر پر دو ہتڑ رسید کر دیا۔ "امیر برہان! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب کیا ہوگا؟"

برہان نے اسی بہکے بہکے انداز میں جواب دیا۔ "ہوگا کیا، کچھ بھی نہ ہوگا، یہ ایک ایسا جلوہ زار ہے جس سے کم از کم میری طبیعت کبھی بھی سیر نہ ہوگی۔ چاندنی! عریشہ نے مجھے از خود رفتہ کر دیا ہے۔"

چاندنی نے کہا۔ "امیر برہان! تو نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اگر تیرے یہی ارادے تھے تو اس کام کے لیے میرے کمرے کا انتخاب نہیں کرنا تھا۔"

عریشہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "اب میں کیا

کروں گی۔ اگر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوگئی تو اس خبیث کے ساتھ مجھ کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''

برہان ذرا بھی خوفزدہ نہ تھا، بولا۔ ''اس کا علم بادشاہ کو ہوگا ہی کیوں، میں تم دونوں کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اپنی زبانیں قابو میں رکھو اور میں کسی سے کچھ کہنے سے رہا۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''جب تجھے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں تھا تو یہ دینداری کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا۔''

برہان نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''چاندنی! اب زیادہ باتیں نہ بنا اور اس طرح خاموش ہوجا، گویا کچھ بھی نہیں ہوا، میں ایک ایسا شخص ہوں جس کو ہر شے میں وہی نظر آتا ہے۔ میری محبت پاک ہے کیونکہ میں محبت کا عرفان رکھتا ہوں اور مجھے معرفتِ الٰہی حاصل ہے۔''

چاندنی نے غصے میں کہا۔ ''امیر برہان! خدا کے لیے اب یہاں سے چلا جا۔ اگر تیری محبت پاک ہوتی اور تجھے محبت کا عرفان حاصل ہوتا تو یہ ذلیل اور کثیف حرکت نہ کرتا۔''

امیر برہان ہنس دیا۔ ''تیری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ معلوم نہیں لطافت اور کثافت سے تو کیا مراد لیتی ہے لیکن یاد رکھ کہ جہاں لطافت ہوگی وہیں کثافت بھی ہوگی اور کثافت کے بغیر لطافت کا اظہار ناممکن ہے۔ سبزہ زار، باغات، گلستان، خوش رنگ اور خوشبودار پھول لذیذ پھل، خوش ذائقہ میوے، یہ سب جس زمین سے پیدا ہوتے ہیں اور جس شے کے تعاون سے ان میں بالیدگی اور تحریک آتی ہے، جانتی ہے اسے کیا کہتے ہیں؟ کھاد اور کھاد کسے کہتے ہیں؟ سراسر کثافت، مکمل غلاظت۔ کیا اس کثافت اور غلاظت کے بغیر اس زندگی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟''

ایک بار پھر امیر برہان نے شیر سے مقابلہ کرنے کے فرضی دعوے سے انہیں حیرت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا اور آج اپنی زبردست پُر از استدلال گفتگو سے دونوں کو گنگ کر دیا تھا۔ عریشہ اور چاندنی، دونوں ہی ایک بات سوچ رہی تھیں کہ امیر برہان آدمی زبردست ہے اور اس کی باتوں میں جادو کی اثر پایا جاتا ہے

بادشاہ، اپنی یادگار غیاث الدین خلجی کے حرم سرا کی طرح قائم کرنا چاہتا تھا اور امیر برہان کا اصرار اس کے شوق پر تازیانے کا کام کر رہا تھا۔ مہینوں کے غور و فکر کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک آہوخانہ قائم کرے گا۔ اس آہوخانے میں دنیا بھر کے بے ضرر اور حسین جانور جمع کیے جائیں گے اور اس آہوخانے کا نظم و نسق عورتوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

بادشاہ نے آہوخانے کے لیے دریا کا کنارہ پسند کیا اور چودہ میل لمبا اور سات میل چوڑا احاطہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس احاطے میں باغات لگائے گئے، گلستان بنے اور جانوروں کو آباد کیا جانے لگا۔ بادشاہ نے آہوخانے میں خوب صورت عورتوں کے ذریعے نظم و نسق قائم کیا۔ اب امیر برہان کا اثر و رسوخ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ امیر برہان کے حوصلے اتنے بڑھے کہ حرم سرا کی چند دوسری لڑکیوں کا بھی گرویدہ ہوگیا۔ اب بادشاہ کے حرم میں بھی کافی اضافہ ہوچکا تھا اور امیر برہان نے حرم سرا کے متعلق عملے میں اپنی مرضی سے خاصا اضافہ کرلیا تھا، اس عملے میں امیر برہان کے رشتے داروں کی اکثریت تھی۔ یہاں تک کہ اس کا نائب اپنا بھانجا دولت خان تھا۔

بادشاہ حرم سرا میں آتا اور اپنی پسندیدہ لڑکیوں اور عورتوں کے پاس رہ کر چلا جاتا۔ اس پورے حرم سرا میں چاندنی اور عریشہ ہی ایسی تھیں کہ جنہیں بادشاہ بے حد پسند کرتا تھا لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی ملکہ بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ چاندنی کو یہ خلش کھائے جارہی تھی کہ وہ ملکہ نہیں بن سکی۔ اس نے امیر برہان کو بڑا لالچ دیا کہ وہ بادشاہ کو دو کاموں میں سے کسی ایک پر آمادہ کردے تو وہ امیر برہان کو دولت اور مرتبے سے اتنا نواز دے گی کہ گجرات کے دوسرے امرا اس پر رشک کرنے لگیں گے۔ ایک کام تو یہ تھا کہ چاندنی کو ملکہ بنانے میں مدد کرے اور بادشاہ کو ہر طرح آمادہ کرنے کی کوشش کرے اور دوسرا کام یہ تھا کہ اگر بادشاہ اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ چاندنی کو اجمیر چلے جانے کی اجازت دلوا دے۔

امیر برہان نے چاندنی کو ایک بار پھر سمجھایا کہ وہ لالچی نہیں ہے اس لیے وہ چاندنی کے لیے جو کام بھی کرے گا بغیر کسی لالچ کے کرے گا۔

اب بادشاہ کے حرم میں اتنا زیادہ اضافہ ہوچکا تھا کہ بادشاہ کو اس کے لیے امیر برہان کے علاوہ اعتماد خان سے بھی کام لینا پڑا، اعتماد خان اس کے لیے تیار نہ تھا، اس نے بادشاہ سے معذرت کی کہ وہ بڑی سے بڑی اور خطرناک ترین خدمت انجام دینے کو تیار ہے لیکن حرم سرا سے دور رہنا چاہتا ہے۔

بادشاہ نے اصرار کیا۔ ''اعتماد خان! تو ڈرتا کیوں ہے؟ آخر امیر برہان الدین بھی تو ہے، وہ کیوں نہیں ڈرتا؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''قبلہ بندگان! امیر

برہان الدین ایک غیر معمولی پارسا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ تو جتنا انکار کررہا ہے میں اتنا ہی مجبور ہوتا جارہا ہوں، اس خدمت کے لیے امیر برہان الدین کے بعد تیرے علاوہ کوئی ہے بھی تو نہیں۔"

اعتماد خان نے درخواست کی۔ "حضور! جلد بازی سے کام نہ لیں، ناچیز کو ایک ہفتے کی مہلت عطا فرمائیں تاکہ میں اس کے نشیب وفراز پر غور کرسکوں، ممکن ہے اس دوران کوئی تیسرا قابلِ اعتماد شخص میسر آجائے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں تیری درخواست پر ایک ہفتے کی مہلت تو دے سکتا ہوں لیکن اس دوران میرا فیصلہ بھی رہے گا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس لیے میرے خیال میں ایک ہفتہ ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اعتماد خان کا چہرہ فق تھا۔ بڑی مایوسی سے بولا۔ "جہاں پناہ! اگر میری درخواست رد کردی گئی تو میں کہیں کا بھی نہ رہوں گا۔ میں برباد ہوجاؤں گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "تو برباد نہیں ہوگا، میں تجھے ایک ہفتے کی مہلت دے رہا ہوں۔"

اعتماد خان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھیل گیا۔

برہان الدین کو جب یہ خبر ملی کہ بادشاہ اعتماد خان کو بھی حرم سرا کی نگہداشت پر لگانا چاہتا ہے تو وہ ڈرا، مگر فوراً ہی اس خیال نے اس کو خوش کردیا کہ اعتماد خان کا اس کے آس پاس ہونا یوں بہت ضروری ہے کہ اپنی لغزشوں کو اعتماد خان جیسے بزدل کے سر تھوپنے میں بڑی آسانی رہے گی، اس نے یہ طے کرلیا کہ اعتماد خان کو نکلنے نہیں دیا جائے گا۔

اعتماد خان برہان الدین سے مشورہ لینے پہنچ گیا۔ برہان الدین نے اس کو دیکھتے ہی مبارکباد دی۔ "اعتماد خان! مبارک ہو کہ بادشاہ کا تجھ پر اعتماد کچھ اور بڑھ گیا۔"

اعتماد خان نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ "امیر برہان! تم میری بربادی اور تباہی کی مبارکباد دے رہے ہو۔"

برہان نے کہا۔ "یہ بلند مرتبہ ہر کسی کو نہیں ملتا۔ تو خوش قسمت ہے۔"

اعتماد خان نے کہا۔ "امیر برہان! اس وقت میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھ کو یہ بتاؤ کہ اب تک تم عورتوں سے محفوظ کس طرح رہے؟ تم نے خود پر قابو کس طرح پایا؟"

برہان الدین نے جواب دیا۔ "بھائی اعتماد خان! تو ان چکروں میں نہ پڑ اور اپنے کام سے کام رکھ۔"

اعتماد خان چیخ مار کر رو دیا۔ "امیر برہان الدین! خدا کے لیے میرا پیچھا چھڑوا دو ورنہ میں تباہ و برباد ہوجاؤں گا۔"

برہان الدین نے جواب دیا۔ "اعتماد خان! بزدلی نہ دکھا۔ میں کہتا ہوں کہ موقع سے فائدہ اٹھا۔"

اعتماد خان اداس آیا تھا۔ روتا چلا گیا۔

ادھر برہان الدین کو چاندنی میں حسن نظر آنے لگا اور وہ چاندنی سے ہمہ اوست کے مسئلے پر باتیں کرنے لگا۔ چاندنی نے اپنے میدے شہابی رنگت پر گلابی کپڑے جو پہنے تو دیکھنے والوں کے ہوش وحواس میں آگ سی لگا دی۔ برہان الدین نے اس کو دیکھتے ہی سبحان اللہ، سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا۔ چاندنی اس سے ناراض تھی منہ پھیرلیا اور ترشی سے کہا۔ "امیر برہان! اپنے ہوش میں رہ اور فوراً چلا جا۔"

برہان نے جواب دیا۔ "میں آج نہیں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا کیونکہ حرم سرا کا انتظام اعتماد خان کو سونپا جانے والا ہے۔ میں آہو خانے چلا جاؤں گا اور اگر اعتماد خان یہاں آگیا تو سمجھ لے کہ کس قسم کا انقلاب آجائے گا۔"

چاندنی نے کہا۔ "کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

برہان الدین نے جواب دیا۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، اعتماد خان یہ بات خود بتا کر گیا ہے۔"

چاندنی نے پوچھا۔ "پھر میرے کام کا کیا ہوگا؟"

برہان الدین نے جواب دیا۔ "میں تجھ کو ملکہ تو نہیں بنوا سکوں گا۔ ہاں اجمیر کا سفر ضرور کرادوں گا۔ میں نے بادشاہ سے بات کرلی ہے۔"

چاندنی امیر برہان کی طرف فوراً مڑ گئی۔ "سچ؟ پھر میں کب تک سفر کروں گی؟"

برہان الدین نے جواب دیا۔ "دو ہفتوں کے اندر اندر۔"

چاندنی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ برہان نے اس کے سراپا پر متجسسانہ نظر ڈالی اور سرشاری میں بولا۔ "چاندنی! اگر حور کا تصور نہ ہو تو جنت اور عبادت کا خیال ہی محال ہوجائے۔ خدا بادشاہوں کو حسینوں سے نوازتا ہے تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ مال وزر پاس ہو تو اس سے آسائشیں اور خواہشیں خریدی جاسکتی ہیں لیکن حیرت تو اس جگہ ہوتی ہے جہاں میرے جیسے متقی، پرہیزگار اور پارسا پر خدا مہربان ہوکر حسینوں سے نوازنے لگتا ہے۔"

چاندنی سمجھ گئی کہ برہان اپنے طرزِ استدلال سے کسی ناجائز کو جائز قرار دینے والا ہے۔ بولی۔ ''رک کیوں گیا امیر برہان! بولتا رہ، خدا نے تجھ کو بلا کی قوتِ استدلال اور طاقتِ لسانی عطا فرمائی ہے۔''

برہان نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں اور کہتا رہا۔ ''میں نے اپنے رب کی اطاعت اس طرح کی ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے ایک وقت کی نماز قضا نہیں کی۔ کسی کا حق نہیں مارا، پڑوسیوں اور عزیزوں کے حقوق ادا کیے ہیں، پھر مجھ سے پرہیزگار اور پارسا کو خدا انعام کیوں نہ دیتا۔ یہ یہاں جو کچھ بھی مجھے مل رہا ہے خدا کا انعام ہے۔''

چاندنی نے کہا۔ ''امیر برہان! تو آگ سے کھیل رہا ہے اور ایک نہ ایک دن تو بہت پچھتائے گا اور اپنے ساتھ معلوم نہیں کتنوں کو برباد کرادے گا۔''

برہان نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''عزت اور ذلت اس مالکِ دو جہاں کے ہاتھ ہے، اگر میں عزت سمیٹوں گا تو مجھے اپنے حصے کی ذلت بھی سمیٹنا پڑے گی۔''

چاندنی نے گھبرا کر کہا۔ ''اچھا امیر برہان اس وقت تو چلا جا بادشاہ کی تشریف آوری سے پوری حرم سرا میں انقلاب آجائے گا اور پتا نہیں کہ کون کیا پا جائے اور کس سے کیا چھن جائے؟''

برہان بادشاہ کے خوف سے چلا تو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر واپس بھی آگیا۔ بولا۔ ''چاندنی! تو مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی میں نے بادشاہ سے معلوم کرلیا ہے کہ وہ حرم سرا میں جائے گا یا نہیں اس نے جواب دیا کہ جن لڑکیوں سے اس کو ملنا تھا وہ اس کے پاس پہنچ چکی ہیں۔''

چاندنی نے حسد سے کہا۔ ''لیکن میں تو نہیں گئی، بادشاہ کی خدمت میں۔''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''ہاں تو اس لیے نہیں گئی کہ خدا نے تجھ کو میرے لیے روک لیا ہے، چاندنی! تو اب بھی میری بات مان لے اور اس پر یقین رکھ کہ تو اللہ کی طرف سے بادشاہ کے بجائے میرے لیے انعام ہے، بادشاہ طفیلی ہے اور میں اصلی مستحق۔''

چاندنی کو خوف آنے لگا لیکن برہان الدین ڈٹا رہا، اتنے میں دولت خان نے آکر بتایا کہ بادشاہ آرہا ہے۔

برہان الدین فوراً باہر نکل آیا اور پھر بادشاہ کے استقبال کو چلا گیا۔ جب بادشاہ کو اس نے سلام کیا تو اس نے منہ پھیر لیا اور برہان الدین سے بات ہی نہیں کی۔ برہان الدین کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن بادشاہ سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

بادشاہ حرم سرا میں چلا گیا اور اس نے یہ اعلان کردیا کہ عنقریب اعتماد خان یہاں کا نظم ونسق سنبھال لے گا اور اس کو بادشاہ کی طرف سے یہ اجازت حاصل ہوگئی ہے کہ وہ حرم سرا کی کسی بھی خاتون کے سامنے جب چاہے آجاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حرم سرا کی آرائش وزیبائش کا کام بھی اعتماد خان ہی کے سپرد کردیا گیا۔

اعتماد خان بادشاہ کے ساتھ ہی تھا اور اس کے چہرے پر یہ خاص بات نظر آئی کہ بادشاہ کے اعلان سے اس کا چہرہ فق ہوتا چلا گیا۔ بادشاہ اور اعتماد خان حرم سرا میں رک گئے اور برہان الدین کو رخصت کردیا گیا۔

دوسری طرف آہو خانے پر بڑی تیزی سے کام ہورہا تھا اور جو جو حصے مکمل ہورہے تھے، انہیں آباد کیا جارہا تھا۔ برہان الدین کو دونوں طرف دیکھنا پڑ رہا تھا اور بادشاہ کے چہرے اور روش سے جو برہمی محسوس ہوتی تھی، بعد میں اس کا اظہار نہیں ہوا۔ اعتماد خان نے حرم سرا کی ذمے داری جبراً قبول کی تھی اور وہ ہر وقت اداس اور پریشان رہتا تھا۔ برہان الدین نے اس سے کہا بھی۔ ''اعتماد خان! تو اداس کیوں ہے؟''

اعتماد خان نے بڑی شکستہ دلی سے جواب دیا۔ ''امیر برہان الدین! میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا، میں برباد ہوگیا۔''

برہان الدین نے تسلی دی۔ ''بہ ظاہر تو تیری پریشانی سمجھ میں نہیں آتی۔ حرم سرا کا نگراں اور آرائش کار ہونا کہاں کی مصیبت ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''امیر برہان! عورتوں کے درمیان رہنا کم از کم میرے نزدیک بڑی خطرناک بات ہے۔''

برہان نے پوچھا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا تجھ کو اپنی ذات پر اعتماد نہیں؟ کیا تو عورتوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں کسی قسم کی پریشانی محسوس کرتا ہے؟ یا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ بادشاہ مجھ پر شک وشبہ تو کر ہی سکتا ہے۔''

برہان ہنس دیا۔ ''شک وشبے کی ایک ہی رہی۔ اگر میری طرح تو بھی زہد وتقویٰ کو اپنی سپر بنالے تو بادشاہ تجھ پر بھی شک وشبہ نہیں کرے گا۔''

اعتماد خان کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ برہان کی کسی بات اور کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ اپنے مسئلے کو سلجھانے کی فکر میں تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”امیر برہان! افسوس کہ میں زہد وتقویٰ کو سپر بنا کر بھی عورتوں کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔“

برہان نے اس کا مذاق اڑایا۔ ”تو بڑا بزدل نکلا اعتماد خان!“

☆☆☆

برہان نے چاندنی کو اجمیر جانے کی اجازت دلوا دی، بادشاہ چاندنی کو بہت پسند کرتا تھا کیونکہ چاندنی ہی وہ عورت تھی جس نے صحیح معنی میں بادشاہ کو جنس کے لذیذ ترین ذائقے سے واقف کیا تھا۔ بادشاہ نے برہان سے کہا کہ چاندنی تیری سفارش پر اپنے وطن اجمیر جا سکتی ہے لیکن اجمیر چونکہ سلطنت دہلی کے ماتحت ہے اس لیے اس کی واپسی کی ذمے داری تجھ کو ہی لینا پڑے گی۔ برہان ذمے داری قبول کرنے سے گھبرا رہا تھا لیکن چاندنی نے اسے مجبور کر دیا۔ اس نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ وہ چاندنی کی واپسی کی ذمے داری قبول کرتا ہے۔

برہان نے بادشاہ کی مصروفیات کا پتا لگا کے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ چاندنی کے ساتھ بھی ...... کچھ وقت ضرور گزارے گا۔ اس نے اعتماد خان سے درخواست کی کہ اس کو چاندنی سے باتیں کرنے کا موقع دیا جائے کیونکہ بادشاہ اس کی ضمانت پر چاندنی کو اجمیر بھیجنے پر رضامند ہوا ہے لیکن اعتماد خان نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ یہ اجازت بادشاہ ہی دے سکتا ہے۔

دوسری طرف چاندنی خود بھی برہان سے ملنا چاہتی تھی کیونکہ وہ امیر برہان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

اس دوران اجمیر سے ایک شخص چاندنی سے ملنے آیا اور اس نے یہ منحوس خبر سنائی کہ اجمیر میں اس کے ماں اور باپ دونوں ہی کا انتقال ہو چکا ہے اور چاندنی کے بھائی اور بہن اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہن دلربا جس کی عمر چودہ سال تھی۔ چاندنی ہی کی طرح رقص اور موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور بھائی مقبول ابھی اپنی عمر کے دسویں سال میں ہے اور مستقبل کی فکر میں سرگرداں ہے۔ آنے والے نے یہ بھی کہا کہ اگر چاندنی اجمیر نہیں جا سکتی تو ان دونوں کو یہیں بلوا لے۔ چاندنی نے اپنے والدین کے سوگ میں سیاہ لباس پہن لیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اجمیر ضرور جائے گی اور ان دونوں کو اپنے ساتھ لا کر بادشاہ کو قابو میں کرنے کی ایک اور تدبیر کرے گی۔ وہ خود ملکہ نہیں بن سکی تھی مگر دلربا تو ملکہ بن سکتی ہے۔

امیر برہان نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اجمیر جانے سے پہلے وہ چاندنی سے ملنا چاہتا ہے تاکہ وہ چاندنی سے واپسی کے عہد و پیمان لے سکے۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ برہان چاندنی کے پاس اسی وقت پہنچ گیا۔ چاندنی سیاہ لباس میں بہت زیادہ کھل رہی تھی۔ اس نے پھیکی مسکراہٹ سے امیر برہان کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

امیر برہان نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ ”چاندنی! تو اپنی زبان بند رکھ کیونکہ تو جو کچھ کہے گی مجھے اس کا علم ہو چکا ہے۔“

چاندنی چیخ مار کر امیر برہان سے دور ہٹ گئی اور بولی۔ ”امیر برہان! اگر بھائی بہن نہ ہوتے تو میں ہرگز اجمیر نہ جاتی۔“

امیر برہان نے عرض کیا۔ ”اے چاندنی! تو کیوں گھبراتی ہے؟“

چاندنی روتی رہی، آہستہ آہستہ، چپکے چپکے‘ برہان نے ادھر ادھر کا جائزہ لے کر چاندنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چاندنی! میں نے تجھ کو اجمیر جانے کی اجازت دلوا دی۔ کیا تو اس سے خوش نہیں ہوئی؟“

چاندنی نے جواب دیا۔ ”میرا سیاہ لباس کیا اس کی غمازی نہیں کر رہا کہ اس وقت میں اپنے والدین کے سوگ میں ہوں۔“

امیر برہان چاندنی کا ہاتھ پکڑ ہی چکا تھا، اس نے سرشار نظروں سے چاندنی کو دیکھا اور کہا۔ ”چاندنی! جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں جہاں بھی اللہ کی شان دیکھتا ہوں وہیں سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ میں نے تجھ میں بھی ویسا ہی محسوس کیا ہے اور اس کی آگ میں مسلسل پھنک رہا ہوں۔ بخدا میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں تیرے چہرے میں پاکیزگی دیکھ رہا ہوں اور ایک عاشق صادق کا یہ فرض ہے کہ وہ پاکیزگی کو بوسہ دے۔“

چاندنی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”افسوس امیر برہان کہ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

امیر برہان نے کہا۔ ”کیوں آخر کیوں؟ چاندنی! میں ایک پارسا پاک خیال اور زہد خصال شخص ہوں، میرے جذبات مقدس اور احساسات منزہ ہیں۔ میری

نیت پاک ہے تو بھی نیت پاک رکھ، اس کے بعد جو ہوتا ہے ہو جانے دے۔''

چاندنی نے زچ ہو کر کہا۔ ''امیر برہان! تجھ میں جو سرشاری اور جرأت رندانہ پائی جاتی ہے۔ وہ کسی نہ کسی دن تیری جان لے لے گی۔''

''چاندنی! اس کی پروانہ کر۔ میں نے کہہ جو دیا کہ میں ایک بار پھر فسانۂ منصور کی یاد تازہ کر دوں گا۔''

چاندنی نے پوچھا۔ ''اس وقت اعتماد خان کہاں ہے؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''مجھے کیا پتا لیکن اتنی بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اعتماد خان کہیں بھی ہو حرم سرا میں نہیں ہے۔''

چاندنی نے کسی قدر نرم پڑ کر کہا۔ ''میں نے ملکہ بننا چاہا لیکن نہیں بن سکی۔ بادشاہ ناقدرا ہے اس لیے میں بھی اس سے انتقام لوں گی اور خود کو پارسا امیر برہان کے حوالے کر دوں گی۔''

اب برہان کے لیے رکاوٹ ختم ہو چکی تھی۔ ایک طوفان اٹھا اور چاندنی اور برہان تنکوں کی طرح اڑنے لگے۔ ایک زلزلہ آیا جس میں دو وجود لوہار کی دھونکنی کی طرح اٹھنے دبنے لگے۔ ایک مدوجزر آیا جس میں دونوں ہچکولے کھانے لگے۔ برہان جس شدید جذباتی دباؤ میں جلا تھا۔ اس میں کمتر لوگ جلا ہوتے ہیں۔

آخر میں چاندنی نے کہا۔ ''میں نے بادشاہ سے اس کی ناقدر شناسی کا انتقام لے لیا۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''ایسا نہ کہہ نادان عورت، جا آئینے میں دیکھ، میں نے تیرے جمال کی دوشیزگی کو نکھار دیا ہے۔ اب تو پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ گویا میں نے ایک مندر کو دھو کر اجلا کر دیا ہے۔''

چاندنی نے کہا۔ ''امیر برہان! میں واپسی میں اپنی بہن دلربا کو بھی لیتی آؤں گی۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ تو اس کو کسی بھی طرح ملکہ بنوا دے۔ میں ملکہ نہیں بن سکی تو کوئی بات نہیں میری بہن دلربا ہی ملکہ بن جائے تو میرے لیے بڑی خوشی اور فخر کی بات ہو گی۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''چاندنی! اپنی بہن دلربا کو لے تو آ۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''

چاندنی چلی گئی۔ اس دن اعتماد خان ہر روز سے زیادہ اداس تھا۔ بادشاہ حرم سرا کی طرف آ رہا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ امیر برہان، دولت خان اور بیس بہادر (جو شیر کش کہلاتے تھے) بھی چل رہے تھے۔ بادشاہ انہیں حرم سرا کی اس عمارت میں لے گیا جو بادشاہ اور اس کے امرا کے وقتی قیام اور دربار کے لیے بنائی گئی تھی۔ بادشاہ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ حرم سرا میں اب تک جتنے بچے پیدا ہوئے تھے ان میں لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ ساری لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اس خبر نے بادشاہ کو بہت اداس کر دیا تھا۔ اس نے بیس شیر کش بہادروں اور دولت خان کو عمارت کے دروازے پر ٹھہرایا اور برہان اور اعتماد خان کو اندر لے گیا۔ یہاں چند طبیب پہلے ہی سے موجود تھے۔

بادشاہ ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنے دائیں طرف پانچ قدم دور اعتماد خان کو کھڑا کیا۔ بائیں طرف اتنے ہی فاصلے پر برہان کو کھڑا کیا گیا۔ طبیب اس کے سامنے کھڑے تھے۔ بادشاہ کے پیچھے ایک پردہ پڑا تھا اور پردے کے پیچھے کسی کی موجودگی کا شبہ ہوتا تھا۔

بادشاہ کچھ دیر تک اعتماد خان کی صورت دیکھتا رہا۔ برہان اور اعتماد خان، دونوں ہی اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ یقیناً اعتماد خان کسی لغزش کا شکار ہو گیا ہے اور اب بادشاہ اس کے خلاف کوئی سزا تجویز کر رہا تھا۔

بادشاہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''میرے جاں نثارو اور وفادارو! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں میں نے یہاں کیوں بلوایا ہے؟''

اعتماد خان اور برہان نے ایک دوسرے کو دیکھا اور لاعلم ہو گئے۔

بادشاہ نے حکم دیا۔ ''حرم سرا کی دائیاں حاضر کی جائیں۔''

کچھ دیر بعد ہی دائیاں حاضر کر دی گئیں۔ بادشاہ نے سوال کیا۔ ''دائیو! حرم سرا میں اب تک لڑکے کتنے پیدا ہوئے ہیں اور لڑکیاں کتنی پیدا ہوئی ہیں؟''

دائیاں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ ایک دائی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''حضور کو معلوم ہو گا کہ ہمارے رسول ﷺ ..... بیٹیوں سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''بیشک، بیشک۔ مگر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

دائی نے کہا۔ ''آج کل حرم سرا میں بھی بیٹیوں ہی کا زور ہے اور حیرت ہے کہ لڑکا ایک بھی نہیں پیدا ہوا۔''

بادشاہ کے چہرے پر غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔ غمزدہ آواز میں کہا۔ ''میں ایک گناہ گار انسان ہوں، میں عاصی ہوں اور عاصی ہی رہوں گا اس لیے اب میں لڑکیوں کی پیدائش برداشت نہیں کر سکتا۔'' پھر ایک دم اعتماد خان کی طرف مڑ گیا۔ ''اعتماد خان! میرا یہ حکم اپنے قلب کی لوح پر

محفوظ کرلے کہ آج اور اس وقت سے حرام سرا کا ہر حمل ضائع کردیا جائے گا کیونکہ میں لڑکیوں کی پیدائش برداشت نہیں کرسکتا۔" پھر اطبا سے کہا۔ "اطبائے کرام! دائیاں موجود ہیں اور یہ تم سب کا فرض ہے کہ جب بھی کسی خاتون کے امید سے ہونے کی خبر ملے مشترکہ مساعی اور تدبیر سے اس امید کو ضائع کردیا جائے۔"

دائیوں اور اطبا نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "مرضیِ مولا از ہمہ اولا۔"

بادشاہ نے اعتماد خان سے پوچھا۔ "آج کل تیری بیوی کہاں ہے؟"

اعتماد خان نے نظریں جھکالیں اور کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔ "قبلۂ بندگان! اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس سوال سے حذر فرمائیں کیونکہ میرے جواب سے حضور باخبر ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "نہیں، میں اپنے سوال کا جواب تیری ہی زبان سے سننا اور حاضرین کو سنانا چاہتا ہوں۔"

اعتماد خان نے کہا۔ "میرے بیوی بچے اپنے گھر پر ہوں گے کیونکہ میں کئی دن سے ان سے نہیں ملا اور نہ آئندہ ملنے کا کوئی امکان ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "ایسا کیوں ہے؟"

اعتماد خان نے نظریں جھکالیں۔ "جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ میں اعتماد خان ہوں۔ میں نے اپنے نام کے معنی ومطلب پر خوب غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھ کو اپنا اعتماد ہر قیمت پر برقرار و قائم رکھنا ہے۔"

بادشاہ نے پھر سوال کیا۔ "میں تجھ سے تیری بیوی کا پتا چاہتا ہوں۔"

اعتماد خان نے جواب دیا۔ "میں نے عرض تو کیا کہ وہ اپنے گھر میں ہوگی اور میں اس سے کئی دن سے نہیں ملا۔" بادشاہ نے اپنے پیچھے پڑے ہوئے پردے کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر اس پردے کے پیچھے جا اور دیکھ کہ یہی تیری بیوی ہے یا کوئی اور؟"

اعتماد خان بھاگ کر پردے کے پیچھے پہنچا اور اپنی بیوی کو موجود دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شرم سے سر جھکالیا اور بیوی سے پوچھا۔ "تو یہاں کیا لینے آگئی؟"

بیوی نے منہ بسور کر جواب دیا۔ "میں فریادی ہوں اعتماد خان!"

اعتماد خان سہم کر بادشاہ سے بولا۔ "بندہ پرور! میں نے اپنی بیوی کو حرم سرا میں داخل کردیا ہے اور اب حضور اس سے متمتع ہوسکتے ہیں۔"

برہان، اطبا اور دائیوں پر سناٹا طاری ہوگیا کیونکہ اعتماد خان نے بڑی بے شرمی کی بات کہی تھی۔

اعتماد خان نے شرما شرما کر ہکلا کر جواب دیا۔

"جہاں پناہ! جیسا کہ میں کئی بار عرض کرچکا ہوں کہ میں اپنے اعتماد کو مجروح نہیں دیکھ سکتا اور اس پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ کوئی بھی مرد عورتوں میں رہ کر پاکبازی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ پھر میں یہ دعویٰ کس طرح کرسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ہفتوں کے غوروفکر کے بعد یہ فیصلہ کرلیا کہ میں بہرحال اعتماد خان ہی رہوں گا۔ میں نے اپنے اعتماد کے قیام واستحکام کی خاطر کافور کھا کر اپنی قوت مردی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زائل کردیا ہے۔"

اعتماد خان کے اعتراف نے ہر ایک کو چونکا دیا اور اطبا کی تو چیخیں نکل گئیں۔

بادشاہ اس کو بڑی عزت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

برہان نے بے اختیار پوچھا۔ "اعتماد خان کیا یہ سچ ہے؟"

اعتماد خان کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ "امیر برہان! کیا میں نے بار بار یہ نہیں کہا تھا کہ اگر حرم سرا کی نگہداشت میرے سپرد کردی گئی تو میں تباہ و برباد ہوجاؤں گا۔ میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔"

برہان نے زیرلب جواب دیا۔ "ہاں تو نے یہ بات کہی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

اعتماد خان نے کہا۔ "پھر میں نے جو کہا تھا کردکھایا، اب میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ بادشاہ سلامت اس ناچیز پر کسی قسم کا شبہ نہیں کرسکتے۔ افسوس کہ میں تیری طرح زہدوتقویٰ کی سپر سے محروم تھا اور پھر میں تو اس پر یقین رکھتا ہوں کہ انسان اگر کئی دن کا بھوکا ہو اور گرم گرم لذیذ کھانوں کی نگرانی اس کے سپرد کردی جائے تو وہ بھوکا انسان اپنے ایمان پر قائم نہیں رہ سکتا، اگر کوئی شخص ضبط و برداشت کرے تو میں اس کے دعوے پر یقین نہیں کرسکتا۔"

امیر برہان کو غصہ آگیا۔ وہ سمجھا اعتماد خان اس پر چوٹ کررہا ہے، برہمی سے بولا۔ "امیر اعتماد خان! تو یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہا ہے۔ قوت مردی کے زیاں نے تیری عقل بھی برباد کردی ہے ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتا۔"

بادشاہ نے امیر برہان کو ڈانٹا۔ "برہان! تو حسد کررہا ہے کیونکہ اعتماد خان نے اپنے اعتماد کی خاطر جو کچھ کیا ہے تو یا کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اس لیے اعتماد خان کی عظمت اور بڑائی کو حاسدانہ حملوں سے منہدم کرنے کی کوشش نہ کر۔"

امیر برہان بادشاہ کی وجہ سے چپ تو ہوگیا لیکن اس

کا دل صاف نہیں تھا۔

بادشاہ نے اطبا اور دائیوں کو حکم دیا۔ ''تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس پر پوری مستعدی اور ہوشمندی سے عمل درآمد ہوگا۔ سارے عمل ضائع کردیے جائیں گے اور کوئی شخص بھی اعتماد خان کی حکم عدولی نہیں کرے گا۔''

ان سب نے بیک آواز جواب دیا۔ ''مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔''

بادشاہ نے اعتماد خان سے کہا۔ ''اعتماد خان! تو اپنی بیوی کو حرم سرا سے لے جا اور اس کو اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے دے، اس پر زیادتی ہوگئی ہے۔ اس لیے اس زیادتی کے ازالے کی یہی صورت ہے کہ اس کو اس کی مرضی اور حال پر چھوڑ دیا جائے۔''

اعتماد خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کی ڈاڑھی کے بالوں پر آنسوؤں کے موتی اٹکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

آہو خانے کا بیشتر کام مکمل ہو چکا تھا اور اس کے نظام کو چلانے کے لیے عورتوں اور لڑکیوں کی تقرریاں بھی عمل میں آرہی تھیں۔ امیر برہان کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ چکی تھیں۔ معلوم نہیں بادشاہ آہو خانے میں بار بار کیوں آرہا تھا۔ جب وہ آہو خانے میں داخل ہوتا تو امیر برہان اور دولت خان اس کے پیچھے پیچھے چلتے۔ بادشاہ آہو خانے کی ترتیب، آرائش و زیبائش اور اس کے انتظام پر نکتہ چینی کرتا ہوا چلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ایک دم گرم ہو جاتا اور کبھی بھی بے موقع ہنس دیتا۔

بادشاہ نے چلتے چلتے پوچھا۔ ''امیر برہان! چاندنی آگئی؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''بندۂ پرور! اس کا صحیح علم تو اعتماد خان کو ہوگا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''اس کی واپسی کی ذمے داری کس نے قبول کی تھی؟''

امیر برہان نے سہم کر جواب دیا۔ ''میں نے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے تجھ سے یہ سوال کیا کہ کیا چاندنی واپس آگئی؟''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا شاید نہیں۔''

بادشاہ نے طیش میں کہا۔ ''اسے واپس آجانا چاہیے تھا برہان! میں اس کو بہت پسند کرتا ہوں، اگر چند باتیں مانع نہ آتیں تو میں چاندنی کو اپنی ملکہ بنالیتا لیکن میں اپنی یہ خواہش پوری نہ کرسکا۔ میں اس کی جدائی زیادہ دن برداشت نہیں کرسکوں گا۔ اگر چاندنی واپس نہ آئی تو تجھے اجمیر جانا پڑے گا اور اس کو اپنے ساتھ واپس لانا پڑے گا۔''

برہان لاجواب ہوگیا۔ عاجزی سے جواب دیا۔ ''بندہ پرور! اس ناچیز نے جو ذمے داری قبول کی تھی، اسے پورا کرے گا۔ میں چاندنی کے لیے اجمیر کا سفر کرنے کو تیار ہوں۔''

بادشاہ نے آہو خانے کے خاص محل کے آس پاس درختوں کے تنوں پر مختلف رنگوں کے مخملیں کپڑے لپٹوادیے۔

برہان نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آہو خانے کے حسن کو چار چاند لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو حسینوں سے پاٹ دیا جائے۔

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''یہ بھی ہو جائے گا، مت گھبرا پریشان نہ ہو۔''

برہان بادشاہ کے ساتھ ساتھ چل پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اچانک کہا۔ ''برہان الدین! اگر چاندنی واپس آجاتی تو میں عریشہ اور چاندنی کو آہو خانے میں منتقل کردیتا کیونکہ میں نے چاندنی اور عریشہ میں یہ بات محسوس کی ہے کہ انہیں یک رنگی اور یکسانیت سے نفرت ہے اور وہ حرم سرا سے عاجز آچکی ہیں۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''حضورِ والا! یوں تو یک رنگی اور یکسانیت کسی قسم کی بھی ہو ناقابلِ برداشت ہوتی ہے لیکن صوم و صلوٰۃ ہی ایسی چیزیں ہیں، جن سے دل نہیں گھبراتا۔''

بادشاہ نے برہان کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''عریشہ امید سے ہے، میں نے اعتماد خان کو حکم دے دیا ہے کہ عریشہ کو حسب دستور ہلکا کردیا جائے، چنانچہ اسقاط کے فوراً بعد ہی اسے آہو خانے میں منتقل کردیا جائے گا۔''

بادشاہ تو واپس چلا گیا اور برہان کچھ اور ہی منصوبے بنانے لگا۔

برہان راتوں کو تہجد ادا کرتا۔ آہو خانے کی عورتیں اور لڑکیاں اس کے تقوے سے بے حد متاثر تھیں اور وہ جب بھی برہان کو دیکھتیں، احتراماً کھڑی ہو جاتیں اور خود برہان کا یہ عالم تھا کہ آہو خانے کی ہر لڑکی میں اسے خدا کی قدرت ضرور دکھائی دیتی۔

ایک دن اعتماد خان نے نصف رات کے بعد برہان الدین کو یہ خوشخبری سنائی کہ چاندنی اپنی بہن کے ساتھ واپس آچکی ہے اور اس کی واپسی سے بادشاہ بہت خوش ہے۔

اس خبر نے برہان کو سرتاپا خوشی سے سرشار کردیا اور وہ بے اختیار سجدے میں گرگیا۔ اس نے رات بڑی....

بے چینی سے گزاری اور علی الصباح نماز کے بعد تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے وہ بادشاہ کی خدمت میں جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "متقی برہان! مجھ سے کوئی کام؟"

برہان نے جواب دیا۔ "قبلۂ بندگان! چاندنی آچکی ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ میرے خدا نے مجھے بادشاہ سلامت کی نظروں میں سرخرو رکھا۔ بہرحال پھر بھی یہ عاجز اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ آئندہ کسی کی ضمانت اور ذمے داری قبول نہ کی جائے۔"

بادشاہ نے سکوت اختیار کیا۔

برہان دوپہر سے ذرا پہلے چاندنی سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ چاندنی اور زیادہ نکھر گئی تھی اور جب اس نے چاندنی کی بہن دلربا کو دیکھا تو اس میں خدا کی شان کا وافر ذخیرہ نظر آیا۔ اس کی طبیعت مچل گئی۔ انگوری لباس میں سے دلربا کا حسن شباب کی شکل میں چھلکا پڑ رہا تھا۔ برہان کی نظروں کا پیام چاندنی نے پالیا اور اس نے دلربا سے کہا۔ "دلربا! تو اندر جا اور آرام کرلے۔ سفر نے جوڑ جوڑ الگ کردیا ہے۔"

دلربا فوراً اندر چلی گئی۔ برہان کو چاندنی کی یہ بات بہت گراں گزری، پوچھا۔ "چاندنی! یہ دلربا کو کہاں بھیج دیا؟ میں تو اس کو جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکا۔"

چاندنی نے جواب دیا۔ "امیر برہان! میں نے تیری آنکھوں میں چمک دیکھ لی تھی۔ اس لیے میرا تجھ کو فوراً نہ بلانا اور محتاط رویہ رکھنا ہم دونوں کے حق میں مفید رہا۔"

برہان نے درخواست کی۔ "اچھا دلربا کو ذرا بلا تو سہی۔"

چاندنی نے جواب دیا۔ "نہیں، وہ نہیں آئے گی، تو بلاوجہ تنگ نہ کر۔"

برہان کو غصہ آگیا۔ "چاندنی! تو نہیں جانتی کہ میں قلندر ہوں۔ میرے مجاہدۂ نفس اور تقویٰ نے میری زبان اور نظر میں وہ تاثیر پیدا کردی ہے کہ اگر میں چاہوں گا تو دلربا میرے پاس کھنچی چلی آئے گی۔ میں جب چاہوں گا بادشاہ کا دل تیری طرف سے منحرف اور بیزار کردوں گا۔"

لیکن اعتماد خان نے مزہ کرکرا کردیا۔ اس نے برہان کی موجودگی پر اعتراض کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گا۔

برہان نے کہا۔ "مجھے یہاں آنے کا شوق نہیں ہے لیکن میں نے چاندنی کی واپسی کی ذمے داری قبول کی تھی اس لیے اس کی آمد کی خبر سن کر ملنے چلا آیا۔ آج کے بعد میں یہاں نہیں آؤں گا۔"

برہان آہو خانے چلا گیا۔ وہاں بادشاہ کا فرمان ملا کہ وہ شکار کھیلنے جارہا ہے۔ اس لیے چودہ روز کے اندر اندر وہ شکار پر ساتھ چلنے کے لیے تیار رہے۔ برہان بادشاہ سے خوش نہیں تھا، کیونکہ محمود شاہ ثانی اب وہ پہلے جیسا بادشاہ نہیں رہا تھا۔ اب اس میں کائیاں پن آگیا تھا اور وہ بادشاہ کی حیثیت سے واقف ہوگیا تھا۔

بیس شیرکش برہان کے ماتحت تھے، حرم، مصاحبین، درباری امرا اور شکاریوں پر مشتمل ایک فوج مالوے کی طرف چل پڑی۔ کئی دن بعد یہ لوگ شکارگاہ میں داخل ہوگئے۔ یہیں برہان کو یہ خاص خبر معلوم ہوئی کہ بادشاہ دلربا کا گرویدہ ہوچکا ہے اور اس بات کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ بادشاہ دلربا سے شادی کرلے۔ برہان کا دل بجھ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ بھی تھے وہ ہر طرح بادشاہ کا دل بہلانے کی کوشش کررہے تھے۔

بادشاہ خود تو جنگل میں نظروں سے اوجھل ہوگیا اور اپنے حرم کو برہان اور اس کے بیس شیرکش ساتھیوں پر چھوڑ دیا۔ اعتماد خان بادشاہ کے ساتھ ساتھ بھاگ دوڑ رہا تھا۔

برہان نے اپنے بھانجے دولت خان کو پہرے پر بٹھایا اور چاندنی سے ملاقات کی۔ چاندنی نے بے رخی دکھائی اور سرزنش کی کہ وہ آئندہ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اس کا برا نتیجہ نکلے گا۔ برہان نے جواب دیا۔ "چاندنی! میں نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تجھ سے نہیں ملوں گا لیکن حالات جو رخ اختیار کررہے ہیں ان سے ہم دونوں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ کیا تو جانتی ہے کہ بادشاہ حرم سرا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والا ہے۔ حرم سرا کی بعض عورتوں کو آہو خانے منتقل کردیا جائے گا۔ ان منتقل ہونے والوں میں تو خود اور عریشہ شامل ہیں۔"

چاندنی نے بیزاری سے کہا۔ "امیر برہان آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

برہان نے جواب دیا۔ "چاندنی! میں نے کل رات کے پچھلے پہر جاگتے میں دیکھا کہ سفید چادر میں لپٹی ایک نورانی شکل مجھ سے کہہ رہی ہے کہ برہان! اٹھ اور ہمت سے کام لے اور وہ کر دکھا جو کسی معمولی اور عام آدمی کے بس کا نہیں۔ اس نورانی مجسمے نے مجھ کو یقین دلایا کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ سب ملے گا۔"

چاندنی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تو بادشاہ بھی بن سکتا ہے؟"

برہان نے جواب دیا۔ "ہاں میں بادشاہ بھی بن سکتا

ہوں اور اگر میں بادشاہ بنا بھی تو گجرات کا بادشاہ ہرگز نہ بنوں گا۔ میں شمالی ہند چلا جاؤں گا اور سلطنتِ دہلی پر قبضہ جماؤں گا۔''

چاندنی کو برہان کے دماغ میں فتور محسوس ہوا، اس نے سوچا کہ اگر اس خطرناک بات۔ چیت کا بادشاہ کو علم ہو گیا تو برہان اور چاندنی پر یکساں مصیبت نازل ہو گی، بولی۔ ''امیر برہان! تو خدا کے لیے یہاں سے چلا جا کیونکہ تو باتیں بڑی خطرناک کر رہا ہے۔''

لیکن برہان تو گیا نہیں، چاندنی چلی گئی۔

بادشاہ شکار مکمل کر احمد آباد واپس چلا گیا۔ یہاں اس کو یہ خطرناک خبر ملی کہ سورت بندر میں مقیم غیر ملکی اس کی حکومت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ بادشاہ نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سورت کے ساحلی قلعے کی تعمیر کا حکم دے دیا اور موقع کا جائزہ لینے خود سورت چلا گیا۔ جانے سے پہلے بادشاہ نے حرم سرا کی کئی خواتین اور لڑکیوں کو آہو خانے منتقل کر دیا۔ ان منتقل ہونے والوں میں عریشہ اور چاندنی بھی شامل تھیں۔

عریشہ، چاندنی سے بہت جلنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر چاندنی دلربا کو نہ لاتی تو بادشاہ عریشہ کو ملکہ بنا لیتا۔ بادشاہ کے سورت جانے کے بعد عریشہ نے چاندنی کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔

عریشہ کا آہو خانے آجانا برہان کے لیے بڑی خوشی کی بات تھی لیکن وہ عریشہ سے بے تکلف نہیں تھا، ایک بار جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس نے برہان کو کئی دن تک بہت پریشان رکھا تھا اور جب اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ بادشاہ عریشہ کو ملکہ بنانے والا ہے تو وہ عریشہ کے نام اور سائے تک سے ڈرنے لگا تھا۔ عریشہ نے اس کو بہت متاثر کیا تھا لیکن وہ اپنے اس تاثر کو سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اب جو اس کو یہ معلوم ہوا کہ عریشہ آہو خانے میں داخل ہو گئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

آہو خانے میں پھل دار درختوں کو بڑے سلیقے اور ترتیب سے لگایا گیا تھا۔ لیمو کے درختوں میں سے ترش خوشبو اور امرود کے پتوں میں سے بکھرتی خوشبو میں بڑی شدت تھی۔ آم اور جامن کے درخت بھی تھے اور فالسے کی جھاڑیاں بھی۔ مہندی کے درختوں کے جھنڈ بھی موجود تھے۔ تاڑی، ناریل، کھجور اور میوے کے درخت بھی موجود تھے۔ برہان آہو خانے کی دیکھ بھال کی خاطر اپنا گھوڑا اکثر ادھر بھگاتا رہتا تھا اور کبھی کبھی آہو خانے کی معزز خواتین

کام کی باتیں

دنیا سب سے بڑی کتاب ہے جو پڑھی نہیں جا سکتی اور...... زمانہ سب سے بڑا استاد ہے جو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔

مرسلہ۔ ایم یوسف سانول، نور پور تھل

......****......

ایک دن بیماری نے دولت سے کہا۔ ''تم کتنی خوش نصیب ہو کہ ہر کوئی تمہیں پانے کی کوشش کرتا ہے اور میں کتنی بدنصیب کہ ہر شخص مجھ سے دور بھاگتا ہے۔''

دولت بولی۔ ''خوش نصیب تم ہو جسے پا کر لوگ اپنے خدا کو یاد کرتے ہیں اور بدنصیب تو میں ہوں جسے پا کر اکثر لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں۔''

......****......

جس قوم کے نوجوان دین چھوڑ کر فحاشی اور مردہ دلی پر زندگی گزارنا شروع کر دیں تو وہ قوم جنگ لڑے بنا ہی فتح ہو جایا کرتی ہے؟

سلطان صلاح الدین ایوبی

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

سے مشورے بھی لے لیا کرتا تھا۔

رات کو جبکہ چاندنی کھلی ہوئی تھی اور تیرھویں کا تقریباً مکمل چاند بھاگتے بادلوں کی وجہ سے خود بھی بھاگتا ہوا نظر آرہا تھا۔ خواتین اپنے اپنے کمروں میں جا چکی تھیں۔ برہان نے ایک خدمت گار خاتون کے ذریعے عریشہ کو بلوایا اور تاکید کر دی کہ اس کا علم چاندنی کو نہ ہونے پائے۔

عریشہ آگئی۔ برہان نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کو مہندی کی جھاڑیوں میں لے گیا۔ وہ تنہائی میں سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ برہان نے پوری کوشش کی کہ عریشہ کے آنسو تھم جائیں لیکن ناکام رہا۔ آخر پوچھا۔ ''عریشہ! تو کیوں رو رہی ہے؟''

عریشہ نے جواب دیا۔ ''جب میں اپنی بدنصیبی پر غور کرتی ہوں تو یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوتی ہوں کہ بادشاہ ہمارے نومولود بھی پسند نہیں کرتا اور انہیں اس خوف سے ضائع کرا دیتا ہے کہ کہیں وہ لڑکی نہ ہو۔''

برہان نے تسلی دی۔ ''عریشہ! یہ ظلم و زیادتی تو عام ہے میں زبان کھولتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن اگر تم لوگ چاہو تو اس کا تدارک ہو سکتا ہے۔''

عریشہ نے پوچھا۔ ''کس طرح تدارک ہوسکتا ہے؟''

برہان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اس ہاتھ میں قرآن لینا پڑے گا اس کے بعد میں تجھ پر یقین کروں گا۔''

عریشہ نے یقین دلایا۔ ''میں اپنے بچوں کی قبل از ولادت موت نہیں برداشت کرسکتی۔''

برہان نے کہا۔ ''عریشہ! جب میں تیرے سراپا کو دیکھتا ہوں تو دل وزبان سے بے اختیار سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔ تیرے جیسی بے مثل حسین لڑکی حرم سرا میں موجود ہو اور بادشاہ ملکہ کے لیے کسی اور لڑکی کا انتخاب کرلے یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔''

عریشہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''خدا کی قسم! اگر میرا بس چلے تو میں چاندنی اور دلربا کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت کردوں۔''

برہان نے تسلی دی۔ ''اس طرح مت سوچ عریشہ، تو عورت ہے جو ناقص العقل ہوتی ہے۔ تو اپنی چاندنی اور دلربا کی دشمنی کو کسی پر ظاہر نہ کر۔ پھر میں جب اشارہ کروں تو کسی بھی بہانے سے چاندنی اور دلربا کو دولت کے حوالے کردے، بقیہ کام دوسرے لوگ انجام دیں گے اور جب یہ دونوں حرم سرا اور آہوخانے سے غائب ہوچکی ہوں گی تو حرم سرا میں تجھ سے زیادہ حسین اور کون ہوگی۔''

عریشہ نے جواب دیا۔ ''میں اپنی عزت اور وقار کی بحالی کے لیے سب کچھ کروں گی، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

برہان نے تذبذب سے کہا۔ ''لیکن میں اپنے تعاون کے عوض تجھ سے بھی کچھ چاہوں گا۔''

عریشہ اس کا مطلب سمجھ گئی، بولی۔ ''جو کچھ پہلے ہوچکا ہے اس کا اعادہ ہوگا شاید؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''ہاں، تو نے ٹھیک سمجھا۔ ابھی چند دن پہلے مجھ کو خواب میں کسی نے خاص ہدایت کی ہے میری زبردست خواہش ہے کہ میری اولاد حکمرانی کرے اور اب جبکہ میری خواہش پوری ہونے والی ہے تو میری معاون ومددگار بن جا۔''

عریشہ نے پھر مکر سے کام لیا۔ ''میں تیرا ساتھ دے سکتی ہوں لیکن آنے والوں کو قبل از وقت ہی مار دیا جائے گا اس کا کیا علاج؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''علاج تو میں سوچوں گا، یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں ہے، میں لڑکا چاہتا ہوں، جو خواہ بادشاہ کا ہی کیوں نہ کہلائے اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو میں اس دن تک زندہ رہنے کی کوشش کروں گا جب تک میرا بیٹا گجرات کے تخت پر نہ بیٹھ جائے اور میں دل ہی دل میں فخر اور طمانیت محسوس کروں گا۔''

عریشہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ''امیر برہان! مجھ پر تیری بزرگی اور دینداری کا خاص رعب ہے لیکن ڈر یہ لگتا ہے کہ اگر بادشاہ کو یہ باتیں معلوم ہوگئیں تو ہمارا بڑا برا حشر ہوگا۔''

''بادشاہ کو ان باتوں کا علم ہی کیوں ہوگا۔ آہوخانے کا نگران میں ہوں، میرا نائب دولت خان میرا بھانجا ہے اور پھر یہ کہ مئوکل میرے قبضے میں ہیں۔ میں جس کو چاہوں مئوکلوں کے ذریعے تباہ وبرباد کرادوں گا۔''

عریشہ نے برہان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''اعتماد خان تیرے تعاقب میں ہے۔ اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

چاندنی رات، مہندی کی جھاڑیاں، دولت خان کی پہرے داری، برہان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا، وہ وہیں دادِ عیش دیتا رہا۔ عریشہ اس کی مطیع وفرماں بردار ہوچکی تھی۔ برہان سوچ رہا تھا کہ اگر اس رات کا نتیجہ کسی لڑکے کی ولادت کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ لڑکا شاہی محل میں پرورش بھی پاتا رہا تو تاج وتخت پر قبضہ کرنے کے بعد اس لڑکے پر یہ راز کیونکر ظاہر ہوگا کہ وہ بادشاہ کا نہیں، امیر برہان کا بیٹا ہے۔ اس پر جتنی شہادتوں کی ضرورت ہوگی خاموشی سے گزار دی جائیں گی۔

بادشاہ کو دو ماہ لگ گئے۔ اس نے سورت میں ایک شاندار قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کی تعمیر کا کام جاری ہی تھا کہ بادشاہ واپس آگیا۔ وہ حرم سرا میں گھس کر بیٹھ گیا۔ حرم سرا سے نکل کر آہوخانے چلا آیا اور چاندنی، عریشہ اور دوسری خواتین سے ملاقاتیں کیں، کچھ ان کی سنی کچھ اپنی سنائی۔ بادشاہ سورت سے چند خوب صورت لڑکیاں اور لایا تھا۔ برہان نے انہیں دیکھا تو غش کھاتے کھاتے رہ گیا۔ برہان، بادشاہ سے کہہ تو نہیں سکا لیکن اس کی خواہش یہی تھی کہ ان لڑکیوں کو آہوخانے میں رکھا جائے۔

غالباً بادشاہ نے برہان کے تردد اور خواہش کو سمجھ لیا اور لڑکیوں کو آہوخانے میں چھوڑ دیا۔ برہان سے مسکرا کر کہا۔ ''برہان! ان لڑکیوں سے کام تو لے، انہیں دیکھ اور ان سے باتیں کرکے یہ اندازہ لگا کہ کون سی لڑکی کس کام کے لیے موزوں رہے گی۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''حضور فکر نہ کریں۔ یہ

میری ذمے داری ہے کہ میں انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام دوں۔''

بادشاہ لڑکیوں کو برہان کے حوالے کرکے چلا گیا۔

برہان نے ان لڑکیوں کو آہو خانے کے بیرونی محل میں اپنے سامنے کھڑا کیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے تمام لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور خود ان سے دور ایک کمرے میں جا بیٹھا، آہو خانے کی ایک عورت کو خدمت گار کی طرح اپنے کمرے کے باہر کھڑا کیا اور اس کو ہدایت کر دی کہ وہ باری باری ایک ایک لڑکی کو اندر بھیجتی رہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی اندر آگئی۔ برہان نے اس کو دیکھتے ہی سبحان اللہ کا نعرہ لگایا۔ لڑکی اس دیندار کو دیکھ کر خاصی مرعوب ہوئی۔

برہان نے لڑکی سے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ وہ بیچ بیچ میں یہ کہتا جاتا کہ مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ تو تو کسی ملک کی ملکہ بننے کے لائق تھی لیکن خیر تو میرے سپرد کر دی گئی ہے۔ اس لیے تجھ کو ذلیل و خوار نہیں ہونے دیا جائے گا۔ دو ایک دن میں تیرے ذمے کوئی مناسب کام کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تو مجھ سے ملتی جلتی رہ مگر اس ملاقات کا کسی کو علم نہ ہو، میں تجھے کہیں سے کہیں پہنچا دوں گا۔''

امیر برہان نے اپنی پسندیدہ لڑکی کو چھوٹے سے گلستان میں لگا دیا تھا، جہاں سیکڑوں قسم کے پھولوں سے لدے ہوئے پودے لگے ہوئے تھے۔ امیر برہان دن میں کئی کئی بار اس لڑکی کے پاس پہنچ جاتا اور ہدایتوں اور نصیحتوں سے لڑکی کو عاجز اور پریشان کر دیتا چونکہ بادشاہ کی طرف سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہو رہی تھی اور اس پر غیر معمولی اعتبار کیا جا رہا تھا۔ اس لیے امیر برہان کے حوصلے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے نئی لڑکی سلیمہ کو اتنا تنگ کیا کہ وہ عافیت کی فکر کرنے لگی۔ بادشاہ آہو خانے میں آتا تو امیر برہان کو وہ عزت دیتا کہ ساکنانِ آہو خانہ پر اس کا اور زیادہ رعب بیٹھ جاتا۔

امیر برہان کو اعتماد خان کی زبانی یہ پیغام ملا کہ بادشاہ آہو خانے کا معائنہ کرنے آ رہا ہے۔ امیر برہان نے آہو خانے کی تزئین و آرائش میں شب و روز ایک کر دیے اور اپنے ساتھ ہی آہو خانے کی عورتوں اور لڑکیوں کو بھی تنگ کر دیا۔ اس نے منتظم عورتوں کو ہلکان کر ڈالا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے سلیمہ کو طلب کیا اور سختی سے کہا۔ ''سلیمہ! تیری کارکردگی اچھی نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تو معتوب نہ قرار دے دی جائے۔''

سلیمہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''اگر مجھ پر عتاب نازل ہوا تو وہ کس طرح اور کیا عتاب ہوگا؟''

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''بادشاہ تجھ کو کسی معمولی اور ذلیل کام پر لگا دے گا۔ مثلاً وہ آہو خانے کے بیت الخلا تیرے سپرد کر دے گا اور شب و روز بدبودار ماحول میں پھنس کر تیرا دماغ اڑ جائے گا۔''

سلیمہ روہانسی ہوگئی۔ بولی۔ ''امیر برہان! میں نے محنت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا آپ میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں؟''

امیر برہان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''سلیمہ! تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ بادشاہ جو کچھ کرے گا میری رائے اور مرضی سے کرے گا اور میں سچ بولنے پر مجبور ہوں کیونکہ میں تیرے کام سے مطمئن نہیں ہوں۔''

سلیمہ نے پوچھا۔ ''میں آپ کو کس طرح مطمئن کر سکتی ہوں؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''سلیمہ! تو بہت نادان ہے۔ اس وقت میں تجھ سے زیادہ باتیں نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے تھوڑا تھوڑا وقت سبھی کو دینا ہے۔ رات کو میں عشا کے بعد ذرا دیر کے لیے کمر ٹیکتا ہوں۔ اس کے بعد نصف شب سے تہجد پڑھنے لگتا ہوں۔ عشا کے بعد صبح تک تو کسی وقت بھی میرے پاس آسکتی ہے۔''

سلیمہ گھبرا گئی۔ ''رات کو، یعنی میں رات کو آجاؤں آپ کے پاس؟''

برہان نے ہنس کر پوچھا۔ ''ہاں، ہاں رات کو۔ رات کو آنے میں کیا تامل ہے تجھے؟''

سلیمہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لوگ کیا کہیں گے؟ دیکھنے والے کیا سوچیں گے؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''تو لوگوں کی نظروں سے بچ کر میرے پاس آئے گی اور لوگوں کی نظروں سے کس طرح بچے گی، میں نہیں جانتا، یہ سوچنا تیرا کام ہے۔ ہاں ایک بات کا تو اطمینان رکھ، سلیمہ! تو نے ایک بات تو خود بھی محسوس کر لی ہوگی کہ بادشاہ اور آہو خانے کی خواتین، مجھ پر غیر معمولی اعتبار کرتے ہیں۔ میں نے تقویٰ اور ریاضت سے نفس کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ میں ہر شے میں قدرت دیکھ لیتا ہوں، لوگ مجھ پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے ہیں، تجھے بھی اعتبار کرنا چاہیے اور یہ بھی سن لے کہ جو لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔ ان پر میں بھی اعتبار نہیں کرتا۔''

سلیمہ نے بھی آواز میں کہا۔ ''میں آجاؤں گی لیکن آپ جو بھی نصیحتیں یا ہدایتیں دیں ان میں زیادہ وقت نہ ضائع ہو اور بادشاہ کو میری طرف سے اتنا مطمئن کر دیں کہ میں کسی ذلیل کام پر نہ لگا دی جاؤں۔''

برہان نے کہا۔ ''ابھی تو ناتجربہ کار ہے اس لیے جب تک تو تربیت نہ پا جائے آہو خانے کی کوئی اچھی اور معتبر جگہ تجھے نہیں دی جاسکتی اور میں تیری سفارش اسی وقت کر سکتا ہوں جبکہ میں خود مطمئن ہو جاؤں۔''

سلیمہ نے جواب دیا۔ ''امیر برہان! میں آپ کے مشورے پر چلوں گی تاکہ مجھے ذلیل و خوار نہ ہونا پڑے۔''

مغرب کے بعد اعتماد خان آ گیا۔ وہ برہان کو یہ بتانے آیا تھا کہ بادشاہ کل کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

امیر برہان نے جواب دیا۔ ''اعتماد خان! تو کل کی بات کر رہا ہے میں ہر وقت تیار ہوں تو اسی وقت بادشاہ کو لا سکتا ہے۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''امیر برہان! میں وقت نکال کر تم سے ملنے اس لیے آیا ہوں کہ تم میرا ایک کام کر دو۔''

امیر برہان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں اور تیرا کام کر دوں، کہیں تو مذاق تو نہیں کر رہا؟''

اعتماد خان نے کہا۔ ''امیر برہان، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔''

اعتماد خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ امیر برہان نے اس کے پاس جاتے ہوئے کہا۔ ''ارے تو رونے کیوں لگا؟ کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی تو بتا۔''

اعتماد خان کی آواز بھی بھرا گئی۔ کہا۔ ''امیر برہان! تم میری ان خدمات سے تو واقف ہو جو میں نے بادشاہ کے لیے انجام دی ہیں، یہاں تک کہ جب بادشاہ نے میری مرضی کے خلاف حرم سرا کا انتظام میرے سپرد کیا تو میں نے اپنے اعتماد کو برقرار اور بحال رکھنے کے لیے کافور کھا کر اپنی رجولیت کو ہمیشہ کے لیے ضائع کر دیا۔ سب کچھ کھو کر میں نے حاصل کیا کیا؟ شکوک، جھڑکیاں، گالیاں، مغلظات، بادشاہ معلوم نہیں کیوں مجھ سے سخت ناراض ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے بادشاہ کو میرے خلاف ورغلایا ہو۔''

امیر برہان نے افسوس کیا۔ ''اعتماد خان! اگر بادشاہ تجھ سے ناراض ہے تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ بہرحال میں بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

امیر برہان کو اعتماد خان پر رحم آ رہا تھا۔ اس نے اسے بڑی تسلیاں دیں اور وعدہ کیا کہ وہ کسی موقع پر بادشاہ سے اعتماد خان کی سفارش ضرور کرے گا۔

☆☆☆

عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو سلیمہ کے انتظار نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ سلیمہ کے تیکھے نقوش اور چہرے کا بھولپن، امیر برہان کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے تھے اور اب وہ صحیح معنی میں یہ کہہ سکتا تھا کہ سلیمہ نے اس پر سحر کر دیا ہے۔

وہ بستر پر لیٹا معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا کہ بے چینی نے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور اس نے صحن میں کھڑے ہو کر آسمان کی طرف دیکھا، ستاروں کے محل وقوع سے اس نے اندازہ لگایا کہ رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے۔ صحن سے باہری دروازے پر گیا اور جھانک کر سلیمہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک سائے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ برہان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازے پر دستک دی اور آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اور زیادہ کھل گیا۔ کوئی اندر داخل ہوا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے آنے والے کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ سلیمہ ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سلیمہ کی آنکھیں ڈھانپ لیں۔ سلیمہ گھبرا گئی اور اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن برہان کی مضبوط گرفت نے اس کو دیکھنے نہیں دیا۔

سلیمہ نے وحشت زدہ آواز میں کہا۔ ''مجھے چھوڑ دو، کون ہو تم؟''

برہان نے ہنس کر چھوڑ دیا اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''شہزادی! میں نے بے جا جسارت کی، معافی چاہتا ہوں مجھے معاف کر دے۔''

سلیمہ چکرا گئی۔ امیر برہان کی عاجزی نے اس کو سرتاپا حیرت بنا دیا۔

برہان نے دروازہ بند کر دیا اور سلیمہ کو لیے ہوئے اندرونی حصے میں چلا گیا لیکن سلیمہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے۔ برہان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور اندر کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''سلیمہ! یہاں کہاں کھڑی ہو گئی، اندر چل، وہاں باتیں ہوں گی۔''

سلیمہ نے گھبرائے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ نے تو یہ یقین دلایا تھا کہ آپ ایک متقی انسان ہیں مجھ کو ڈرنا نہیں چاہیے۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''اور میں اب بھی وہی یقین

دلا رہا ہوں۔ تجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔''

سلیمہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ''آپ نے مجھ کو کیوں بلایا تھا؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''لڑکی دم تو لے ذرا۔ ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے تجھے... کیوں بلایا تھا۔''

سلیمہ اور زیادہ خوفزدہ ہوگئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''امیر برہان! مجھ پر رحم کیجیے۔''

برہان اس کے سامنے جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''سلیمہ! تو پریشان کیوں ہو رہی ہے؟ میں تیرا بھلا چاہتا ہوں۔ کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ میں نے تجھ کو شہزادی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں تجھ کو شہزادی ہی دیکھنا چاہتا ہوں، تو ہے بھی شہزادی۔''

سلیمہ نے کہا۔ ''آپ نے مجھے جن مشوروں کے لیے بلایا تھا، جلد از جلد دے کر رخصت کر دیجیے۔''

برہان نے اجازت طلب کی۔ ''کیا میں تیرے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟''

سلیمہ کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''بیٹھ جائیے۔''

برہان نے کہا۔ ''یوں نہیں سلیمہ، اس طرح۔''

اور سلیمہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسہری کی طرف لے گیا اور اس پر زبردستی بٹھا کر اس کے پاس ہی خود بھی بیٹھ گیا۔

سلیمہ نے مختصر بات کی۔ ''آپ نے مجھے جن باتوں کے لیے بلایا تھا جلدی جلدی کر ڈالیے، مجھ کو ڈر لگ رہا ہے۔''

برہان نے کہا۔ ''اگر ڈر لگ رہا ہے تو سن میری باتیں۔ سلیمہ! میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تیرے سراپا میں کچھ خاص دیکھا ہے اور میں یہ خاص جلوہ جہاں بھی دیکھتا ہوں، بے چین ہو جاتا ہوں۔''

اس نے سلیمہ کی نرم و سیاہ زلفوں کی ایک لٹ انگلیوں میں لے لی اور ان کی خوشبو سونگھنے لگا۔ سلیمہ نے لٹ کو چھڑانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ برہان نے کہا۔ ''اب اتنا ظلم نہ کر لڑکی۔ سلیمہ! میں حیران ہوں کہ تیرے حسن کا بادشاہ پر شدید اثر کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ میں خود دیوانہ ہو رہا ہوں، اگر میں دیندار نہ ہوتا تو تیری پرستش کرنے لگتا۔''

سلیمہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''اب میں واپس جاؤں گی۔''

برہان نے پھر تسلی دی۔ ''لڑکی حماقت کی باتیں مت کر۔ میں تجھ کو آہو خانے کا نگران بنوا دوں گا۔ بادشاہ میرے اختیار میں ہے میں اس سے جو چاہوں کرا لوں گا۔''

سلیمہ نے بدستور بیزاری سے کہا۔ ''میں تیری سفارش سے کچھ بھی بننا ناپسند کروں گی۔ اب مجھ کو جانے دے۔''

برہان نے بالوں کی لٹ کو بوسہ دیا۔ ''اب غصہ تھوک دے لڑکی اور مجھ سے تعاون کر۔''

سلیمہ نے رو کر کہا۔ ''امیر برہان! اس وقت میں آپ کے قبضے میں ہوں، آپ جو چاہیں کریں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔''

برہان نے سلیمہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ''اگر تو معاملے کو مجھ پر چھوڑ رہی ہے تو اب خاموش ہو جا اور صبر کر لے۔''

سلیمہ واقعی خاموش ہوگئی۔

اسی وقت کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور کئی آوازیں سنائی دیں۔ ''امیر برہان دروازے کھولو۔''

برہان کی جان نکل چکی تھی لیکن اس نے پھر بھی حواس کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ سلیمہ سسکیاں لینے لگی۔

اچانک اعتماد خان کی آواز سنائی دی۔ ''امیر برہان! دروازے کھول دے۔ ورنہ توڑ دیے جائیں گے۔''

برہان نے سلیمہ سے کہا۔ ''سلیمہ تو چوکی پر بیٹھ جا۔ میں دروازے کھولنے جا رہا ہوں۔ میری عزت و آبرو تیرے ہاتھ میں ہے۔ اگر تو چاہے گی تو یہ کہہ دے گی کہ میں نے تجھے بلایا نہیں تھا بلکہ کچھ پوچھنے کے لیے تو خود ہی چلی آئی تھی۔''

سلیمہ نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بولوں گی امیر برہان۔ تو نے جس نیت اور جس ارادے سے مجھے یہاں بلایا تھا میں اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔''

امیر برہان نے کہا۔ ''تیری مرضی۔ میں نے آج تک کسی کی خوشامد تو کی نہیں۔''

امیر برہان نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کا کھلنا تھا کہ بادشاہ اور اس کے پندرہ امرا اور مصاحبین آگے پیچھے اندر داخل ہوگئے۔ اعتماد خان بادشاہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بادشاہ کا مارے غصے کے بہت برا حال تھا۔

بادشاہ نے سلیمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برہان سے پوچھا۔ ''اس لڑکی کو یہاں کون لایا اور اتنی رات گئے ہے؟''

برہان نے جی سخت کر کے کہہ دیا۔ ''اس لڑکی کو میں نے طلب کیا تھا کیونکہ میں حضور کی تشریف آوری سے پہلے آہو خانے کو رشک ارم بنا دینا چاہتا تھا۔''

بادشاہ نے سلیمہ سے پوچھا۔ ''کیا یہ شخص تیرا ساتھی ہے؟ اور جو کچھ یہ کہہ رہا ہے درست ہے۔''

سلیمہ رونے لگی، وہ سسکیاں لے لے کر روئی۔

بادشاہ اس کے قریب چلا گیا اور نرمی سے کہا۔ ''لڑکی! مت رو، بلکہ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں تو اس کا جواب دے، تجھ کو کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔''

سلیمہ روئے چلی جارہی تھی اور امیر برہان چور کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

بادشاہ نے حکم دیا۔ ''برہان کو باندھ دیا جائے اور لڑکی کو حراست میں لے لیا جائے۔''

برہان کی مشکیں کس دی گئیں۔ اعتماد خان آگے آگے تھا اور برہان نے یہ محسوس کیا گویا اعتماد خان بادشاہ کا سب سے زیادہ معتمد آدمی ہے۔ برہان کو یقین ہوگیا کہ اعتماد خان نے اس سے جو گفتگو کی تھی، وہ محض فریب تھی اور اس کو دھوکے میں رکھنے کے لیے کی گئی تھی۔ برہان نے اعتماد خان سے کہا۔ ''اعتماد خان! تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو تجھے بھی دھوکا دیا جائے گا۔''

اعتماد خان نے بادشاہ سے کہا۔ ''بندۂ پرور! برہان الدین کا دعویٰ ہے کہ اس نے مؤکلوں کو قبضے میں کر رکھا ہے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''کوئی بدکار اور فاسق مؤکلوں کو قبضے میں کس طرح رکھ سکتا ہے۔''

بادشاہ برہان کو لے کر چلا گیا۔

حرم سرا اور آہو خانے میں تہلکہ مچ گیا کہ امیر برہان گرفتار ہوگیا ہے۔ برہان نے اپنے پہریداروں میں سے کسی کے ذریعے چاندنی اور عریشہ کو دو پیغام بھیجے۔ چاندنی سے کہلوایا۔ ''میں نے تجھ پر چند احسان کر رکھے ہیں۔ اب مجھ پر وقت آگیا ہے اس لیے میرے لیے کچھ کر اور احسان کا بدلہ احسان سے اتار۔''

عریشہ سے کہلوایا۔ ''میری نجات میں بہتوں کی نجات مضمر ہے اگر میں رہا نہ ہوا تو کئی اور بھی رسوا ہو جائیں گے اس لیے میری رہائی ضروری ہے۔ اگر میری مدد نہ کی گئی تو میں کئی پردہ نشینوں کے راز فاش کر دوں گا۔''

برہان کے پیغام تو دونوں جگہ پہنچ گئے لیکن جواب کسی نے بھی نہیں دیا۔

بادشاہ کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوا، سلیمہ نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ برہان نے کہا۔ ''سلیمہ! میں نے تیرا بھلا چاہا تھا اور تو نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔''

سلیمہ نے جواب دیا۔ ''امیر برہان! تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا......''

بادشاہ نے کہا۔ ''لڑکی اب تو اس کے نام کے ساتھ امیر نہ لگا کیونکہ اب یہ امیر برہان کے بجائے اسیر برہان ہے۔''

برہان نے اعتماد خان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا لیکن اعتماد خان نے منہ پھیر لیا۔ بادشاہ کو غصہ آیا کہ برہان وسیلے اور سفارش سے کام چلانا چاہتا ہے خود بادشاہ سے رحم کی درخواست نہیں کرتا۔

بادشاہ نے برہان سے پوچھا۔ ''تو اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے، خدمت کی ہے اور ایک بڑے منصب کا حامل رہا ہوں، ان خصوصیات کے بعد اگر حضور ایک اجنبی اور معمولی لڑکی کی شہادت بے جا اور بیانِ کاذب کی بنیاد پر سزا دینا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''لڑکی تیرے پاس تھی اور نصف رات کے بعد تیری قیام گاہ پر چھاپا مار کر لڑکی کو برآمد کیا گیا۔ لڑکی کی شہادت کے علاوہ حالات اور واقعات بھی تیرے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ ان کی تردید تو کس طرح کرے گا؟''

برہان خاموش ہوگیا گویا وہ لاجواب ہو چکا تھا۔

بادشاہ نے فیصلہ سنایا۔ ''چونکہ برہان نے پارسائی اور دیانتداری کے پردے میں نہایت مکروہ حرکت کی ہے اور اپنے خدا اور بادشاہ کو بیک وقت دھوکا دیا ہے۔ اس لیے یہ بھیانک اور عبرتناک سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ میں نے برہان کو دیوار میں چنوا دینے کی سزا تجویز کی ہے۔ برہان کو اس طرح چنوایا جائے کہ اس کے چہرے کے علاوہ پورا جسم دیوار میں چھپ جائے۔ چہرہ اس لیے کھلا رکھا جائے کہ یہ لوگوں کو آزادانہ خوش و خرم چلتا پھرتا دیکھے اور اپنی بددیانتی خیانت اور بدکاری پر افسوس کرے اور اسی طرح سسک سسک کر مر جائے۔''

حاضرین پر سناٹا طاری ہوگیا اور برہان صدمے سے بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

برہان کو شاہی محل کے باہر دیوار میں اس طرح چن دیا گیا کہ اس کا پورا جسم دیوار کے اندر غائب ہوگیا اور صرف چہرہ نظر آتا رہا۔ بادشاہ نے امرا اور مصاحبین کو حکم دیا کہ وہ برہان کے سامنے سے گزریں چنانچہ امرا اور مصاحبین کی قطاریں برہان کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ برہان نے مارے شرم کے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا لیکن سخت جانی نے اس کو زندہ رکھا۔

حرم سرا اور آہو خانے میں سناٹا طاری تھا۔ چاندنی کو بھی صدمہ پہنچا اور عریشہ بھی بہت پریشان ہوئی۔ ان دونوں نے سلیمہ کو لعنت ملامت کی کہ اس کو امیر برہان کے خلاف بیان نہیں دینا چاہیے تھا۔ خود سلیمہ کو بھی بہت ملال تھا لیکن

اب تو جو ہو چکا تھا، کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح تھا جو واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔

بادشاہ نے برہان کو مزید ذلیل کرنے کے لیے حرم سرا کی خواتین اور آہو خانے کی مستورات اور لڑکیوں کو بھی یہ حکم دیا کہ وہ ایک قطار میں برہان کے سامنے سے گزریں۔

رات کو شاہی محل کے اس حصے کو بقعۂ نور بنا دیا گیا، جہاں برہان دیوار میں چنا گیا تھا۔ برہان کو دیوار میں چننے کی سزا کے بعد یہ دوسری سزا زیادہ اذیت پہنچا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

چاندنی بالکل قریب پہنچ گئی اور آہستہ سے کہا۔ ''افسوس کہ میں تیری کوئی مدد نہ کر سکی لیکن اب افسوس کر رہی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تیرے لیے جو کچھ بھی کر سکتی ہوں ضرور کروں گی۔''

لیکن برہان تو بول بھی نہ سکتا تھا۔ اب اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور پلکیں جھک گئیں۔

کچھ دیر بعد عریشہ بھی اس کے پاس سے گزری اور نہایت غمزدہ آواز میں کہا۔ ''امیر برہان! میں تجھے اس حال میں دیکھ کر بڑا دکھ محسوس کر رہی ہوں۔ خدا تجھے زندہ رکھے میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔''

سلیمہ بھی سامنے سے گزاری گئی۔ اس نے ایسا دردناک منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔

بادشاہ اپنے محل میں بیٹھا برہان کی سزا سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اس نے سامنے موجود امرأ سے کہا۔ ''میرا ذاتی خیال ہے کہ جب ملازمین بددیانتی، خیانت اور بدکاری کے مرتکب ہوں تو انہیں اس قسم کی عبرت ناک سزا دینا چاہیے اور سزا کے بعد دوسرے امرأ اور مصاحبین کی عبرت کے لیے اس کی نمائش ضرور کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح دوسروں کو صحیح اور صاحب کردار رکھا جا سکتا ہے۔''

اعتماد خان نے ذرا اختلاف کیا، بولا۔ ''حضور والا! اگر میری خدمات کو اس لائق سمجھا جاتا ہے کہ میں ان کے بل بوتے پر ناگوار سچ بولوں اور حضور اس سچ کو گوارا فرمالیں تو کچھ عرض کروں؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''اعتماد خان! میں تیری نیت پر شبہ نہیں کر سکتا اس لیے تجھے اجازت ہے کہ جو کہنا چاہتا ہے صاف صاف کہہ دے۔''

اعتماد خان نے عرض کیا۔ ''حضور نے برہان الدین کو جو سزا دی ہے اس سے جہاں بددیانتوں، بدکاروں اور خیانت کرنے والوں کو عبرت ہوگی وہیں ایماندار اور مخلص غلاموں کے دل ٹوٹ جائیں گے کہ مدتوں خدمت کرنے کے بعد کسی لغزش پر حضور، خدمات کو نظر انداز کر کے اتنی روح فرسا سزا دے دیں گے اور جب مخلص اور ایماندار غلاموں کے دل یوں ٹوٹ جائیں گے تو وہ کسی اور دربار کے لیے سوچنا شروع کر دیں گے۔''

بادشاہ دم بخود سناٹے میں آ گیا، وہ کچھ دیر اعتماد خان کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد کہا۔ ''اعتماد خان! بول تو کیا چاہتا ہے؟''

اعتماد خان نے کہا۔ ''سزا اور سرزنش میں اعتدال......''

بادشاہ نے کہا۔ ''وعدہ، آئندہ اس کا خیال رکھا جائے گا۔''

بادشاہ حرم سرا میں گیا تو وہاں چاندنی، دلربا اور عریشہ اس کو منتظر ملیں۔ بادشاہ یوں ہی بہت پریشان تھا۔ ان تینوں کو یکجا دیکھ کر سمجھ گیا کہ انہیں بھی کوئی خاص بات کرنا ہوگی۔

چاندنی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، یہ اجتماع ثلاثہ کیسا؟''

چاندنی نے عرض کیا۔ ''حضور کا مزاج تو اچھا ہے، بندی روئے مبارک پر کبیدگی اور افسردگی محسوس کر رہی ہے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''چاندنی! تیرا خیال درست ہے۔ آج میں بہت پریشان ہوں۔''

چاندنی نے گزارش کی۔ ''اگر پریشانی کا سبب معلوم ہو جائے تو ممکن ہے اس کی تلافی ہو جائے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''میں نے برہان الدین کو دیوار میں چنوا دیا۔ میرا خیال تھا لوگ اس سے عبرت پکڑیں گے لیکن اس کا الٹا اثر ہوا اور میرے مخلص اور دیانت دار امرأ مجھ سے برگشتہ و دل برداشتہ ہو گئے ہیں اور مجھے خود بھی برہان الدین سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔''

چاندنی نے عرض کیا۔ ''ہم تینوں نے ابھی ابھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ برہان الدین کے لیے آپ سے رحم کی درخواست کریں گے، کیونکہ برہان الدین کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دی گئی ہے۔''

بادشاہ نے چونک کر پوچھا۔ ''خیر یہ بات تو میں ماننے سے رہا۔ برہان الدین خائن تھا، اس نے بددیانتی اور بدکاری کی، کیا یہ معمولی جرم ہیں؟ اور انہیں کون معمولی کہہ سکتا ہے۔''

دلربا نے کہا۔ ''قبلۂ بندگان! بندی ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس نے کون سی بددیانتی اور بدکاری کی ہے اور ابھی تک اس کی خیانت بھی ثابت نہیں ہو سکی ہے۔ اس لحاظ سے برہان الدین کو ایک ایسے جرم کی سزا دی گئی ہے جو سرے سے اس نے کیا ہی نہیں۔''

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''دلربا! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

اب عریشہ بھی بول اٹھی۔ ''جہاں پناہ! دلربا صحیح کہہ رہی ہے۔''

بادشاہ نے جھنجلا کر کہا۔ ''تم لوگ یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''سلیمہ نے برہان الدین پر یہی الزام تو لگایا تھا کہ اس نے رات کی تنہائی میں سلیمہ کو بلایا تھا، برہان الدین نے سلیمہ کے ساتھ کچھ کیا تو نہیں۔ اگر کچھ کرنا ثابت ہو جاتا تو برہان الدین اس سے زیادہ عبرت ناک سزا کا مستحق ہوتا۔''

بادشاہ کو یاد آ گیا کہ یہ عورتیں صحیح کہہ رہی ہیں۔ اس نے اسی وقت سلیمہ کو طلب کر لیا۔ سلیمہ آہو خانے جا چکی تھی۔

بادشاہ نے کہا۔ ''میں نے واقعی زیادتی کی ہے۔ میں نے برہان الدین پر ظلم کر دیا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''حضور اس کو دیوار سے نکلوا سکتے ہیں۔''

بادشاہ نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ بچے گا پھر بھی نہیں۔''

عریشہ نے عرض کیا۔ ''وہ زندہ رہے یا مر جائے۔ یہ برہان الدین کی قسمت پر موقوف ہے۔ حضور اس کو فوراً ہی نکلوا لیں۔ انصاف کی نظر میں یہی کافی ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''میں اس وقت تک کچھ نہیں کروں گا جب تک مجھے سلیمہ سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ برہان الدین نے سلیمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر برہان الدین مرتکب نکلا تو اس کی موجودہ سزا برقرار رہے گی۔''

چاندنی نے عرض کیا۔ ''اس صورت میں ہم تینوں حضور سے رحم کی درخواست نہیں کریں گے۔''

کافی دیر بعد سلیمہ کو بادشاہ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ بادشاہ نے گھما پھرا کر بار بار یہ کہلوانے کی کوشش کی کہ برہان الدین نے سلیمہ سے عملاً زیادتی کی ہے اور وہ سب کر گزرا ہے جو کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن سلیمہ نے بار بار یہی کہا کہ میں برہان الدین کو کسی ایسے جرم کا مرتکب نہیں قرار دوں گی جو اس نے کیا ہی نہیں۔

بادشاہ نے بے بسی سے کہا۔ ''آہ... تم سب نے مجھ کو کتنا مجبور اور بے بس کر دیا ہے۔''

وہ پیشانی کو دونوں ہتھیلیوں پر ٹکا کر بیٹھ گیا اور معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ برہان الدین نے دوسروں کو وسیلہ بنا کر معافی چاہی مگر براہِ راست مجھ سے رحم کی درخواست نہیں کی۔ اگر وہ مجھ سے ایک بار بھی معافی چاہ لیتا تو میں اس کو معاف کر دیتا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو وہ بچ بھی نہیں سکتا، اگر زندہ بھی ہے تو کچھ دیر بعد مر جائے گا۔''

چاندنی نے گزارش کی۔ ''حضور والا! اس کو دیوار کے زنداں سے نکال لیجیے۔ اس کے بعد اگر وہ مر جائے تو مر جانے دیجیے۔''

عریشہ نے سوگواری سے کہا۔ ''حضور کو جلدی کرنا چاہیے۔ اس میں تامل اور تاخیر نہیں اختیار کرنا چاہیے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا اب میں برہان الدین کو دیکھنے جا رہا ہوں، دیکھتا ہوں اس کا کیا حال ہے اور وہ کہتا کیا ہے؟''

چاندنی، دلربا، عریشہ اور سلیمہ کے چہروں پر شگفتگی دوڑ گئی۔

بادشاہ حرم سرا سے نکلا اور محل کے بیرونی حصے میں چلا گیا۔ اس نے دور ہی سے برہان الدین کا دیوار میں نمایاں چہرہ دیکھا اور دل میں کانپ گیا۔ چہرے سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ برہان الدین زندہ ہے یا مر گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے چہرے کے قریب پہنچ گیا۔ بادشاہ نے برہان الدین کی پتلیوں کو حرکت کرتے دیکھا۔ جب وہ بالکل قریب پہنچ گیا تو بادشاہ کو یوں محسوس ہوا گویا برہان الدین اس کو سلام کر رہا ہے۔ بادشاہ کانپ گیا کہ برہان الدین اس حال میں بھی اس کا احترام کر رہا تھا۔

بادشاہ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''برہان الدین! میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ میں نے تجھ پر بے حد ظلم کیا، خدا تجھ کو زندہ و سلامت رکھے، اب تو زیادہ دیر تک اس دیوار میں نہیں رہے گا۔''

بادشاہ نے اسی وقت خدام کو حکم دیا کہ برہان الدین کو نہایت احتیاط سے باہر نکال لیا جائے۔

خدام نے نہایت احتیاط سے اینٹوں کو ہٹانا شروع کر دیا اور آناً فاناً برہان الدین کو دیوار سے نکال لیا۔ وہ اتنا بے حال ہو چکا تھا کہ اینٹیں جیسے ہی ہٹیں، وہ غش کھا کر گر گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ ''اس کو ہوش میں لایا جائے۔''

خدمت گاروں نے اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کی اور بادشاہ کو یہ افسوسناک اطلاع دی کہ برہان الدین کا جسم گل سڑ رہا ہے۔ بادشاہ نے برہان الدین کو شاہی محل کے ایک کمرے میں لے جا کر اطبا کو متعین کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ برہان الدین کو بہر قیمت صحت یاب کرنا ہے۔

اطبا نے اپنا کام شروع کر دیا۔

جب امرا کو برہان الدین کی رہائی کی خبر ملی تو وہ خوش ہوئے لیکن اعتماد خان ملول ہو گیا۔ اس ملال اور افسردگی کو بادشاہ نے بری طرح محسوس کیا اور پوچھا۔ ''اعتماد خان! کیا تو برہان الدین کی رہائی سے خوش نہیں ہے؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں ذرا بھی خوش نہیں، برہان الدین کی رہائی نے مجھ کو فکرمند اور خوفزدہ کر دیا ہے۔''

بادشاہ نے حیرت سے کہا۔ ''اعتماد خان! تو نے بھی تو برہان الدین کی سزا کو پسند نہیں کیا تھا اور اعتدال کی سفارش کی تھی۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''بیشک سزا اور سرزنش میں، میں نے میانہ روی کی سفارش کی تھی لیکن اس سے یہ کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ میں نے برہان الدین کی رہائی کی سفارش کی تھی۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''برہان الدین کا جسم گل سڑ چکا ہے اور شاہی معالج بڑی تندہی سے اس کا علاج کر رہے ہیں۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت! انسان کو انسان کی فطرت ضرور معلوم ہونا چاہیے۔ انسان بڑا منتقم مزاج ہوتا ہے۔ حضور نے برہان الدین کو جتنی عبرت ناک سزا دی تھی، اب اگر وہ رہا ہو گیا اور یہیں کہیں زندہ موجود رہے گا تو اس سے حضور کو ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑے گا۔ حضورِ والا بزرگوں کے اس قول سے تو واقف ہی ہوں گے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ دوست زیادہ سے زیادہ بناؤ اور دشمن کم سے کم۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ اپنے دشمن کو یا تو دوست بنا لو یا پھر اسے اپنی راہ سے بالکل ہی ہٹا دو۔ کیونکہ ستایا ہوا انسان زخمی سانپ کی طرح ہوتا ہے، جو موقع پاتے ہی ڈس لیتا ہے۔ برہان الدین بھی ناقابلِ اعتبار ہے اور اس سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

بادشاہ کی سمجھ میں بات آ گئی، بولا۔ ''بہرحال تیرا مشورہ سر آنکھوں پر۔ اب برہان الدین کو کوئی ایسا منصب نہیں دیا جائے گا جو اس کی بدنامی کا سبب بن جائے۔ اب وہ نہ تو حرم سرا میں داخل ہو سکے گا اور نہ ہی آہو خانے میں۔''

اعتماد خان نے مایوسی سے کہا۔ ''بہرحال حضورِ والا! یہ اچھا نہیں ہوا۔''

بادشاہ نے ناراضی سے کہا۔ ''بال کی کھال نہ نکال اور اندیشہ ہائے دور دراز سے خود کو محفوظ رکھ۔''

اعتماد خان پاسِ ادب سے خاموش ہو گیا۔ ورنہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شاہی اطبا کی سرتوڑ کوششوں نے برہان الدین کے تن مردہ میں جان ڈال دی اور وہ صحت یاب ہو گیا۔ بادشاہ اسے دیکھنے گیا اور صحت یابی کی مبارکباد دی۔ برہان الدین اتنا شکرگزار تھا کہ بادشاہ کو دیکھتے ہی اس کے قدموں میں گر گیا اور رونے لگا۔

کئی دن بعد بادشاہ نے برہان الدین کو دربار میں طلب کیا۔ امرا اور مصاحبین نے برہان الدین کو مبارک باد دی اور بادشاہ کی شان میں قصیدہ گوئی کی لیکن اعتماد خان اب بھی اداس تھا۔

بادشاہ نے دربار میں اعلان کیا۔ ''اب چونکہ برہان الدین کو معافی دی جا چکی ہے اس لیے میں اسے متوسلینِ دربار میں دوبارہ شامل کر لینا چاہتا ہوں۔''

برہان الدین نے بادشاہ کو فرشی سلام کیا۔

بادشاہ نے مزید کہا۔ ''برہان الدین کی صحت یابی کے بعد اب میں اس کو بیس شیر کش سپاہیوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کرتا ہوں۔ آج سے یہ نہ تو حرم سرا کی طرف جائے گا اور نہ ہی آہو خانے کی طرف سے گزرے گا۔''

حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اعتماد خان خاموش رہا۔ آخر برہان الدین برداشت نہ کر سکا، اس نے کہا۔ ''بھائی اعتماد خان! تیرے دل میں میرے خلاف حسد و کینہ کیوں ہے آخر؟''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''یہ تیری خام خیالی ہے ورنہ میں کسی کا بھی دشمن نہیں ہوں۔''

برہان الدین نے دھمکی دی۔ ''اعتماد خان! یہ یاد رکھنا کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں، سدا دن کسی کے بھی یکساں نہیں رہتے۔ میں بھی انسان ہوں اور کبھی بھی کسی کے نفع و نقصان کا ذمے دار بن سکتا ہوں۔''

اعتماد خان نے جواب دیا۔ ''میں اپنے رب کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔''

برہان الدین نے کہا۔ ''جس رب سے تو ڈرتا ہے وہی مجھے تیرے خلاف کوئی بھی حکم دے سکتا ہے اور یہ خدا ہی کی مہربانی تھی جو میں تم سب کے سامنے موجود باتیں کر رہا ہوں۔ ورنہ میں مر بھی جاتا تب بھی رہائی نصیب نہ ہوتی۔''

بادشاہ کی نوازشیں بحال ہو چکی تھیں۔ برہان الدین کے دل و دماغ سے بےعزتی کا خیال ابھی تک نہیں نکلا تھا۔

برہان الدین چاندنی، دلربا، عریشہ اور سلیمہ سے ملنا چاہتا تھا

لیکن اب ملاقات بہت دشوار تھی کیونکہ یہ سب جہاں تھیں، وہاں تک رسائی ناممکن تھی۔ پھر بھی اس نے عریشہ سے رابطہ قائم کیا اور ایک بڑی بی کے ذریعے عریشہ کو یہ پیغام بھیجا کہ مت گھبرانا، میں رہا ہو چکا ہوں اور اپنے مخالفین سے چن چن کر بدلے لوں گا۔

جواب میں عریشہ نے کہلایا۔ ''امیر برہان! ایسی باتیں نہ کر کیونکہ پچھلے دنوں ایک بدترین عذاب سے گزر چکا ہے۔''

بادشاہ شکار کھیلنے جا رہا تھا، امرا اور مصاحبین تیاریوں میں لگ گئے۔ برہان الدین بھی اپنے بیس شیر کشوں کے ساتھ شکارگاہ کے لیے تیار ہو گیا۔

شکارگاہ میں برہان الدین، دولت خان اور بیس شیر کش جوانوں نے غیر معمولی شجاعت دکھائی۔ بادشاہ ان سے بہت خوش ہوا۔ ابھی شکار جاری تھا کہ برہان الدین بادشاہ کو چھوڑ کر حرم کے خیمے کے در پر پہنچ گیا۔ اس نے رشوت دے کر عریشہ کو اپنی آمد سے مطلع کیا اور ملاقات کی اور وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ برہان الدین تو سچ مچ اپنی جان کا دشمن ہے۔

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''عریشہ! تم لوگوں نے بادشاہ سے میری سفارش کر کے جاں بخشی کرادی تھی۔ اس وقت میں اس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔''

لیکن عریشہ جا چکی تھی۔ عریشہ کے بعد چاندنی آ گئی اور اس کو متنبہ کیا۔ ''امیر برہان! اپنی نہیں تو ہماری ہی عزت و آبرو کا خیال کر اور اسی وقت واپس چلا جا۔''

برہان الدین نے جواب دیا۔ ''چاندنی! میں موت کے منہ سے نکل چکا ہوں، اس لیے موت کا ڈر نکل گیا اور جب میں موت ہی سے نہیں ڈرتا تو بادشاہ سے کیا ڈروں گا۔'' اس کے بعد چاندنی سے درخواست کی۔ ''چاندنی! اگر اس سفر میں سلیمہ بھی موجود ہے تو خدا کے لیے اس سے میری ملاقات کرا دے۔''

چاندنی نے کہا۔ ''سلیمہ موجود تو ہے لیکن تجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اب وہ بادشاہ کی منظورِ نظر ہے اور وہ تیرے سامنے نہیں آسکتی۔''

برہان نے خوشامد کی۔ ''اچھا، ایک نظر اس کا دیدار ہی کرا دے۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''ناممکن۔ بالکل ناممکن۔''

برہان نے کہا۔ ''چاندنی! تو ابھی تک مجھے نہیں سمجھی۔ میں ایک جنونی انسان ہوں۔ میں سلیمہ کی خاطر حرم سرا میں گھس سکتا ہوں۔''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''اگر ایسی حماقت کرے گا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

برہان نے کہا۔ ''پروا نہیں۔''

لیکن اسی وقت اعتماد خان آ گیا۔ چاندنی چلی گئی، اعتماد خان نے پوچھا۔ ''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

برہان نے گھور کر اعتماد خان کی طرف دیکھا اور جواب دیے بغیر واپس جانے لگا۔

اعتماد خان نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''برہان الدین! میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔''

اعتماد خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ برہان کو حراست میں لے لیں اور برہان سے کہا۔ ''تیرے پاس جواب ہو یا نہ ہو، لیکن میرے پاس تیری حرکتوں کا جواب ہے۔ میں تجھے گرفتار کرتا ہوں۔''

برہان نے تلوار کھینچ لی۔ ''اعتماد خان! تو مجھ سے حسد کرتا ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ تو ہی وہ شخص ہے جس نے دھوکے سے مجھے گرفتار کرایا تھا مگر آج میں مر جاؤں گا اور گرفتار نہیں کیا جا سکوں گا۔''

اعتماد خان نے کہا۔ ''برہان الدین! مزاحمت نہ کر، ورنہ تجھے پچھتانا پڑے گا۔''

برہان نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہی کہتا ہوں کہ میرا راستہ نہ روک ورنہ پچھتائے گا۔''

اعتماد خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ برہان کو چلا جانے دیا جائے۔ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گئے اور برہان نے اپنی راہ لی۔

اعتماد خان نے بادشاہ سے شکایت کر دی اور کہا۔ ''جہاں پناہ! مجھے برہان الدین کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ وہ باغی ہو رہا ہے، آج اس نے میری عدم موجودگی میں حرم سرا کی خواتین سے ملاقات کی کوشش کی اور جب میں نے منع کیا تو وہ تلوار کھینچ کر میرے مقابلے پر آ گیا۔''

بادشاہ نے اسی وقت برہان الدین کو طلب کر لیا۔ وہ بادشاہ کے پاس اعتماد خان کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا، تیکھے انداز میں اعتماد خان سے کہا۔ ''اعتماد خان! چغلی کھانے میں تو عورتوں کی طرح ہے، کر دی شکایت؟''

بادشاہ نے گرج کر پوچھا۔ ''او نمک حرام! مجھے یہ بتا کہ تو حرم کی خواتین سے کیوں ملنے گیا تھا؟''

برہان نے جواب دیا۔ ''میں ان معزز خواتین کا

شکریہ ادا کرنے گیا تھا جنہوں نے حضور سے میری سفارش کی تھی۔''

بادشاہ اور زیادہ گرم ہوگیا۔ ''او ذلیل انسان! تو میری اجازت کے بغیر میری حرم سے ملنے کیوں گیا تھا؟''

برہان الدین نے ایک بار پھر اعتماد خان کو دیکھا اور کہا۔ ''حضور والا! اگر میں نے کوئی غلطی کی ہے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن اعتماد خان کو بھی سمجھا دیں کہ یہ اپنی اوقات میں رہے اور حد سے نہ بڑھے۔''

بادشاہ نے اور زیادہ درشت لہجے میں کہا۔ ''برہان الدین! میں محسوس کر رہا ہوں کہ شامت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے اور تو میرے ہاتھ سے سخت اور عبرتناک نقصان اٹھائے گا۔''

برہان منہ بنا کر چپ ہوگیا لیکن بادشاہ اس کو دیر تک برا بھلا کہتا رہا۔

برہان کے واپس چلے جانے کے بعد اعتماد خان نے کہا۔ ''بندہ پرور! سزا بھگتنے کے بعد برہان الدین میں سرکشی آگئی ہے اور میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ جب کسی کو کوئی سخت سزا دی جائے تو وہ اتنی سخت اور قطعی ہو کہ خطاکار کا کام تمام ہوجائے لیکن سخت اور ذلیل ترین سزا دے کر معاف کر دینا اور مجرم کو کوئی ذمے دار عہدہ دے دینا اس ناچیز کی رائے میں ایک خطرناک فعل ہے اور اس کے ردِعمل سے ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہیے۔''

بادشاہ ہنس دیا۔ ''اعتماد خان! میں جانتا ہوں کہ تو میرا بے حد وفادار مگر شکی امیر ہے۔ میں تجھے مشورہ دوں گا کہ کہیں کہیں نرمی اور میانہ روی سے بھی کام لینا چاہیے۔''

اعتماد خان نے عرض کیا۔ ''میانہ روی ہر جگہ اور ہر موقع کے لیے مناسب نہیں۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس سے بہت نقصان پہنچ جاتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں برہان الدین پر مجھے اعتبار نہیں آرہا ہے۔ یہ ایک خطرناک انسان ہے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''اگر برہان الدین خطرناک انسان ہے تو میں کل تک اس کے ڈنک توڑ دوں گا۔''

اعتماد خان نے عرض کیا۔ ''حضور کچھ بھی کریں مگر اس سے ہوشیار ضرور رہیں۔''

شکار کھیل کر بادشاہ احمد آباد واپس پہنچا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ محل میں داخل ہوتے ہی حمام میں چلا گیا۔ وہ دیر تک حمام میں رہا، باہر نکلا تو اس کے بڑے بڑے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس وقت بادشاہ بہت خوش تھا۔ بادشاہ کے بڑے کمرے سے ملحق کمرے میں رقاصائیں اور گانے والیاں سازندوں کے ساتھ بادشاہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے سامنے شراب اور آلاتِ شراب نہایت سلیقے سے سجا دیے گئے تھے کیونکہ بادشاہ کا دستور تھا کہ جب وہ شکار سے واپس آتا تو جی بھر کے مے نوشی کرتا تھا اور اس کے بعد محفلِ طرب کے مزے لیتا تھا۔ کمرے کے باہر دولت خان اور بیس شیر کش جوان نہایت مستعدی سے پہرے داری کر رہے تھے۔

بادشاہ نے اپنے جسم کو چادر میں چھپا رکھا تھا۔ بالوں سے پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ بادشاہ نے شراب نوشی شروع کر دی اور دولت خان کو حکم دیا کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا جائے۔

بادشاہ دیر تک شراب نوشی کرتا رہا یہاں تک کہ نشے سے ادھر ادھر گرنے جھکنے لگا۔ دولت خان نے بادشاہ کو مطلع کیا... ''بالوں کا پانی شراب میں شامل ہو رہا ہے اور جسم کی چادر بھی بھیگ رہی ہے اگر حضور اجازت دیں تو بالوں کو خشک کر دیا جائے۔''

بادشاہ نے اجازت دے دی۔

دولت خان نے مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''حضور اس پر اس طرح لیٹ جائیں کہ بال سرہانے لٹک جائیں تاکہ میں انہیں کپڑے سے خشک کر دوں۔''

بادشاہ نشے میں دھت مسہری پر دراز ہوگیا۔ دولت خان نے نہایت احتیاط اور سلیقے سے بادشاہ کے بالوں کو سرہانے لٹکا دیا اور انہیں کپڑے سے خشک کرنے لگا، اس نے دو تین مرتبہ بالوں کو کھینچا اور ہلکے ہلکے جھٹکے بھی دیے لیکن بادشاہ نشے میں بے حال اور بے خبر تھا، اس پر دولت خان کی اس حرکت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

دولت خان نے بادشاہ کے بالوں کو مسہری کی پٹی سے کس کر باندھ دیا۔ بادشاہ نے نشے میں پوچھا۔ ''دولت خان! تو یہ کیا کر رہا ہے؟''

دولت خان نے جواب دیا۔ ''حضور! بالوں کو خشک کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بال ہوا میں نہ اڑیں، اس لیے میں نے انہیں باندھ دیا ہے۔''

بادشاہ مسکرایا۔ بڑی ترنگ میں بولا۔ ''جو جی میں آئے کر، پانی کے قطروں نے شراب کا مزہ خراب کر دیا ہے۔''

دولت خان پھرتی سے باہر نکلا اور اپنے ماموں برہان الدین کو اندر لے آیا۔ برہان الدین نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور دولت خان سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''تلوار...... کوئی تلوار ہے یہاں؟''

دولت خان نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کی اپنی تلوار جو موجود ہے۔“

بادشاہ نے نشے میں سرگوشیاں اس طرح سنیں گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے دولت خان کو آواز دی۔ ”دولت خان! تو کہاں چلا گیا؟“

دولت خان نے بادشاہ کی تلوار سنبھالی اور برہان الدین بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے بادشاہ کو نہایت حقارت سے مخاطب کیا۔ ”او ذلیل بادشاہ! تیرا یوم حساب آچکا ہے، آنکھیں کھول اور دیکھ کہ تیرے سامنے تیری موت کس آن بان سے کھڑی ہے۔“

بادشاہ نے دھندلی دھندلی نظروں سے برہان کو اپنے سامنے دیکھا تو چکرا گیا، پوچھا۔ ”یہ دولت خان کہاں مر گیا؟“

دولت خان نے تلوار ہوا میں لہرائی اور کہا۔ ”میں بھی موجود ہوں بادشاہ سلامت! اور اللہ نے ماموں کے انتقام کا فرض مجھے سونپا ہے۔“

بادشاہ کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بندھے ہوئے بالوں نے ناکام کر دیا۔

برہان نے مسکرا کر شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”چپ چاپ پڑا رہ، دیوار میں زندہ چنوا دینے کے مقابلے میں ایک ہی وار میں کام تمام کر دینا نسبتاً شریفانہ عمل ہے اور اس طرح میں تجھ سے زیادہ شریف ہوں۔“

بادشاہ نے چیخ کر کہا۔ ”آہ اعتماد خان! تیرا خیال صحیح نکلا۔ میں نے برہان کو معاف کر کے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی تھی۔“ پھر برہان سے کہا۔ ”لیکن برہان! تو بھی نمک حرامی کی سزا پا کر رہے گا۔“

برہان نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کوئی پروا نہیں لیکن اس وقت تو میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا انتقام لے لیا۔“

بادشاہ پھر چیخا۔ ”مجھے تیری پارسائی اور تقویٰ نے دھوکا دیا۔“

برہان نے سختی سے کہا۔ ”بدبخت انسان! شور نہ کر۔ اگر تو اس لیے شور کر رہا ہے کہ باہر موجود میں شیر کش تیری آواز سن کر تیری مدد کو آجائیں گے تو یہ تیرا خیالِ خام ہے کیونکہ میں نے انہیں راضی کر لیا ہے، اب وہ میری بادشاہت میں عمدہ عہدے حاصل کر سکیں گے۔“

بادشاہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”اگر تو مجھے چھوڑ دے تو میں تجھے معاف کر دوں گا اور کوئی اس سے بھی بڑا منصب عطا کروں گا۔“

برہان نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ میں تیری طرح احمق نہیں ہوں۔ تو نے مجھے ایک بار معاف کر دیا تھا لیکن میں تجھے معاف نہیں کر رہا اور اس کا انتقام لے رہا ہوں۔ پھر میں کس طرح یہ یقین کر لوں کہ تو مجھے معاف کر دے گا۔ یہ بات انسانی سرشت کے خلاف ہے۔“

بادشاہ نے دونوں ہاتھ گلے پر رکھ لیے اور دولت خان سے کہا۔ ”دولت خان! تو ہی کچھ خیال کر۔“

دولت خان نے اپنے ماموں برہان الدین کی طرف دیکھا۔ ماموں نے گردن کے اشارے سے کارروائی کرنے کا حکم دے دیا۔ دولت خان کی ایک ہی ضرب نے گردن اور دونوں ہاتھوں کو جسم سے الگ کر دیا۔ بادشاہ کا لاشہ پھڑکنے لگا اور پھڑکتے پھڑکتے مسہری کے نیچے آگیا۔

دولت خان نے پوچھا۔ ”ماموں! اب کیا ہوگا؟“

برہان نے جواب دیا۔ ”ابھی اعتماد خان کا کام تمام کرنا باقی ہے اور اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے امرا کا بھی۔“

دولت خان نے خون آلود تلوار کو بادشاہ کے جسم پر لپٹی ہوئی چادر سے پونچھ کر صاف کیا۔

برہان کمرے سے نکلا اور دس شیر کش سپاہیوں کو بلا کر اندر لے گیا اور بادشاہ کے بے سر لاشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس ناقدر شناس کی لاش ہے جس کو مردم شناسی نہیں آتی تھی۔ اب تم لوگ یہیں موجود رہو گے اور جو جو امرا بادشاہ سے ملاقات کرنے آئیں گے تم ان کا کام تمام کرتے جاؤ گے۔ اس خدمت کا تمہیں میں جو صلہ دوں گا، بادشاہ نے زندگی بھر کی خدمات کے عوض بھی وہ نہیں دیا ہوگا۔“

اس کے بعد برہان الدین باہر نکلا اور گانے والیوں کو حکم دیا۔ ”بادشاہ کا حکم ہے گانے کا آغاز کیا جائے اور اس میں پورے جوش و خروش سے کام لیا جائے۔“

سازندوں نے ساز چھیڑے اور گانے والیوں کی ایک جماعت نے آوازیں ملا کر گانا شروع کر دیا۔

دوسری طرف برہان، نامی گرامی امرا کو بادشاہ کی طرف سے بلاتا اور قتل کرتا رہا۔ ایک قاصد اعتماد خان کے پاس بھی پہنچ گیا اور بادشاہ کی طرف سے حکم دیا... ”اعتماد خان فوراً حاضر ہو جائے کیونکہ بعض اہم اور نازک معاملوں پر بات چیت کرنا ہے۔“

اعتماد خان نے پوچھا۔ ”بادشاہ سلامت اس وقت کیا کر رہے ہیں؟“

قاصد نے جواب دیا۔ ”رقص و موسیقی سے لطف

اندوز ہو رہے ہیں؟''

اعتماد خان کو شبہ گزرا، بولا۔ ''خوب! ایک طرف تو بادشاہ سلامت کو بعض اہم اور نازک معاملات پر بات کرنا ہے اور دوسری طرف اطمینان کا یہ عالم ہے کہ رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔''

قاصد نے زور دیا۔ ''آپ کو اسی وقت چلنا ہے ورنہ بادشاہ کا عتاب نازل ہوگا۔''

اعتماد خان نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ ''تو بادشاہ سے جا کر کہہ دے کہ اعتماد خان رات کو نہیں آسکتا صبح آجائے گا۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دوسرا قاصد بھی پہنچ گیا اور اعتماد خان کو دھمکی دی۔ ''امیر اعتماد خان! آپ کو بادشاہ نے اسی وقت یاد فرمایا ہے اور یہ حکم دے دیا ہے کہ اگر اعتماد خان راضی خوشی نہ آئیں تو انہیں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔''

اعتماد خان ہنس دیا۔ ''اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا کیونکہ میں بادشاہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بلانے والوں کو یہ معمولی سی بات نہیں معلوم کہ بادشاہ اپنے خاص امرا کو رات میں نہیں بلاتا اور جب بھی ضرورت پڑتی ہے تو رات کی تاریکی میں خود آجاتا ہے۔''

اعتماد خان کے انکار نے برہان الدین اور اس کے بھانجے دولت خان کو بہت مایوس کر دیا۔ برہان نے ایک آدمی آہو خانے کی طرف روانہ کر دیا اور سلیمہ کو طلب کیا۔ لیکن اتنی دیر میں اعتماد خان نے امرا سے ہنگامی ملاقاتیں کیں اور انہیں موہوم خطرے سے آگاہ کیا۔ ان امرا نے فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور آہو خانے اور حرم سرا کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس دوران برہان الدین نے دربار کے ایک نامی گرامی امیر عبدالصمد شیرازی کو بادشاہ کی طرف سے خلعت بھیجی اور یہ پیغام دیا کہ میرے پاس فوراً آجاؤ کیونکہ میں تمہیں منصب وزارت پر فائز کرنا چاہتا ہوں۔

عبدالصمد شیرازی نے جواب دیا۔ ''میں یہ خلعت اس وقت تک قبول نہیں کروں گا۔ جب تک کہ بادشاہ مجھ سے خود مخاطب نہ ہو۔''

قاصد نے کہا۔ ''تب پھر آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیے اور بادشاہ کا حکم اپنے کانوں سے سن لیجیے۔''

عبدالصمد شیرازی خلعت لے کر قاصد کے ساتھ بادشاہ کے پاس چل دیا۔

شاہی محل کے اس حصے میں، جس سے ملحق کمرے میں بادشاہ کی لاش پڑی تھی، محفل طرب شباب پر تھی۔ عبدالصمد شیرازی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، دو طاقتور نوجوانوں نے امیر عبدالصمد کو زمین پر گرا دیا۔ عبدالصمد نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''دوستو! یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟''

برہان الدین نے عبدالصمد شیرازی کو اپنے پاس بلایا اور بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔ ''شیرازی امیر! کیا تو بادشاہ سے ملنا چاہتا ہے؟ جواب میں وقت نہ ضائع کر نفی یا اثبات میں سر ہلا کر جواب دے سکتا ہے۔''

شیرازی امیر نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کی زبان سے اس کی پیشکش سننا چاہتا ہوں۔''

برہان الدین نے شیرازی امیر کو بادشاہ کی لاش کے پاس اس طرح کھڑا کر دیا کہ اس کے چاروں طرف شیر کش بہادر تلواریں لیے کھڑے تھے۔ اس کے بعد برہان الدین نے ان امرا کی لاشیں دکھائیں جنہیں دھوکے سے بلوا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد عبدالصمد شیرازی سے کہا۔ ''میں چاہوں تو تجھے بھی قتل کرادوں لیکن میں تجھے اپنا وزیر بنانا چاہتا ہوں، بول، تیری کیا رائے ہے؟''

عبدالصمد شیرازی نے کہا۔ ''برہان الدین! کیا تو بتا سکتا ہے کہ یہ ذلیل اور نمک حرامی کا کارنامہ کس نے انجام دیا ہے؟''

دولت خان نے تلوار کی نوک شیرازی امیر کے پہلو میں چبھو دی۔ ''شیرازی امیر! اپنی اوقات میں رہ، اور کسی کو ذلیل یا نمک حرام مت کہہ، ورنہ ایک ہی وار میں بادشاہ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''

عبدالصمد شیرازی نے جواب دیا۔ ''میں ستر سالہ بوڑھا، موت سے نہیں ڈرتا اور تجھ جیسے غاصب اور نمک حرام کی وزارت قبول کر کے نمک حرامی نہیں کر سکتا۔''

دولت خان نے تلوار کی نوک پیٹ میں اتار دی اور جب وہ گر کر تڑپنے لگا تو برہان الدین نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

☆☆☆

برہان الدین نے بڑی کوشش کی کہ سلیمہ کو حاصل کرلے لیکن ناکام رہا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے مخالف اور صف آرا ہونے والے امرا کا صفایا کر دیا جائے اس کے بعد وہ گجرات کا حکمراں ہو جائے گا اور ہر چیز اس کے اختیار اور تصرف میں ہوگی۔

دوسرے دن صبح اعتماد خان اور دوسرے امرا متحد ہو کر برہان کے مقابلے پر آگئے۔ برہان الدین نے بھی سر

پر چتر شاہی کا سایہ کیا اور شاہی محل کی فوج لے کر وفادار امرا کے مقابل پہنچ گیا۔ برہان الدین کہہ رہا تھا۔ ''بہادرو! ان نمک حراموں کو ایسی سزا دینا ہے کہ وہ دوبارہ مقابلے پر آنے کی ہمت بھی نہ کر سکیں۔ آگے بڑھو اور انہیں روند کر ٹھکانے لگا دو۔''

مقابلے پر اعتماد خان موجود تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''او نمک حرام انسان! میں نے تجھے صحیح پہچانا تھا۔ بادشاہ بھولا تھا، تیرا شکار ہو گیا لیکن میں تجھے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے زندہ ہوں۔''

اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ برہان موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس عالم میں اس نے اپنے عقب میں عریشہ، دلربا، چاندنی اور سلیمہ کی سواریاں اپنی طرف آتے دیکھیں۔ سلیمہ نے دور ہی سے مخاطب کیا۔ ''امیر برہان! میں آ گئی ہوں اور زندگی بھر تیرے قدموں میں رہوں گی۔''

چاندنی نے کہا۔ ''امیر برہان! جنگ بند کر اور مجھے اپنے ساتھ لے کر کہیں بھاگ چل۔ میں رزم آرائیوں سے تنگ آ چکی ہوں۔''

دلربا نے کہا۔ ''اگر تم دونوں چلے گئے تو میں کہاں جاؤں گی؟ اپنے ساتھ مجھے بھی لے چلو۔''

عریشہ نے درخواست کی۔ ''امیر برہان! ذرا سوچ تو۔ تم سے سب سے زیادہ قریب میں رہی ہوں، اس لیے پہلا حق میرا ہے، بعد میں کسی اور کا۔''

برہان ان حسن کے پیکروں کو اپنے قریب دیکھ کر سب کچھ بھول گیا۔ وہ سلیمہ کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ لیکن اب ان چاروں کو اپنے قریب دیکھ کر برہان سرشار ہو گیا۔ اس نے ان چاروں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں چتر شاہی کے سائے میں لے لیا۔ اس دوران اعتماد خان اور دوسرے امرا کی وفادار فوجوں نے برہان الدین پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ برہان الدین گھبرا گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا لیکن خواتین نے اسے روک لیا اور اسی کشمکش میں مقتول بادشاہ کا ایک اور وفادار امیر شیروان خان آگے بڑھا اور برہان الدین کو نیچے گرا لیا۔ برہان الدین کا گرنا تھا کہ اس کی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیروان خان اور اعتماد خان، برہان الدین کے سر پر پہنچ گئے۔ اعتماد خان نے للکارا۔

''او نمک حرام! اب تو کہاں جائے گا، بچ کر۔''

امیر شیروان خان زمین پر ڈھیر برہان پر جھک گیا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ امیر برہان نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا۔ ''شیروان خان، تو اس منہ پر تھوک رہا ہے جس سے میں ذکرِ الٰہی کرتا رہا ہوں۔''

امیر شیروان نے جواب دیا۔ ''او بدبخت جھوٹے انسان! یہ قدرت کے پیکر خاص کر اس لیے تیرے پاس بھیجے گئے تھے کہ تو ان کے جلووں میں گم ہو جا اور ہم اپنی کارروائی اطمینان سے اختتام کو پہنچا دیں۔''

برہان نے آخری بار سلیمہ کو دیکھنا چاہا۔ وہ اس کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شیروان خان کا نیزہ اٹھا اور برہان کے سینے میں اتر گیا۔ ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔ دوسری طرف اعتماد خان نے دولت کا کام تمام کر دیا۔ بیس شیر کش جیالے بھی مارے گئے۔ برہان کی حمایتی سپاہ نے راہِ فرار اختیار کی۔

برہان زمین پر چت پڑا سسکیاں لے رہا تھا۔ شیروان خان نے اس کے پاؤں میں رسی باندھ دی اور اعتماد خان نے نہایت ادب و احترام سے چاندنی، دلربا، عریشہ اور سلیمہ سے درخواست کی کہ اس کو کھینچ کر شاہی محل کی سیر کرا دیں۔ بادشاہ کی حرم کو نہ جانے کیوں اس وقت برہان سے ہمدردی ہو گئی اور انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اعتماد خان اور شیروان خان نے برہان کا سسکتا ہوا جسم چند سپاہیوں کے حوالے کر دیا اور یہ حکم دیا کہ اسے بازاروں اور گلیوں میں کھینچا جائے تاکہ مقتول محمود شاہ ثانی کی رعایا اپنے بادشاہ کے غدار اور نمک حرام کا حشر دیکھ کر خوش ہو سکے۔

جب برہان کے نیم جان لاشے کو کھردری راہوں پر کھینچا گیا تو حرم کی کئی خواتین رونے لگیں۔ اگر برہان قدرت کے ان پیکروں کی آنکھوں میں یہ آنسو دیکھ لیتا تو اپنی تمام اذیتوں اور دکھوں کے باوجود خوشی محسوس کرتا کہ چند حسین اس کے حشر پر آنسو بہا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک نزاعی بات تھی کیونکہ اعتماد خان اور اس جیسے دوسرے امرا نے ان خواتین کو روتے دیکھا تو یہ رائے قائم کی کہ وہ مقتول بادشاہ کے غم میں سوگوار اور آنسو بہانے پر مجبور ہیں۔

کہانی کے تاریخی ماخذ

بساتین السلاطین	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	بدون تاریخ	فرمانروایان اسلام	مآثر الامرا
مرزا ابراہیم زبیری	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	طبا طبائی	لین پول	صمصام الدولہ شاہنواز خان

اصل شو بزنس

کاشف زبیر

کاروبار کوئی بھی ہو اس کی کامیابی میں نمود و نمائش کا پچاس فیصد ہاتھ ضرور ہوتا ہے مگر... یہ تو مکمل ایسا بزنس تھا جس کے سو فیصد شو کرنے میں ہی کامیابی تھی... یہ خونیں کھیل دیکھنے والوں میں جوش اور جنون کو بڑھا رہا تھا۔ عجیب انسان تھے وہ جن کی پیاس خون سے بجھتی اور فطرت کو رقصِ اجل سے تسکین ملتی تھی... کھیل کوئی سا بھی ہو... کسی کی ہار، کسی کی جیت بن جاتی ہے۔ جبکہ وہ یہ کھیل نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ کے لیے ختم کردینا چاہتی تھی اور بس اسی جنون میں اس نے ایسا کارنامہ کردکھایا جس کی توقع کسی کو نہ تھی۔

انسانیت سوز تماشے کرنے والی وحشی قوم کا عبرتناک احوال

بین جرکن کی آنکھ کھلی تو کچن سے اس کی بیوی کی آواز آرہی تھی... جو اپنے بیٹے سے بات کررہی تھی اور وہ غوں غاں کرکے جواب دے رہا تھا۔ بین مسکرانے لگا۔ جینی کو اپنے چار مہینے کے بیٹے رومین سے بہت محبت تھی لیکن بین بیٹے کے لیے پاگل تھا۔ اس سے پہلے جینی تین بار امید سے ہوئی اور ہر بار معاملہ قبل از وقت ختم ہوگیا اور اس علاج معالجے نے بین کو خاصا مقروض کردیا۔ ابھی وہ یہ قرض اتار رہا تھا کہ جینی پھر امید سے ہوگئی اور ڈاکٹر نے کیس کو پیچیدہ

قرار دیتے ہوئے جینی کی خصوصی دیکھ بھال اور علاج کی تجویز پیش کی۔ بدقسمتی سے بین کی سوشل سیکیورٹی اور جاب ان اخراجات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

سوشل سیکیورٹی کی جانب سے اخراجات کا صرف بیس فیصد ادا کیا گیا تھا۔ بین جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا اس کے مالک جارج نے کسی قسم کی انشورنس ادائیگی سے صاف انکار کیا ہوا تھا۔ مجبوراً بین کو بینک سے قرض لینا پڑا۔ رومین کے دنیا میں آتے آتے یہ قرض بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار ڈالرز تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اب تک بہ مشکل بیس ہزار ڈالرز واپس کرسکا تھا اور ابھی اسے مزید ایک لاکھ ڈالرز ادا کرنے تھے۔ دو ہفتے پہلے ہی ایک بینک آفیسر نے اسے کال کر کے خبردار کیا تھا کہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔

بین جانتا تھا کہ اگر معاملہ ادائیگی نہ کرنے سے کورٹ تک گیا تو اس کی سوشل سیکیورٹی منسوخ ہوسکتی تھی اور اس صورت میں وہ کہیں بھی اچھی ملازمت حاصل کرنے کے قابل نہ رہتا۔ یہاں اسے ایک ہفتے کے سات سو نوے ڈالرز ملتے تھے۔ سوشل سیکیورٹی منسوخ ہونے کی صورت میں اس سے آدھی تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔

بین نے سات سال پہلے شادی کے کچھ عرصے بعد قسطوں پر یہ گھر لیا تھا اور ابھی وہ اس کی آدھی اقساط ہی ادا کرسکا تھا۔ جاب نہ ہونے کی صورت میں یا آمدنی کم ہونے پر وہ مکان کی قسط ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے بین کی مسکراہٹ ماند پڑ گئی تھی۔ وہ تیار ہوکر نیچے آیا تو جینی ناشتا بنا چکی تھی۔ رومین اپنی کرسی پر بندھا ہوا سامنے رکھے کھلونے سے کھیل رہا تھا، اس کی کوشش تھی کہ اسے کسی طرح نیچے گرادے۔ باپ کو دیکھ کر اس نے قلقاری ماری۔ بین نے اسے کرسی سے آزاد کر کے گود میں لے لیا۔

''بینک کی طرف سے کوئی نوٹس تو نہیں آیا۔'' جینی نے پوچھا۔ وہ بھی اس بارے میں فکرمند تھی۔ اس نے بین سے کہا کہ وہ بھی ملازمت کر لیتی ہے مگر بین نے منع کر دیا۔ اسے گوارا نہیں تھا کہ رومین چند گھنٹوں کے لیے بھی ماں باپ سے الگ ہو۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اب اسے جینی کو اجازت دینی پڑے گی یہی ایک صورت تھی کہ وہ اس قرض سے چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ بین نے سر ہلایا۔

''ابھی تک تو نہیں آیا لیکن جلد امید ہے۔''

جینی ہراساں ہوگئی۔ ''تب کیا ہوگا؟''

''تم فکر مت کرو۔'' بین نے کافی کا مگ رکھ کر اسے پیار کیا۔

وہ ورکشاپ پہنچا تو جارج کا موڈ خراب تھا کیونکہ کل بین چھ بجتے ہی کام ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے گاڑی ابھی تک نامکمل تھی اور اس نے گاہک سے آج شام کا وعدہ کیا ہوا تھا اس نے بین سے کہا۔ ''اگر تم کل آدھا گھنٹا اور کام کر لیتے تو آج میں گاڑی تیار کر چکا ہوتا۔''

''اگر تم مجھے ایک گھنٹے کا اوور ٹائم دے دیتے تو میں رک جاتا۔''

''کام آدھے گھنٹے کا ہے تو ایک گھنٹے کے اوور ٹائم کا مطلب سمجھتے ہو؟''

''ہاں تمہیں بارہ ڈالرز اضافی ادا کرنے پڑتے لیکن آج شام تک تم گاڑی گاہک کے حوالے کر سکتے تھے۔'' بین نے شانے اچکائے۔ ''یہ تم پر ہے کہ بارہ ڈالرز بچاؤ یا اپنی عزت۔''

''بکواس کرنے کے بجائے کام شروع کرو۔'' جارج غرایا۔ ''تم یہاں باتیں کرنے نہیں آئے ہو۔''

''بات تو تم کر رہے تھے۔'' بین نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ وہ انجن کا ماہر تھا۔ ورکشاپ میں آنے والی تمام گاڑیوں کے انجن وہی دیکھتا تھا اور یہ خاصا محنت طلب کام تھا۔ جارج اسے بارہ ڈالرز فی گھنٹا دیتا تھا، اس حساب سے اوور ٹائم چوبیس ڈالرز فی گھنٹا بنتا تھا۔ اس کا معاوضہ اس کی صلاحیت کے لحاظ سے کم تھا مگر جارج نے اسے اس وقت ملازمت دی تھی جب اسے کوئی ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا۔ چار گھنٹے بعد اسے ایک گھنٹے آرام اور لنچ کا وقفہ ملتا تھا۔ لنچ وہ گھر سے لاتا تھا۔ اب تو وہ بار بھی شاذونادر ہی جاتا تھا اس کی زندگی کا محور اس کی بیوی بچہ اور گھر تھا۔ لنچ کے بعد وہ واش روم سے باہر آیا تو جارج نے اسے آواز دی۔

''ہے بین! یہ کوریئر والا تمہارے لیے آیا ہے۔''

بینک کے مونوگرام والا لفافہ دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا، اس نے سائن کر کے لفافہ لیا اور اندر جانے لگا۔ جارج نے پوچھا۔ ''کیا بینک کی طرف سے نوٹس آیا ہے۔''

''ارے نہیں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''میں نے چیک سے ادائیگی کی تھی اس کی رسید ہوگی۔''

''واقعی؟'' جارج کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ وہ اسے نظرانداز کر کے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ لفافہ کھولا تو اس کا خدشہ حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ بینک نے اس کا کیس اسپیشل کورٹ بھیج دیا تھا۔ اب اسے وہاں جا کر وضاحت کرنی تھی کہ وہ کیوں قرض ادا نہیں کر رہا اور پھر وہاں سے جو فیصلہ ہوتا اس پر عمل درآمد ہوتا۔ بین اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی بھی

فیصلہ اس کے حق میں نہیں آئے گا۔ صرف ایک صورت تھی کہ وہ کہیں سے ایک لاکھ ڈالرز کا بندوبست کرلے اور بینک کا قرض اتار دے۔ دوسری صورت میں بہت زیادہ امکان تھا کہ اسے نادہندہ قرار دے دیا جائے گا اور اس کی سوشل سیکیورٹی منسوخ ہوجائے گی۔ اس نے بے دلی سے لنچ کیا اور پھر کام میں بھی اس کا دھیان اسی طرف رہا۔ اس سے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ اس پر اسے شام کو جارج سے پھٹکار سننے کو ملیں۔ جارج نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اب میں تمہیں کہوں گا کہ تم یہ کام کرو تو تم اوور ٹائم کی بات کرو گے۔''

''سوری مسٹر جارج۔'' بین نے خالی لہجے میں کہا۔ ''میں یہ ابھی کرتا ہوں۔''

وہ ادھورے رہ جانے والے کام نمٹانے لگا۔ اس چکر میں آٹھ بج گئے تھے پھر وہ تیار ہوکر نکل رہا تھا کہ جینی کی کال آگئی۔ ''تم کہاں ہو اب تک گھر کیوں نہیں آئے؟''

''میں بس نکل رہا ہوں۔ آج کام زیادہ تھا اس لیے دیر ہوگئی۔ تم فکر مت کرو۔''

مگر وہ ورکشاپ سے باہر آیا اور گھر جانے کے بجائے بس اسٹاپ کے راستے میں آنے والے ایک بار پر رک گیا۔ اس نے سوچا یہاں ایک جام پی لے پھر گھر جائے گا۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور وہ اپنی توجہ بانٹنا چاہتا تھا۔ اس حال میں گھر جاتا تو جینی اس کے چہرے سے بھانپ جاتی۔ بار کا ماحول خاموش اور پُرسکون تھا۔ اس نے بیئر کا آرڈر دیا اور ایک طرف ٹی وی پر آنے والا فٹ بال میچ دیکھنے لگا۔ بارٹینڈر نے بیئر کا گلاس اس کے سامنے رکھا تھا کہ اس کے برابر میں ایک شخص آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی تھی اور وہ خوش شکل آدمی تھا مگر اس کی آنکھوں میں الگ ہی تاثر تھا۔ اس نے بارٹینڈر کو وہسکی کا کہا تو اس کی آواز نے بین کو چونکا دیا... اس نے آدمی کی طرف دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ شاٹ تھا۔ اس کا اصل نام شارٹی تھا مگر وہ مخصوص حلقۂ احباب میں شاٹ مشہور تھا۔ بین خود ایک زمانے میں اس حلقے میں شامل تھا۔ اس کے یوں دیکھنے پر شاٹ نے اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔

''کیا ہے؟''

''شاٹ۔'' بین نے کہا تو وہ چونکا اور اس نے پہلی بار بین کو غور سے دیکھا۔

''بین۔'' اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر اچانک اس سے لپٹ گیا۔ ''میرے خدا تم تو بالکل بدل گئے ہو۔ یہ چشمہ اور تمہارے سر کے بال کہاں گئے۔''

''میں واقعی بدل گیا۔'' بین جبراً مسکرایا۔ ''تم بھی بدل گئے ہو۔''

شاٹ اسے ایک کونے میں میز پر لے آیا۔ ذرا دیر میں اس نے بین کے بارے میں سب جان لیا اور بولا۔ ''یعنی اب تم شریف آدمی بن گئے ہو۔''

''ہاں کیونکہ میں نے شادی کرلی ہے۔'' بین نے کہا۔ ''اب میرا بیٹا ہوگیا ہے۔''

''تمہیں پرانے دن یاد آتے ہوں گے۔'' شاٹ نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں امید تھی کہ بین اثبات میں جواب دے گا مگر اس نے انکار کیا۔

''ان دنوں میں یاد کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ تب ہم مجرم اور بدمعاش تھے۔''

''یہ بات تم کہہ سکتے ہو۔'' شاٹ کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ ''کیونکہ تم شریف ہوگئے ہو۔''

''تم کیا کررہے ہو؟''

''دو مہینے پہلے جیل سے آیا ہوں۔'' شاٹ نے مزے سے کہا۔ ''سات مہینے کی سزا ہوئی تھی۔''

''شاپ لفٹنگ؟''

''نہیں ایک شخص سے پرس چھینا تھا بدقسمتی سے اسی وقت وہاں پولیس کار آگئی اور میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ شکر ہے اس شخص پر تشدد نہیں کیا تھا ورنہ کم سے کم دو سال کے لیے جیل چلا جاتا۔''

بین آج سے دس سال پہلے ایسا ہی مجرم تھا۔ شاٹ اس کا سب سے قریبی ساتھی اور دوست تھا، باقی سب وارداتوں کے ساتھی ہوتے تھے مگر شاٹ اور اس کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا۔ وہ رہتے بھی ایک ہی جگہ تھے پھر ایک بڑی واردات کے بعد وہ سب تتر بتر ہوگئے۔ پولیس کے خوف سے شاٹ لاس اینجلس سے بھاگ کر میامی چلا گیا اور تین سال وہاں رہا۔ چار سال پہلے واپس آیا تو بین لاپتا تھا، شاٹ نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اب گاڑیوں کے انجن ٹھیک کر رہے ہو، میں تمہیں جرائم کرنے والوں میں تلاش کرتا رہا۔''

''تمہارے جانے کے بعد میری ملاقات جینی سے ہوئی اور پھر سب بدل گیا۔''

''اس نے تم سے جرائم چھڑوا دیے۔'' شاٹ کے لہجے میں حسد آگیا۔ ''ایک عورت کی خاطر تم نے اپنا پروفیشن

بدل دیا۔‘‘

’’اس نے کچھ نہیں کیا در حقیقت میں نے سب چھوڑ دیا۔ میں سکون کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا یوں سمجھ لو کہ میں جرائم کی راہ پر چلتے چلتے تھک گیا تھا۔‘‘

شاٹ ذرا مایوس ہوا تھا، اس نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ ’’لیکن ہم جو مل کر مزے کرتے تھے...... ساری رات بارز اور نائٹ کلبس میں گزارتے تھے۔‘‘

’’تھوڑا بہت یاد آتا ہے۔‘‘ بین نے گہری سانس لی۔ ’’لیکن میں نے کہا نا میں سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔‘‘

’’تو تمہیں سکون مل گیا اب تم مزے میں ہو؟‘‘ شاٹ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’اگر ایسا ہوتا تو تم اس وقت اس بار میں اکیلے بیٹھے ہونے کے بجائے سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے ہوتے۔‘‘

بین نے پھر گہری سانس لی اور پھر شاٹ کو بتا دیا کہ وہ کس مشکل میں ہے۔ شاٹ نے فوراً کہا۔ ’’میرے پاس پچیس ہزار ڈالرز ہیں۔ اگر تمہیں ضرورت ہے تو تم لے لو۔‘‘

بین نے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ’’شکریہ دوست لیکن پچیس ہزار ڈالرز سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوگا، مجھے پورے ایک لاکھ ڈالرز کی ضرورت ہے۔‘‘

شاٹ نے شانے اچکائے دیئے۔ ’’اتنے تو میں کسی صورت نہیں کر سکتا۔‘‘ پھر وہ آگے کی طرف جھکا۔ ’’اتنے دنوں بعد ملے ہیں کیا خیال ہے کچھ ہلا گلا نہ ہو جائے۔ میں ایک نائٹ کلب جاتا رہتا ہوں۔ بہت سپر قسم کی لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں۔‘‘

بین نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’مجھے گھر جانا ہے، میں نے بیوی سے کہا تھا کہ میں گھر آ رہا ہوں لیکن میں یہاں بار میں رک گیا۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔‘‘

’’کم آن یار...... ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔‘‘ شاٹ نے اصرار کیا۔ ’’تم اگر دو تین گھنٹے دیر سے گھر چلے جاؤ گے تو تمہاری بیوی طلاق نہیں دے دے گی۔‘‘

’’جینی بہت نرم مزاج عورت ہے ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ کچھ نہیں کہے گی مگر وہ پریشان ہوگی۔‘‘

’’دیکھو وہ پریشان ہوگی تو تمہیں کال کرے گی اور تم اسے بتا دینا کہ ایک پرانا دوست مل گیا ہے اور تم ذرا دیر سے گھر آؤ گے۔‘‘

بین خود بھی ابھی گھر جا کر جینی کا سامنا کرنا اور اسے یہ بری خبر نہیں سنانا چاہتا تھا اس کی خواہش تھی کہ وہ گھر پہنچے تو جینی سو چکی ہو۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ ’’او کے لیکن مجھے گیارہ بجے تک لازمی گھر پہنچنا ہوگا۔‘‘

شاٹ خوش ہو گیا۔ ’’ابھی نو بجے ہیں گیارہ بجنے میں تو بہت دیر ہے۔ آؤ چلیں۔‘‘

وہ باہر آئے اور شاٹ کی ہیوی بائیک پر روانہ ہوئے۔ نائٹ کلب زیادہ دور نہیں تھا۔ سردی خاصی تھی شمال اور مشرق کی طرف سے بہت تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ نائٹ کلب تک پہنچتے پہنچتے بین ٹھٹھر گیا تھا کیونکہ اس نے کوئی گرم چیز نہیں پہنی ہوئی تھی۔ معمولی سی جیکٹ تھی جو سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی تھی۔ نائٹ کلب باہر سے سادہ تھا مگر اندر سے اچھا خاصا شاندار اور بہترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ شاٹ اسے ایک میز پر لے آیا۔ سامنے گول اسٹیج پر چند لڑکیاں نہ ہونے کے برابر لباس میں اپنی نمائش کر رہی تھیں اور آنے والے گاہکوں کو لبھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شاٹ نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ’’اسے جانتے ہو؟‘‘

بین کو جانی پہچانی لگی تھی۔ ’’صورت سے دیکھی ہوئی لگ رہی ہے۔‘‘

’’اس کی ماں کال گرل تھی اور ہم اکثر اس کے پاس جاتے تھے۔‘‘

بین کو یاد آ گیا۔ ’’تم گومتی کی بات کر رہے ہو وہ انڈین عورت، یہ اس کی بیٹی ہے۔‘‘

’’ہاں اس وقت یہ صرف دس سال کی ہوتی تھی۔ اب دیکھو بالکل بدل گئی ہے۔‘‘

بین دیکھ رہا تھا کہ وہ واقعی بالکل بدل گئی تھی۔ وسکی کے چند پیگ حلق سے اتار کر بین کا موڈ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ ہنس بول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کے برابر میں ایک جوڑا آیا۔ مرد تقریباً چالیس بیالیس برس کا تھا اور اس نے سر پر قیمتی فلیٹ ہیٹ لگایا ہوا تھا۔ اس کا لباس بھی قیمتی تھا اور اس کے ساتھ ایک نہایت حسین اور سنسنی خیز لباس والی لڑکی تھی۔ مرد پہلے شاٹ سے بے تکلف ہوا اور پھر اس نے بین سے بھی بات چیت شروع کر دی۔ وہ بہت دولت مند لگ رہا تھا اس نے اپنے پرس سے کئی بڑے نوٹ نکال کر ایک لڑکی کو دیے تو وہ اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔ مگر اب وہ اس سے بے پروا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنا نام جان ایش کرے بتایا تھا اور لڑکی کا تعارف صرف نورما کہہ کر کرایا تھا۔ اچانک جان بین کی طرف مڑا اور اس نے کہا۔

’’یہ لڑکی دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کی پشت پر ایک زوردار ہاتھ مارو تو......

"میں اٹھا کر باہر پھینک دیا جاؤں گا۔"

"ہم اس سے پہلے بھاگ جائیں گے اور میں تمہیں اس ایک ہاتھ کے بدلے پانچ سو ڈالرز دوں گا۔"

بین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم مذاق کر رہے ہو۔"

جواب میں جان نے اپنے پرس سے پانچ سو ڈالرز نکالے اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ بین نے انہیں جیب میں رکھا اور کھڑا ہوا تو جان اور نورما پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ناچتے افراد کے ہجوم سے ہوتے باہر جا رہے تھے۔

بین نے اشارے سے لڑکی کو اپنی طرف بلایا۔ وہ کھنچی چلی آئی۔ بین کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنی پشت اس کی طرف کی تھی کہ بین کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہاں شور اتنا تھا کہ تھپڑ کی آواز اور لڑکی کی ہلکی سی چیخ دب کر رہ گئی اس کے ساتھ ہی بین اور شاٹ باہر کی طرف لپکے۔ شاٹ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا اور بین جلد از جلد وہاں سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ وہ باہر نکلے تو جان اور نورما ایک قیمتی کیڈی لاک کار میں بیٹھ چکے تھے۔ باہر آکر بین نے چند گہرے سانس لیے۔ اسے بھی مزہ آیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے اور اب اسے گھر جانا چاہیے۔ اس نے شاٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے شاٹ سے کہا۔

"اب میں گھر جاؤں گا۔"

اسی لمحے نائٹ کلب کا دروازہ کھلا اور ایک تنومند شخص باہر آیا وہ بین کی طرف بڑھا اور اس نے نزدیک آکر پوچھا۔ "لڑکی کو تم نے ہاتھ مارا تھا۔"

"ہاں۔" بین نے اقرار کر لیا۔ "اگر مارا تھا تو کیا ہوا۔"

جان ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اس نے قہقہہ لگایا اور بین سے کہا۔ "اگر تم اسے بھی ایک ہاتھ رسید کر دو تو مزید پانچ سو ڈالرز تمہارے۔"

بین نے اس شخص کو دیکھا اور پھر بے اختیار اس کا ہاتھ گھوما۔ لیکن اس کے کے کا تنومند پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے صرف اپنا رخسار سہلایا اور بین دیکھ نہیں سکا کہ اس کا ہاتھ کب حرکت میں آیا اور کب اس کے منہ پر لگا اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

بین کو ہوش آیا تو اس کی ناک میں شدید درد تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ لیدر کے صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور نزدیک ہی کہیں ذرا اونچی آواز میں پاپ میوزک بج رہا تھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنی ناک کو ہاتھ لگایا تو اس سے بہنے والا

خون جم سا گیا تھا۔ برابر میز پر اس کی دو ٹکڑے ہو جانے والی عینک رکھی تھی اور اسی وجہ سے اسے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ وہ اٹھا تو اسے چکر سا آ گیا۔ مگر چند لمحے بعد وہ سنبھل گیا اور جھالروں والے پردے کی طرف بڑھا جس کی دوسری طرف سے میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پردہ ہٹا کر باہر آیا تو ایک طرف شاٹ نورما کے ساتھ ناچ رہا تھا اور جان ایک صوفے پر بیٹھا ہوا ٹانگ ہلا رہا تھا۔ اس نے فلٹ ہیٹ اتار دیا تھا، اندر سے وہ فارغ البال تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چلایا۔ ''ہے یہ بھی آ گیا ہے۔''

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟''

جان کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے ذرا ڈرامائی انداز میں جھکا۔ ''یہ میرا گھر ہے اور تم یہاں ہو۔''

''ہے بین تم ایک ہی گھونسے میں بے ہوش ہو گئے تھے۔'' شاٹ نے اونچی آواز میں کہا اس پر نورما نے اسے گھورا اور رقص چھوڑ کر بین کی طرف آئی۔ اس نے نرمی سے اس کا بازو تھاما اور بولی

''آؤ میں تمہیں دیکھتی ہوں۔''

وہ اسے واش روم میں لائی۔ ان لوگوں نے اس کی جیکٹ اتار دی تھی اور اس کی سفید ٹی شرٹ پر سامنے کی طرف خون کے دھبے تھے۔ نورما نے ایک خانے سے میڈیکل ایڈ کا سامان نکالا اور اس سے روئی نکال کر اس کی ناک اور آس پاس لگا خون صاف کرنے لگی۔ ''ہڈی بچ گئی ہے لیکن سوجن ہے وہ دو تین دن میں ختم ہو جائے گی۔ اب تم ٹھنڈے پانی سے ناک دھو لو۔''

بین نے سرد پانی سے ناک دھوئی تو اسے سکون ملا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر سے ممکنہ حد تک شرٹ کے خون کے دھبے بھی صاف کر لیے تھے۔ وہ باہر آیا تو شاٹ ایک طرف کھڑا ہوا تھا اس کا منہ بنا ہوا تھا کیونکہ نورما اسے چھوڑ کر بین کے ساتھ چلی آئی تھی۔ جان نے پلیئر بند کر دیا تھا اور لاؤنج میں موجود بار کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا اور اس نے بین کے لیے ایک پیگ بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

بین نے چھوٹا سا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ شراب بہت تیز تھی اس کے سینے میں لگی لیکن اسے سچ مچ اس کی ضرورت تھی۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''بیورلی ہلز۔'' اس نے جواب دیا۔

بین چونکا۔ ''تم بہت دولت مند آدمی ہو۔''

جان نے شانے اچکائے۔ ''لوگ تو یہی کہتے ہیں۔''

''تم مشہور بھی ہو گیا؟'' شاٹ نے پوچھا۔ ''مجھے تمہاری صورت دیکھی ہوئی لگ رہی ہے۔''

''میں کوئی سیلیبریٹی نہیں ہوں۔'' جان نے تردید کی اور اپنے لیے بیئر کی بوتل نکال کر لے آیا۔ ''کسی کو ضرورت ہے تو وہ اپنی مدد آپ کرے۔''

شاٹ نے فوری اس پیشکش کا فائدہ اٹھایا نورما ایک طرف صوفے پر یوں گھٹنے موڑ کر بیٹھ گئی تھی کہ اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ بین نے ایک طرف پڑی اپنی جیکٹ اٹھا کر پہنی اور بولا۔ ''میں گھر جاؤں گا۔''

''ابھی سے۔'' جان نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں بارہ بج رہے تھے۔ ''ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔''

بین نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا تو اس میں جینی کی دو کالز موجود تھیں۔ اس نے جینی کو کال کی اس نے فوری کال ریسیو کی اور روہانسے لہجے میں بولی۔ ''تم کہاں ہو؟ میں تمہیں دو بار کال کر چکی ہوں۔''

''سوری ہنی، مجھے دیر ہو گئی لیکن بس میں نکل رہا ہوں شور میں بیل نہیں سنائی دی تھی۔''

''تم کتنی دیر میں گھر آ رہے ہو؟''

''بس پون گھنٹا لگے گا میں ذرا دور ہوں اور بسیں کم ہو گئی ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے بھئی۔۔۔'' جینی نے کہا اور کال بند کر دی۔ شاٹ اس کی طرف آیا۔

''کچھ دیر رک جاؤ، مسٹر ایش گرے بہت اچھا انسان ہے۔''

''میں شکر گزار ہوں۔'' بین نے کہا۔ ''لیکن اب مجھے جانا ہے میرے پانچ سو ڈالرز دو۔''

''کیوں نہیں۔'' جان اس کے پاس آیا اور پرس نکال کر اس میں سے سو ڈالرز والے نوٹ نکالے اور گن کر پانچ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔ ''یہ شرط پوری کرنے پر۔'' پھر اس نے پانچ نوٹ اور گنے۔ ''یہ اس تکلیف کے بدلے جو تمہیں اٹھانی پڑی۔ تمہیں نئی عینک بھی بنوانی ہو گی۔''

شاٹ رشک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''بین آج تمہارا لکی ڈے ہے صرف ایک گھونسے کے بدلے پندرہ سو ڈالرز۔''

بین نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم رکو گے؟''

''ایک منٹ۔'' جان بولا۔ ''آج رات میں فارغ

ہوں اور تمہیں بھی گھر جا کر سونا ہی ہے تو کیوں نہ ہم اس وقت کو استعمال کریں۔''

''کیا مطلب؟'' شاٹ نے پوچھا۔

''ہم ایک گیم کھیلتے ہیں۔''

بین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری حالت دیکھ رہے ہو میں کوئی گیم کھیلنے کے قابل نہیں ہوں۔''

''تمہاری حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔'' جان نے کہا۔ ''میں کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہوں گا جو تم نہ کر سکو۔''

''گیم کس کے درمیان ہوگا؟'' شاٹ نے سوال کیا۔

''تم دونوں کے درمیان۔'' جان نے انگلی سے باری باری بین اور شاٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم دوست ہیں۔'' شاٹ نے اعتراض کیا۔

''دوستوں کے درمیان ہی مقابلہ ہوتا ہے، دشمنوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔'' جان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''لیکن ہمیں اس کا کیا فائدہ ہوگا؟'' شاٹ دلچسپی لے رہا تھا اس لیے سوال کر رہا تھا۔ ''اس کے رول کیا ہوں گے؟''

''جیتنے والے کو ڈالرز ملیں گے اور صرف دو رول ہوں گے۔ نمبر ایک جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا نمبر دو میں جو انعام رکھوں گا تم اسے مسترد کر کے اپنا مطالبہ پیش کر سکتے ہو۔ مثال کے طور پر میں کہوں کہ تم دونوں کو رم کا ایک گلاس ایک ہی سانس میں خالی کرنا ہوگا اور میں اس کے بدلے جیتنے والے کو ہزار ڈالرز انعام دوں گا۔ اگر تم محسوس کرو کہ رقم کم ہے تو تم بڑھانے کا مطالبہ کر سکتے ہو۔ اگر میرے خیال میں مناسب ہوا تو میں مان جاؤں گا ورنہ کھیل ختم ہو جائے گا۔''

''ایک منٹ۔'' شاٹ نے مداخلت کی۔ ''کیا مطلب کھیل ختم ہو جائے گا؟ یعنی تم کوئی دوسرا گیم کرو گے۔''

''نہیں میرے کسی کھیل میں حصہ نہ لینے کی صورت میں کھیل ختم ہو جائے گا۔''

''اور اگر ہم میں سے ایک نہ مانے تو کیا دوسرا فاتح ہوگا؟''

''نہیں کھیل تو دو افراد کے درمیان ہوتا ہے ایک نے بھی منع کیا تو کھیل ختم ہو جائے گا۔''

بین بولا۔ ''میں کہہ چکا ہوں میں کسی کھیل میں حصہ نہیں لوں گا میں گھر جا رہا ہوں۔''

''میری بات سنو۔'' شاٹ نے کہا اور بین کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ ''بین یہ موقع ہے...... دیکھو اس شخص کے پاس یقیناً بہت ساری دولت ہے اور یہ اسے لٹانے کو تیار ہے تو ہم کیوں انکار کریں۔''

''مجھے یہ سب حماقت لگ رہی ہے۔''

شاٹ نے اس کے پرس پر ہاتھ مارا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''اس میں جو اضافی پندرہ سو ڈالرز ہیں وہ اسی حماقت کا نتیجہ ہیں۔ بین میری بات سنو، تمہیں رقم کی ضرورت ہے۔''

''مجھے ایک لاکھ ڈالرز کی ضرورت ہے۔''

''ہوسکتا ہے ہم آج رات اس سے زیادہ ہی کما کر واپس جائیں۔''

''ایک لاکھ ڈالرز۔'' بین نے بے یقینی سے کہا۔ ''پندرہ سو ڈالرز اور ایک لاکھ ڈالرز میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔''

''تم فرق نہیں اس شخص کا رویہ دیکھو۔'' شاٹ نے اصرار جاری رکھا۔ ''کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ وہ کتنا دولت مند ہے۔''

بین نے شاٹ کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے جو موقع ہے ہم اسے ایک بار استعمال کر کے تو دیکھیں۔''

اس دوران میں جان اور نورما ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جان کا انداز ایسا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ دونوں مان جائیں گے۔ اس لیے وہ بہت پرسکون انداز میں بار کاؤنٹر سے کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ نورما...... بے تاثر تھی مگر وہ یونہی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس کا بڑا سا پرس اس کے برابر میں رکھا تھا اور وہ اپنے گلے میں موجود مالا کی موتیوں سے کھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شاٹ اور بین ان کی طرف آئے تو ان کے چہروں پر اقرار تھا۔ شاٹ پرجوش تھا اور بین ہچکچا رہا تھا لیکن وہ مان گیا تھا۔ شاٹ نے پوچھا۔

''مسٹر گرے ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''کیوں نہ کھیل کا آغاز اسی مثال سے کیا جائے جو میں نے سمجھانے کے لیے دی تھی۔''

''رم کا ایک گلاس۔'' شاٹ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہ بہت تیز ہوتی ہے ایسا نہ ہو کہ اس کے بعد ہم کھیل میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے پاس نشہ اتارنے والی گولیاں ہیں۔'' جان نے کہا اور کاؤنٹر کی ایک دراز سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر ان کے سامنے رکھی۔ ''یہ تیز ترین نشے کو بھی ایک منٹ میں بے اثر کر دیتی ہے۔''

شاٹ نے بین کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلایا تو شاٹ بولا۔ ''ٹھیک ہے ہم تیار ہیں۔''

جان نے کاؤنٹر کے پیچھے شیلف سے دو بڑے گلاس اٹھائے۔ شاٹ نے احتجاج کیا۔ ''یہ بڑے ہیں ایک ہی سانس میں خالی کرنا مشکل ہوگا۔''

جان مسکرایا۔ ''یہی تو کھیل ہے دوست...... اس میں جیتنے والے کو ایک ہزار ڈالرز ملیں گے۔''

''ایک ہزار ڈالرز کم ہیں۔'' بین نے کہا۔ ''پانچ ہزار ڈالرز دو۔''

ان کا خیال تھا کہ جان انکار کرے گا یا بارگیننگ کرے گا مگر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے پانچ ہزار ڈالرز لیکن خیال رہے کہ فاتح وہی ہوگا جو ایک سانس میں گلاس خالی کرے اور پہلے کرے۔''

جان نے گلاس رم سے بھر کر ان کے سامنے رکھے۔ نورما اپنا آئی فون نکالتے ہوئے اٹھ کر ان کے پاس آگئی تھی۔ اس نے بین کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ سے سہلاتے ہوئے بولی۔ ''شروع کرو۔''

ان دونوں نے ایک ساتھ گلاس اٹھائے اور منہ سے لگا لیے۔ بین نے پہلے ایک ہلکی سانس لی تھی اور شاٹ نے گہری سانس لی۔ اس لیے اس کا سانس جلد اکھڑ گیا۔ وہ پون کے قریب گلاس خالی کر چکا تھا مگر اس سے زیادہ دیر سانس پینے میں روکنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے سانس لے لی اور جان نے کاؤنٹر پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''یہ...... تم مقابلے سے باہر ہوگئے ہو۔''

بین نے ابھی نصف گلاس ہی پیا تھا مگر اسے سانس لینے یا نکالنے کا مسئلہ نہیں تھا اس لیے اس نے کسی نہ کسی طرح گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر پٹخ دیا۔ وہ اب منہ کھولے سانس لے رہا تھا ناک تو خون جمنے کی وجہ سے پہلے ہی بند تھی۔ نورما نے اس منظر کی ویڈیو بنائی، وہ تالی بجانے لگی۔ اسے بین کے جیتنے کی خوشی ہو رہی تھی۔ بین کسی کی طرف توجہ دیے بغیر لڑکھڑاتا ہوا جا کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے عرصہ ہوا تیز شراب ترک کر دی تھی۔ اب ہلکی پیتا تھا اور وہ بھی کم ہوتی تھی اس لیے تیز رم کے پورے گلاس نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ شاٹ نے پون گلاس پیا تھا اور وہ تیز شراب کا عادی بھی تھا لیکن اس نے فوری ڈبیا سے ایک گولی نکال کر کھالی۔ اس کے تاثرات میں غصہ تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ بین یہ مقابلہ نہیں جیت سکے گا۔ نورما بین کے لیے گولی لے آئی۔ بین نے اسے منہ میں ڈالا اور چبا کر نگل گیا۔ اس نے جان کی طرف دیکھا۔

''میرے پانچ ہزار ڈالرز۔''

''اوہ کیوں نہیں۔'' جان نے کہا اور ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ شاٹ اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے کھیل کے اگلے مرحلے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جان نے اسے جواب دیا۔ ''پہلے میں رقم نکال لوں اس کے بعد بتاتا ہوں۔''

یہ کمرا اسٹڈی روم تھا۔ جان نے کتابوں کے شیلف کے نیچے بنے ایک کپ بورڈ کا دروازہ کھولا تو اس کے پیچھے چھوٹی سی آہنی تجوری نظر آئی۔ جان نے اس کا کمبی نیشن لاک کھولا اور پھر اندر تہ در تہ رکھی گڈیوں میں سے کچھ گڈیاں باہر نکالیں۔ تجوری بند کر کے وہ شاٹ کے ساتھ باہر آیا اور دس ہزار والی ایک گڈی کی پن کھول کر اس نے پانچ ہزار ڈالرز کے نوٹ گن کر بین کے حوالے کیے۔ ایک مقابلہ جیت کر بین کی ہچکچاہٹ دور ہوگئی تھی۔ بین نے کہا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے دوست ابھی تو پوری رات پڑی ہے۔'' جان نے بے پروائی سے کہا۔ ''کیا تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہے؟ میں بہت اچھا کک ہوں۔''

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' بین نے کہا اگرچہ اس نے رات کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا تھا مگر اسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''میں نے بھی کھانا کھا لیا تھا۔'' شاٹ نے کہا وہ زیادہ بے صبر ہو رہا تھا مگر جان کو بظاہر کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر لان میں دیکھ رہا تھا اچانک اس نے گالی دی۔

''کتیا کا بچہ۔''

وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے، شاٹ نے کہا۔ ''کیا مطلب مسٹر گرے؟''

''میرے ساتھ آؤ۔'' جان نے کہا اور انہیں لے کر باہر آیا۔ مکان عام سطح سے زیادہ بلند تھا اور گول چکر کھاتی سیڑھیاں داخلی دروازے تک آرہی تھیں۔ اس سے آگے ایک لہراتی ہوئی روش تھی اور اس کے عین وسط میں کوئی براؤن سی چیز پڑی تھی۔ جان نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھو۔''

انہوں نے جھک کر دیکھا اور بین نے کہا۔ ''کتے کی پوٹی۔''

''ہاں...... یہ کتے کا بچہ میرے پڑوسی کا ہے۔'' جان نے برابر والے گھر کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہمیشہ یہاں پوٹی کر کے جاتا ہے۔ کاش کہ میں اسے شوٹ کر سکتا۔ لیکن میں جانوروں پر ظلم کے خلاف ہوں۔''

''ویسے بھی قصور تو پڑوسی کا ہے اس نے اپنے کتے کو اتنی

چھوٹ کیوں دی ہوئی ہے۔'' بین بولا۔ شاٹ نے سر ہلایا۔
''بالکل تمہیں انتقام پڑوسی سے لینا چاہیے۔''
''پڑوسی سے۔'' جان نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''خیال تو اچھا ہے۔ کیوں نہ اسے ہی ہم اگلا مرحلہ بنالیں۔''
''وہ کیسے؟'' بین نے سوال کیا۔
''پڑوسی کا خبیث کتا آکر یہاں میرے لان میں پوٹی کرکے جاتا ہے تو کیوں نہ میں اس کے گھر میں پوٹی کرواؤں۔''
''پوٹی کرواؤ گے۔'' شاٹ نے پوچھا۔ ''ہم سے؟''
''بالکل...... تم دونوں جاؤ گے اور وہاں پوٹی کرکے آؤ گے۔''
''اس میں کھیل کہاں ہوا؟'' شاٹ نے پھر کہا۔
''جو یہ کام کرکے پہلے واپس آئے گا وہ فاتح ہوگا۔''
''اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ آنے والے نے واقعی پوٹی کی ہے۔'' شاٹ نے پھر سوال کیا۔
''اس کے لیے پوٹی کرنے والا اس کی تصویر کھینچ کر لائے گا بہ طور ثبوت۔''
بین جو اب تک خاموش تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت خطرناک کام ہے ٹریس پاس پر پکڑے جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟''
''کم آن یار۔'' شاٹ نے بے قراری سے کہا۔ ''مسٹر گرے تم اس کے بدلے کیا دو گے؟''
''آٹھ ہزار ڈالرز۔'' جان نے کہا۔
''نہیں یہ بہت کم ہیں پکڑے جانے پر ہم کم سے کم سال سے اوپر کے لیے جیل جائیں گے اور میرا تو کیریئر ہی ختم ہو جائے گا۔'' بین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری طرف سے کھیل ختم سمجھو۔''
''اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔'' شاٹ نے کہا۔ ''ابھی ہم نے کوشش کہاں کی ہے۔''
بین نے سوچا اور جان کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر گرے اگر تم پچیس ہزار ڈالرز دو تو میں راضی ہوں۔''
پچیس ہزار ڈالرز کا سن کر شاٹ کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نظر آئے اس کا خیال تھا کہ جان انکار کر دے گا اور کھیل یہیں ختم ہو جائے گا مگر اس نے کہا۔ ''پچیس ہزار ڈالرز زیادہ ہیں' میں پندرہ دے سکتا ہوں، منظور ہے تو ٹھیک ورنہ تم دونوں یہیں سے جاسکتے ہو۔''
شاٹ نے گھگیا کر بین کی طرف دیکھا تو اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ جان نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ''او کے تمہارے پاس دس منٹ کا وقت ہے۔''
''وقت کی قید کا پہلے ذکر نہیں کیا تھا۔'' بین نے اعتراض کیا۔
''او کے وقت کی قید نہیں ہے۔ تم دونوں کے پاس کیمرے والے موبائل ہیں؟''
انہوں نے سر ہلایا اور برابر والے مکان کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے درمیانی باڑ پھلانگی اور پڑوسی کے لان میں داخل ہو گئے۔ وہ دبے قدموں دوڑتے ہوئے مکان تک آئے اور اس میں اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ بین کھڑکیاں دیکھ رہا تھا اور شاٹ دروازے چیک کر رہا تھا۔ مزے کی بات تھی اسے داخلی دروازہ ہی کھلا مل گیا۔ وہ اندر گیا تو بین تیزی سے اس کے پیچھے اندر آیا۔ اتنی دیر میں شاٹ پینٹ سرکا کر ایک موزوں جگہ بیٹھ چکا تھا۔ بین اسی راہداری کے سرے پر آیا۔ قسمت اس پر مہربان تھی اس بار بھی اس کا کام پہلے ہوا اور اس نے جلدی سے اپنے موبائل سے اپنے کیے دھرے کی تصویر لی اور دروازے کی طرف لپکا۔ شاٹ ناکام رہا۔ دل ہی دل میں بین کو برا بھلا کہتے ہوئے اس نے اپنی پینٹ اوپر کی۔ اسی لمحے اندر سے ایک چھوٹا سا سفید پپی بھونکتا ہوا باہر آیا۔ مگر اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ شاٹ نے جلدی سے اسے گود میں اٹھالیا اور باہر آیا۔ اس وقت تک بین جان کے مکان تک پہنچ گیا تھا اور جب شاٹ اندر داخل ہوا تو وہ جان کو موبائل پر تصویر دکھا رہا تھا۔
''شاندار۔'' جان نے بین کی پیٹھ تھپکی۔ ''اب اس حرامزادے کو پتا چلے گا کہ اپنے گھر میں کسی کی پوٹی دیکھ کر آدمی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔''
''میں کامیاب رہا ہوں۔'' بین نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔
''بالکل تم کامیاب رہے ہو۔'' جان نے کہا اور اپنی جیب سے ایک پوری گڈی اور ایک آدھی گڈی نکال کر بین کے حوالے کی۔ شاٹ پتھرائی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بین دیکھتے ہی دیکھتے بیس ہزار ڈالرز حاصل کر چکا تھا۔ پندرہ سو ڈالرز اس کے علاوہ تھے اور اسے اب تک کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے جان سے کہا۔
''یہ دیکھو میں تمہارے مجرم کو لے آیا۔'' اس نے کتا دکھایا اور جیب سے چاقو نکال کر کتے کی گردن پر رکھ دیا۔ ''اگر میں اسے قتل کر دوں تو تم مجھے کتنی رقم دو گے؟''
جان نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ ''میں جانوروں پر تشدد کے سخت خلاف ہوں۔''

''تشدد میں کر رہا ہوں تم نہیں ...... یہ روز تمہارا لان گندا کرتا ہے۔''

نورما اٹھ کر آگے آئی، اس نے شاٹ سے کتا لیا اور اسے چمکارتی ہوئی واپس جا کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ بین نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''کھیل صاف ستھرا ہوگا اس میں تشدد کا عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔''

بین ایک طرف کھڑا ہوا سر جھٹک رہا تھا۔ جان نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے اندر بلیڈنگ ہو رہی ہے۔'' بین نے کہا اور سر جھٹکا تو اس کی ناک سے خون کے قطرے نکل کر اس کی شرٹ پر گرے تھے۔ کچھ قطرے فرش پر بھی ٹپکے تھے۔ جان چلایا۔

''اسے میرا گھر گندا مت کرو۔''

''ایک منٹ میں اسے واش روم لے جاتا ہوں۔'' شاٹ نے جلدی سے کہا اور اس سے پہلے بین منع کرتا وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً زبردستی واش روم میں لے آیا۔ بین منمنا کر کہہ رہا تھا کہ اسے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر شاٹ نے ایک نہیں سنی۔ اس نے اندر آتے ہی بین کو واش بیسن کی طرف دھکیلا اور کموڈ کا فلیش ٹینک چلا کر اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''سنو ہمارے پاس موقع ہے۔''

''کیسا موقع؟'' بین نے سنبھل کر کہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاٹ اسے جھگڑے کے لیے یہاں لایا ہے اس لیے اس نے دفاعی انداز اپنا لیا تھا۔

''جان ایلش گرے کی تجوری میں تقریباً ڈھائی لاکھ ڈالرز کی رقم ہے۔ اگر ہم ہمت کریں تو اسے حاصل کر سکتے ہیں۔''

''کیسے کھیل کر؟''

''احمق کھیل میں وہ ڈھائی لاکھ ڈالرز ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔''

''وہ بیس ہزار ڈالرز تو دے چکا ہے۔''

''ہاں مگر اب مزید نہیں دے گا وہ کوئی ایسا کھیل سامنے رکھ دے گا جس میں ہم ناکام ہو جائیں گے۔''

''پھر ہم کیا کریں؟''

شاٹ نے اپنا چاقو نکال کر بین کو دکھایا۔ ''ہم اس کی مدد سے اسے لوٹ لیں گے۔''

بین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ڈکیتی......؟''

''ہاں ہم بہت آسانی سے ڈھائی لاکھ ڈالرز کی رقم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں سے آدھے یعنی سوا لاکھ ڈالرز تمہارے ہوں گے اور تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

شاٹ کی اس بات نے بین کو سوچنے پر مجبور کر دیا، اسے بھی لگ رہا تھا کہ اب جان ان کے سامنے کوئی مشکل کام رکھے گا جسے وہ نہیں کر سکیں گے اور اسے ان ہی بیس ہزار ڈالرز پر قناعت کرنا پڑے گی جو اس نے جیت لیے تھے۔ بین نے کہا۔ ''وہ پولیس میں رپورٹ کر سکتا ہے، ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکیں گے۔''

''وہ نہیں کرے گا کیونکہ اسی کے کہنے پر ہم نے پڑوسی کے گھر میں نقب لگائی ہے اور جب ہم یہاں سے جائیں گے تو انہیں باندھ جائیں گے۔ وہ پولیس کو خبردار بھی نہیں کر سکیں گے۔''

بین نے سر جھٹکا۔ ''سنو مجھے یہ آدمی ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جو ظاہر کرتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''لیکن ہم ایک بات جانتے ہیں کہ اس کے پاس دولت ہے اور ہم یہ دولت حاصل کر سکتے ہیں۔'' شاٹ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا تم صرف لڑکی کو قابو کرنا باقی میں کر لوں گا۔''

بین نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا میں کسی ... پُرتشدد کارروائی میں شامل نہیں ہوں گا۔''

''مجھے امید ہے چاقو دیکھ کر وہ ہتھیار ڈال دے گا۔'' شاٹ نے کہا اسی لمحے باہر سے جان کی آواز آئی۔

''اندر سب خیریت ہے نا؟''

''سب ٹھیک ہے۔'' شاٹ چلایا اور اس نے بین کو اشارہ کیا، اس نے کچھ پانی منہ پر ڈالا اور کچھ اپنی شرٹ پر گرایا۔ وہ باہر آئے۔ شاٹ نے بین کو لڑکی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود جان کی طرف بڑھا۔

''مسٹر گرے...... اب اگلا مرحلہ شروع کرو۔'' شاٹ کہتے ہوئے اس کے پاس آیا اور اچانک اسے دھکیل کر دیوار سے لگاتے ہوئے اس نے چاقو جان کی گردن پر رکھ دیا۔ ''خبردار حرکت مت کرنا ورنہ گردن کٹ جائے گی۔''

نورما کھڑی ہوئی تھی کہ بین نے اسے عقب سے جکڑ لیا۔ مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے اس کے بازوؤں میں جھولتی رہی۔ جان نے گھٹی آواز میں کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

جواب میں شاٹ نے اسے کالر سے پکڑ کر صوفے پر اوندھے منہ گرایا اور چاقو کی نوک اس کی گدی پر رکھ دی۔ ''تمہاری تجوری میں رکھی دولت چاہیے۔ تجوری کا نمبر بتاؤ۔''

''جب میں تمہیں ویسے ہی رقم دے رہا ہوں تو تم یہ

حرکت کیوں کر رہے ہو؟''
''بکومت۔'' شاٹ غرایا اور اس نے چاقو کی نوک جان کی گردن میں چبھوئی۔ ''نمبر بتاؤ۔''
''او کے......او کے بتاتا ہوں۔'' جان نے کہا تو بین شاٹ کے اشارے پر اسٹڈی میں چلا گیا اور تجوری تلاش کر لی۔ جان کا بتایا ہوا کمبی نیشن لگا کر تجوری کھولی اور اس میں رکھی رقم وہاں موجود ایک ڈبے میں جمع کرنے لگا۔ رقم خاصی زیادہ تھی شاید چار لاکھ ڈالرز سے اوپر تھی۔ بین بہ مشکل ڈبا سنبھالتا ہوا باہر آیا تو شاٹ نے اسی پوزیشن میں جان کو قابو کیا ہوا تھا۔ اس نے شاٹ سے کہا۔
''اسے چھوڑو اور یہاں سے نکلو۔''
''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔'' جان نے سکون سے کہا۔ نورما واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بین کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو؟''
''کیا نہیں جانتے ہیں؟'' شاٹ نے پوچھا۔
''ذرا اپنے پیچھے دیوار پر لگی تصاویر اور میرے سرٹیفکیٹس کو غور سے دیکھو۔''
شاٹ نے پلٹ کر دیکھا۔ دیوار پر کئی تصاویر لگی تھیں اور وہ پہلی بار انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تصویر میں جان جوڈو کے لباس میں تھا اور اس کے ساتھ لاس اینجلس جوڈو ایسوسی ایشن کا جاری کیا ہوا بلیک بیلٹ کا سرٹیفکیٹ تھا۔ شاٹ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''لعنت ہو۔''
اگلے ہی لمحے جان نے گھومتے ہوئے شاٹ کا چاقو والا بازو پکڑ کر گھمایا اور وہ اپنے زور میں پلٹ کر صوفے پر گرا اور جان کھڑا ہو گیا۔ اس نے نہایت آرام سے شاٹ سے چاقو کھینچ لیا اور اس کا بازو عقب میں مروڑ کر لاک کر دیا۔ شاٹ چلایا۔ ''بین کیا کر رہے ہو؟''
بین رقم کا ڈبا اٹھائے دم بہ خود کھڑا تھا کیونکہ اسی اثنا میں نورما نے اپنے پرس سے ایک پستول نکال کر اس پر تان لیا تھا۔ ایک منٹ بعد رقم کا ڈبا بار کے کاؤنٹر پر رکھا تھا اور وہ دونوں صوفے پر برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ جان نے چاقو کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا اور نورما نے پستول واپس پرس میں ڈال دیا تھا۔ شاٹ کی حالت خراب تھی۔ کیونکہ چاقو اسی نے استعمال کیا تھا اگر جان اسے پولیس کے حوالے کرتا تو وہی اصل مجرم قرار پاتا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم کیا کرو گے ہمیں پولیس کے حوالے کردو گے؟''
''نہیں۔'' جان نے کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم کھیل کا پھر سے آغاز کریں گے لیکن اس سے پہلے کچھ مزہ ہو جائے۔''
جان نے ایک ڈبا نکالا اور اس میں کسی سفید پاؤڈر کی چھوٹی چھوٹی پیک تھیلیاں نکالیں اور ان کی طرف دیکھا۔ ''کولمبیا کی خالص کوکین، اس میں ایک فیصد بھی ملاوٹ نہیں ہے۔''
اس نے ایک تھیلی کھول کر اس کی کوکین کاؤنٹر پر گرائی اور پھر اسے شاٹ کے چاقو سے چھ الگ الگ لائنوں میں تقسیم کیا۔ اس نے ڈبے سے ایک نلکی نکال کر ایک لکیر پر رکھی اور زور سے سانس کھینچتے ہوئے نلکی کو حرکت دی تو لکیر کی ساری کوکین اس کی ناک میں چلی گئی۔ جان نے سیدھے ہو کر سر جھٹکا اور پھر ان کی طرف دیکھا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''
شاٹ کھڑا ہو گیا۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا، اس نے جان سے نلکی لی اور کوکین کی ایک لائن صاف کر دی۔ جان نے بین کی طرف دیکھا۔ ''اب تمہاری باری ہے۔''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نشہ نہیں کرتا۔''
''انکار نہیں کر سکتے۔'' جان نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔''
مجبوراً بین بھی حرکت میں آیا اور اس نے بھی ایک لائن صاف کی پھر جان اور شاٹ نے دوسرے راؤنڈ میں کوکین ناک میں چڑھائی۔ بین کا دماغ گھوم گیا تھا اس نے اوائل جوانی میں بھی کوکین استعمال کی تھی اور یہ خالص کوکین تھی۔ دوسرے راؤنڈ کے بعد بین کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے تھے اور وہ ٹٹولتا ہوا آ کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں جان اور شاٹ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ نورما اس کے عقب میں آئی اور اس کے شانوں کا مساج کرنے لگی۔ ''اوہ تمہارے شانوں میں کتنی گٹھلیاں ہیں۔''
بین کو اس کے مساج سے سکون مل رہا تھا۔ اچانک وہ چونکا کیونکہ جان تالی بجا کر کہہ رہا تھا۔ ''اب نئے راؤنڈ کا وقت آ گیا ہے۔''
''میں مزید کوکین نہیں لوں گا۔'' بین نے کہا۔
''میں کھیل کی بات کر رہا ہوں۔'' جان نے کہا اور چاقو نکال لیا۔ ''میں کھیل میں تشدد شامل کرنے کے خلاف تھا مگر تم لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔''
شاٹ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''کیا مطلب؟''

"تم میں سے ایک، دوسرے کے کسی ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹے گا۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" بین کھڑا ہو گیا۔

"میری پوری بات سن لو۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سننی ہے۔" بین نے کہا اور اپنی جیکٹ اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ شاٹ اس کی طرف لپکا مگر وہ اس سے پہلے ہی دروازے سے نکل گیا۔ عقب سے جان نے کہا۔

"بیکار ہے وہ چلا گیا ہے۔"

"وہ چلا گیا ہے لیکن میں تو موجود ہوں۔" شاٹ نے کہا۔ "میں اپنی انگلی کٹوانے کے لیے تیار ہوں، بولو تم کیا دو گے؟"

جان نے نفی میں سر ہلایا۔ "کھیل ہمیشہ دو افراد کے درمیان ہوتا ہے۔"

"پلیز...... مجھے اس کھیل میں کچھ نہیں ملا ہے۔" شاٹ گڑگڑایا۔ "مجھے ایک چانس تو ملنا چاہیے نا۔"

جان سوچ میں پڑ گیا پھر نورما نے کہا۔ "ڈیئر، یہ واقعی حقدار ہے اسے کچھ نہیں ملا ہے۔"

جان نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے لیکن تمہیں اپنی انگلی خود کاٹنی ہوگی۔"

شاٹ کا رنگ سفید پڑ گیا مگر اس نے سر ہلایا۔ "اور اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟"

"پندرہ ہزار ڈالرز۔"

"یہ کم ہیں کم سے کم تیس ہزار ڈالرز تو کرو۔"

"آخری آفر بیس ہزار کی ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔" دروازے کی طرف سے بین کی آواز آئی، وہ پلٹ آیا۔ شاٹ اسے دیکھ کر کراہا۔

"لعنت ہو تم پھر آ گئے؟"

اس نے جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔ "ہاں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

جان اور نورما خوش نظر آنے لگے۔ "اب کھیل میں مزہ آئے گا لیکن یہ آفر میں نے شاٹ کو کی ہے۔"

"انیس ہزار۔" بین نے کہا۔ "اس رقم میں، میں اپنی انگلی کٹوانے کو تیار ہوں۔"

شاٹ کا بس چلتا تو شاید وہ بین کو قتل کر دیتا۔ اس نے گھٹی آواز میں کہا۔ "تم ذلیل شخص۔" اور جان کی طرف دیکھا۔ "اٹھارہ ہزار۔"

جان اب پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا اس نے کہا۔ "میں بیس ہزار کی آفر کر چکا ہوں اب بولی میں جتنی رقم کم ہوگی، وہ انگلی کاٹنے والے کو ملے گی۔"

"سترہ ہزار۔" بین نے کہا تو شاٹ نے اپنی اونی ٹوپی اتار کر پھینک دی اور زہریلے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہاری انگلی کاٹ کر بہت خوشی ہوگی۔"

جان کے اشارے پر نورما کچن سے سبزی کاٹنے والا تختہ اور گوشت کاٹنے والا چھوٹا چاپر لے آئی تھی اور پھر اپنا آئی فون اٹھا لیا، وہ اس منظر کی بھی ویڈیو بنا رہی تھی۔ یہ تیز دھار چاپر بہ آسانی ایک ہی وار میں انگلی کیا ہاتھ بھی جسم سے الگ کر سکتا تھا۔ بین نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ تختے پر رکھا اور شاٹ نے چاپر سنبھالا تو جان نے کہا۔ "ٹھہرو، میں یہ چاقو گرم کر کے لے آؤں، میں اپنے لاؤنج میں خون اور گندگی برداشت نہیں کروں گا۔"

اب بین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ جان چاقو گرم کر کے لایا اور شاٹ نے چاپر بلند کیا۔ ابتدائی غصے اور جوش کے بعد اب اسے بھی یہ کام بہت مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو آمادہ کیا اور چاپر مارنے والا تھا کہ بین کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر دیکھا۔ جینی کال کر رہی تھی۔ وہ ان سے معذرت کرتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا جہاں اسے ہوش آیا تھا اور اس نے کال ریسیو کی۔ "بین تم کہاں ہو۔ تم نے کہا تھا کہ پون گھنٹے میں آجاؤ گے اور اب دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔"

"جینی میں آرہا ہوں، بس کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گا۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں دوستوں کے ساتھ ہوں۔"

"مجھے ٹھیک وقت بتاؤ جب تم گھر آؤ گے۔"

بین نے سوچا اور بولا۔ "میں ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔"

جینی سے بات کر کے وہ باہر آیا۔ چاقو ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور جان دوبارہ اسے گرم کر کے لے آیا۔ اس نے شاٹ سے کہا۔ "چلو اپنا کام کرو۔"

نورما اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ شاٹ نے پھر سے دل کڑا کیا اور چاپر بلند کیا۔ بین نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ چاپر تختے سے ٹکرایا تو پہلے تو بین کو کچھ محسوس نہیں ہوا پھر اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اسے خون اور اپنی کٹی انگلی دکھائی دی۔ پھر اس کے حلق سے دھاڑ نکلی اور اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کیا تو پتا چلا کہ انگلی ٹھیک سے نہیں کٹی تھی وہ کھال کے چھوٹے سے حصے سے بدستور لٹک رہی تھی۔ خون فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔

جان نے چلّا کر کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا ہے۔ اسے کاٹو۔''

شاٹ ناچ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، وہ چاپر کا ٹھیک استعمال نہیں کر سکا تھا۔ بالآخر اس نے ہمت کی اور بین کا ہاتھ قابو کر کے انگلی کھینچ کر ہاتھ سے الگ کر دی اور پھر اسے گھبرا کر ایک طرف پھینک دیا۔ جان نے موقع غنیمت جان کر گرم چاقو بین کے زخم سے لگا دیا اور اس وقت تک لگائے رکھا جب تک گوشت جلنے کی بو نہیں آگئی۔ اب بین کی دھاڑوں میں کمی آگئی تھی۔ شاٹ نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ نورما اسے ہمدردی سے دیکھ رہی تھی پھر وہ اس کے لیے وھسکی کا ایک گلاس بنا کر لے آئی جو بین نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا تھا۔ نورما واش روم سے پٹی لے آئی اور اس کے زخم پر لپیٹ دی۔ وھسکی سے اس کی حالت خاصی سنبھل گئی تھی اور اس نے جان سے کہا۔ ''میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا اس نے مجھے جان کر اذیت دینے کے لیے ادھورا کام کیا۔'' اس کا اشارہ شاٹ کی طرف تھا۔ ''اس لیے ساری رقم مجھے دی جائے۔''

''بکواس مت کرو۔'' شاٹ نے کہا۔ ''میں نے جان کر نہیں کیا مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے کام مکمل کر دیا۔''

''سوری دوست۔'' جان نے دس دس ہزار کی دو گڈیاں نکالیں اور ان میں سے ایک سے تین ہزار نکال کر شاٹ کی طرف بڑھائے اور باقی رقم بین کے سامنے رکھ دی۔ رقم دیکھ کر بین کا درد کم ہوا تھا اور اس نے گڈیاں اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔ اب رقم اتنی ہوگئی تھی کہ اس کی جیبوں میں نہیں آرہی تھی۔ نورما جو فریج کی طرف جا رہی تھی اچانک اس نے ہلکی سی چیخ ماری۔

''اسے کیا ہوا ہے؟''

''کیے...... کیا ہوا؟'' جان نے پوچھا۔

نورما فرش پر جھک کر ساکت پڑے پپی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تینوں اس کے پاس آئے اور جان نے اس کا معائنہ کیا پھر ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ مر گیا ہے۔''

نورما کے منہ سے سسکی نکلی اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جان نے شاٹ کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ تھا۔''

''تم اسے مارنے کی بات کر رہے تھے۔'' جان سرد لہجے میں بولا۔

''ہاں مگر رقم کے لیے اور میں بلاوجہ اس معصوم کتے کو کیوں مارتا۔''

بین جھک کر دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ ''کتے کے منہ میں کچھ ہے۔''

وہ تینوں ہی کتے پر جھک گئے۔ جان نے اس کا منہ اوپر کیا تو سچ مچ اس میں کچھ تھا اور جب اس نے کتے کا جبڑا کھولا تو بین اچھل پڑا۔ کتے کے منہ میں اس کی انگلی تھی۔ جان نے احتیاط سے کھینچ کر انگلی نکالی۔ اسے کھانے کی کوشش میں کتے نے جان دے دی تھی۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ یہ انگلی بھی اس کے لیے بڑی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے شاٹ اور بین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب اس کا کیا کریں؟''

''باہر اس کے گھر کے آگے پھینک آتے ہیں۔'' شاٹ نے تجویز دی۔ جان نے سر ہلایا اور کتے کو اٹھا کر لے گیا۔ بین کی انگلی بھی اس کے پاس تھی۔ نورما نے فریج سے سافٹ ڈرنک کا ٹن نکالا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ شاٹ نے حسرت سے اسے دیکھا۔

''کاش میں اس کا شوہر ہوتا۔ کیا حسین عورت ہے۔''

''وہ جان کی بیوی ہے اور جان خطرناک آدمی ہے۔'' بین نے آہستہ سے کہا۔ ''بہتر ہوگا ہم اپنی توجہ کھیل پر مرکوز رکھیں۔''

''تم یقیناً یہی کہو گے۔'' شاٹ نے تلخی سے کہا۔ ''اب تک ملنے والی تمام رقم تم نے سمیٹ لی ہے۔''

''میں نے جیتی ہے۔'' بین نے تصحیح کی اور بار کاؤنٹر کی طرف آیا اس نے ایک گلاس میں برانڈی نکال کر اس میں آئس کیوبس ڈالیں اور گھونٹ لینے لگا۔ شاٹ بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر جان کے بار کی مہنگی شرابوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جان کو گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی تھی اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کتے کو گھر کے اندر تک پہنچانے گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی اور اس نے لاؤنج میں آکر کہا۔

''تم لوگوں کو یقیناً بھوک لگی ہوگی۔''

شاٹ اور بین نے بیک وقت نفی میں سر ہلایا۔ بین بولا۔ ''میرا کھانے کا موڈ نہیں ہے۔''

''میرا بھی۔'' شاٹ نے کہا۔ ''اب اگلا کھیل شروع کرو۔''

''کیوں نہیں۔'' جان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ تم دونوں کو بھوک نہیں ہے کیونکہ اگلا کھیل کھانے سے متعلق ہے۔''

وہ دونوں متجسس ہو گئے۔ ''کھانے سے متعلق؟''

''ہاں ایک منٹ رکو......'' جان کچن کی طرف گیا جب واپس آیا تو اس نے دو ڈھکی ہوئی قابیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ اس نے میز پر رکھ دیں۔ ''میں نے بتایا تھا کہ میں بہت اچھا کک بھی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری بنائی ہوئی ڈش تم دونوں کو پسند آئے گی۔''

''اس میں کھیل کیا ہے؟'' بین نے سوال کیا۔

''دونوں قابوں میں برابر کی مقدار میں کھانا ہے۔ جو پہلے ختم کرے گا وہ جیت جائے گا۔'' جان نے کہتے ہوئے بیک وقت دونوں قابوں سے ڈھکن ہٹا دیا۔ شاٹ اور بین نے ایک ساتھ جھک کر دیکھا اور پھر ایک ساتھ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹے۔ بین دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

''کتا...... تم نے کتا پکا دیا ہے۔''

دونوں قابوں میں پپی کے جسم کے دو حصے کر کے ان کو بہت اچھے طریقے سے پکایا ہوا تھا۔ اس میں سینہ اور آگے پیچھے کی دونوں ٹانگیں شامل تھیں۔ سر، کھال اور اندر کی آلائشیں صاف کر دی گئی تھیں۔ جان نے کہا۔ ''ہاں یہ بے چارہ مر گیا تھا اور اس کی لاش ملنے پر اس کا خبیث مالک میرے خلاف پولیس کے پاس دوڑا جاتا اور ممکن ہے وہ مجھ سے کوئی تعلق تلاش کر ہی لیتی اس لیے میں نے اسے استعمال کر لیا۔ کھال، سر اور باقی حصے میں نے گرشر میں ڈال کر قیمہ کر کے بہا دیے ہیں اور یہ تم لوگ کھا لو گے۔ اس کا وجود ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ اب اس کا مالک جو چاہے سمجھتا رہے۔''

''میں نہیں کھا سکتا۔'' بین نے انکار کیا۔

''بیس ہزار ڈالرز۔'' جان نے کہا۔

''نہیں۔'' بین کا انکار برقرار رہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔'' شاٹ نے گھبرا کر کہا۔ ''ہمیں ایک کتا ہی تو کھانا ہے۔''

''آدھا کتا۔'' جان نے تصحیح کی۔

''میں کتا نہیں کھا سکتا۔''

''تیس ہزار ڈالرز۔''

''نہیں۔'' اس بار بین کا انکار کمزور ہو گیا تھا۔ نورما آگے آئی اور اس نے جان کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے اعلان کیا۔

''اوکے پچاس ہزار ڈالرز، یہ میری آخری پیشکش ہے۔''

''ہاں۔'' اس بار بین کے منہ سے نکلا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ شاٹ نے بھی پھرتی دکھائی۔ جان ان کی طرف جھکا اور بولا۔

''رقم بہت بڑی ہے اس لیے تمہیں اپنا حصہ دو منٹ سے پہلے ختم کرنا ہوگا اور جو دو منٹ میں اور پہلے کامیاب رہا وہی فاتح ہوگا۔''

''دو منٹ کم ہیں۔'' شاٹ نے کہا۔

''ہاں کیونکہ رقم بہت بڑی ہے۔''

پچاس ہزار ان کے لیے واقعی بڑی رقم تھی۔ اگر بین جیت جاتا تو وہ قرض سے نجات حاصل کر لیتا۔ یہ سوچ کر وہ آمادہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر اب بھی کراہت آمیز تاثرات تھے۔ جان نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جیسے ہی میں ریڈی کہوں تم لوگ کھانا شروع کر دو گے۔ ہر دس سیکنڈ بعد میں وقت کا اعلان کروں گا۔ میرے اسٹاپ کہنے تک اگر یہ سب ختم نہیں ہوا تو تم دونوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ تم متفق ہو؟''

انہوں نے سر ہلایا اور جیسے ہی جان نے 'ریڈی' کہا انہوں نے پلیٹ سے اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔ وقت دو منٹ تھا اور پپی چھوٹا تھا مگر اس وقت انہیں بڑا لگ رہا تھا، اس لیے وہ وحشیوں کی طرح کھا رہے تھے۔ حسب معمول نورما اس منظر کی بھی ویڈیو بنا رہی تھی۔ جان ہر دس سیکنڈ بعد اعلان کرتا کہ ان کے پاس کتنا وقت رہ گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ رکھی جانے والی ہڈیوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ ان پر گوشت تو باقی نہیں رہا ہے۔ اس نے خبردار کیا تھا کہ گوشت چھوڑنے کی صورت میں وہ مقابلے سے باہر ہو جائیں گے اس لیے شاٹ اور بین کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔

''دس سیکنڈ۔'' جان نے اعلان کیا اور کاؤنٹ ڈاؤن کرنے لگا۔ ''نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک، صفر اور اسٹاپ۔''

اتفاق سے اسی لمحے بین اور شاٹ نے اپنے اپنے حصے کا آخری ٹکڑا بھی حلق سے اتار لیا تھا۔ نورما اور جان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نورما بولی۔ ''مقابلہ برابر کا رہا ہے۔''

''ہاں دونوں نے ساتھ ہی ختم کیا ہے۔''

''تو، انعام دونوں کو ملے گا؟'' شاٹ نے امید سے کہا۔

''نہیں انعام ایک ہی کو ملے گا۔'' جان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک منٹ' ایک کام ہو سکتا ہے۔'' وہ کچن کی طرف چلا گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بین کی انگلی تھی۔ ''جو اسے کھائے گا وہ فاتح ہوگا۔''

''میں تیار ہوں۔'' شاٹ نے کہا۔

''یہ میری انگلی ہے۔'' بین غرایا۔

جان نے انگلی کچھ دور فرش پر پھینک دی۔ ''میں تین تک گنوں گا اور تین کہتے ہی تم دونوں میں سے جو پہلے انگلی

تک پہنچ کر اسے کھانے میں کامیاب رہا وہی فاتح ہو گا۔ایک......دو......تین۔''

وہ دونوں کرسی سے اٹھ کر وحشیانہ انداز میں جھپٹے تھے۔شاٹ آگے تھا، اس نے جست لگائی اور بین اس کے اوپر گرا۔انگلی شاٹ کے نیچے دب گئی تھی۔بین اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر شاٹ نے انگلی تلاش کی اور منہ میں ڈال لی، وہ اسے نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔بین نے اسے سیدھا کیا اور اس کی گردن دبوچ لی۔وہ شاٹ کو انگلی نگلنے سے روک رہا تھا۔ساتھ ہی وہ اس کا منہ کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔گلے پر دباؤ کی وجہ سے شاٹ ناکام اور بین اس کے منہ سے انگلی نکلوانے میں کامیاب رہا۔اس نے انگلی منہ میں ڈالی اور جلدی سے نگل گیا۔وہ کامیاب رہا تھا اس لیے اس نے شاٹ پر دباؤ ختم کر دیا تھا، اس لیے اس نے بین کو اچھال کر نیچے گرایا اور اس کے اوپر آ کر دیوانہ وار اس پر گھونسے برسانے لگا۔ساتھ ہی وہ اسے چیخ چیخ کر گالیاں دے رہا تھا۔بین نے دفاع کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔شاٹ کے طاقتور گھونسوں نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے اور اگر جان آ کر اسے نہ روکتا تو شاید وہ اسے جان سے مار دیتا۔

''بس......بس۔'' جان نے کہا اور اسے کھینچ کر بین پر سے اٹھا لیا۔وہ بے سدھ پڑا تھا۔

''میں اسے قتل کر دوں گا۔'' شاٹ نے بپھرے لہجے میں کہا۔جان اسے بار تک لایا اور اسے بیئر کی بوتل تھما دی۔

''آؤ ہم ذرا تازہ ہوا لیں۔'' جان نے بے ہوش پڑے بین کی طرف دیکھا۔نورما اپنی جگہ بیٹھ گئی تھی۔وہ دونوں ٹیرس پر نکل آئے۔یہاں سے نیچے دور تک پھیلے لاس اینجلس کی روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔شاٹ نے بیئر کا ایک گھونٹ لیا اور شکایتی انداز میں بولا۔

''یہ میرا دوست ہے......تم نے دیکھا اس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔اس نے مجھے ایک ڈالر بھی کمانے کا موقع نہیں دیا۔''

''یہ تو ہے۔'' جان نے سر ہلایا۔''مجھے لگ رہا ہے اب کھیل ختم ہو گیا ہے کیونکہ بین حصہ لینے کے قابل نہیں رہا ہے۔''

''دوسرے لفظوں میں مجھے بس تین ہزار ڈالرز ملیں گے اور یہ ساڑھے اٹھاسی ہزار ڈالرز لے جائے گا۔''

جان نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔''نہیں کھیل ابھی جاری ہو سکتا ہے۔''

شاٹ چونکا۔''جاری رہ سکتا ہے......وہ کیسے؟''

جان نے اندر دیکھا جہاں نورما تولیا گیلا کر کے بین کے چہرے پر پھیر رہی تھی۔ان دونوں کے باہر جاتے ہی وہ اٹھ کر بے ہوش بین کے پاس آئی تھی۔وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔جان نے آہستہ سے شاٹ سے کہا۔''تم نے کہا تھا کہ تم بین کو قتل کر دینا چاہتے ہو؟''

''ہاں میں نے کہا تھا۔'' شاٹ جلدی سے بولا۔''لیکن اس نے میرے ساتھ بہت برا کیا اسی لیے میں نے کہا تھا۔''

''مجھے تمہارے کہنے پر اعتراض نہیں ہے۔میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم میں اپنی بات پر عمل کرنے کی ہمت ہے؟''

شاٹ زیادہ چونکا۔''تت......تمہارا مطلب ہے؟''

''بین کو قتل کر دو۔'' جان کا لہجہ سرد ہو گیا۔''اس کے پاس جتنی دولت ہے وہ سب تمہاری ہو جائے گی۔''

''لیکن قتل......؟''

''کسی کو پتا نہیں چلے گا۔لاش بھی میں ٹھکانے لگا دوں گا۔''

شاٹ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔''بین کو جو رقم ملی ہے وہ مجھے مل جائے گی؟''

''بالکل ساڑھے اٹھاسی ہزار ڈالرز تمہارے ہوں گے۔'' جان نے زور دے کر کہا۔

''مگر پولیس اسے تلاش کرے گی۔''

''پولیس یا کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔اس نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا تھا۔اس لیے وہ بھی پولیس کو کچھ نہیں بتا سکے گی۔میں اور نورما بھی کسی سے نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم خود اس میں شامل ہیں۔پھر لاش بھی میں ٹھکانے لگاؤں گا۔''

شاٹ سوچ میں پڑ گیا۔جان بہ غور اسے دیکھ رہا تھا۔اس نے پھر کہا۔''ایک پیشکش اور ہے۔تم نے دیکھا میرے پاس تین لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم ہے۔اگر تم نے بین کو قتل کر دیا تو اتنی ہی رقم تمہیں بونس کی اور ملے گی۔یعنی ساڑھے اٹھاسی ہزار ڈالرز، کل ملا کر تمہیں ایک لاکھ ستتر ہزار ڈالرز ملیں گے۔''

''ایک لاکھ ستتر ہزار ڈالرز۔'' شاٹ نے خواب ناک انداز میں کہا اور اندر دیکھا جہاں بین اٹھ بیٹھا تھا۔شاٹ کے مکوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور ایک آنکھ سوجن سے بند ہو گئی تھی مگر وہ ہوش میں آ گیا تھا۔شاٹ نے سر ہلایا۔''میں اسے قتل کروں گا۔''

''زبردست۔'' جان نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔''میں تمہارے اندر ایک بہادر آدمی کو دیکھ رہا ہوں۔''

وہ اندر آئے تو بین رقم کی گڈیاں ایک بیگ میں رکھ رہا تھا۔ اتنی رقم وہ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ نورما ایک طرف کھڑی تھی۔ جان نے اندر آتے ہوئے شاٹ کو اشارے سے کاؤنٹر پر رکھے اس کے چاقو کی طرف متوجہ کیا اور نورما کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ بین کی پشت ان کی طرف تھی۔ جان نے نورما کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ شاٹ نے کاؤنٹر سے اپنا چاقو اٹھایا اور دبے قدموں بین کی طرف بڑھا۔ نورما اور جان دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شاٹ نے ان کی طرف دیکھا تو جان نے سر ہلا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ شاٹ بین کی پشت تک پہنچا اور اس نے خنجر بلند کیا۔ بین سست روی سے بیگ میں گڈیاں رکھ رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ موت اس کے سر تک آ گئی تھی۔ شاٹ کے چہرے پر تذبذب تھا، اس نے ایک بار پھر جان کی طرف دیکھا اور اس نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ اپنا کام کرے۔ شاٹ نے ہمت کرنے کی کوشش کی مگر جب وہ وار کرنے جا رہا تھا اس کی ہمت جواب دے گئی۔ جس شخص کو سالوں سے اپنا دوست سمجھتا آیا تھا اسے قتل کرنا اس کے بس سے باہر تھا، اس نے جان اور نورما کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلایا جن کے چہروں پر مایوسی تھی اچانک نورما چلائی۔

''بین بچو۔''

بین تیزی سے گھوما اور اس کے ہاتھ میں دبے پستول سے شعلہ نکلا اور شاٹ جھٹکے سے پیچھے گرا۔ یہ نورما کا پستول تھا۔ شاٹ حلق سے خرخراتی آوازیں نکالتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی اس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ بین اپنی واحد کھلی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاٹ نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ ''تم نے...... ایسا کیوں...... کیا؟''

''اپنی بیوی اور اپنے بچے کے لیے۔'' بین نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا دوست۔''

شاٹ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر لڑھک کر فرش پر گرا اور چند سانسیں لے کر دم توڑ دیا۔ بین نے پستول صاف کر کے تپائی پر رکھ دیا۔ جان اور نورما آگے آئے۔ نورما نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم ہی جیتو گے۔''

''میں کھیل جیت گیا لیکن دوست ہار گیا۔'' بین نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''باقی رقم دو اب میں گھر جاؤں گا۔''

''او، کیوں نہیں۔'' جان بولا اور اس نے ڈبے سے مزید ساڑھے اٹھاسی ہزار ڈالرز نکالے اور بین کے حوالے کیے۔ نورما نے شاٹ کی جیب سے تین ہزار ڈالرز نکالے اور وہ بھی بین کو دے دیے۔ اس نے ساری رقم بیگ میں ڈالی اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ جان اور نورما اسے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ بین سڑک پر پہنچا اور گلی کے سرے.... کی طرف چل پڑا۔ نورما نے جان سے کہا۔ ''یہ اپنے گھر تک پہنچ جائے گا؟''

''کیوں نہیں؟'' جان بولا۔ ''تم نے اس کی ہمت نہیں دیکھی' وہ فاتح ہے۔''

نورما مسکرانے لگی۔ ''ہمارے اگلے آن لائن جانے والے گیم شو کا فاتح۔''

''مجھے یقین ہے پیٹر اور گیری نے پورے گھر میں لگے کیمروں کا بہترین استعمال کیا ہوگا، کوئی منظر مس نہیں ہوا ہوگا۔'' جان نے کہا۔ ''مناسب ایڈیٹنگ کے بعد ایک بہترین گیم شو تیار ہوگا جو ہم اپنے کسٹمرز کو آن لائن دکھا سکیں گے۔''

نورما نے آگاہ کیا۔ ''پچھلے ایک ہفتے میں ہمارے کسٹمرز کی تعداد میں سات فیصد اضافہ ہوا ہے۔''

جان نے سر ہلایا۔ ''پچھلے ہفتے ہمیں ساڑھے چار لاکھ ڈالرز کی آمدنی ہوئی تھی۔ اس بار امید ہے یہ آمدنی پانچ لاکھ ڈالرز سے تجاوز کر جائے گی۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارا یہ آئیڈیا اتنا کامیاب رہے گا۔''

''ہاں کیونکہ لوگ اب ٹی وی پر آنے والے نام نہاد رئیلٹی شوز سے بیزار ہو گئے ہیں، وہ حقیقی شو دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے رقم بھی خرچ کرنے کو تیار ہیں۔''

''ان دونوں نے تمہیں نہیں پہچانا کہ تم کسی زمانے میں ٹی وی پر رئیلٹی شو کرتے تھے۔''

''میں ہمیشہ ایسے آدمی چنتا ہوں جن کی ٹی وی سے دلچسپی کم سے کم ہو۔''

''اگلے پروگرام کے لیے کھلاڑیوں کی تلاش کب کرو گے؟''

جان نے مسکرا کر نورما کی طرف دیکھا۔ ''کل سے شروع کرتے ہیں۔ امید ہے ایک ہفتے میں اگلا شو بھی تیار ہوگا۔'' جان نے کہا اور برابر والے مکان کی طرف بڑھا۔ یہ مکان بھی اسی کا تھا اور وہ اسے لاک کرنے جا رہا تھا۔ کھیل کے لیے اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس سارے کھیل میں اس کا واحد نقصان اس کا ننھا کتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل ہی اپنے لیے دوسرا کتا لے آئے گا۔

شیش محل

اسماء قادری

قسط: 5

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے رب کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات، واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی ذاتی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوؤں اور ناآسودہ محبتوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ عرش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کون سا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

اس کے کمرے میں آنے والی ان دونوں برقع پوش خواتین کے چہرے اگرچہ نقاب میں چھپے ہوئے تھے لیکن ان کی تابناکی ایسی تھی کہ نقاب کے پیچھے سے بھی چھلکے جاتی تھی۔ برقع پوشوں کی اجلی رنگت اور خوب صورت آنکھیں اعلان کر رہی تھیں کہ لفافے کے اندر جو مضمون ہے، وہ بھی بہت خوب ہے۔ فاروق نے لمحہ بھر میں ہی انہیں شناخت کر لیا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو اس نے ان دونوں میں سے ایک کو لائبریری میں اسی طرح نقاب میں چہرہ چھپائے اپنے مقابل بیٹھا دیکھا تھا۔

''آداب۔'' پہچان کے مرحلے سے گزرنے کے بعد وہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، اس سے قبل ہی دو میں سے ایک نقاب پوش خاتون نے جو دوسری کے مقابلے میں چھریرے بدن کی اور جوان معلوم ہوتی تھی، ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے کھنکتی آواز میں کہا۔ اس آواز کو سننے کے بعد شک کی رہی سہی گنجائش بھی ختم ہو گئی۔ وہ سو فیصدی چاند بانو تھی۔ بمبئی کے بازارِ حسن میں لکھنوی تربیت دینے والی زمرد بائی کے چمن کا سب سے خوش نما اور خوشبودار پھول جس کی شہرت آج کل چہار سو پھیلی ہوئی تھی اور بڑے بڑے ساہوکار اس کے درشن کے لیے دونوں ہاتھوں سے اپنی دولت لٹانے کو تیار رہتے تھے۔ حسن کا شاہکار یہ لڑکی جسے چاند بانو کہا جاتا تھا، کیوں خود چل کر فاروق تک آئی تھی، اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی بڑے حساب کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جذبہ جو چاند کو چکور بنائے دے رہا تھا، ہر ایک کی طرح فاروق پر بھی منکشف تھا اور اس انکشاف نے اسے عجیب بے چینی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ چاند بانو کو کس طرح یہ بات سمجھاتا کہ 'مجھے نہ چاہو' کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھا سکا تھا کہ 'جولیٹ کو مت چاہو' اسے معلوم تھا کہ یہ جو چاہنے کا عمل ہوتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی بے اختیاری نہیں ہوتی۔ یہ بے اختیاری انسان کی ساری عقل سمجھ کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور وہ اچھی طرح جاننے کے باوجود کہ جس راہ پر چل رہا ہے، اس پر چل کر کچھ حاصل ہونے والا نہیں، اپنے قدموں کو روک نہیں پاتا۔

''لگتا ہے جناب نے ہمیں پہچانا نہیں۔'' اسے خاموش گم صم پا کر چاند بانو نے خیال ظاہر کیا اور چہرے پر پڑا نقاب الٹ دیا۔ سیاہ برقعے کے ہالے میں اس کا چاند چہرہ اپنی تمام تر تابناکی سمیت فاروق کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ناتا کے پاڑے پر بجنے والی محفل کے سوا فاروق نے اسے کسی بھی ملاقات میں آرائشِ حسن کے لیے مصنوعی سہارے لیتے نہیں دیکھا تھا لیکن اسے تو بنانے والے نے خود اس قدر سجا بنا کر بھیجا تھا کہ وہ سادگی میں بھی غضب ڈھاتی تھی اس وقت بھی وہ اپنے دھلے ہوئے بالکل صاف چہرے کے ساتھ کسی گلاب کی کھلتی کلی کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ رعبِ حسن نے فاروق کو پل بھر کے لیے ساکت کیا لیکن پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کو پہچان گیا تھا لیکن حیران تھا کہ آپ یہاں کیسے؟ بہرحال، آیئے تشریف رکھیے۔''

''شکریہ۔'' چاند بانو نے کہتے ہوئے اپنی ساتھی سمیت نشست سنبھال لی۔ نشست سنبھالنے کے بعد اس کی ساتھی نے بھی نقاب الٹ دیا۔ وہ چاند بانو سے چھ سات سال بڑی ایک خوش شکل لڑکی تھی لیکن چاند بانو کے سامنے اس کی خوب صورتی سورج کے سامنے چراغ کے مانند تھی۔

''یہ کاجل ہیں۔ ہم ساتھ ہی رہتے ہیں۔'' چاند بانو نے تعارف کی رسم نبھائی اور کاجل نے بھی فاروق کو آداب کہا۔ اس کے آداب کا جواب دے کر فاروق دوبارہ چاند بانو کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ وہ اپنی کھنکتی ہوئی آواز میں اسے بتا رہی تھی۔

''آپ کے اسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع ملنے پر ہم یہاں آنے کے لیے سخت بے چین تھے لیکن بائی جی کی طرف سے اجازت ملنا مشکل تھی۔ اپنی مشکل کا حل ہم نے کاجل کی صورت میں نکالا اور انہیں راضی کر لیا کہ یہ بازار کے بہانے ہمارے ساتھ اسپتال چلیں۔ ہمارے خاص ملازم کو تو آپ جانتے ہی ہیں، وہ باہر تانگے میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ ہمیں بازار لے جائیں گے تاکہ ہمارے بہانے کا بھرم قائم رہے۔''

''میں کچھ ایسا خاص بیمار نہیں تھا۔ آپ نے ملاقات کے لیے خوامخواہ ہی اتنی زحمت اٹھائی۔''

''زحمت کیسی؟ زحمت تو وہ اذیت تھی جو آپ کے زخمی ہونے کی خبر سننے کے بعد ہمارے دل کو تڑپائے دے رہی تھی۔ ہمیں کسی پل چین نہیں آتا تھا کہ آپ ہماری وجہ سے اس حال کو پہنچے۔ کوئی لاکھ ہمیں بتاتا کہ آپ خیریت سے ہیں لیکن آپ کو روبرو دیکھے بغیر ہمیں یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تو تھوڑی سی تسلی ہو گئی ہے لیکن آپ یہ مت کہیے کہ آپ اتنے معمولی بیمار ہیں کہ آپ کو عیادت کی بھی ضرورت نہیں۔ سچ میں چند دن ہی تو گزرے ہیں لیکن ہمیں ایسا لگ رہا ہے کہ ہم نے اپنے بالا خانے پر

جس شخص کو دیکھا تھا، آج اس کی پرچھائیں دیکھ رہے ہیں۔ کتنے کمزور ہو گئے ہیں آپ اور ہم نادم ہیں کہ اس کا سبب ہم ہیں۔ نہ اس روز ہم اصرار کر کے آپ کو ملاقات کے لیے بلاتے، نہ آپ کا مجو دادا اور گورے ولیم سے واسطہ پڑتا۔'' بولتے بولتے چاند بانو کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور فاروق نے اپنے دل میں درد سا محسوس کیا۔ یہ لڑکی جس کی ایک ایک ادا پر لوگ لاکھوں لٹانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، خود اس پر مرمٹی تھی اور یہ کتنا غلط ہوا تھا کہ اس کا جولیٹ کی محبت سے لبریز دل کسی اور کی محبت کو قبول کرنے کی گنجائش ہی نہیں رکھتا تھا۔

''آپ خوامخواہ ہی خود کو الزام دے کر بوجھل ہو رہی ہیں۔'' چاند بانو کی کیفیت پر دل گرفتہ اس نے پہلے خود کو مجتمع کیا پھر بولنے لگا۔ ''آپ کے بلاوے پر آپ کے ہاں آنا اور پھر مجو دادا اور ولیم سے سامنا ہو جانا تو محض ایک بہانہ تھا جو ان لوگوں کو کہیں بھی مل سکتا تھا۔ حقیقت میں تو مجو دادا مجھ پر پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھا تھا اور اسے میرے ساتھ وہ سب کرنا ہی تھا جس پر آپ فضول میں اتنی شرمندہ ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو میری خاصی بچت ہی ہو گئی ورنہ وہ لوگ تو دل میں نہ جانے کون کون سے ارمان چھپائے بیٹھے تھے۔ اگر ان کے ارمان پورے ہو جاتے تو شاید آج آپ میری خیریت معلوم کرنے کے لیے اسپتال آنے کے بجائے میری قبر پر پھول چڑھانے آئی ہوتیں۔''

''اللہ نہ کرے۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' چاند بانو نے بے ساختہ ہی اپنا دل تھام لیا اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ اسے ٹوکا۔

''واقعی فاروق صاحب! یہ تو آپ کی زیادتی ہے جب کوئی اتنا ٹوٹ کر چاہنے والا سامنے ہو تو اس کے سامنے اپنی موت کا نام لے کر اس کے دل کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔'' اب تک خاموشی سے چاند بانو کے ساتھ بیٹھی کاجل نے بھی لب کشائی کی اور شکوہ کرنے کے انداز میں بولی۔

''میرا مقصد کسی کو تکلیف دینا نہیں تھا۔ میں تو بس ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔'' فاروق نے بوکھلا کر اپنی صفائی پیش کی۔

''دنیا کا ہر سچ کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ حقائق اور سچائیوں کو سب جانتے ہیں لیکن کچھ پل کے لیے ان سے نظریں چرا کر اپنے جینے کا سامان کر لیتے ہیں جیسے اس پگلی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ آپ کو چاہ کر چاند پانے کی تمنا کر رہی ہے لیکن خود کو روکے بغیر بند آنکھوں سے پیار کی راہ پر چلی جا رہی ہے۔'' کاجل کی بات نے فاروق اور چاند بانو دونوں کو ہی نظریں جھکا کر خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا کہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے بس تھے اور کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ خریداری کے لیے بازار بھی جانا ہوگا۔'' خاموشی کے ان بوجھل لمحوں کو چاند بانو کی آواز نے توڑا۔

''ہاں چلتے ہیں۔ تم تانگے میں جا کر بیٹھو۔ میں فاروق صاحب سے کچھ باتیں کر کے ابھی آتی ہوں۔'' کاجل نے سنجیدگی سے اسے حکم دیا تو وہ پل بھر کے لیے حیرانی سے ٹھٹکی ضرور لیکن پھر کوئی سوال کیے بغیر فاروق کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔ فاروق اپنی جگہ حیران تھا کہ کاجل کو اس سے تنہائی میں کیا بات کرنی ہے کیونکہ وہ تو آج پہلی بار ہی اس سے مل رہا تھا اور پہلی ملاقات میں کسی رازداری کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔

''اتنے حیران مت ہوں۔ مجھے آپ سے چاند بانو کے حوالے سے ہی کچھ بات کرنی ہے۔'' کاجل نے اس کی حیرانی بھانپ لی اور تدبر سے بولی۔

''جی فرمائیے۔'' فاروق بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''چاند بانو بہت کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی ہے اور ستم یہ ہے کہ اتنی نوعمری میں محبت جیسے عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہماری دنیا کی لڑکیوں کے لیے سچی محبت ایک عذاب ہی تو ہے، ہاں جھوٹ موٹ کی محبتیں ہم جتنی کریں ہمیں اتنا ہی فائدہ دیتی ہیں۔ بائی جی کو چاند بانو کی اس کیفیت پر سخت تشویش ہے۔ انہوں نے دنیا دیکھ رکھی ہے اور خوب جانتی ہیں کہ چاند بانو کس راہ پر چل نکلی ہے۔ چاند بانو سمجھ رہی ہے تاکہ وہ انہیں دھوکا دے کر آپ سے ملنے کے لیے آئی ہے تو یقین جانیے کہ وہ بالکل غلط ہے۔ بائی جی کو اچھی طرح علم ہے کہ وہ بہانے سے کیوں باہر نکلی ہے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ سے کہوں کہ آپ چاند بانو کو سمجھائیں۔ آپ سمجھائیں گے تو شاید بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔''

''لیکن میں کیا سمجھاؤں؟'' فاروق سٹپٹا سا گیا۔

''یہی کہ وہ سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی خراب نہ کرے۔ جس دن سے آپ کا بالاخانے پر مجو دادا سے جھگڑا ہوا ہے، چاند بانو نے کسی سے ملاقات نہیں کی ہے اور کوئی محفل سجانے پر تیار نہیں ہوئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہوتی تو بائی جی اسے تھوڑی مہلت دے دیتیں اور انتظار کر لیتیں کہ وہ خود کو سنبھال لے گی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک مشہور ہدایت کار چاند بانو کو اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں لیکن وہ

راضی ہی نہیں ہوئی اور بائی جی کو ڈر ہے کہ اس کی ضد کی وجہ سے یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اسی لیے اسے سمجھانے کی ذمے داری انہوں نے آپ کو سونپی ہے۔ آپ کا کہا وہ ٹال نہیں سکے گی۔'' کاجل نے اس کے سامنے مدعا بیان کیا۔

''لیکن میں اس سے یہ سب کیسے اور کیوں کہوں؟''

فاروق بدک سا گیا۔ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا، وہاں کسی عورت کا فلمی دنیا میں جانا تو دور کی بات، عورتوں کا فلم دیکھنا بھی بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کے خاندان کی کسی عورت نے آج تک سنیما گھر کی صورت نہیں دیکھی تھی اور اس سے کہا جا رہا تھا کہ وہ چاند بانو کو فلموں میں کام کرنے کے لیے راضی کرے۔

''میں آپ سے یہ درخواست اس لیے کر رہی ہوں کہ وہ آپ کی بات مان لے گی۔'' کاجل نے اپنے تئیں اس کی بات کا سب سے مناسب جواب دیا۔

''لیکن میں یہ مناسب نہیں سمجھتا۔ میں کیسے کسی عورت کو ناچنے گانے کے لیے دنیا کے سامنے پیش ہو جانے کی نصیحت کر سکتا ہوں۔'' اس بار فاروق نے واضح طور پر اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''اوہ.....'' اس کی بات سن کر کاجل نے ایک گہرا سانس لیا پھر کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''اگر آپ اسے ایسی نصیحت نہیں کر سکتے تو پھر نکاح پڑھوا کر اپنے گھر میں بٹھالیں کیونکہ وہ جس دنیا کی باسی ہے اسے ہر صورت یہی کام انجام دینا ہے۔'' اس کے اس مطالبے پر فاروق نے چپ سادھ لی۔ ایک طرف دل کی بے بسی تھی تو دوسری طرف اپنی تہی دامنی۔ اس کے پاس کب کوئی ایسا گھر تھا جہاں وہ کسی کو بسا سکتا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے لیکن آپ یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ فلمی لائن میں آ جانے میں ہی چاند بانو کی بہتری ہے۔ فلموں میں کام کر کے وہ اپنے حسن اور فن کی کمائی تو ضرور کھائے گی لیکن عزت کو بچالے گی اور کسی ایک مرد کی بن کر رہنے کی خواہش مند طوائف زادی کے لیے یہ بھی بہت ہوتا ہے۔'' اسے خاموش پا کر کاجل نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور اسے قائل کرنے لگی۔

''مگر......'' وہ متذبذب ہوا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ فلموں کا ماحول بھی کچھ اچھا نہیں ہوتا۔''

''عورت نہ چاہے تو کون اسے ورغلا سکتا ہے۔ چاند بانو وہاں خود کو بچالے گی۔ آپ اس کا موازنہ عام عورت سے نہ کریں۔ عام عورت اور ایک طوائف زادی کے لیے عزت کا معیار ایک جیسا نہیں ہوتا۔ شریف گھرانے کی عزت دار عورت کسی غیر مرد کو اپنی ایک جھلک دکھانے میں جھجکتی ہے لیکن طوائف سوچتی ہے کہ محض حسن و ادا کو دکھا کر باقی کی عزت بچالے تو بھی بہت ہے۔'' کاجل کی بیان کی گئی تلخ حقیقت نے اسے لبوں کو سینے پر مجبور کر دیا۔

''تو پھر آپ اسے قائل کرنے کی کوشش کریں گے نا؟'' اس کی خاموشی نے کاجل کو باور کروا دیا کہ اب اس کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے، سو بڑی آس سے دریافت کیا۔

''جی ہاں لیکن ابھی تو میں خود مجبور ہوں۔ نہ جانے کب اسپتال سے ڈسچارج کیا جاؤں گا۔'' اس نے بہت دھیمی آواز میں اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ دل سے قائل نہیں تھا کہ چاند بانو کو فلمی دنیا میں بھیجا جائے لیکن عقلی دلائل نے بے بس کر دیا تھا۔

''اللہ کرے کہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو کر اسپتال سے رخصت ہوں لیکن اگر خدانخواستہ زیادہ دن یہاں رکنا پڑا تو میں خود چاند بانو کو لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔'' کاجل نے بہت مہذبانہ انداز میں اسے جواب دیا۔ اس کی بول چال اور رکھ رکھاؤ میں بھی وہی بات تھی جو زمرد بائی کے کوٹھے کا خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ بمبئی کی عام طوائفوں کی طرح اکھڑ لہجے میں بات کرنے کے بجائے کچھ لکھنوی ادا کے ساتھ بات کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' فاروق نے مختصر بیانی سے کام لیا۔

''بہت شکریہ۔ اب اجازت دیجیے۔ چاند بانو بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہی ہو گی۔'' کاجل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے آداب کرنے کے بعد چہرے پر نقاب ڈال کر باہر نکل گئی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد بھی فاروق بہت دیر تک گم صم کیفیت میں بیٹھا رہا۔ سگریٹ کی طلب میں باہر جانے والا شیدو واپس آیا تو اس نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ اسے باہر ہی علم ہو گیا تھا کہ دو برقع پوش خواتین اس سے ملاقات کے لیے آئی ہیں اس لیے باہر ہی رک گیا تھا اور اب بھی اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فاروق سے ان خواتین کے بارے میں استفسار کر سکے۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تو کیتھرائن چلی آئی۔ وہ شیڈول کے مطابق اسے دوائیں اور انجکشن دینے آئی تھی۔

''آج تو آپ کی طبیعت کافی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر پرکاش بھی آپ کی طرف سے خاصے سیٹسفائی نظر آتے ہیں۔ اسی لیے تو انہوں نے آپ کے لیے وزیٹرز الاؤ کر دیے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے شاید آپ کی کوئی ریلیٹو ملنے آئی تھیں۔ برقعے میں تھیں پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ بہت خوب صورت ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو آپ کی قریبی رشتے دار ہیں۔'' اس کے بائیں ہاتھ کی آستین اوپر کر کے بازو پر انجکشن لگاتے ہوئے بولتی کیتھرائن کے لہجے میں ستائش کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔ فاروق نے اس کی بات کے جواب میں محض ہلکا سا ''ہوں'' کرنے پر اکتفا کیا۔ وہ چاند بانو اور کاجل کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیتھرائن نے بھی شاید اس کے اس انداز کو محسوس کر لیا چنانچہ کچھ کھسیانی سی ہو گئی اور اسے معمول کی ہدایات دینے کے بعد اپنا سامان سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد فاروق نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت اس کا کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد زندگی کے سات آٹھ برسوں میں اس نے اس دنیا کے کئی رنگ دیکھے تھے لیکن ہر بار کوئی نیا رنگ سامنے آنے پر اداس ہو جاتا تھا۔ اب بھی اسے طوائف اور شریف زادیوں کے لیے سامنے آنے والا عزت کا دہرا معیار دکھی کر رہا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو واقعی وہ چاند بانو کو اپنی چھت کے نیچے عزت کی زندگی گزارنے کا موقع دے دیتا لیکن بس میں ہی تو کچھ نہیں تھا۔ جولیٹ کے سوا اسے کسی دوسری عورت کی گنجائش ہی نظر نہیں آتی تھی۔ اپنے اور چاند بانو کے حال پر جلتے کڑھتے آخرکار کسی پل اس پر غنودگی چھا گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں ربن کی دھیمی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے سوئے ہوئے ہونے کا خیال کر کے بہت ہلکی آواز میں شیدو سے اس کی طبیعت کے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔ فاروق نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا تو فوراً متوجہ ہو گیا اور پوچھنے لگا۔

''کیسی طبیعت ہے شہزادے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' فاروق نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔ سوتے وقت وہ جو کچھ سوچتا رہا تھا، اس کا اثر اب بھی طبیعت پر تھا۔

''کچھ ست دکھائی پڑتا ہے۔'' ربن سے اس کے لہجے کی بیزاری کیونکر چھپی رہ سکتی تھی۔ سو اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''بے وقت سو گیا تھا اس لیے طبیعت ست ہو رہی ہے۔'' اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور بستر پر اٹھ بیٹھا پھر یکدم ہی نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

''میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں تو اتنی دیر میں چائے کا بندوبست کر لے۔'' اس کا مخاطب شیدو تھا جو فوراً ہی تابعداری سے حرکت میں آ گیا۔ وہ باتھ روم سے فارغ ہو کر آیا تو ربن کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا اور اس کے ماتھے پر سوچ کا جال تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو دادا؟'' اس نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''تیرے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''میرے بارے میں؟ میرے بارے میں کیا سوچتا؟'' ربن کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔

''ڈاکٹر پرکاش سے اپن کی بات ہوئی تھی۔ وہ بول رہا تھا کہ تیرے کو اچھے علاج کے ساتھ اچھے ماحول کی بھی ضرورت ہے۔ کسی پہاڑی علاقے میں لے جانے کو بولتا تھا۔ اپن ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ تیرے کو کدھری لے جانے کا۔'' وہ فاروق کو اڈے سے دور رکھنا چاہتا تھا تاکہ جولیٹ کے ساتھ ہونے والا حادثہ اس کے علم میں نہ آسکے کیونکہ ڈاکٹرز کے مطابق ذہنی دباؤ اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ ادھر ڈاکٹر پرکاش نے اسے بتایا تھا کہ جلد فاروق کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ ایسے میں اسے فاروق کو اڈے سے دور رکھنے کی یہی تدبیر سوجھی کہ ڈاکٹر کے مشورے کو بہانہ بنا کر اسے کسی دوسری جگہ لے جایا جائے۔ صحت یاب ہونے کے بعد وہ واپس آتا تو اول تو حادثے کی دھول بیٹھ چکی ہوتی، دوسرے اس کے علم میں آ بھی جاتا تو نقصان کا اندیشہ نہ ہوتا۔ مکمل صحت یابی کے بعد اس کے اندر اتنی طاقت تو ہوتی کہ وہ اس صدمے کو سہہ سکے۔

''کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے دادا۔ میں اڈے پر ہی رہ کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس نے اپنی طرف سے ربن کی فکر دور کی۔

''اپن تیرے کو بولا تھا نا کہ علاج کے معاملے میں اپن تیری ایک نہیں سنے گا اور تیرے کو وہی کرنا ہوگا جو ڈاکٹرز نے بولا ہے پھر کاہے کو بار بار بیچ میں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے۔ تیرے کو کچھ بولنا ہے تو بس اتنا بول کہ کدھری جانے کو مانگتا ہے۔ شملہ، کوہاٹی، کھنڈالہ جدھری تو بولے گا اپن ادھری کا ٹکٹ کٹوا لے گا پر اس سے جاستی کچھ نہیں بولنے کا ہے۔'' ربن یکدم ہی اس پر الٹ پڑا۔ سختی کا یہ مظاہرہ اس کی مجبوری تھی۔ وہ نرمی سے کام لے کر فاروق کو اتنی رعایت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اسے اڈے پر ہی قیام

کے سلسلے میں دلائل دے سکے۔ اس کی حکمتِ عملی سے ناواقف فاروق کو اس کے اس رویے نے حیران کردیا۔ وہ اتنے برسوں سے ربن کے ساتھ تھا اور اس کا بے حد چہیتا سمجھا جاتا تھا۔ اس طویل عرصے میں ربن نے کبھی اس سے اس لب و لہجے میں گفتگو نہیں کی تھی جیسے اب کرنے لگا تھا۔ اس کے اس رویے کی اسے عادت بھی نہ تھی اور کچھ رگوں میں دوڑتے نوابی خون کا بھی اثر تھا کہ طبیعت پر ذرا گراں گزرا اور پھولے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔

''جب تم اپنی مرضی کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو تو جگہ بھی تم ہی سوچ لو۔ مجھے تو بس گلے میں پٹا ڈال کر اپنے ساتھ لے چلنا۔''

''اڑی بازی کرے گا تو اپنے گلے میں پٹا ڈالنے میں بھی پیچھے رہنے والا نہیں ہے۔'' ربن نے اس کے روٹھے لہجے کی پروا نہیں کی۔ اسی وقت شیدو چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

''ایک دم اسپیشل چائے بنوا کر لایا ہوں۔ سالے چائے والے کے سر پر کھڑے ہو کر بنوائی ہے کہ کہیں پانی میں نری چائے پتی گھول کر نہ دے دے۔ دیکھو تو کیسی خوشبو اٹھ رہی ہے۔'' کمرے کے ماحول سے ناواقف شیدو نے چائے کے برتنوں کی بھری ٹرے میز پر رکھی۔ ٹرے میں چائے کے علاوہ بسکٹ اور پیٹیز بھی نظر آرہے تھے۔

''چائے بنا کر پہلے اپنے شہزادے کو دے۔'' ربن نے معمول کے لہجے میں اسے حکم دیا تو شیدو نے سر ہلاتے ہوئے فٹافٹ چائے کی پیالی تیار کی اور اسے تھماتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بسکٹ اور پیٹیز بھی دوں فاروق بھائی...... ایک دم تازہ ہیں، اس واسطے لے آیا تھا۔''

''نہیں بس چائے کافی ہے۔'' فاروق نے انکار کردیا۔ چائے واقعی خوش رنگ اور خوشبودار تھی لیکن اپنے مزاج میں آنے والی تبدیلی کے باعث وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پا رہا تھا اور بس رواداری نبھانے پر مجبور تھا۔

☆☆☆

دونوں گھٹنے آپس میں جوڑے اپنی ٹھوڑی ان پر ٹکائے وہ گم صم سی کیفیت میں بیٹھی تھی اور صاف پتا چل رہا تھا کہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دفتر سے واپس آئے اسے لگ بھگ آدھا گھنٹا گزر چکا تھا اور وہ پورے آدھے گھنٹے سے اسی انداز میں بیٹھی ہوئی تھی حالانکہ ابھی اسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔ جوزفین کے بعد اس کی ذمے داریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ پہلے وہ چھٹی والے دن یا اپنے موڈ کے مطابق گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹا دیتی تھی لیکن اب اسے ہر حال میں سارے کام خود دیکھنے ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کا معمول بن گیا تھا کہ دفتر سے آتے ہی سب سے پہلے کچن کا رخ کرتی اور رات کا کھانا چڑھانے کے بعد گھر کی صفائی ستھرائی کرتی لیکن آج اس نے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اپنے کمرے میں آکر جو چپ چاپ بیٹھی تھی تو ابھی تک اسی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر میں ایسا کوئی تھا بھی نہیں جو اسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے مخل ہوتا۔

گھر کا دوسرا مکین جوزف تو اس سے بھی زیادہ خاموش اور اداس رہنے لگا تھا۔ جوزفین کی موت نے اسے دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ سارا وقت اپنے بستر پر دراز اس کی یادوں میں کھویا پایا جاتا تھا۔ اس کی حالت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ جوزفین کے بعد اس دنیا میں محض اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے رہ گیا ہے ورنہ اسے کسی چیز سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جولیٹ ہی اسے صبح و شام پابندی سے زبردستی کھانا کھلا دیتی تھی تو وہ چند لقمے کھا لیتا تھا ورنہ اسے کچھ ہوش نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں آتا اور اسے اس کیفیت سے نکالتا۔ اس کا تو وہ حال ہوگیا تھا کہ ماں کو موت لے گئی تھی اور باپ جیتے جی مرگیا تھا۔ ان حالات میں اپنی زخمی روح کے ساتھ وہ بڑی ہمت سے اپنی زندگی کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھی، وہ بھی سینے میں جلتی انتقام کی آگ کے طفیل ورنہ اب اسے خود بھی زندگی کی اتنی چاہ نہ رہی تھی۔ پہلے وہ دل میں جن امنگوں کو لے کر جیتی تھی، اب ان کا کوئی نام و نشان نہیں رہا تھا لیکن انتقام کی جلتی آگ کہتی تھی کہ اپنے دشمن کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر اسے کسی صورت زندگی کا دامن نہیں چھوڑنا ہے ورنہ تو عارف کی بے وفائی کے بعد اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے اور وہ گھر تو پہلے ہی بکھر گیا تھا جہاں وہ اپنے ماں باپ کی محبت کی گھنی چھاؤں میں بڑے سکھ سے رہتی تھی۔

عارف کے دفتر چھوڑ جانے کے بعد بھی اس نے اپنی ملازمت جاری رکھی۔ یہ ملازمت ایک تو اس کے معاشی مسائل کا حل تھی، دوسرے وہ دلدار آغا کے بارے میں بھی باخبر رہ سکتی تھی کہ اس جیسی ہستیوں کے معمولات سے آگاہ رہنا تو اخبار والوں کے پیشے کا تقاضا تھا۔ خود اس نے بھی آج اپنے طور پر اس کے بارے میں جاننے کی ایک کوشش

کی تھی۔ اس نے پوسٹ آفس سے ثنا کے گھر کے لیے کال بک کروا کر اس سے بات کی تھی۔ کرنے کو تو وہ دفتر سے بھی اسے فون کر سکتی تھی لیکن وہاں کھل کر گفتگو کرنا مشکل ہوتا اس لیے اس نے یہ کال بک کروائی تھی اور مسلسل دعا کرتی رہی تھی کہ اس کی ثنا سے بات ہو جائے ورنہ اس سے قبل اسے یہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اسے ثنا سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا اور ہر بار یہ پیغام ملتا تھا کہ ثنا گھر سے باہر ہے۔ اس بار اس کی دعا رنگ لائی اور ثنا نے اس کی کال ریسیو کرلی۔ وہ یہ جان کر بہت حیران ہوئی کہ اسے فون کرنے والی جولیٹ ہے۔

''تم نے مجھے کال کیوں کی جولیٹ؟ تمہیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' جولیٹ کی آواز سن کر دوستانہ گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اس نے برہم سے لہجے میں اس سے کہا۔ اس کے اس انداز پر جولیٹ کو دھچکا سا لگا اور اس نے مری ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔

''میں نے تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے کال کی تھی ثنا۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرا جو اخلاقی فرض بنتا تھا، وہ میں نے پورا کیا۔ آگے تم اپنی زندگی جس طرح چاہے گزارو لیکن مجھے بخش دو۔ آغا صاحب کو اگر معلوم ہو گیا کہ صبیحہ کے ذریعے میں نے تمہیں فرار کروایا تھا تو وہ میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دیں گے۔ ہماری بھرپور منصوبہ بندی کے باوجود وہ صبیحہ سے بری طرح پیش آئے ہیں لیکن شکر ہے کہ صبیحہ نے اپنی زبان نہیں کھولی اور میرا نام پوشیدہ رہا لیکن اگر تم اس طرح مجھے فون کیا کرو گی تو ان کو ضرور شک ہو جائے گا کہ اس سارے معاملے میں میرا بھی کوئی ہاتھ ہے اور میں نے تم سے اپنی دوستی نبھانے کی کوشش کی ہے۔'' ثنا خفا خفا سے لہجے میں بولتی چلی گئی تو جولیٹ کو احساس ہوا کہ وہ کیوں اس کی فون کال پر برہم ہے۔ واقعی ایک بیوی کی حیثیت سے اس کی پوزیشن بہت نازک تھی اور حقیقت کھل جانے پر آغا اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

''آئی ایم ویری سوری ثنا...... واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے تمہیں کال نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن اب جبکہ میں یہ غلطی کر چکی ہوں تو تم مجھ پر ایک مہربانی اور کر دو اور مجھے یہ بتا دو کہ آج کل آغا کہاں ہوتا ہے؟'' اس نے وہ سوال کیا جس کے لیے یہ کال کی تھی۔ اصل میں آج کل دفتر میں بھی آغا سے متعلق کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ نہ وہ کانگریس کے کسی جلسے جلوس میں شریک نظر آ رہا تھا اگر ایسا ہوتا تو خبروں میں بھی اس کا ذکر ہوتا۔

''وہ یورپ گئے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اپنا بزنس یورپ کے کسی کنٹری میں سیٹ کرلیں اسی لیے گھوم پھر کر جائزہ لینے گئے ہوئے ہیں...... لیکن تم کیوں ان کے متعلق پوچھ رہی ہو؟'' ثنا نے اس کے سوال کا جواب تو دے دیا لیکن آخر میں حیرت سے پوچھنے لگی۔ اس کے جواب نے جولیٹ کی الجھن دور کر دی تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ آج کل آغا خبروں میں کیوں نہیں تھا اور اس کے آزاد ہونے کے بعد اس نے دوبارہ اس سے رابطہ کرنے یا تنگ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم آغا سے متعلق کیوں پوچھ رہی ہو؟'' ثنا نے اپنے سوال کو دہرایا۔

''سوری ثنا! تم ایک اچھی دوست ہو اور تم نے مجھے اپنے شوہر کی کسٹڈی سے چھڑوا کر دوستی کا حق بھی ادا کر دیا ہے لیکن میں نہ تو شاید اس احسان کا بدلہ اتار سکتی ہوں اور نہ ہی دوستی کا حق ادا کر سکتی ہوں۔ میری وجہ سے اگر تمہارا کوئی لاس ہو تو اس کے لیے میں پہلے ہی تم سے سوری کہتی ہوں۔'' اس نے ثنا کے سوال کے جواب میں یہ جملے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اس کے بعد خود عجیب سی کیفیات کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ اس کی زندگی برباد کرنے والا آغا خود مزے سے یورپ میں گھومتا پھر رہا ہے اور وہاں اپنے بزنس کو منتقل کرنے کی تیاری میں ہے۔ بزنس کی منتقلی کے بعد یقیناً وہ خود بھی یورپ شفٹ ہو جاتا اور اس کی پہنچ سے بہت دور نکل جاتا۔ ان حالات میں بہت ضروری ہو گیا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنی انتقامی کارروائی انجام دینے کا انتظام کرلے۔ اس کام کے لیے اس کے پاس اتنی ہی مہلت ہوتی کہ آغا یورپ سے واپس آتا اور ہندوستان میں اپنا بزنس وائنڈ اپ کرتا۔ اس مختصر مدت میں اپنا کام انجام دینے کے لیے اول تو اس کا آغا کی ہندوستان واپسی سے آگاہ رہنا بہت ضروری تھا، دوسرے اسے کوئی ہتھیار حاصل کرنا تھا۔ ایسا ہتھیار جس کا پہلا ہی وار کاری ثابت ہو اور آغا کو بچنے کی مہلت نہ ملے۔ ایسے ہتھیار کے حصول کے لیے اسے جو راہ نظر آ رہی تھی، اس پر فاروق کا چہرہ ہی سامنے تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ صبح شام اس کے انتظار میں کھڑے ہونے والے فاروق کی نگاہوں میں اس کے لیے پسندیدگی تھی۔ وہ اس پسندیدگی کا فائدہ اٹھا کر فاروق سے اپنے مطلب کے کسی ہتھیار کا مطالبہ کر سکتی تھی لیکن آج کل تو فاروق بھی اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کے اغوا کے بعد

وہ بھی اپنی پسند سے دست بردار ہو گیا تھا۔

"جولی...... جولی! کدھر ہے تو۔ کتنا اندھیرا کر رکھا ہے گھر میں۔" وہ جانے کب تک اپنے خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہتی کہ للیتا موسی کی آواز نے اسے چونکایا۔ آوازیں دیتی ہوئی وہ اس کے کمرے تک پہنچ گئی تھی اور خود ہی بتی روشن کر دی تھی۔

"کیا بات ہے...... تو ایسے چپ چاپ اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہوئی تھی؟" اچانک روشنی آنکھوں پر پڑنے کی وجہ سے اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے تو موسی نے پُرتجسس لہجے میں دریافت کیا۔ اغوا والے واقعے کے بعد وہ محلے کی خواتین کے لیے ایک پُرتجسس کردار ہی بن کر رہ گئی تھی جس سے وہ کوئی نہ کوئی کہانی سننے کی منتظر رہتی تھیں۔

"بس ایسے ہی موسی، ذرا تھک گئی تھی تو لیٹ گئی اور نیند آ گئی۔ ابھی تمہارے آواز دینے پر ہی آنکھ کھلی ہے۔" اس نے بہانہ بنایا اور فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اچھا ہوا تم نے مجھے جگا دیا۔ مجھے ڈیڈ کے لیے ڈنر بھی تیار کرنا تھا۔" وہ یہاں فارغ بیٹھ کر موسی کے سوال جواب کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"چل میں تیرا ہاتھ بٹا دیتی ہوں۔ گھر والے تو سارے میری نند کی بیٹی کے بیاہ میں گئے ہوئے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں گھر پر ہی رک گئی تھی، پر اکیلے گھر میں من گھبرانے لگا تو تیرے پاس چلی آئی۔" موسی کے جواب نے اسے بتایا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے ٹلنے والی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ موسی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی نند سے پرخاش کے باعث اس کی بیٹی کے بیاہ میں نہیں گئی تھی۔ یہاں محلے میں اس طرح کی کہانیاں عام تھیں اور سب ہی ایک دوسرے کے ان حالات سے واقف تھے۔ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ موسی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے مونگ کی دال پکانے کے لیے نکالی تو موسی نے اسے مونگ کی دال پکانے کے دسیوں طریقے ایک سانس میں بتا ڈالے۔ وہ خاموشی سے سنتی ہوئی اپنا کام نمٹاتی رہی۔

"بڑا بوجھ آ گیا ہے تجھ پر۔ کمانے بھی جانا ہے اور چولہا چکی بھی سنبھالنی ہے۔ بڑا من دکھتا ہے تیری اس حالت پر۔ کیسا اچھا جیون بتا رہی تھی تو اپنے ماتا پتا کے سنگ پر ایک دم سے سب کچھ ختم ہو گیا۔ جوزف بے چارہ تو بالکل ہی ٹوٹ گیا ہے۔ آس پڑوس والوں ہی نے تیری ماں کا کریا کرم کیا ورنہ اسے کہاں کسی بات کا ہوش تھا۔ ادھر اڈے والوں نے تو بہت ہی ساتھ دیا، سارا خرچہ بھی اٹھایا اور ان کے بندے بھی آتے جاتے رہے حالانکہ ان کے تو اپنے سو جھمیلے ہیں۔ اب بھی سنا ہے کہ دادا کا سب سے لاڈلا گرگا زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔ فاروق نام لے رہے تھے اس لڑکے کا لوگ۔ سنا ہے سر پر چوٹ آئی ہے۔ بڑا انگریز ڈاکٹر علاج کر رہا ہے اس کا۔" باتوں ہی باتوں میں للیتا موسی اسے بڑے کام کی بات بتا گئی۔ وہ جواب تک یہ سمجھتی رہی تھی کہ اغوا ہونے کے بعد فاروق جیسے غنڈے نے بھی اسے اپنی توجہ کے لائق نہیں سمجھا، یہ جان کر ہلکی پھلکی ہو گئی کہ فاروق کے غیاب کی وجہ عدم دلچسپی کے بجائے کچھ اور ہے۔

"کون سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے وہ؟" اس نے پہلی بار موسی کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے اس سے کوئی سوال کیا ورنہ اب تک تو بس بہ مشکل ہاں ہوں، ہی کرتی رہی تھی۔

"جدھر تو تھی وہیں تو ہے وہ۔ ہم تجھے لے کر اسپتال پہنچے تھے تو ربن دادا پہلے سے ہی ادھر تھا۔ ادھر بھی اس نے بڑا خیال رکھا۔ تیری دوا دارو دیکھ بھال سب اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ میں تو تیرے پاس ہاسپٹل میں رکنا چاہ رہی تھی پر دادا نے حکم دیا کہ گھر واپس جاؤ تو آنا پڑا، پر بھگوان جھوٹ نہ بلوائے، میرا من تجھ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔" للیتا نے اپنا خلوص جتایا حالانکہ سچ یہ تھا کہ ربن نے اس کی ٹوہ لینے والی فطرت بھانپ کر اسے اسپتال سے چلتا کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ للیتا کے ذریعے اس سے متعلق داستانیں گھر گھر پھیلیں۔

"اچھا کیا نا دادا نے کہ تمہیں واپس گھر بھجوا دیا۔ دیکھ بھال کے لیے تو وہاں بہت اسٹاف تھا۔ تم خوامخواہ تھکتیں۔ نظر رکھنے کے لیے تو ربن دادا کے آدمی وہاں بھی موجود تھے ہی۔" جولیٹ نے نرمی سے اسے جواب دیتے ہوئے دال میں چمچ چلایا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔ میری مان تو، تو کسی دن جا کر ربن دادا کو دھنیواد بول دینا۔ ایسے لوگوں سے بنا کر رکھنے میں فائدہ رہتا ہے۔ تو تو ہے بھی اکیلی ناری۔ باپ تو تیرا بس نام کو رہ گیا ہے۔ اسے تو اپنا ہی ہوش نہیں رہا، تیرا خیال کہاں سے کرے گا۔"

"ٹھیک ہے موسی، میں کسی دن جاؤں گی وہاں۔" للیتا کا مشورہ اس کے دل کو لگا اور سوچنے لگی کہ موقع دیکھ کر دفتر سے واپسی میں اسپتال کا چکر لگا لے گی تو اس بہانے فاروق کی عیادت بھی ہو جائے گی اور ربن دادا کا شکریہ بھی

ادا کر دے گی۔ عیادت کی یہ رسم اسے یہ موقع فراہم کر سکتی تھی کہ وہ فاروق سے کسی ہتھیار کی فرمائش کر سکے۔

''میری مان تو اب تُو گھر بسا لے جولی۔ وہ لڑکا کیا نام ہے اس کا...... ہاں عارف، تیری ماں نے بتایا تھا کہ تیرا اس سے بیاہ ہونے والا ہے۔ تو اس سے کہہ کہ وہ جلدی تجھ سے شادی کر لے۔ بیاہ کے بعد تم دونوں پتی پتنی مل کر بھی اس کے سارے مسئلے حل کر سکتے ہو۔ پتی پتنی کا ایک دوسرے پر ادھیکار ہوتا ہے۔ تو اپنی کمائی سے اس کی بہنوں کا دہیج (جہیز) تیار کر دے گی تو اس میں کوئی برائی تھوڑی ہے۔''

للیتا اسے اب ایک نیا مشورہ دے رہی تھی۔ جولیٹ کو اندازہ ہوا کہ اس کی ماں جوزفین نے محلے والیوں کو اچھا خاصا حالات سے باخبر رکھا ہوا تھا۔ اصل میں محلے کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا۔ عورتیں دن کا بیشتر حصہ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے اور گلی میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے میں گزارتی تھیں اس لیے ایک دوسرے کے حالات سے بھی پوری طرح واقف تھیں۔ جوزفین کو کسی کے گھر جانے یا گلی میں دروازے پر کھڑے ہونے کی تو عادت نہیں تھی لیکن گھر پر عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یقیناً عارف کو ان کے گھر آتے جاتے دیکھ کر عورتوں میں سے کسی نے اس کے بارے میں استفسار کیا ہو گا اور جوزفین نے اس کے بارے میں سب بتا دیا ہو گا لیکن یہ سب تو اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا اور عارف اس کی زندگی سے نکل گیا تھا۔

''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو موسی لیکن عارف نہیں مانتا۔ اصل میں اس کی ماں کو ڈر ہے کہ شادی کے بعد وہ بدل جائے گا اس لیے وہ بیٹیوں سے پہلے اس کی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔'' وہ اپنے ٹھکرائے جانے سے متعلق تو موسی کو آگاہ نہیں کر سکتی تھی اس لیے بہانہ بنا گئی۔

''تو عارف اور اس کی ماں کو مجھ سے ملوانا، میں انہیں بتاؤں گی کہ ہماری جولیٹ کتنی اچھی لڑکی ہے اور ایسی لڑکی کے پتی کبھی اپنے گھر والوں سے نہیں بدلتے۔'' موسی نے اس سے پیار جتایا۔

''نہیں موسی رہنے دو، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو میں خود بھی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میری شادی ہو گئی تو ڈیڈ کا خیال کون رکھے گا۔ اچھا ہے پہلے عارف اپنی بہنوں کی شادی کر لے پھر ہم شادی کر کے ڈیڈ کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لیں گے۔'' دل پر بہت جبر کر کے اس نے للیتا کو ایسے بہانے سے ٹالا جو کبھی اس کی اور عارف کی منصوبہ بندی کا حقیقی حصہ ہوتا تھا۔ تبھی تو سوچا تھا انہوں نے کہ اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک مشترکہ گھر میں مل جل کر رہیں گے لیکن وہ گھر بننے سے پہلے ہی کسی کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔

''کہہ تو تو بھی ٹھیک رہی ہے۔ بہنوں کو بیاہنے کے بعد عارف، جوزف کو اپنے ساتھ رکھنے پر راضی ہو جائے گا۔ جوان بہنوں کے گھر میں ہوتے ہوئے تو کبھی وہ غیر مرد کو ساتھ رکھنے والا نہیں ہے۔ ان مسلوں کے ہاں پردے کا بھی تو بڑا چکر ہے۔ خود چاہے کہیں بھی دندناتے پھریں لیکن اپنے گھر کی عورتوں کو کسی دوسرے مرد کے سامنے نہیں آنے دیتے۔''

موسی نے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے تبصرہ کیا تو جولیٹ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ برداشت کرنا مشکل ہونے لگا تو ٹوکری سے ایک پیاز نکال کر کاٹنے لگی۔ جلتی آنکھوں سے نکل کر بہتے آنسوؤں کا کوئی جواز بھی تو فراہم کرنا تھا۔

☆☆☆

کاجل نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کے چوڑی دار پاجامے اور کُرتے میں ملبوس سرخ رنگ کا چنا ہوا دوپٹا دائیں شانے پر بے پروائی سے ڈالے چاند بانو ستار تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور انگلیاں بہت آہستگی سے ستار کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔ گلابوں کا رنگ چرائے ہونٹ بھی متحرک تھے لیکن وہ جو کچھ گا رہی تھی، اتنی آہستہ آواز میں گا رہی تھی کہ چند قدموں کے فاصلے پر کمرے کے دروازے پر کھڑی کاجل کو بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتی چاند بانو کے قریب آ بیٹھی۔ قریب بیٹھنے پر اس کے کان وہ بول سننے میں کامیاب ہو گئے جو چاند بانو کے ہونٹوں پر مچل رہے تھے لیکن چاند بانو اب بھی اس کی آمد سے بے خبر رہی اور سابقہ محویت کے ساتھ گنگناتی رہی۔ اس عالمِ محویت میں اس کا جسم اتنا ساکت تھا کہ اگر ہونٹوں اور انگلیوں کا تحرک نہ ہوتا تو اس پر کسی مجسمے کا گمان ہوتا۔ کاجل نے کچھ دیر تو اس کی محویت میں دخل نہ دیا لیکن پھر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ستار کے ایک تار کو قدرے زور سے چھیڑا۔ دھن بگڑی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''اچھا تو یہ آپ ہیں۔'' کاجل کو نظروں کے سامنے پا کر وہ مسکرائی۔

''جی ہاں، اتنی دیر سے آ کر بیٹھی ہوں لیکن تمہیں اپنی محویت میں کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے دخل اندازی کرنا پڑی۔''

''اس گیت کے بول ہیں ہی اتنے خوب صورت کہ ہم

جب بھی ہونٹوں پر لائیں، ایسے ہی محو ہو جاتے ہیں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے کاجل کے شکوے کا جواب دیا۔

''ٹھیک کہتی ہو، بول بھی خوب صورت ہیں اور اسے گایا بھی خوب گیا ہے لیکن تمہاری آواز میں تو یہ اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اللہ نے تمہیں بڑا رسیلا گلا دیا ہے۔ حسن اور آواز کا ایسا میل بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اب اس گیت کو گانے والی ہی کو دیکھ لو کہ کیسی معمولی شکل کی ہے کہ اخبار میں چھپا فوٹو دیکھ کر دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ اتنا پیارا گیت گانے والی یہی ہوگی...... لیکن فلم کی ہیروئن پر اس کی آواز کیسی جچ رہی تھی حالانکہ سنا ہے کہ اس ہیروئن کی اپنی آواز اتنی بھدی ہے کہ کسی اور کی آواز میں ڈبنگ کروانی پڑی تھی۔'' اس کے چہرے کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کاجل نے اپنی رائے دی۔

''یہ تو بنانے والے کی اپنی مرضی ہے۔ وہ جسے جو چاہے دے دیتا ہے۔'' چاند بانو نے نہایت انکساری سے جوابی تبصرہ کیا۔

''یہ بات تو اپنی جگہ ہے پر جنہیں اتنا نوازا گیا ہو، انہیں ناشکری نہیں کرنی چاہیے۔''

''ہم نے کب بھی ایسا کیا ہے؟'' کاجل کے ٹوکنے پر وہ نظریں چرا گئی۔

''یہ ناشکری نہیں تو اور کیا ہے کہ اتنا بڑا ڈائریکٹر خود چل کر یہاں تک آیا لیکن تم اس کی پیشکش قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔ تم جیسا حسین چہرہ اور آواز رکھنے والی تو فلمی دنیا میں قدم رکھتے ہی تہلکہ مچا دے گی۔'' کاجل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہمیں بالکل شوق نہیں ہے تہلکہ مچانے کا۔ ہم اپنی جگہ خوش ہیں بلکہ سچ پوچھیں تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ کسی ویرانے میں سب سے چھپ کر اکیلے جا بیٹھیں اور کسی کی تصویر آنکھوں میں سجائے ساری زندگی بتا دیں۔'' اس کا لہجہ بڑا حسرت ناک تھا۔

''کیا فائدہ ایسی دیوانگی کا چاند بانو! مت کرو خود پر ظلم۔ یہ عشق تمہیں اندر سے کھوکھلا کر دے گا۔'' کاجل نے دکھی لہجے میں اسے سمجھایا۔

''عشق کہاں کھوکھلا کرتا ہے۔ یہ تو انسان کی روح کو ہرا بھرا کر دیتا ہے۔ ہم اپنے دل کو جس خوشبو سے مہکا پاتے ہیں، اس کی تو پہلے ہمیں خبر ہی نہیں تھی۔'' اپنے آپ میں گم اس کے ہونٹوں پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ تھی۔

''یہی سراب تو آدمی کو مار ڈالتا ہے اور میں تمہیں ایسے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔'' کاجل کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''آپ کے خیال میں فلمی لائن میں جا کر ہم بہت آباد ہو جائیں گے؟'' چاند بانو نے اس بار ذرا تیکھے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''کم سے کم تمہیں اس ماحول سے نکلنے کا موقع تو مل جائے گا۔ یہاں رہ کر محفلیں آباد کرنے سے بہتر ہے کہ تم فلمی لائن میں چلی جاؤ ورنہ یہاں تمہارے ساتھ بہت برا ہوگا۔ بائی جی ہمیشہ تمہارے انکار کو خاطر میں لانے والی نہیں ہیں۔ تم نے زیادہ ضد کی تو وہ تمہارا کسی دولت مند سیٹھ سے سودا کر کے دام کھرے کر لیں گی۔'' کاجل نے اسے ڈرایا۔

''نہیں، وہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔'' چاند بانو نے بڑی شدت سے سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے اسے جھٹلایا لیکن اس کے اندر سے ایک خوف زدہ ....آواز نے اسے للکارا۔

''ایسا کیوں نہیں ہو سکتا چاند بانو...... یہ کوٹھا ہے اور یہاں دن رات انسانی جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں اس سنی سنائی پر مان ہے کہ تم زمرد بائی کی بیٹی ہو تو یہ کون سی انوکھی بات ہے۔ صدیوں سے اس بازار میں مائیں بیٹیوں کا سودا کر کے دام کھرے کرتی رہی ہیں۔ اگر تمہاری ماں نے بھی ایسا کچھ کر لیا تو کیا انوکھا ہوگا اور پھر یہ بھی تو پکی بات نہیں ہے کہ تم سچ مچ زمرد بائی کی بیٹی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے قول کے مطابق تم اس کی بہن ہی ہو اور کوٹھوں پر بہنوں کی رگوں میں ایک خون ہونا ذرا مشکل ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے کسی فیصلہ کن گھڑی میں خون کے جوش مارنے کے امکانات بھی ذرا کم ہی ہیں۔'' اپنے اندر کی اس آواز نے اسے کچھ ایسا دہشت زدہ کیا کہ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟ تمہارا رنگ کیوں پیلا پڑ گیا۔ اپنے کہنے پر خود ہی یقین نہیں ہے نا؟'' کاجل نے مسکرا کر چیلنج کرنے والے انداز میں اس سے دریافت کیا۔

''تو پھر ہم کیا کریں؟'' چاند بانو نے بے بس سے انداز میں اس سے دریافت کیا۔

''میرا مشورہ مان لو اور فلم والوں کو ہاں کر دو۔'' کاجل نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''ہم ان کے سوا کسی کو دکھائی اور سنائی دینا نہیں چاہتے۔'' اس نے حیا سے پلکیں جھکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو اس پل کاجل کو وہ ہمیشہ سے بھی بہت بڑھ کر حسین

لگی۔ اس وقت گویا وہ اس زمین کی مخلوق ہی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ تو کوئی آسمانی حور تھی جو آسمان سے اتر کر زمین پر چلی آئی تھی۔

''فاروق صاحب کتنے خوش نصیب ہیں، کاش انہیں اس بات کا اندازہ ہوتا۔'' کاجل بے ساختہ ہی بول اٹھی۔

''خوش قسمت تو ہم ہیں کہ ہمیں ان سے ملاقات نصیب ہوئی۔'' وہاں عشق اپنے پورے جوبن پر تھا۔

''تم تو بالکل پگلی ہو چاند بانو، ایک زمانہ تم پر فدا ہے۔ بڑے سے بڑا سیٹھ اور افسر تمہاری ایک دید کو.... بے چین رہتا ہے اور تم ہو کہ اپنی قدر و قیمت بھلائے فاروق صاحب پر مرمٹی ہو۔''

''عشق کا اصل لطف ہی مر مٹنے میں ہے۔'' اس کے لہجے میں عجب خماری تھی۔

''اگر فاروق صاحب ہی تم سے کہیں کہ فلم والوں کو ہاں کر دو تو کیا کر دو گی؟'' کاجل نے گویا اسے آزمانے کی کوشش کی۔

''ان کے کہنے پر تو ہم بنا اُف کیے جلتی آگ میں بھی کود پڑیں گے۔'' اس نے ایک پل کے لیے بھی سوچے بغیر بڑی بے ساختگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے پھر اپنی اس بات کو یاد رکھنا۔ ابھی تو فاروق صاحب اسپتال میں ہی ہوں گے۔ کل ہی چلتے ہیں ان سے ملاقات کے لیے۔ اب تو اس مقدمے کا فیصلہ وہی کریں گے۔'' کاجل جوش میں آگئی۔

''کہیں تم نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات تو نہیں کر رکھی؟'' اسے شک ہوا اور اسپتال کی ملاقات میں کاجل کا کچھ دیر فاروق کے پاس تنہا رکنا یاد آیا۔ اس نے وہاں سے واپسی میں بھی اس سلسلے میں کاجل سے استفسار کیا تھا لیکن وہ اسے طرح دے گئی تھی۔

''کیوں، تمہارے فاروق صاحب کے پاس اپنی عقل سمجھ نہیں ہے کیا جو وہ میرے سکھانے پر کچھ سیکھ جائیں گے۔ اچھے خاصے معقول آدمی لگتے تھے۔ یقیناً اپنی ذاتی رائے بھی مناسب ہی رکھتے ہوں گے۔'' اس بار بھی کاجل نے اسے واضح جواب دینے کے بجائے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسا ڈالا۔ ''پھر کیا کہتی ہو، چلیں ان سے ملنے؟'' وہ خاموش رہی تو کاجل نے اسے اکسایا۔

''چکور سے چاند کی طرف پرواز کرنے کا بھی کبھی کسی نے پوچھا ہے کیا؟'' کاجل کے استفسار کا جواب ایک سوال کی صورت اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوا۔

''ہاں بھئی، یہاں میں تو بھول ہی گئی تھی کہ یہاں تو عشق نے دنیا ہی الٹ کر رکھ دی ہے اور جو خود چاند ہے، وہ چکور بن بیٹھی ہے۔'' کاجل نے ہنس کر تبصرہ کیا اور پھر بولی۔ ''چلو پھر کل ہی چلتے ہیں تاکہ روز روز کی بحث سے جان چھوٹے۔''

''باجی جی سے باہر جانے کی اجازت کیسے ملے گی؟'' اسے اندیشے نے گھیرا۔

''اس کی تم فکر مت کرو۔ یہ میری ذمے داری ہے۔'' کاجل نے اس کے رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے جواب دیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں بیٹھ کر خواب بنو، میں چلتی ہوں۔ خان صاحب ریاض کروانے کے لیے آتے ہی ہوں گے۔'' وہ وہاں سے چلی گئی تو چاند بانو نے ایک بار پھر ستار تھام کر آنکھیں موند لیں۔ اس بار اس کی تھرتھراتی انگلیوں نے ستار پر جو دھن چھیڑی تھی، اس میں پیا ملن کی آس بڑی واضح تھی۔

☆☆☆

کوٹھی کے لان میں ٹہلتی ثنا دلدار آغا کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور اس سنجیدگی کے ساتھ وہ ایک ایک پودے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے پھول دار پودے بہت اچھے لگتے تھے اور اس کے مالدار شوہر کی کوٹھی کا لان نایاب نسل کے پھول دار پودوں سے بھرا پڑا تھا۔ پھول دار پودوں کے علاوہ بھی وہاں کچھ ایسے پودے بھی موجود تھے جو اپنی خوب صورتی کے اعتبار سے لاجواب تھے لیکن ان پر پھول نہیں آیا کرتے تھے۔ شادی سے قبل اپنے میکے میں بھی ثنا کو لان کی آرائش سے خصوصی دلچسپی رہی تھی لیکن اس نے کبھی کوئی غیر پھول دار پودا لگانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہاں اپنی اس کوٹھی کے لان میں بھی اسے ان پودوں کی موجودگی پسند نہیں تھی لیکن کبھی اعتراض اس لیے نہیں کر سکی تھی کہ دلدار آغا نے خود بطور خاص یہ پودے لگوائے تھے۔ ثنا کا کہنا تھا کہ وہ شجر ہی کیا جس پر پھول اور پھل نہ آئیں اور عجیب بات یہ تھی کہ ایسی سوچ رکھنے والی کے اپنے آنگن میں اب تک کوئی پھول نہیں کھل سکا تھا۔

شادی کو کوئی اتنا بہت طویل عرصہ نہیں گزرا تھا کہ آغا کو اس سلسلے میں تشویش ہوتی لیکن اس کی والدہ بھی کبھار باتوں میں یہ تذکرہ چھیڑ دیتی تھیں۔ وہ تو شادی کے پہلے سال کے اندر ہی پوتا دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ خود ثنا کو بھی اس سلسلے میں تشویش تھی اس لیے اس نے کسی کے بھی علم میں لائے بغیر خاموشی سے ایک لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کر کے اپنا

چیک اپ کروالیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے چند ضروری ٹیسٹ کروائے تھے اور اس کے بعد آج صبح اسے حتمی جواب دے دیا تھا۔ اس کے مطابق ثنا میں ماں بننے کی صلاحیت نہیں تھی اور اس بات کا امکان بھی بہت ہی کم تھا کہ وہ علاج معالجے کے بعد بھی ماں بن سکے۔ اپنے بانجھ ہونے کا سن کر ثنا کو سخت صدمہ ہوا تھا اور یہ حقیقت برداشت کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا کہ وہ ایک بے پھل و پھول کا شجر ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے غریب عورت تصور کر رہی تھی جس کا دل پہلے ہی اجڑا ہوا تھا اور اب گود کی ویرانی کی بھی خبر مل گئی تھی۔ ایک طرح سے وہ شدید غم و غصے کا شکار قدرت سے اس کی بے انصافی کا شکوہ کر رہی تھی جس نے اسے ایسی تقدیر عطا کی کہ پہلے وہ طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنی پسند عارف کو نہ اپنا سکی اور اب اپنے ادھورے پن کی خبر بھی سننی پڑی تھی۔ یہ خبر اس کے تن بدن کو جھلسا رہی تھی اور بس نہ چلتا تھا کہ دنیا کو آگ لگا دے۔

''کتنے لوگ ہوں گے جو میری قسمت پر رشک کرتے ہوں گے۔ میں جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی اور پھر ملک کی ایک ممتاز شخصیت سے بیاہی گئی، لوگوں کی نظر میں قابل رشک ہوں گی لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اندر تک کیسی اجڑی ہوئی اور ویران عورت ہوں۔'' خاموش ہونٹوں اور خشک آنکھوں سے وہ اپنے غموں پر ماتم کناں تھی کہ کھل کر ماتم کرنا بھی اس کے مفاد میں نہیں تھا۔ نہ وہ عارف والی بات کسی سے کہہ سکتی تھی اور نہ ہی اپنے بانجھ پن کو تسلیم کر سکتی تھی کہ دونوں ہی حقائق کا سامنے آنا اسے دلدار آغا کی زندگی سے نکال سکتا تھا اور وہ چاہے اپنی دلی رضامندی کے بغیر اس کی بیوی بنی تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ دلدار آغا کی بیوی بنے رہنے میں ہی اس کی بھلائی تھی۔ آغا کی بیوی کی حیثیت سے اسے جو عزت اور مقام حاصل تھا، وہ اسے کسی صورت نہیں گنوا سکتی تھی پھر اس کے میکے والوں کے بھی مفادات تھے جنہیں وہ کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

''بیگم صاحبہ! صاحب کا فون ہے۔'' وہ جانے کب تک اپنے بارے میں ہی سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی کہ ملازمہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے فون کی اطلاع فوری طور پر پہنچانے کے چکر میں وہ بے چاری بھاگتی ہوئی آئی تھی اس لیے اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اطلاع سن کر ثنا بھی تیزی سے حرکت میں آگئی اور تیز قدموں سے کوٹھی کے اندرونی حصے کا رخ کیا۔

''ہیلو۔'' اس نے تپائی پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا تو اس کا سانس ذرا چڑھا ہوا تھا۔

''اتنی دیر لگا دی فون تک آنے میں؟ کچھ اندازہ ہے کہ اتنی دور سے کال کتنی مہنگی پڑتی ہے؟'' آغا نے اس کی ہیلو کے جواب میں سب سے پہلے اس کی خبر لی۔

''جی میں ذرا لان میں تھی اس لیے دیر لگ گئی۔'' ثنا کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ رات اس کے شوہر نے کسی ایسی مہنگی کال گرل کے ساتھ بتائی ہوگی جس کے چارجز کے سامنے اس فون کال کا بل نہایت حقیر ہوگا لیکن پھر بھی اسے کچھ جتا نہیں سکی اور ایک فرماں بردار بیوی کی طرح اپنی صفائی پیش کی۔

''موسم بدل رہا ہے۔ وقت بے وقت لان میں مت جایا کرو، بیمار ہو جاؤ گی۔'' اس بار آغا کا لہجہ نرم تھا۔

''نہیں ہوتی میں بیمار۔ آپ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے اور کام کا کیا ہوا؟'' کچھ دیر قبل اپنی پسند کے نہ ملنے پر اداس عورت اب بھرپور ناز و ادا کے ساتھ اپنے شوہر سے گفتگو کر رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ کام بھی چل رہا ہے۔ ایک پارٹی سے بات ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے میں ان لوگوں سے پارٹنرشپ کرلوں بہرحال یہ تو کاروباری باتیں ہیں، تمہیں ان کا کیا کرنا ہے۔ تم اپنی سناؤ سب ٹھیک ہے نا؟'' اس کی گفتگو کا انداز واضح احساس برتری لیے ہوئے ہوتا تھا۔

''یہاں بھی سب معمول کے مطابق ہے۔ بس میں آپ کی غیر موجودگی کی وجہ سے بوریت محسوس کر رہی ہوں۔'' اس نے شوہر پرست بیوی کی طرح لگاوٹ کا اظہار کیا۔

''گھر بیٹھ کر بور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ گاڑی اور ڈرائیور دونوں چوبیس گھنٹے موجود ہوتے ہیں۔ اپنی فرینڈز وغیرہ سے ملنے چلی جایا کرو۔'' آغا نے اسے مشورہ دیا۔

''میری فرینڈز یہاں کہاں؟ وہ تو سب بمبئی میں ہی رہ گئیں۔'' وہ اداس ہوئی۔

''فرینڈز کا کیا ہے، وہ تو نئے بن جاتے ہیں۔ تم ذرا کلب وغیرہ جانا شروع کرو تو تمہارا یہ مسئلہ دو چار دنوں میں ہی حل ہو جائے گا۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پھر بھی پرانے دوستوں کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔'' اس نے شوہر کے مشورے کے جواب میں اپنی رائے دینا ضروری سمجھا۔

''یہاں میں تم سے ایگری کرتا ہوں۔ وہ جو تمہاری

جرنلسٹ فرینڈ تھی، کیا نام تھا اس کا؟ وہ تو مجھے بھی بہت پسند آئی تھی۔''

''جولیٹ نام ہے اس کا۔'' ثنا کو معلوم تھا کہ خوب صورت چہرے والی عورتوں کا نام آغا کی یادداشت سے کبھی محو نہیں ہوتا پھر بھی بردباری سے بتایا۔

''ہاں جولیٹ، اچھی ذہین لڑکی لگی تھی وہ مجھے۔''

''جی ہاں، ذہین تو وہ خاصی تھی۔ اتفاق سے ابھی کل ہی اس کا فون آیا تھا میرے پاس۔ بے چاری کی مدر کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' ثنا نے بہت عام سے لہجے میں اطلاع دی لیکن حقیقتاً اس نے بطورِ خاص آغا کو اس کال کے بارے میں بتایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آغا کو اپنی عدم موجودگی میں ہونے والی عام سے عام بات کی اطلاع بھی مل جاتی ہے اس لیے اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتی تھی۔

''اوہ ویری سیڈ، اب تمہاری بات ہو تو میری طرف سے بھی تعزیت کر لینا۔ اچھا، اب میں فون رکھتا ہوں۔ کچھ دیر میں ایک میٹنگ کے لیے جانا ہے۔'' آغا نے عجلت میں کال منقطع کر دی تو ثنا نے بھی ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☆☆☆

آج پھر چاند بانو اور کاجل اس کے روبرو تھیں لیکن آج وہ ان کی آمد پر حیران نہیں تھا کیونکہ پچھلی بار کاجل سے اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی روشنی میں وہ اس ملاقات کا منتظر ہی تھا۔ ابتدا میں انہوں نے سلام دعا اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت سے متعلق رسمی گفتگو کی پھر کاجل نے اصل بات چھیڑ دی۔

''اپنی چندا کو فلم سے آفر آئی ہے۔ بہت بڑا ڈائریکٹر ہے جو اسے اپنی فلم میں لینا چاہتا ہے، پر یہ راضی نہیں ہوتی۔'' اس نے اس انداز میں فاروق کے سامنے یہ تذکرہ چھیڑا جیسے پہلی بار اسے بتا رہی ہو۔

''زبردست، یہ تو اچھی خبر ہے۔'' دل پر جبر کر کے فاروق نے اس ڈرامے میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا اور بطورِ خاص چاند بانو کی طرف رخ کر کے اس سے بولا۔

''تم کیوں انکار کر رہی ہو چاند بانو؟ ایسا چانس تو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔''

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم فلم میں کام کریں؟'' چاند بانو نے عجیب سے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ اس لہجے میں جیسے یہ خواہش بول رہی تھی کہ فاروق اسے روک دے، منع کر دے کہ نہیں چاند بانو، تم فلم میں کام مت کرنا۔

مجھے تمہارا فلمی ہیروئن بننا اچھا نہیں لگے گا۔

فاروق نے اس کے لہجے کی اس حسرت بھری خواہش کو پوری طرح محسوس کیا لیکن جان کر انجان بن گیا اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ''میرے خیال میں تو تمہیں ہاں کر دینی چاہیے۔ ہمارے ہاں لوگ فلمیں شوق سے دیکھتے ہیں اور فلمی فنکاروں کو بہت پسند بھی کیا جاتا ہے۔ تم فلم لائن میں چلی جاؤ گی تو عزت، شہرت، دولت سب پالو گی۔''

''عزت بھی......؟''

چاند بانو کے سوال میں بیک وقت حیرت اور حسرت تھی جسے فاروق نے نظرانداز کر دیا اور سابقہ انداز میں بولا۔ ''بہرحال میں نے تمہیں صرف ایک مشورہ دیا ہے، تم اپنے لیے جو مناسب سمجھو فیصلہ کر سکتی ہو۔''

''آپ کا مشورہ ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ نے کہا ہے تو ہم ضرور فلم میں کام کریں گے۔'' اس نے فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اسی وقت ربن کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں لڑکیوں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اسے آداب کہا۔

''کیسا چل رہا ہے تم لوگوں کا دھندا؟ پھر دوبارہ تو کسی نے تنگ نہیں کیا نا؟'' اس نے شفقت کے ساتھ ان دونوں سے دریافت کیا۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھا اور چاند بانو کی فاروق میں دلچسپی کو سمجھتا تھا اس لیے ان لوگوں کی یہاں موجودگی پر قطعی حیران نہیں ہوا تھا۔

''نہیں دادا، اب کوئی تنگ نہیں کر رہا۔ سننے میں آیا تھا کہ مجو دادا کو آپ نے سبق سکھا دیا ہے اور انگریز افسر ولیم انگلستان گیا ہوا ہے۔'' اس کے سوال کا جواب کاجل نے دیا۔

''سبق تو اس گورے کو بھی سکھانے کا تھا، پر سالا نکل گیا۔ خیر لوٹ کر تو ادھر ہی کو آئے گا نا پھر اپن اس کو بھی دیکھ لے گا۔'' ربن نے اپنے عزم کا اظہار کیا اور پھر موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔

''زمرد بائی کیسی ہے......اب تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہے نا؟''

''بائی جی بالکل ٹھیک ہیں بلکہ آج کل تو خاصی خوش ہیں۔ یہ جو اپنی چندا ہے نا، اسے فلم سے آفر آئی ہے۔'' کاجل نے اسے اطلاع دی۔

''کس نے کی ہے آفر؟'' ربن نے دلچسپی سے پوچھا۔

''انیل کمار نے۔ بڑے شاندار ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی بنائی فلمیں ہمیشہ ہٹ ہوتی ہیں۔'' کاجل نے ربن سے زیادہ چاند بانو کو سنانے کے لیے بتایا۔

''ہاں ری، اپن جانتا ہے اسے۔ ڈائریکٹر تو بچ ایک دم چوکس ہے۔ اصل میں مال پانی خوب لگاتا ہے فلم پر تو فلم تو ہٹ ہونی ہی ہے۔'' ربن نے اس کی بات سن کر تبصرہ کیا اور پھر فاروق کی طرف رخ کر کے اسے بتانے لگا۔

''فلم کا دھندا ابھی ایک دم چالو دھندا ہے۔ بڑا بڑا سیٹھ لوگ اس دھندے میں اپنا پیسا لگا رہا ہے۔ اپنا بھابیہ سیٹھ بھی اس طرف مال لگاتا ہے بلکہ اپن نے سنا ہے کہ یہ جو انیل کمار ہے، اس کی اگلی فلم میں اپنا بھابیہ سیٹھ ہی پیسا لگانے والا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ اگر سیٹھ انیل کمار کی فلم میں پیسا لگاتا ہے تو تم اس سے کہہ دینا کہ چاند بانو کا خیال کرے۔'' اس نے جیسے چاند بانو کی دل جوئی کی کوشش کی۔

''بالکل بول دے گا۔ اپن بولے گا تو دیکھنا ادھر سیٹ پر سارا لوگ کیسے چاند بانو کے آگے پیچھے گھومے گا۔'' ربن نے ایک بار پھر اپنی جہاندیدگی کا ثبوت دیا۔ وہ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ لینے والا آدمی تھا اس لیے سمجھ گیا تھا کہ فاروق سر جھکا کے خاموش بیٹھی چاند بانو کو فلم میں کام کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے، سو خود بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹایا۔

''دیکھ لو چاند بانو...... تم کتنی خوش قسمت ہو۔ خدا خود ہی بیٹھے بٹھائے تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرتا جا رہا ہے۔'' ربن کی بات سن کر خوش ہوتی کاجل نے چاند بانو کو ٹھوکا دیا لیکن وہ اپنی سابقہ حالت میں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''قسمت والا تو یہ اپنا فاروق بھی بہت ہے۔ اس کا بھی ہر کام فاافٹ بن جاتا ہے۔ ابھی یہ دیکھو کہ اپن سوچ رہا تھا کہ اسے علاج کے واسطے کون سے پہاڑی شہر میں لے جائے کہ بھابیہ سیٹھ خود ہی بول دیا کہ اس کا ایک بنگلا ادھر شملہ میں ہے۔ اگر اپن چاہے تو فاروق کو ادھر لے جا کر رکھ سکتا ہے۔ اپن نے فوراً ہاں بول دیا اور شملہ کا ٹکٹ بھی کٹوا لیا۔ ابھی ٹھیک چار گھنٹے بعد اپن کو شملہ جانے کے واسطے ٹرین میں بیٹھنے کا ہے۔'' اس کی دی اطلاع نے فاروق کو چونکا دیا۔

''اتنی جلدی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اسپتال سے فارغ ہو کر پہلے کچھ دن اڈے پر جا کر رہیں گے پھر کہیں اور جائیں گے۔''

''اڈے پر جانے کا ٹیم نہیں ہے اب۔ اپن ادھر پیغام بھیج دیا ہے۔ گولو تیرا سب سامان باندھ کر تیار کر دے گا۔ تو سیدھا اسٹیشن ہی پہنچ جائے گا۔ تھوڑا ٹیم تیرے کو ادھر اسپتال میں بھی لگنے کا ہے۔ ڈاکٹر لوگ تیرا فائنل چیک اپ کر کے دوائیں وغیرہ لکھنے کو مانگتا ہے۔ اپن نے سسٹر کیتھی سے پہلے ہی بات کر لیا ہے۔ وہ اپن کے ساتھ شملہ چلے گا تاکہ تیرا ٹھیک سے دیکھ بھال کر سکے۔'' ربن نے اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کیا تو وہ اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ اس نے غصے میں ربن سے سارے فیصلے خود کر لینے کا کہا تھا اور وہ بچ بچ ایسا کر چکا تھا لیکن اس کے اپنے پاس اب اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی اور اب موقع بھی نہیں تھا کہ وہ ربن سے پروگرام میں کسی تبدیلی کی فرمائش کرتا۔ ویسے تو اسے خود بھی عادت تھی کہ وہ ربن کے فیصلوں کو بغیر حیل و حجت کے قبول کر لیتا تھا کہ اس کا ہر فیصلہ اس کی بھلائی کے لیے ہی ہوتا تھا لیکن اس بار کچھ بے چینی اس لیے تھی کہ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے جولیٹ کو ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا لیکن اب اس کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ وہ اگر ضد کر کے کچھ دیر کے لیے اڈے پر چلا بھی جاتا تو جولیٹ سے سامنا ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق یہ جولیٹ کے دفتری اوقات تھے اور ان اوقات میں وہ دفتر میں ہی ہو سکتی تھی۔

''بڑا ہی اچانک پروگرام بنا لیا آپ لوگوں نے۔ فاروق صاحب نے تو ہمیں اس بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔'' چاند بانو کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ کر کاجل نے شکوہ کیا۔

''ڈاکٹر لوگ نے سجیشن دیا تھا کہ اپنے ہیرو کو کسی پہاڑی علاقے میں لے جا کر رکھو تو کھلی ہوا میں اس کا صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ اپن سوچ میں تھا کہ کدھر لے کر جائے، پر کوئی پکا پروگرام طے نہیں تھا اس لیے اس نے تمہیں نہیں بتایا ہوگا۔'' ربن نے رسان سے اس کے شکوے کا جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں علم ہونے سے زیادہ ان کا صحت یاب ہونا ضروری ہے۔'' اس بار چاند بانو نے دھیمے لہجے میں کہا تو فاروق اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ کیا نہیں تھا اس چھوٹی سی لڑکی کے چہرے پر...... دکھ، حزن اور ملال کے سارے رنگ جیسے اس کی رنگت کے ساتھ گھل کر رہ گئے تھے اور ان سب رنگوں پر غالب ایک رنگ تھا۔ محبت کا رنگ...... اس رنگ میں رنگی گویا وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو گئی تھی اور آگاہ تھی کہ تقدیر نے اسے جس حیثیت میں اس دنیا میں اتارا ہے، اس حیثیت میں وہ کسی سے کوئی شکوہ کرنے کا حق

نہیں رکھتی ہے۔ حق تو رشتے دیا کرتے ہیں اور طوائف کے پاس رشتے نہیں ہوتے۔ وہ ماں، بیٹی، بہن، بیوی کچھ بھی تو نہیں کہلاتی۔ وہ بس طوائف ہوتی ہے جسے کوئی نوٹ کمانے کے لیے استعمال کرتا ہے تو کوئی نوٹ خرچ کر کے اپنی دل بستگی کے لیے۔ چاند بانو کا دکھ سیدھا فاروق کے دل میں اتر گیا۔ وہ مجبور تھا کہ اس لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی محبت کا احترام تو اس پر واجب تھا چنانچہ اس کی دل جوئی کے لیے بہت نرمی سے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ تمہاری دعائیں میرے بہت کام آئیں گی اور میں بہت جلد صحت یاب ہو کر بمبئی واپس لوٹوں گا۔ اس وقت ہم ایک تفصیلی ملاقات کریں گے اور تم مجھ سے وہ سب کہہ سکو گی جو کہنا چاہتی ہو۔“

”اللہ کرے وہ دن جلد آئے۔“ اس کی بات سن کر چاند بانو کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے بڑی بے ساختگی سے دعا کی۔

”آمین۔“ اسی جیسی بے ساختگی کے ساتھ کاجل بھی بول اٹھی پھر فاروق کو مخاطب کر کے بولی۔

”شملہ میں آپ کے قیام کے دوران اپنی خیر خبر معلوم کرنے کی کیا صورت ہوگی؟“

”میرے بارے میں اطلاعات تو آپ کو اڈے سے ہی مل سکتی ہیں لیکن ٹھہریئے۔“ جواب دیتے ہوئے فاروق پل بھر کے لیے رکا۔ ”میرا خیال ہے اڈے آنا آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ میں ایسا کروں گا کہ شملہ سے آپ لوگوں کے نام ایک الگ چٹھی لکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ اڈے کا کوئی بھی آدمی چٹھی آپ تک پہنچا دے گا۔ کیوں دادا! چٹھی پہنچ جائے گی نا..... کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟“ بولتے بولتے وہ اچانک ربن سے مخاطب ہوا۔

”مسئلہ کیا ہونا ہے رے۔ تو نے بول دیا تو سمجھ لے کہ یہ کام ہونا ہی ہونا ہے۔“ ربن نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اسے یقین دلایا۔

”میرے خیال میں اب تو آپ کا اطمینان ہو گیا ہوگا اور مزید کوئی وسوسہ نہیں ستائے گا۔“ بظاہر وہ دونوں سے پوچھ رہا تھا لیکن اصل مخاطب چاند بانو تھی۔ اس نے بھی یہ بات خوب سمجھی اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ اسی پل دروازے پر دستک ہوئی۔

”مسٹر فاروق آپ کو چیک اپ کے لیے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“ دستک کا جواب ملنے پر نرس کیتھرائن ایک دوسری نرس کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور پیشہ ورانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”میں چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ اتنی نفری کے ساتھ کیوں آئی ہیں..... کیا میری طرف سے انکار کا خدشہ تھا؟“ فاروق نے اسے چھیڑا۔

”جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں تو سسٹر انیتا اس وقت ڈیوٹی پر ہیں۔ میں تو صرف اس لیے آپ کے ساتھ جا رہی ہوں کہ ڈاکٹر جو بھی انسٹرکشنز دیں، وہ اچھی طرح نوٹ کر سکوں تا کہ شملہ میں کسی قسم کی کوئی پریشانی پیش نہ آئے۔“ کیتھرائن نے جلدی سے وضاحت پیش کی تو وہ مسکرا دیا۔ پھر کاجل اور چاند بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا تو اب اجازت دیجیے۔“

”بالکل، اب ہم بھی روانہ ہوتے ہیں۔ آپ اطمینان سے معائنے کے لیے جائیے۔“ اس بار بھی جواب چاند بانو کی طرف سے آیا تھا۔ فاروق کی طرف سے ہونے والے اپنائیت کے ذرا سے اظہار نے اسے بڑا سہارا دیا تھا اور وہ خاصی پُراعتماد نظر آ رہی تھی۔ فاروق، کیتھرائن اور اس کی ساتھی نرس کے ساتھ معائنے کے لیے چلا گیا تو اس نے ربن سے شملہ روانگی سے متعلق دو ایک سوالات کیے اور پھر خود بھی کاجل کے ساتھ اسپتال سے روانہ ہو گئی۔ البتہ ربن کے لیے یہ سوچ ضرور چھوڑ گئی کہ کیا جولیٹ کے سحر سے فاروق کو آزاد کروانے میں چاند بانو کوئی کردار ادا کر سکتی ہے؟ اگر ہاں تو کیسے؟

☆☆☆

دفتر سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہونے کے بجائے جولیٹ نے قریبی بازار کا رخ کیا اور پھلوں کے ٹھیلے پر رک کر کچھ پھل خریدے۔ پھلوں کی خریداری کے بعد وہ پھولوں کی ایک دکان پر پہنچی اور بہت دیکھ بھال کر ایک چھوٹا سا گل دستہ منتخب کیا۔ آج وہ فاروق کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور صبح دفتر کے لیے روانہ ہوتے وقت اس سلسلے میں جوزف کو آگاہ کر کے آئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے رات کا کھانا بھی تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اسے علم تھا کہ کھانا پکا ہوا ہونے کے باوجود جوزف خود سے اسے کھانے کی زحمت نہیں کرے گا۔ وہ تو اس کے بے حد ..... اصرار پر بھی مشکل سے ہی چند لقمے کھاتا تھا لیکن کھانا تیار ہونے کی صورت میں اسے خود یہ سہولت رہتی کہ اگر اسپتال سے واپسی میں تاخیر بھی ہو جاتی تو گھر جا کر اسے کسی الجھن میں نہ پڑنا پڑتا اور وہ آسانی سے جوزف کو کھانا کھلانے کے ساتھ خود بھی زہر مار کر لیتی۔

آج کل وہ کھانا زہر مار ہی کرتی تھی لیکن اس عزم کے ساتھ کہ اپنے دشمنوں کے انجام تک ہر حال میں جینا ہے اور ظاہر ہے جب جینا تھا تو زندگی کی ضروریات بھی پوری کرنا تھیں۔ فاروقی کی مزاج پرسی کے لیے جانا بھی اس کی ایک ضرورت ہی تھی لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے وضع داری کا پورا خیال رکھا تھا اور اپنے محدود بجٹ کے باوجود اس کے لیے پھلوں اور پھولوں کی خریداری کی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بس اسٹاپ پر پہنچی اور اپنی مطلوبہ بس کا انتظار کرنے لگی۔ بسوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے مسافروں کو ان کا خاصا انتظار کرنا پڑتا تھا یا دوسری صورت یہ تھی کہ تانگے میں جایا جائے، پر تانگے میں جانے میں خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ چلنے کو ٹیکسیاں بھی چلتی تھیں لیکن ظاہر ہے ٹیکسی میں سفر مہنگا پڑتا تھا اور اس کے حساب سے اسے اسپتال پہنچنے کی اتنی جلدی نہیں تھی کہ وہ مہنگی سواری استعمال کرتی۔ آنے والے وقت میں اسے کس قسم کے اخراجات درپیش ہوتے اور کتنی رقم درکار ہوتی، اس کا اسے درست اندازہ نہیں تھا اس لیے بھی مناسب تھا کہ سوچ سمجھ کر رقم خرچ کی جائے۔ اپنی اسی سوچ کے تحت اس نے بہت صبر سے بس کا انتظار کیا۔ دفتری اوقات کے خاتمے کی وجہ سے یہ رش کا وقت تھا اور آنے والی بس خاصی بھری ہوئی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ اگلی بس کافی وقفے سے آئے گی اور وہ بھی ایسی ہی بھری ہوئی ہو سکتی تھی۔ اس لیے بغیر کسی جھجک کے اسی بس میں سوار ہو گئی۔

بس کی ساری نشستیں پُر تھیں اس لیے اسے ایک ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ کر کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں خریدے گئے پھل اور پھول موجود تھے جبکہ اپنے ذاتی سامان کا پرس کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ اس حالت میں سفر کرنا اچھا خاصا مشکل تھا اور اسے بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ بڑی جدوجہد سے اپنا توازن قائم رکھ کر کھڑی ہوئی تھی ایسے میں اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا حرکت کرتی ہوئی بس یا ٹوٹی سڑک کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ کوئی اس کے شانے سے ٹکرایا تھا۔ اس نے پلٹ کر ٹکرانے والے کو دیکھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان تھا جس کے سر پر الجھے ہوئے بالوں کا ٹوکرا سا رکھا ہوا تھا اور لباس بھی خاصا شکن آلود تھا۔ جولیٹ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ خباثت سے مسکرایا اور اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے ''سوری'' بول دیا۔ اس کے اس انداز پر جولیٹ دانت کچکچا کر رہ گئی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی کہ ہو سکتا ہے بس کو لگنے والے کسی جھٹکے کے باعث وہ اتفاقاً اس سے ٹکرا گیا ہو لیکن ٹھیک دو منٹ بعد لڑکے کا کندھا پھر اس کے کندھے سے ٹکرایا تو وہ جھنجلا کر اس کی طرف پلٹی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور دوسری طرف رخ کیے مسافروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جولیٹ کو اس بار بھی خاموش رہنا پڑا اور وہ خود بھی دوبارہ رخ پھیر گئی۔ اس بار لڑکے کا کندھا کوئی تین ساڑھے تین منٹ کے وقفے کے بعد اس سے ٹکرایا تھا اور اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ یہ حرکت جان بوجھ کر کر رہا ہے کیونکہ بس کو لگنے والے جھٹکے اتنے شدید نہیں تھے کہ اچھا خاصا ہٹا کٹا لڑکا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتا جبکہ وہ خود ایک لڑکی ہوتے ہوئے ہاتھ میں موجود سامان کے باوجود اپنا توازن قائم رکھے ہوئے تھی۔ اس بار اس نے بہت جارحانہ موڈ میں پلٹ کر لڑکے کو گھورا۔ وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے گھورنے کا اثر لیے بغیر وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بڑے دوستانہ انداز میں بولا۔

''بمبئی کی سڑکیں بہت خراب ہیں۔ میونسپل کمیٹی والوں کو ان کی مرمت کی طرف دھیان دینا چاہیے۔''

''میرے خیال میں سڑکوں کی مرمت سے زیادہ تم جیسوں کے دماغ کا علاج ہونا ضروری ہے۔'' جولیٹ نے بہت ناراض لہجے میں اسے احساس دلایا کہ وہ اس کی حرکت کو سمجھ رہی ہے۔ پھر مزید اس کے منہ لگنے کے بجائے ذرا آگے کی طرف کھسک کر کھڑی ہو گئی۔ یہ جگہ دو عورتوں کے ابھی ابھی اپنے اسٹاپ پر اترنے کی وجہ سے بنی تھی۔ اسے جگہ تبدیل کرتے دیکھ کر لڑکا مسکرایا لیکن خود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ جولیٹ بھی اس کی طرف سے دھیان ہٹا کر آگے دیکھنے لگی۔ اسپتال نزدیک آ رہا تھا، اس لیے راستے پر توجہ رکھنی زیادہ ضروری تھی۔ مطلوبہ اسٹاپ آنے پر وہ بس سے اتر گئی۔ اترتے ہوئے اس کی نظر خود بخود بس کے پچھلے دروازے کی طرف چلی گئی اور اس نے یہ دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا کہ وہ لڑکا بھی اسی اسٹاپ پر اتر گیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اس کی بھی منزل یہی تھی یا وہ اس کے پیچھے پیچھے اترا تھا۔ اگر وہ اس کے پیچھے اترا تھا تو وہ اس سے زیادہ خوف زدہ نہیں تھی۔ وہ شکل سے ہی ایک ایسا سڑک چھاپ آوارہ گرد نظر آ رہا تھا جو بمبئی کی سڑکوں پر عام پھرتے نظر آتے ہیں اور لڑکیوں کو چھیڑنے اور انہیں تھوڑا سا خوف زدہ کر دینے سے آگے کچھ نہیں کر پاتے۔ اس کے پیچھے آنے والا لڑکا تو عمر میں بھی اس سے کم تھا اور وہ ایک نوعمر لڑکے سے ڈرنے والی نہیں تھی چنانچہ بے نیازی سے اسپتال کی عمارت کی طرف

بڑھ گئی۔ اندر پہنچ کر اس نے معلوماتی کاؤنٹر کا رخ کیا۔ وہاں سے اسے اس شعبے کا علم ہو گیا جہاں فاروق جیسے پیشنٹس کو رکھا جاتا ہے۔ اس شعبے کی طرف بڑھتے ہوئے بھی اس نے اس لڑکے کو اپنے پیچھے پایا اور تھوڑی سی الجھن محسوس کرنے لگی۔ وہ خاصا ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا جو اندر تک اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ بہر حال اس نے ایک بار پھر اسے نظر انداز کر دیا اور شعبے کے معلوماتی کاؤنٹر سے فاروق کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگی۔

''مسٹر فاروق، ہیڈ انجری...... وہ تو ڈسچارج ہو گیا۔ ابھی دس منٹ پہلے تو ادھر سے گیا ہے۔'' استقبالیہ پر موجود فربہ جسم کی پینتیس چالیس سالہ عورت نے اسے اطلاع دی۔

''اوہ...... خیر کوئی بات نہیں۔ میں ان کے گھر جا کر ان سے مل لوں گی۔'' اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔

''کیسے مل لیں گا۔ وہ تو ہاسپٹل سے نکل کر سیدھا ریلوے اسٹیشن گیا ہے۔ ادھر سے وہ شملہ جانے کو مانگتا ہے۔ ڈاکٹر لوگ نے اسے علاج کے لیے پہاڑ پر جانے کو سجیسٹ کیا ہے اس لیے اس کا فادر ہاسپٹل کی ایک نرس ہائر کر کے اسے اپنے ساتھ سیدھا شملہ لے جا رہا ہے۔'' استقبالیہ پر موجود خاتون نے اسے مکمل معلومات فراہم کیں۔

''وہ یہاں سے سیدھا شملہ چلے جائیں گے؟'' جولیٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہم کو یہی انفارمیشن ملا ہے۔ اپنا کیتھی نے بتایا تھا۔ وہ مسٹر فاروق کو لک آفٹر کرنے اس کے ساتھ گیا ہے نا۔'' خاتون نے اسے یقین دہانی کروائی۔

''اوکے، تھینک یو سو مچ فار یور کائنڈ انفارمیشن۔'' جولیٹ نے مسکرا کر خاتون کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کے ہونٹ محض کھنچ کر رہ گئے۔ فاروق سے اس کا کوئی قلبی تعلق نہیں تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے تڑپتی لیکن اس سے ملاقات نہ ہونے پر اسے مایوسی ضرور ہوئی تھی کہ وہ اس سے جو حاصل کرنا چاہتی تھی، وہ حاصل نہ کر سکی تھی۔ وہاں سے واپس پلٹتے ہوئے اسے ہاتھ میں تھامے پھلوں اور پھولوں کا وزن منوں کے برابر لگ رہا تھا اور وہ بہت تھکے تھکے انداز میں چل رہی تھی۔

''پھول اپن کو بھی بہت اچھا لگتا ہے، تمہارا پیشنٹ نہیں ملا تو کوئی بات نہیں...... تم یہ پھول اپن کو بھی دے سکتی ہو۔ اپن بھی تم کو دیکھ کر ایک دم ہارٹ پیشنٹ ہو گیا ہے۔'' بے دھیانی سے چلتے ہوئے وہ اپنے بالکل قریب سے یہ سرگوشی سن کر چونک پڑی۔ اس کے دائیں جانب بالکل ساتھ ساتھ چلتا لڑکا وہی تھا جو بس میں بھی اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ اس نے لڑکے کو اپنے پیچھے پیچھے اسپتال میں بھی آتے دیکھا تھا لیکن فاروق سے ملاقات نہ ہونے پر اس بری طرح الجھ گئی تھی کہ اس پل اسے بھلا بیٹھی تھی۔ اب جو لڑکے نے اسے مخاطب کیا تو اسے دیکھ کر اس کے اندر طیش کی شدید لہر دوڑ گئی۔

''شٹ اپ، گیٹ لاسٹ فرام ہیئر، ورنہ میں پولیس کو کمپلین کر دوں گی۔'' اس نے لڑکے کو ڈانٹا۔

''پولیس والا سالا اپن کا کیا اکھاڑ لیں گا۔ ماں کی گود سے نکل کر اپن سیدھا تھانے میں ہی گیا تھا۔ اکھا شہر کا پولیس والا اپن کا یاری ہے۔ تم پولیس سے اپنا کمپلین کریں گا تو وہ اپن سے بولے گا کہ چھوکری کو اپنے ساتھ شیئر کرنے کا ہے چارلی۔'' وہ ایک آنکھ کا کونا دبا کر لفنگے پن سے بولا تو جولیٹ اپنے اشتعال پر قابو نہ پا سکی اور ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر لمحے بھر کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا اور گال پر ہاتھ رکھے جولیٹ کو حیران نظروں سے گھورتا رہا لیکن پھر اس کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے اور وہ بے پناہ غصے میں نظر آنے لگا۔ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لا کر جولیٹ نے تنتناتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ فوراً ہی اس کے پیچھے لپکا۔

''اے سالا چھوکری لوگ! تم چارلی کو تھپڑ مار کر ایسے کدھر جاتا ہے۔ اپن تم کو اس تھپڑ کا مزہ چکھائیں گا۔'' بلند آواز میں کہتے ہوئے اس نے جولیٹ کا بایاں بازو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ جولیٹ کے ہاتھ میں موجود پھل اور پھول گر پڑے۔ گرنے سے پھلوں کا تھیلا کھل گیا اور اس میں سے پھل نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اس سارے منظر نے کئی لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی لیکن اس سے قبل کہ کوئی دخل اندازی کرتا، چارلی نے اپنی جیب سے چاقو نکال کر ایک کھٹکے کے ساتھ کھول لیا۔ چاقو دیکھ کر لوگوں کے بڑھتے ہوئے قدم اپنی جگہ رک گئے۔

''سالا کسی نے بیچ میں ٹانگ اڑایا تو اپن اس کا گلا کاٹ ڈالے گا۔'' کھلے ہوئے چاقو کو لہراتے ہوئے اس نے دھمکی دی تو پہلے ہی قدم روک لینے والے مزید اپنی جگہ سکڑ کر رہ گئے۔ جولیٹ نے بھی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس کی۔ وہ جس لڑکے کو عام سا آوارہ گرد سمجھی تھی، وہ باقاعدہ غنڈا نکلا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' اپنے جسم میں دوڑتی خوف کی لہر پر قابو پا کر اس نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''تم کو اپن کے ساتھ چلنا ہوگا۔تم سے اس تھپڑ کا حساب لینے کے بعد ہی اپن تمہیں چھوڑیں گا۔'' یہ جواب دیتے ہوئے جولیٹ کے جسم پر رینگتی اس کی نگاہوں میں جو غلاظت تھی، اس نے جولیٹ کو کپکپا کر رکھ دیا۔ ابھی زیادہ دن تو نہیں گزرے تھے مرد کی انا سے پیدا ہونے والی ذلت کو سہے ہوئے اور اب ایک بار پھر یہ ذلت اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تم مجھے جان سے مار دو لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' آخرکار اس نے بہت عزم سے اعلان کر دیا اور چارلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہوگئی۔ بے پناہ خوف کے ردِعمل میں پیدا ہونے والی یہ ہمت صرف اس وجہ سے تھی کہ اسے اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آج اگر وہ چارلی کے ہاتھوں مر جاتی تو صرف ایک بات کا افسوس ہوتا کہ دلدار آغا سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیے بغیر مر گئی ورنہ اب اسے زندگی کی کوئی چاہ نہیں تھی۔

''اپن کو تیرا جان لے کر کیا کرنے کا ہے۔ تو نے اپن کا انسلٹ کیا ہے، اپن بھی تیرا مٹی پلید کرنے کو مانگتا ہے۔ تو شرافت سے اپن کا بات نہیں مانے گا تو اپن ابھی ادھر ہی تیرا کپڑا اپھاڑ ڈالے گا۔'' اس نے واشگاف لہجے میں اعلان کیا تو پہلی بار جولیٹ کو اندازہ ہوا کہ وہ قدرے نشے میں بھی ہے اور شاید نشے نے ہی اس کی ہمت کو اتنا بلند کر رکھا تھا کہ وہ آس پاس موجود پبلک کو بھی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اپنے ناپاک عزم کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر پھرتی سے جولیٹ کے گلے میں پڑا اسکارف کھینچ کر دور پھینک دیا۔ جولیٹ نے ایک چیخ مار کر ابھی تک اس کے شکنجے میں جکڑے اپنے بائیں بازو کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جولیٹ کا بازو چھوڑنے کے بجائے اس نے پہلے اسے دو تین زوردار جھٹکے دیے پھر اس کے بلاؤز کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ گریبان سے چند سینٹی میٹر کے فاصلے پر ہی تھا کہ اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور بری طرح چیختے ہوئے اس نے اپنے بازو کو جھٹکا دیا۔ اس کایا پلٹ پر حیران جولیٹ نے اس کے بازو پر نظر ڈالی تو اس کی قمیص کی آستین خون آلود نظر آئی اور فوراً ہی بازو میں کھبا چاقو بھی نظر آ گیا۔

''کیوں سالا ٹپوری لوگ، ادھر یہ کیا تماشا کھڑا کر رکھا تھا؟'' ابھی وہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھ نہیں سکی تھی کہ لوگوں کے ہجوم میں سے ایک شخص آگے آیا اور چارلی کو گھورتے ہوئے اس سے بولا۔

''تم کون ہے؟'' بہ ظاہر چارلی نے دبنگ بن کر اس سے یہ سوال کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔

''اپن کا نام جانی ہے اور یہ چھوکری اپنے ربن دادا کے محلے کی ہے۔ تمہارا ہمت کیسے ہوا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا؟'' اس نے کڑے انداز میں اسے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

ربن دادا کا نام سن کر چارلی کے چہرے کی رنگت اڑ گئی اور سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے صفائی دینے کے انداز میں بولا۔ ''اپن کو خبر نہیں تھا استاد کہ اس مس لوگ کا ربن دادا سے ریلیشن ہے۔ اپن تو اس سے ایسے ہی ذرا چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا پر اس نے سالا چارلی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ تھپڑ کھا کر اپن کا بھیجا گھوم گیا تھا اس لیے غلطی ہوگیا۔'' بمبئی کا ایسا کون سا غنڈا تھا جو ربن کی حیثیت کو نہیں پہچانتا تھا اور چارلی جیسے تیسرے درجے کے غنڈے تو اس کے مقابل کھڑے ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے وہ فوراً ہی بھیگی بلی بن گیا تھا۔

''ایسا غلطی آئندہ نہیں ہونے کو مانگتا ہے۔ آگے سب شریف دوسن کو اپنا مدر سسٹر سمجھنا۔ مستی کرنی ہو تو ادھر کوٹھے والیوں کے پاس جانا۔ اپن نے پھر تیرے کو ایسی حرکت کرتے دیکھا تو چاقو سیدھا دل میں اترے گا۔'' جانی نے اس کے بازو سے اپنا چاقو کھینچا اور اسی کی قمیص سے صاف کر کے بند کرنے کے بعد جیب میں رکھ لیا۔ خود چارلی کا اپنا چاقو تو کب کا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور آس پاس بکھرے پھلوں میں سے ایک سیب میں پھنسا ہوا تھا۔

''تیرے جیسے ٹپوریوں کا چاقو بس فروٹ کاٹنے لائق ہی ہوتا ہے۔ ایسے چاقو کو آگے بھی پبلک میں نکالنے کا مسٹیک مت کرنا ورنہ تیرا ناک ہی کٹ کر گر جائے گا۔'' جانی اس کی طبیعت پوری طرح صاف کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چارلی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے آنکھ ملا پاتا۔ وہ بس اپنے بازو کے زخم کو ہاتھ سے دبائے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت فضا میں پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز گونجی اور پولیس والوں کو اپنا یار قرار دینے والا چارلی متوحش نظر آنے لگا۔ ممکن تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا لیکن جانی نے ڈپٹ دیا۔

''بھاگنے کا نہیں ہے ہیرو۔ اپن تیرا گارنٹی لیتا ہے۔'' ناچار اسے اپنی جگہ کھڑا رہنا پڑا۔ جولیٹ بھی اس پوری صورتِ حال پر انگشت بدنداں جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ جانی

کو اس نے ربن کے اڈے کے ایک فرد کے طور پر پہلے ہی شناخت کرلیا تھا۔ اس کے نام سے اگرچہ اسے واقفیت نہیں تھی لیکن گلی میں آتے جاتے دیکھ چکی تھی اور خیال تھا کہ جب وہ اسپتال میں داخل تھی تو شاید تب بھی یہ بندہ وہاں آیا تھا۔

''تو ادھر کیا لفڑا کر رہا ہے جانی؟ اسپتال مینجمنٹ نے پولیس اسٹیشن فون کر کے کمپلین کیا ہے کہ ادھر اسپتال میں کوئی گڑبڑ ہے۔'' پولیس کی گاڑی آ کر رکی تو لوگوں کا رش خود بخود چھٹنے لگا۔ گاڑی سے ایک سپاہی کے ساتھ برآمد ہونے والا تھانے دار جانی کو پہچان کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

''آپ دیر سے پہنچا مائی باپ۔ اب ادھر سارا لفڑا نمٹ گیا ہے۔'' جانی نے کچھ مضحکہ خیز انداز میں تھانے دار کی بات کا جواب دیا۔

''پر لفڑا تھا کیا؟'' اب وہ آیا تھا تو صورتِ حال جانے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

''یہ سالا لڑکا لوگ اپنی سسٹر کو چھیڑ رہے لے تھا۔ اپن نے اس کو لیسن دے دیا کہ ایسا مسٹیک کا کیا پنشمنٹ ہوتا ہے۔ اب ادھر سب سیٹ ہے۔'' جانی نے مختصراً اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''پیارے لال، بٹھا اس مائی کے لال کو گاڑی میں۔ تھانے جا کر اس کو اسی مستی کا مزہ چکھاتے ہیں۔'' تھانے دار نے فوراً ہی حکم صادر کیا۔

''جانے دو صاحب، ابھی اس کو کافی سبق مل گیا ہے۔ آگے کچھ الٹا سیدھا کرتے دیکھو تو پھر الٹا لٹکا دینا۔'' جانی نے اس کی سفارش کی۔

''تیرے بولنے پر چھوڑ دیتا ہوں۔ تو یہ بتا کہ دادا کا کیا حال ہے؟'' تھانے دار نے فوراً ہی اس کی بات مان لی۔

''ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ ابھی اپنے شہزادے کے ساتھ شملہ جانے کو نکلا ہے۔'' جانی نے اسے بتایا۔ یہ تھانے دار بمبئی کے ان پولیس والوں میں سے تھا جن کے ساتھ ربن کی اچھی سلام دعا تھی اور وہ اڈے سے باقاعدگی سے جانے والے بھتے کو ''حلال'' کرتا تھا۔

''میں نے سنا تھا کہ فاروق استاد کو ہیڈ انجری ہو گیا ہے اور وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔'' تھانے دار نے اپنی معلومات کی تصدیق کرنے کے انداز میں کہا۔ اس دوران میں اس کے ساتھ آنے والا سپاہی ہجوم کو منتشر کر چکا تھا۔ جانی سے گفتگو کرتے تھانے دار نے اشارے سے چھاری کو بھی وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ فوراً ہی اپنا بازو دبائے وہاں سے سرک گیا۔

''دادا، فاروق استاد کا علاج کے واسطے ہی شملہ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے ہل اسٹیشن لے جانے کو بیسٹ کیا تھا۔'' جانی، تھانے دار کو تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ جولیٹ نے چاہا کہ اب وہ بھی وہاں سے روانہ ہو جائے۔ خاصا وقت ہو گیا تھا اور اسے گھر جا کر جوزف کو بھی دیکھنا تھا۔

''ابھی رکو سسٹر، اپن خود تمہارے ساتھ چلے گا۔'' جانی نے اس کا ارادہ بھانپ کر اسے روک لیا پھر تھانے دار سے اجازت لے کر اس کے ساتھ اسپتال سے باہر نکل گیا۔

''آپ ادھر کیا کرنے آیا تھا مس؟'' جولیٹ کے ساتھ ساتھ چلتے اس نے اس سے دریافت کیا۔

''میں مسٹر فاروق کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔ وہ تو نہیں ملے لیکن یہ غنڈا تنگ کرنے لگا۔ تھینک گاڈ کہ آپ آگئے ورنہ آج ایک بار پھر میرا تماشا بن جاتا۔'' جولیٹ نے سرخ چہرے کے ساتھ اسے بتایا۔

''اپن بس اتفاق سے ادھر رہ گیا۔ دادا اور فاروق استاد اسٹیشن کے لیے نکلا تو گاڑی میں اپنے لیے جگہ نہیں بچی۔ دادا بولا، جانی اب اسٹیشن آنے کو چھوڑ اور یہیں سے فاروق کو گڈ بائی بول کر اڈے پے چلا جا۔ اپن کو دادا کا حکم تو ماننا ہی تھا پر ادھر ہاسپٹل میں ایک جاننے والا دکھائی دے گیا اور اس کی طبیعت معلوم کرنے میں تھوڑی دیر لگ گئی۔ اس سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس سالا غنڈا لوگ کو آپ سے مس بی ہیو کرتے دیکھا بس پھر اپن میدان میں کود پڑا۔'' جانی نے بھی اسے اپنی وہاں موجودگی کے جواز سے آگاہ کیا۔

''آئی ایم ویری تھینک فل ٹو یو مسٹر جانی۔ آپ نے سچ مچ میری بہت ہیلپ کی۔ بمبئی کا ماحول بہت خراب ہو گیا ہے۔ کوئی عورت کھانے کمانے اکیلی گھر سے باہر نکلے تو مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا کہ ایسے لوگوں کا دماغ درست رہ سکے۔ ابھی میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو میں اس غنڈے کو مزہ چکھا دیتی۔'' بہت اچانک ہی اس کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ فاروق نہیں ملا تو کیا ہوا، وہ جانی سے بھی ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے چنانچہ اب اسی کے لیے تمہید باندھ رہی تھی۔

''نو نو، ویپن رکھنا بہت ڈینجرس ہوتا ہے۔ ویپن صرف اس آدمی کو رکھنا مانگتا جو سیلف کنٹرول جانتا ہو۔ اناڑی پرسن کے تو اپنے لیے یہ ٹربل بن جاتا ہے۔ آپ بھی ایسا سوچنا بھی مت۔'' جانی نے فوراً ہی دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر اس کی مخالفت کی۔

''کیسے نہیں سوچوں ۔ میرے ساتھ جو ہوا وہ سب کو معلوم ہے اور آج بھی آپ نے دیکھ لیا کہ میں کیسی مشکل میں پڑ گئی تھی ۔ اگر آپ نہ آجاتے تو میرا کیا ہوتا۔'' جولیٹ نے قدرے تیز لہجے میں اپنے حق میں دلیل دی۔

''وہ سب ٹھیک ہے، پر اپنا دل نہیں مانتا کہ آپ کے پاس ویپن ہو۔'' جانی اب بھی مخالفت پر قائم تھا لیکن لہجہ ذرا کمزور پڑ گیا تھا۔

''دل نہیں دماغ سے سوچو مسٹر جانی...... میں ایک تنہا لڑکی ہوں۔ آپ نے میرے فادر کا حال دیکھا ہے نا، وہ تو جیتے جی مر چکے ہیں۔ ایسے میں مجھے خود ہی اپنے ڈیفنس کے لیے کوئی انتظام کرنا چاہیے یا نہیں؟ گھر سے باہر نکلنا تو میں چھوڑ نہیں سکتی۔ کماؤں گی نہیں تو کھاؤں گی کہاں سے؟'' اس نے اپنا لہجہ ذرا رقت آمیز کر لیا۔

''یو آر رائٹ، پر ویپن...'' جانی اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''میں ہتھیار اپنے ڈیفنس کے لیے رکھنا چاہتی ہوں، کوئی قتل و غارت کے لیے نہیں۔ ابھی آپ نے مجھے اپنا سسٹر بولا تھا تو کیا آپ سسٹر کی اتنی بھی ہیلپ نہیں کریں گے؟'' اس نے اپنا لہجہ اور بھی رقت آمیز کر لیا۔

''کیا مطلب؟'' اس کے الفاظ پر جانی بوکھلا گیا۔ وہ تو اس کے اپنے پاس ہتھیار رکھنے کے خیال کے سلسلے میں بحث کر رہا تھا اور وہ الٹا اس سے ہی مدد مانگ رہی تھی۔

''آئی مین کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جو مجھے کوئی ہتھیار پرووائڈ کر سکتے ہیں۔'' اس بار اس نے کھل کر اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' جانی ہنوز شپٹایا ہوا تھا۔

''آپ نے مجھے سسٹر بولا ہے اور سسٹر کے لیے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ دونوں وہیں لب سڑک کھڑے ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ جولیٹ کے بے حد اصرار اور لفظ سسٹر کی گردان سے جانی خاصا نرم پڑ چکا تھا اور اسے اپنا وہ گھر یاد آ گیا تھا جسے وہ برسوں پہلے چھوڑ آیا تھا۔ اس گھر میں اس کی ماں تھی جو ظالم شوہر کی عیاشیوں اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے دھندا کرتی تھی۔ ماں کے کربناک ماضی کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ اتنے برسوں میں یقیناً ماں کی جوانی ڈھل گئی ہوگی اور اس کی بہنیں سنِ بلوغت میں داخل ہو چکی ہوں گی۔ جس ماحول میں وہ رہتی تھیں وہاں اس بات کا پورا امکان تھا کہ اس کی بہنیں بھی اسی جہنم میں دھکیل دی گئی ہوں جس میں اس کی ماں برسوں جلی تھی کیونکہ پیٹ کا

دوزخ بھرنے کے لیے آدمی ہاں ہر جہنم کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جولیٹ نے اس سے اپنی مجبوری بیان کی تھی کہ وہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کمانے کی خاطر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہے۔ وہ ٹیکسی چلاتی تھی اس لیے اسے کوئی الٹا سیدھا کام کرنے کی تو ضرورت نہیں تھی لیکن تحفظ کے مسئلے سے دوچار تھی۔ اگر اس کے ایک معمولی سا ہتھیار فراہم کرنے سے اسے تحفظ مل جاتا تو اس میں ایسی کوئی برائی نہیں تھی۔

''کس سوچ میں پڑ گئے برادر؟'' اس بار جولیٹ نے اسے مسٹر جانی کے بجائے بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔

''کچھ نہیں۔'' جانی نے سر کو نفی میں جنبش دی اور جیب سے اپنا چاقو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ رکھ لو پر اپن سے پرامس کرو کہ اس کا مس یوز نہیں کرے گا۔''

''بالکل نہیں برادر۔'' جولیٹ نے فوراً اس سے چاقو جھپٹ لیا اور اسے شولڈر بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ چاقو بھی اچھی چیز ہے، پر آپ کوشش کرنا کہ میرے لیے کوئی گن ارینج کر دو۔ گن یوز کرنا ایزی بھی ہوتا ہے اور اس کا رعب بھی زیادہ پڑتا ہے۔ میں آپ کو اس کی پیمنٹ کر دوں گی۔''

''گاڈ بلیس یو۔ یہ تم کیسا بات کرتا ہے۔ اپن کو تو لگتا ہے کہ تم سچ مچ کسی کا مرڈر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' اس کا مطالبہ سن کر جانی وحشت زدہ ہو گیا۔

''اوہ سو سوری..... آپ پریشان مت ہوں۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی اگر آپ کے لیے پاسیبل نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔'' جولیٹ کو اندازہ ہوا کہ جانی کو اس پر شک ہو رہا ہے تو فوراً ہی اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹ گئی ورنہ ڈر تھا کہ وہ اپنا چاقو بھی واپس مانگ لے گا اور وہ اس چاقو کی کارکردگی دیکھ چکی تھی۔ کھٹکے دار یہ چاقو پرس میں رکھنے کے حساب سے بھی آئیڈیل تھا۔ ہاں استعمال کے لیے اسے مشق کرنی پڑتی تو اس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دلدار آغا کی واپسی تک اس کے پاس وقت تھا، اس عرصے میں وہ خاصی مشق کر سکتی تھی۔

''دیکھو لو سسٹر! کچھ الٹا سیدھا نہیں کرنے کا ہے۔ کوئی پرابلم ہے تو اپن کو بولو۔ اپن تمہارا پرابلم سولو کرے گا۔'' جانی اس کی طرف سے کھٹک چکا تھا۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے۔ اس بحث کو چھوڑو اور گھر چلنے کی کرو۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' جولیٹ نے اس کا دھیان دوسری طرف لگایا اور وہ سچ مچ واپسی کی فکر میں لگ گیا۔

''او کے۔ تم ادھر رکو اپن ابھی اس ٹیکسی والے سے بات کرتا ہے۔'' جولیٹ کو وہیں رکنے کا کہہ کر وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی طرف نظریں جمائے جولیٹ نے دھیرے سے اپنے پرس کو تھپتھپایا۔ فاروق کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال آنا بےکار نہیں گیا تھا اور وہ اپنے مقصد میں خاصی کامیاب رہی تھی۔ پرس میں پڑے چاقو نے اسے دلدار آغا سے انتقام لینے کے سلسلے میں مزید پرعزم کر دیا تھا۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن کا وہی مخصوص ماحول تھا۔ کہیں سامان سے لدے پھندے عیال دار لوگوں کی بوکھلاہٹیں تھیں تو کہیں کوئی چھڑا چھانٹ اپنا بیگ اور بستر بند اٹھائے بے نیازی سے کھڑا تھا۔ جوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھے قلی مسافروں کے گرد منڈلا رہے تھے کہ ان کے ڈھیروں سامان کا بوجھ اپنی ایک جان پر لاد کر چار پیسے کما سکیں تو ٹی اسٹال والے، خوانچے والے اور اخبار والے بھی اس فکر میں تھے کہ مسافروں کی جیب ہلکی کر کے اپنے کنبوں کے لیے روزی کا بندوبست کر سکیں۔ بے تحاشا آوازوں میں ہر فرد کسی نہ کسی طور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ کہیں بیوی، کمانے کے لیے دوسرے شہر جانے والے شوہر کو... نم ناک لہجے میں الوداع کہہ رہی تھی تو کہیں دوسرے شہر بسنے والے رشتے داروں کو سلام دعا اور دیگر پیغامات کی ہدایات جاری تھیں۔ کہیں کسی ایک فرد کو رخصت کرنے کے لیے پورا خاندان اس خیال سے اٹھ آیا تھا کہ اسٹیشن کی رونق میں ذرا تفریح رہے گی تو کہیں بیزاری تھی کہ جلد از جلد ریل آئے اور رخصت کرنے کی ذمے داری سے جان چھوٹے۔ فاروق، ربن، کیتھرائن اور گولو کے گرد بھی ان کے ساتھیوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ان چاروں کو رخصت کرنے کے لیے اڈے کے آدھے سے زیادہ افراد اٹھ آئے تھے۔ جو نہیں آسکے تھے وہ بھی صرف اس مجبوری کے تحت نہیں آئے تھے کہ انہیں ربن اور راموں کی طرف سے اجازت نہیں ملی تھی۔ اڈے کو کسی صورت خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا، یہ بات سب سمجھتے تھے اس لیے رکنے والے طوعاً و کرہاً ہی سہی، رک گئے تھے۔ گولو خاصا اترایا ہوا تھا کہ بابا اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں اور وہ مستقل اپنے فاروق بھائی کے ساتھ ہی رہے گا۔ دوسری طرف بجو کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''ادھر آپ لوگوں کو کھانے پینے کا پریشانی ہوگا فاروق بھائی! آپ کو کھانا پکانے کے واسطے اپن کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔'' وہ آخری لمحات میں بھی جانے والوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

''کوئی پریشانی نہیں ہونے کا ہے۔ ادھر بھابیہ سیٹھ کا کک ہے۔ دیسی، انگریزی، چینی سارے کھانے بنانا جانتا ہے۔'' فاروق کے بجائے ربن نے اس کی دلیل کو بڑی بے نیازی سے رد کیا۔

''اس کے ہاتھ میں اپنے جیسا ٹیسٹ تو نہیں ہوگا نا دادا۔ آپ لوگوں کو اپنے ہاتھ کا کھانا کھانے کا عادت ہے۔'' سجو نے بھی ہمت نہیں ہاری اور عاجزی سے ہی سہی، کوشش جاری رکھی۔

''اسی لیے تو اپن تیرے کو ساتھ لے کر نہیں جارہا ہے۔ ادھر ہم صرف تین آدمی کو پرابلم ہوگا، پر ادھر تو سارے کے سارے بھوکے رہ جائیں گے۔ تو ہم لوگوں کی فکر چھوڑ اور ان سب کا خیال کر۔'' بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہی ربن کی اس بات پر وہاں قہقہہ پڑ گیا۔ سجو اب یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ اڈے کے باقی لوگ جہنم میں جائیں، وہ صرف ان لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ سو منہ لٹکا کر خاموشی اختیار کرلی۔

''دل چھوٹا کیوں کررہے ہو یار! ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جارہے ہیں۔ بس تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر واپس یہیں ہوں گے۔'' اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فاروق نے اس کی دل جوئی کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ کچھ اور لٹک گیا۔

''اپنے کو لگتا ہے سجو کو آپ کی جدائی سے زیادہ شملہ نہ دیکھنے کا غم ہورہا ہے۔ سنا ہے بڑا خوب صورت ہے جبھی تو گورا لوگ نے اسے اپنا سمر کیپٹل بنایا تھا۔ سالا سب خوب صورت چیز پر اپنا قبضہ کرنے کو مانگتا ہے۔'' نہایت سنجیدگی سے یہ تبصرہ کرنے والا اجے تھا جسے سن کر سجو کو پتنگے لگ گئے اور غصے سے بولا۔

''غلط بات مت بولو اجے بھیا۔ اپنے کو گھومنے پھرنے کا کوئی شوق نہیں ہے ورنہ وہ جو جوہو میں پارسی سیٹھ رہتا ہے، اس نے اپنے کو آفر کیا تھا کہ اپن اس کے پاس آجائے۔ سیٹھ کا میڈیسن کا بزنس ہے اور سارے ہندوستان میں گھومتا پھرتا ہے۔ بولا تھا جہاں جائے گا، اپنے کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اپن شوقین ہوتا تو سیٹھ کا آفر مان لیتا لیکن اپن بولا کہ اپن ادھر کے لوگوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے کا ہے۔ اپن تو دادا اور فاروق بھائی کا شکل دیکھ دیکھ کر جیتا ہے۔''

''تم بھی ہمیں بہت عزیز ہو سجو...... تمہارے بنائے کھانے ہمیں شملہ جا کر بھی نہیں بھولیں گے لیکن دادا نے تمہیں یہاں رکنے کا بولا ہے تو اس کا مطلب ہے، سوچ سمجھ کر ہی بولا ہوگا۔ دادا ایسے ہی تو کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہیں نا۔''

فاروق نے ایک بار پھر اسے پچکارتے ہوئے سمجھایا۔ اصل میں تو اس کی اپنی قلبی کیفیت بہت عجیب تھی اور وہ خود بھی بمبئی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ بمبئی وہ شہر تھا جہاں وہ زندگی کے بہت سے تجربات سے گزرا تھا اور... بے مہر ہوتے ہوئے بھی اس شہر نے اسے اپنی بانہوں میں پناہ دی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہاں جولیٹ رہتی تھی جس کی ایک جھلک دیکھ لینا ہی اسے زندگی کا حاصل لگتا تھا۔ کتنے دن گزر گئے تھے کہ وہ اس کی ایک جھلک سے بھی محروم تھا اور اب بھی ایک نامعلوم مدت کے لیے یہ محرومی اس کا نصیب بننے والی تھی لیکن وہ دادا کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ خوشی سے یا ناراضی سے ہر حال میں اسے دادا کی بات قبول تھی اور شملہ جانے کا فیصلہ تو دادا نے ڈاکٹروں کے مشورے پر اس کی بھلائی کے لیے ہی کیا تھا ورنہ موجودہ حالات میں بمبئی چھوڑ کر جانا خود اس کے اپنے لیے بہتر نہیں تھا۔ اس نے ابھی کچھ دن پہلے ہی مجو کے اڈے کی چوکی سنبھالی تھی اور اس نئے اڈے کی چوکی پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود وہاں رہتا۔ خود اپنے اڈے سے متعلق بھی ڈھیروں امور ہوتے تھے لیکن وہ ان سب باتوں کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ شملہ جارہا تھا اور پیچھے ساری ذمے داری رامو پر ڈال دی تھی۔ یوں تو رامو اس کا دستِ راست تھا اور بہت باصلاحیت آدمی تھا لیکن دادا تو دادا تھا۔ اس کی جگہ بھلا کوئی دوسرا کیسے لے سکتا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک بول رہے ہیں فاروق بھائی۔ اپن دادا کے فیصلے کو قبول کرتا ہے۔'' سجو نے یک دم ہی اپنا موڈ تبدیل کرکے چہرے پر مسکراہٹ سجالی تو فاروق نے اسے محبت سے گلے لگالیا۔ قریبی بینچ پر بیٹھی کیتھرائن دلچسپی سے یہ سب دیکھتی رہی۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ عام حالات میں تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ اڈے پاڑے کے لوگوں سے کوئی واسطہ رکھے گی لیکن اسپتال میں ان لوگوں کے چند دن کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر منوہر بھابیہ والے واقعے نے اسے بے حد متاثر کیا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ ان لوگوں کا دھندا چاہے جو بھی ہو لیکن بنیادی طور

پر وہ بڑے اچھے کردار کے لوگ تھے۔ فاروق کی دیکھ بھال کے لیے اسے بہت اچھے معاوضے پر شملہ چلنے کی پیشکش کرتے وقت بھی ربن نے مکمل کرا سے اپنے بارے میں بتا دیا تھا اور ساتھ ہی یہ یقین دہانی بھی کروائی تھی کہ وہ ان کے ساتھ بالکل محفوظ رہے گی چنانچہ وہ بخوشی شملہ جانے کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ اسے اسپتال سے اتنی جلدی میں وہ بھی نامعلوم مدت کے لیے چھٹیاں دلوانے کا کارنامہ بھی ربن نے ہی انجام دیا تھا چنانچہ اب وہ ان لوگوں کے ساتھ تھی اور لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''ٹرین آنے میں بس دس منٹ رہ گیا ہے۔ سب سامان دھیان سے ڈبے میں چڑھا دینا، یہ نہ ہو کہ ملنے ملانے کے چکر میں تم لوگ گڑبڑ کر ڈالو۔'' وہاں جاری سارے ہنگامے سے بے نیاز بنے ربن نے کلائی موڑ کر گھڑی میں وقت دیکھا اور بطورِ خاص کسی کو مخاطب کیے بغیر ہدایت کی۔

''فکر نہیں کرو دادا، کوئی گڑبڑی نہیں ہو گا۔'' ایک کرگے نے اسے یقین دہانی کروائی۔ اسی وقت فاروق کی نظر کرتے پاجامے میں ملبوس ایک آدمی پر پڑی۔ وہ چاند بانو کا ملازم خاص تھا اور انہی کی طرف آ رہا تھا۔

''شکر ہے آپ لوگ مل گئے ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے پہنچنے تک ٹرین چل ہی نہ پڑے۔ اصل میں، میں غلط پلیٹ فارم کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں آپ لوگوں کو ڈھونڈنے میں وقت برباد کرتا رہا لیکن بعد میں لوگوں سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ آپ والی ٹرین کو تو یہاں آنا ہے۔ بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں کہ کسی طور آپ لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔'' ملازم نے ان کے قریب پہنچ کر پہلے سلام کیا اور پھر جلدی جلدی بولنے لگا۔ بولتے ہوئے اس کی سانسوں کی غیر متوازن لَے سے ظاہر تھا کہ وہ واقعی بڑی افراتفری میں ان تک پہنچا ہے...... کیوں؟ یہ سبب بھی فوراً ہی سامنے آ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ہرے کپڑے سے نہایت اہتمام کے ساتھ سیا گیا امام ضامن برآمد کیا اور اجازت طلب نظروں سے فاروق کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے فوراً ہی سر کو اثبات میں ہلا دیا کہ عقیدے کا معاملہ چاہے جو بھی ہو لیکن وہ کسی کی اتنی محبت کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ امام ضامن چاند بانو نے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے خود تیار کر کے اس کے لیے بھجوایا ہو گا۔ اگر ہرے کپڑے میں لپٹا سوا روپیا اس کے بازو سے بندھوا کر وہ محبت کی ماری سکون پا سکتی تھی تو اس کا کیا جاتا تھا۔ اس نے بازو آگے بڑھا کر خاموشی سے وہ امام ضامن بندھوا لیا۔

''بی بی نے راستے میں کھانے کے لیے بھی کچھ سامان بھجوایا ہے۔'' ملازم نے اسٹیل کے اس بڑے سے توشے دان کی طرف اشارہ کیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور امام ضامن باندھنے کے لیے بینچ کے قریب رکھ دیا تھا۔

''اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یہ اپنا بجو ہے نا، اس نے پہلے ہی اتنا ڈھیر سارا کھانا ساتھ کر دیا ہے۔'' فاروق ذرا کھسیا سا گیا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ اردگرد موجود اڈے کے افراد میں سے کوئی بھی اتنی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس سے امام ضامن یا توشے دان کے بارے میں کچھ دریافت کر سکے لیکن وہ انسانی فطرت کے تجسس سے بھی واقف تھا۔ کسی کے زبان پر سوال نہ لانے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ دل و دماغ بھی سوالات سے خالی ہوں گے۔ یہ لازمی تھا کہ ان میں سے ہر ایک سوچ رہا ہو کہ یوں اسٹیشن پر اسے امام ضامن اور توشے دان بھجوانے والا بھلا کون نکل آیا کہ وہ تو ان کی دنیا کا فرد تھا جس کا ان کے سوا کسی سے واسطہ نہیں رہا تھا۔

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں حضور...... میں تو بس حکم بجا لانے کا پابند ہوں۔ البتہ آپ کو یہ مشورہ ضرور دے سکتا ہوں کہ اسے قبول کرنے سے انکار نہ فرمائیے۔ آپ کے پاس بے شک زادِ راہ کے طور پر بہت کچھ ہو گا لیکن اس توشے میں موجود اشیا کا سواد آپ سب سے جدا پائیں گے۔'' ملازم نے ہاتھ باندھ کر بہت احترام سے اسے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے رے۔ اتنی حجت کی کیا ضرورت ہے۔ محبت سے بھیجی چیزوں کو لوٹانے کا تو نہیں ہے نا۔'' اس بار اب تک خاموش بیٹھے ربن نے دخل اندازی کرتے ہوئے ٹوکا تو فاروق چونک سا گیا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ ربن نے اسے چاند بانو کے حوالے سے چھیڑا ہو لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بالکل سنجیدہ تھے۔ وہ اپنا وہم سمجھ کر ٹال گیا۔ اسی وقت پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ ریل گاڑی کی وسل اور پہیوں کی مخصوص گڑگڑاہٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ گاڑی پہنچنے والی ہے چنانچہ ہر ایک اس فکر میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اپنے کل مال و اسباب اور ساتھیوں سمیت بالکل تیار رہے تاکہ گاڑی میں آسانی سے سوار ہوا جا سکے۔ ان کے ساتھی بھی مستعدی سے ان کا سامان سمیٹنے لگے۔ چاند بانو کے ملازم کا لایا گیا توشے دان بھی ان میں سے ایک نے تھام لیا۔ گاڑی

پلیٹ فارم پر آکر رکی تو مزید ہلچل مچ گئی اور ہر طرف بھاگتے دوڑتے انسانی جسموں کے ساتھ آوازیں ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کے ساتھیوں نے اس بھیڑ اور ہنگامے میں بھی بڑی مستعدی اور مہارت کے ساتھ مطلوبہ ڈبا تلاش کر کے ان کا سامان وہاں پہنچا دیا۔ ربن نے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بکنگ کروائی تھی تاکہ فاروق مکمل آرام کے ساتھ سفر کر سکے۔ سامان ڈبے میں سیٹ ہو جانے کے بعد ایک بار پھر ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ اڈے کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد وہاں موجود تھی اس لیے ان تینوں کو ان سب سے فرداً فرداً ملنے میں اچھا خاصا وقت لگا۔ ملنے والوں کا بھی یہ حال تھا کہ جو سینے سے لگاتا تھا، آسانی سے جدا ہونے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ شملہ کے بجائے سات سمندر پار جا رہے ہوں۔ جذبات میں ڈوبے ان لمحات سے گزر کر وہ تینوں کیتھرائن سمیت اپنے ڈبے میں سوار ہوئے تو ٹرین کی روانگی کا وقت ہونے ہی والا تھا۔ ربن اور کیتھرائن نے ڈبے کے اندر جا کر اپنی نشستیں سنبھال لیں لیکن فاروق اور گولو دروازے پر ہی کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ ٹرین نے وسل دی اور پھر آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے ساتھیوں کو الوداع کہتے رہے، یہاں تک کہ ٹرین نے رفتار پکڑلی اور پلیٹ فارم کی حدود سے نکل کر ان کے ساتھیوں کے چہرے ان کی نظروں سے اوجھل کر دیے۔ فاروق نے ایک آخری نظر باہر دوڑائی اور بوجھل قدموں سے دروازے پر سے ہٹ گیا۔ یہ صرف اس کا دل جانتا تھا کہ اس نے کتنی بے دلی سے اس شہر کو الوداع کہا ہے جہاں اس کے ساتھیوں کے علاوہ جولیٹ بھی بستی تھی۔ جولیٹ جو اس کے لیے رگِ جاں تھی لیکن جسے وہ اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆☆☆

''مس جولیٹ! باس آپ کو اپنے روم میں بلا رہے ہیں۔'' وہ اپنی میز پر سر جھکائے کل کے اخبار میں لگنے والے ایک آرٹیکل کو دیکھ رہی تھی کہ چپڑاسی نے اسے پیغام دیا۔

''او کے، میں آتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنے سامنے موجود کاغذات کو ترتیب سے رکھنے کے بعد ان کو پیپر ویٹ تلے دبا دیا۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے اس کی نظریں یونہی اس میز کی طرف اٹھ گئیں جہاں عارف بیٹھا کرتا تھا۔ اب وہاں تقریباً اسی کی ہم عمر سلونی رنگت والی کملا موجود تھی۔ اس نے عارف کے ملازمت چھوڑنے کے بعد اس اخبار کو جوائن کیا تھا اور خاصی خوش مزاج و باصلاحیت لڑکی تھی۔ اس کے دوستانہ اطوار کے باعث مختصر عرصے میں ہی دفتر کے تمام لوگ اسے پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن جولیٹ کو ہر بار اسے دیکھ کر تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے اس دفتر میں عارف کی جگہ لی تھی اور اسے دیکھ کر اسے خود بخود ہی عارف یاد آجاتا تھا۔ عارف جس کے ساتھ زندگی بتانے کے اس نے بے شمار خواب دیکھے تھے لیکن جو پہلا امتحان سامنے آنے پر ہی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ عارف کے چلے جانے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ انسان کسی محبوب ہستی کے بچھڑ جانے پر اتنا آزردہ نہیں ہوتا، جتنا اس بات پر آزردہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک عرصے تک ایک غلط شخص کو اپنا محبوب بنا رکھا تھا۔ عارف اندھیرے میں ساتھ چھوڑ جانے والے سائے کی طرح ثابت ہوا تھا اور محبوب ہونے کا حق ادا کرنا تو دور کی بات، برسوں کی دوستی کا بھی لحاظ نہیں رکھ سکا تھا...... اور ایسے شخص کا یاد آنا یقینی طور پر تکلیف دہ ہی ہو سکتا تھا۔ وہ بھی کملا کے چہرے پر نظریں ٹکائے عارف کو یاد کرتے ہوئے تکلیف سے گزر رہی تھی۔

''مے آئی ہیلپ یو؟'' کملا نے اس کی نظروں کو مسلسل خود پر ٹکا پا کر اس سے دریافت کیا۔ اسے اپنے دفتری ساتھیوں سے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ اس سے پہلے اس سیٹ پر کام کرنے والے عارف سے جولیٹ کی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دونوں آپس میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن پھر اچانک ہی عارف ملازمت چھوڑ گیا اور جولیٹ بھی بدلی بدلی نظر آنے لگی جس سے لوگوں کو شبہ ہوا کہ دونوں کے درمیان کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک آدھ نے اشارتاً جولیٹ سے اس بارے میں دریافت کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ یہ ساری تفصیلات سننے کے بعد کملا کو اس بارے میں خاصا تجسس محسوس ہوا تھا لیکن جولیٹ کے لیے دیے رویے کی وجہ سے وہ اس موضوع کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی، البتہ اس کوشش میں رہتی تھی کہ کسی طرح جولیٹ اس سے بے تکلف ہو جائے لیکن ابھی تک دونوں کے درمیان رسمی گفتگو کے علاوہ تعلقات قائم نہیں ہو سکے تھے اور اس کا سبب جولیٹ کا بہت زیادہ محتاط رویہ تھا۔

''نو۔'' اب بھی اس کے بہت خلوص سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں جولیٹ نے انکار کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے دفتر میں رندھاوا اس کا منتظر تھا۔

''بیٹھو۔'' جولیٹ کو دیکھ کر اس نے اپنے سامنے موجود کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''کل کی کاپی تیار ہے؟'' اس نے ایک باس کے مخصوص انداز میں دریافت کیا۔

''یس سر۔'' جولیٹ نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''گڈ...... میں تمہارے کام سے خوش ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ سال کمپلیٹ ہونے پر تمہیں اسپیشل بونس دیا جائے۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے جولیٹ کے چہرے کا جائزہ لیا، وہاں اسے کوئی خاص تاثر نظر نہیں آیا۔

''تھینک یو سر۔'' شکریے کے الفاظ ادا کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم نے دلدار آغا کا جو فیملی انٹرویو لیا تھا، وہ بہت اچھا رہا تھا۔ خود آغا صاحب کی طرف سے بھی اسے پسند کیا گیا تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ دوسرے لیڈرز کے بھی فیملی انٹرویوز لیے جائیں تو پبلک کی طرف سے اچھا رسپانس آئے گا۔ لوگ فیمس پرسنالٹیز کی پروفیشنل ایکٹیوٹیز کے ساتھ ان کی پرسنل لائف کے بارے میں پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہم نے آغا کے انٹرویو سے اسٹارٹ تو لے ہی لیا ہے، اب باری باری دوسرے پولیٹیشنز کے انٹرویوز بھی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے ہمارے نیوز پیپر کی سرکولیشن بڑھ جائے گی۔'' اب وہ خاصے دوستانہ انداز میں اس سے اپنے آئیڈیے کو ڈسکس کر رہا تھا۔

''آئی تھنک یہ ذرا مشکل ہو گا۔ آئی مین فیملی انٹرویوز...... سیاسی لوگ اپنی پرسنل لائف کو سامنے لانا پسند نہیں کرتے۔ آغا کے سلسلے میں تو مجھے اس لیے کامیابی مل گئی تھی کہ اس کی مسز میری کلاس فیلو رہی تھی اور اس نے خود پرسنلی بہت کوآپریٹ کیا۔'' اس نے بالکل پروفیشنل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''دیٹس آ پوائنٹ۔'' رندھاوا اپنی کرسی پر ذرا سا آگے ہو کر بیٹھا۔ ''مسز آغا سے فرینڈشپ کا تم بہت فائدہ اٹھا سکتی ہو۔ اس سے کہو کہ تمہیں دوسرے لیڈرز کی بیویوں سے ملوائے۔ ملاقات میں تم اپنے مطلب کے سوالات کر سکتی ہو۔ بعد میں ہم لیڈرز کے انٹرویوز کے ساتھ ان کی بیویوں کی گفتگو کو مرج کر کے چھاپ سکتے ہیں۔'' وہ جیسے اپنے ہی آئیڈیے پر بہت خوش تھا۔

''لیکن یہ اَن فیئر ہوگا۔'' اس نے فوراً احتجاج کیا۔

''ارے تو یہ لیڈر لوگ کون سا بہت فیئر بندے ہیں۔ یہ بھی تو دن رات جنتا کو فول بناتے رہتے ہیں۔ اگر ہم انہیں ہاتھ دکھا گئے تو کیا غلط ہو گا۔'' رندھاوا نے اسے قائل کرنے کے لیے دلیل دی۔

''لیڈرز کے حوالے سے میں آپ کا آرگومنٹ مان لیتی ہوں لیکن ثنا کو میں کیا جواب دوں گی۔ وہ خود کو اس طرح استعمال کرنے پر مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ میں آپ کے نیوز پیپر کی سرکولیشن بڑھانے کے لیے اپنی پرانی دوستی کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ ایسی ہی کسی سچویشن سے بچنے کے لیے میں نے پہلے بھی آپ کو اپنی اور ثنا کی فرینڈشپ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔'' ایک تو اسے رندھاوا کی تجویز سے ویسے ہی اصولی اختلاف تھا، دوسرے یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ ثنا اس سے تعلقات نبھانے کے سلسلے میں محتاط ہو گئی ہے اور نہیں چاہتی کہ دلدار آغا کو ان کے آپس میں روابط کا علم ہو۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے ذریعے رندھاوا کی خواہش کے مطابق کچھ حاصل کر پاتی۔

''تم نے نہیں بتایا تھا پر عارف نے بتا دیا تھا۔ وہ بھی تو مسز آغا کا کلاس فیلو رہا ہے اگر وہ جاب چھوڑ کر نہ جا چکا ہوتا تو میں تمہارے بجائے اسے یہ ڈیوٹی دے سکتا تھا۔'' رندھاوا کا جواب سن کر اسے عارف پر شدید غصہ آیا۔ وہ جاتے جاتے اس کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر گیا تھا۔

''میں نے اہم پولیٹیشنز سے انٹرویو کے لیے ٹائم لینے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ اگلے ہفتے سے کانگریس پنجاب بھر میں اپنی کل لیڈرشپ کے ساتھ جلسوں کا اسٹارٹ لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان جلسوں کی کوریج کے ساتھ ساتھ لیڈرز کے انٹرویوز بھی ہمارے نیوز پیپر میں چھپتے رہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم بھی فوری طور پر اپنا کام شروع کر دو۔'' اس کے اعتراض کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنی کہے جا رہا تھا۔ جولیٹ کو اس پر شدید غصہ آیا لیکن پھر ایک خیال نے اسے غصے کے اظہار سے روک کر سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

''کانگریس کے ان جلسوں میں دلدار آغا بھی شریک ہو گا کیا؟ میرے پاس جو انفارمیشن ہے، اس کے مطابق تو وہ آج کل آؤٹ آف کنٹری ہے۔''

''وہ دو چار دن میں واپس آنے والا ہے۔ کانگریس کے یہ جلسے بہت امپورٹنٹ ہیں اور ایسے ٹائم میں وہ غائب نہیں رہ سکتا۔'' رندھاوا نے اسے بتایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ایک شرط پر آپ کے مطلب کے انٹرویوز حاصل کروں گی۔ آپ کو ان جلسوں کی

کورٹ کے لیے بھی مجھے ہی بھیجنا ہوگا۔'' ذہن میں موجود ایک خیال نے اسے رندھاوا سے مطالبہ کرنے پر مجبور کیا۔

''تمہارے لیے یہ مشکل نہیں ہوجائے گا۔ دو، دو کام ایک ساتھ کیسے کروگی؟'' رندھاوا نے اسے احساس دلایا۔

''وہ میرا پرابلم ہے، میں مینج کرلوں گی۔ آپ کو تو بس اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے۔'' وہ اپنے اصرار پر قائم رہی۔

''اوکے..... ایز یو وش.....'' رندھاوا نے بھی زیادہ بحث نہیں کی اور ہتھیار ڈال دیے پھر وہ دونوں تفصیل سے اس سارے پروگرام کو ڈسکس کرنے لگے۔ رندھاوا کے پاس پورا شیڈول تھا کہ کب، کب اور کہاں جلسہ ہونا ہے۔ اس حوالے سے وہ جولیٹ کو اچھی طرح بریف کرتا رہا۔ ایک لمبی میٹنگ کے بعد جولیٹ اس کے دفتر سے باہر نکلی تو خاصی پُرجوش تھی اور بار بار ذہن پرس میں پڑے چاقو کی طرف جاتا تھا جو اس نے جانی سے حاصل کیا تھا۔ اس چاقو کے استعمال کا وقت قریب آتا جارہا تھا۔

دفتر کے اوقات ختم ہونے کے بعد گھر کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی اس کا یہ جوش قائم رہا۔ گھر پہنچ کر اس نے حسبِ معمول پہلے جوزف کا حال احوال معلوم کیا پھر کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس کام کو بہت پھرتی سے نمٹانے کے بعد وہ دوبارہ جوزف کے کمرے میں پہنچی تاکہ اسے کھانا کھلا کر جلد از جلد فارغ ہوجائے لیکن وہ سویا ہوا تھا اور وہ بھی اتنی گہری نیند کہ اس کے پکارنے پر بھی نہیں جاگا ......اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسے سونے دیا جائے۔ چنانچہ مزید آوازیں دینے کے بجائے اپنے کمرے میں آگئی۔ یہاں ایک دیوار پر اس نے نشانے بازی کی مشق کے لیے استعمال ہونے والا بورڈ آویزاں کر رکھا تھا۔ یہ بورڈ وہ کچھ دن قبل ہی لائی تھی اور اس پر نشانے بازی کی مشق کررہی تھی۔ اس کام کے لیے وہ پہلے پھل اور سبزیاں کاٹنے والا عام سا چاقو استعمال کرتی رہی تھی لیکن اب اس کے پاس ایک سکہ بند بدمعاش کا آزمودہ چاقو آچکا تھا اور اس چاقو نے اس کے جوش اور حوصلے میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ پرس سے جانی کا دیا چاقو نکال کر وہ کچھ فاصلے سے نشانہ بازی والے بورڈ کے مقابل آکھڑی ہوئی اور چاقو کو ممکنہ مہارت سے تھام کر بورڈ کی طرف پھینکا۔ چاقو بورڈ پر بنے بیرونی دائرے میں پیوست ہوگیا۔ اس نے چاقو واپس نکالا اور دوبارہ ناپ تول کر پھینکا پھر وہ بار بار یہ عمل دہراتی رہی۔ چاقو بازی کے فن سے اسے بالکل بھی واقفیت نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی سے اس سلسلے میں تربیت حاصل کرسکتی تھی لیکن انتقام کا جنون تھا جو اس کا راہبر و استاد بنا ہوا تھا اور وہ محسوس کررہی تھی کہ اس کا نشانہ بہتر ہوتا جارہا ہے۔ اب بھی وہ فاصلہ بدل، بدل کر مختلف زاویوں سے چاقو پھینکنے کی مشق کررہی تھی۔

آج رندھاوا سے ہونے والی میٹنگ کے بعد اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ کسی جلسے کے موقعے پر دلدار آغاز کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے اسے جلسے کے دوران اسٹیج سے قریب تر رہنے کا موقع مل سکتا تھا اور وہ ایسے کسی موقعے کا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ بعد میں چاہے اسے اس جرم میں گرفتار کرلیا جاتا لیکن اس کا انتقام تو پورا ہوجاتا بلکہ اس نے سوچ لیا تھا کہ گرفتار ہونے کی صورت میں وہ صاف، صاف آغا کے قتل کی وجہ بیان کردے گی تاکہ لوگوں پر اس کا مکروہ کردار کھل کر سامنے آجائے۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوجاتی تو اس کے بعد اسے کسی بات کی پروا نہ رہتی اور کامیابی کا انحصار سب سے زیادہ اسی بات پر تھا کہ وہ درست ترین نشانہ لینے میں مہارت حاصل کرسکے۔ کیونکہ ناکامی کی صورت میں اسے دوسرا موقع ملنا ممکن نہیں تھا۔ وہ گن کے حصول کی بھی اسی لیے خواہش مند تھی کہ پے در پے کئی گولیاں چلانے کی صورت میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے لیکن اب جبکہ وہ گن حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی تو اسے دستیاب ہتھیار سے ہی کامیاب ترین وار کی بھرپور مشق کرنی تھی۔

پوری جانفشانی سے یہ مشق کرتی ہوئی وہ بورڈ کے مقابل کھڑی اس سے اپنا فاصلہ بڑھاتی ہوئی بالکل دیوار سے جالگی۔ اب فاصلہ خاصا بڑھ گیا تھا اور اسے امید تھی کہ جلسہ گاہ میں وہ ایسی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی جہاں سے اس کے اور آغا کے درمیان اس سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا۔ اتنے فاصلے سے حملے کی مشق کے لیے اس نے اپنے چاقو والے بازو کو حرکت دی۔ چاقو اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکلا اور ہوا میں تیرتا ہوا بورڈ کی طرف بڑھا لیکن بورڈ میں پیوست ہونے کے بجائے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ چاقو کے نیچے گر جانے پر پل بھر کے لیے اس کے ہونٹ غصے سے بھنچے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور آگے بڑھ کر چاقو اٹھانے کے بعد دوبارہ اپنے عمل کو دہرایا۔ اس کے بعد وہ پے در پے کئی بار اس عمل کو دہراتی چلی گئی لیکن بار، بار کی مشق کے باوجود بھی اسے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں

ہو رہا تھا۔ یا تو چاقو پیوست ہی نہیں ہوتا تھا یا اصل ٹارگٹ سے چند انچ ادھر ادھر پیوست ہو جاتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چند انچ بھی اس کے لیے بہت اہم ہیں۔ یہ چند انچ زندگی اور موت کے درمیان فاصلے کو طے کرنے والے تھے اور وہ دلدار آغا کی موت کے فیصلے سے کم پر راضی ہونے والی نہیں تھی۔ چنانچہ بار، بار کی ناکامی کے بعد پہلے تو خوب جھنجلائی لیکن پھر اپنے اعصاب کو قابو میں کرتے ہوئے ایک بار پھر دیوار کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اس بار اس نے چاقو پھینکنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا اور خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی رہی، لیکن حقیقتاً اب وہ اپنے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ پشت لگائے نہیں کھڑی تھی اب وہ لوگوں سے بھری جلسہ گاہ میں پہنچ چکی تھی۔ لوگوں اور ان کی آوازوں سے بھری اس جلسہ گاہ میں وہ اسٹیج کے بہت قریب سب سے اگلی قطار میں موجود تھی۔ اس قطار میں کھڑے، کھڑے اس نے ایک کرسی پر براجمان دلدار آغا کو دیکھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے تھری پیس سوٹ میں ملبوس دلدار آغا اپنی کرسی سے اٹھا اور مائک کے سامنے آکھڑا ہوا۔ مائک منہ کے نزدیک کر کے اس نے کچھ بولنا شروع کیا لیکن وہ اس کی آواز نہیں سن رہی تھی بلکہ اب وہ کسی کی بھی آواز نہیں سن رہی تھی۔ اس کی تمام حسیات ایک پل کے لیے بصارت میں بدل گئی تھیں اور دلدار آغا کے سینے پر بائیں جانب عین دل کے مقام پر مرکوز تھیں۔ شدید ارتکاز کے اس عالم میں اس نے اپنے دائیں بازو کو حرکت دی تو اس کی انگلیوں میں دبا چاقو آزاد ہو کر پرواز کرتا ہوا سیدھا آغا کے سینے میں دل کے مقام پر جا کر پیوست ہو گیا۔ اس کی نظروں نے آغا کے سینے سے خون کا فوارہ نکلتے دیکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔

اس کے گرتے ہی جولیٹ کے منجمد ہو جانے والے حواس میں تحرک پیدا ہوا اور وہ واپس اپنے حواسوں میں لوٹی تو سر سے پیر تک پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد موجود لوگوں کا ہجوم اور جلسہ گاہ کا اسٹیج بھی غائب ہو چکا تھا اور نشانہ بازی کی مشق کا بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اس بورڈ پر عین درمیان میں بالکل صحیح مقام پر پیوست چاقو اسے یقین دلا رہا تھا کہ دلدار آغا سے نفرت اور سینے میں جلتی انتقام کی آگ خود اس کی کامیابی کی ضامن ہے۔ اپنے دل میں پیدا ہونے والے اس یقین سے بے حد تقویت حاصل کرتی وہ آہستہ، آہستہ نارمل ہونے لگی اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی کی سوئیوں نے اسے احساس دلایا کہ وقت خاصا آگے بڑھ چکا ہے۔ وہ عجلت میں چاقو کو پرس میں واپس رکھ کر باورچی خانے کی طرف بھاگی اور ٹرے میں کھانا نکال کر جوزف کے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ کمرا جو کبھی اس کے ماں، باپ کا کمرا ہوا کرتا تھا، اب اس کی ماں کے وجود سے خالی تھا اور اسے بہت ویران لگ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر یاد آیا کہ اس ویرانی کا ذمے دار آغا ہے جس نے اس کی صحت مند، ہنستی مسکراتی ماں کو ایسے غم سے دوچار کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ یوں دلدار آغا صرف اس کی عزت کا لٹیرا ہی نہیں بلکہ اس کی ماں کا قاتل بھی تھا اور قاتل کو اس کے انجام تک پہنچائے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

''کھانا کھا لیں ڈیڈ......'' کھانے کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے وہ بستر پر دراز جوزف سے مخاطب ہوئی تو اسے اپنی آواز خود ہی اجنبی محسوس ہوئی۔ جوزف جواب نیند سے جاگ چکا تھا، اس کی آواز پر کسی معمول کی طرح اٹھ بیٹھا۔ جولیٹ نے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے شروع کیے تو وہ بہت آہستگی اور بے دلی سے کھاتا رہا۔ اس کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے جولیٹ کے دل میں خیال ابھرا کہ اگر وہ دلدار آغا کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گئی تو اس کا کیا ہوگا؟ یہ شخص جو اس کے کھلائے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتا زندگی کے دن کیسے پورے کرے گا؟ لیکن بس یہ کچھ پل کی سوچ تھی کیونکہ اب وہ سوچ رہی تھی کہ دلدار آغا کو قتل کر کے وہ صرف اپنے انتقام کی آگ نہیں بجھائے گی بلکہ اپنے باپ کے غم کا بھی مداوا کرے گی۔ رہی اس کے بغیر زندگی بتانے کی بات تو زندہ تو وہ تب بھی رہا تھا جب وہ دلدار آغا کی قید میں تھی اور پھر اس کے بعد اسپتال میں زیر علاج رہی تھی۔ اس عرصے میں اس کے پاس موجود ہمدرد محلے داروں نے جوزف کا بھرپور خیال رکھا تھا۔ یوں بھی اپنی عزیز بیوی کے جانے کے بعد اسے زندگی سے اتنی دلچسپی کہاں رہی تھی کہ وہ اسے پورے اہتمام سے جیتا۔ وہ تو زندگی اور موت کے بیچ لٹکا بس باقی رہ جانے والی سانسوں کو گن رہا تھا۔ حقیقتاً وہ اپنی جوزفین کے پاس جانے کو۔۔۔ بے قرار تھا اور اس بے قراری میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا کہ کوئی اس کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔

''بس......'' حسب معمول گنتی کے چند نوالے کھا کر اس نے جولیٹ کو روک دیا۔ جولیٹ نے بھی اصرار نہیں کیا کیونکہ وہ اس سے پہلے کئی بار اپنے اصرار کا نتیجہ دیکھ چکی تھی۔ ایک بار انکار کر دینے کے بعد وہ کسی صورت مزید کھانے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے روک دینے پر وہ

ٹرے اٹھا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں باپ بیٹی آج کل جیسی زندگی گزار رہے تھے، اس میں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے اور بات چیت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ گم صم رہتے تھے لیکن آج ایک خلافِ معمول واقعہ پیش آیا۔ وہ کھانے کی ٹرے لے کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تو جوزف کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے ایک لفظ ادا ہوا۔

''بیٹھو.....'' اس کے ہونٹوں سے خارج ہونے والے اس لفظ پر حیرت زدہ وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

اس کے بیٹھنے کے بعد جوزف چند پل کے لیے یوں خاموش رہا جیسے لفظوں کو مجتمع کر رہا ہو پھر بولنا شروع ہوا۔

''جولی مائی ڈارلنگ! آئی ایم ویری سوری..... آئی نو کہ اپن ایک اچھا فادر ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے اور تمہارے لیے بوجھ بنا ہوا ہے، بٹ ڈونٹ وری..... اپنے کو بیلیو ہے کہ اپن زیادہ دن اس دھرتی پر بوجھ بن کر نہیں رہنے کا ہے۔ اپنے کو اپنی جوزفین کے پاس جانے کا ہے، بٹ تم اپنے فادر کو اپولوجائس (معاف) کر دینا۔ اپنے کو تمہارے اوپر بوجھ بننے کے بجائے تمہاری رسپانسیبلٹی اٹھانی چاہیے تھی، پر اپن بہت مجبور ہے۔ اپنے سے اپنی جوزفین کے بغیر جیا نہیں جاتا۔ ہم اس ورلڈ میں زندہ رہنے کو ہی نہیں مانگتا ہے تو اس لائف کے دوسرے کام کیسے ٹھیک طرح سے کر سکتا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ان آنسوؤں نے جولیٹ کو ایک بار پھر کرب سے دوچار کیا۔ اس کے باپ کے زندہ درگور ہو جانے کی ذمے داری بھی ولدار آغا پر آتی تھی اور وہ اتنی بے بس تھی کہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے پاس وہ لفظ ہی نہیں تھے جو اس کے باپ کے بے تحاشا غم کا مداوا بن سکیں چنانچہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بس چند آنسو ہی بہا کر رہ گئی۔

''ڈونٹ کرائے مائی ڈارلنگ! اپنے کو تمہارے رونے سے پین ہوتا ہے۔ جوزفین بھی ادھر تمہارے لیے تڑپتی ہوگی پر ہم سب اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔ کوئی کسی کے واسطے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں ہم اتنا ضرور چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنا ایک ڈیوٹی پوری کر دے۔ یہ ڈیوٹی جوزفین کے بعد ہم کو ہی ادا کرنا ہے، وہ زندہ ہوتی تو صحیح وقت پر خود اسے پورا کرتی۔'' وہ اس سے معموں میں بات کر رہا تھا۔

جولیٹ نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ ادھر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ایک چابی ہے، اسے نکالو اور کپ بورڈ کھولو۔'' اس کی الجھن کو تو معلوم نہیں جوزف نے محسوس کیا یا نہیں لیکن ایک حکم ضرور دے ڈالا۔ جولیٹ اس کے حکم کی تعمیل میں اپنی جگہ سے اٹھ کر حرکت میں آگئی۔ ''رائٹ سائڈ پر سب سے نیچے والے خانے میں ایک جیولری باکس رکھا ہے، اسے نکالو۔'' وہ الماری کے لاک میں چابی گھما رہی تھی تب جوزف نے اسے نئی ہدایت دی۔ اس نے الماری کھول کر بیٹھتے ہوئے دائیں جانب کے سب سے نچلے خانے میں جھانکا۔ فوری طور پر کوئی جیولری باکس نظر نہیں آیا..... لیکن پھر پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹی مستطیل شے کی موجودگی کو محسوس کر کے اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ جیولری باکس ہو سکتا ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر نکال لیا اور تھیلی کو کھولا۔ اندر موجود شے اب بھی ململ کے سرخ کپڑے میں لپٹی ہونے کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل تھی۔ اس نے کپڑے کی تہیں کھول کر اسے باہر نکالا۔ وہ چاندی کا بنا نہایت خوب صورت ڈیزائن کا جیولری باکس تھا جو اپنی بناوٹ کے اعتبار سے تو خاصا پرانا لگ رہا تھا لیکن جس کی آب و تاب ایسی تھی جیسے بالکل نیا ہو۔ جولیٹ نے اس سے قبل کبھی اس جیولری باکس کو نہیں دیکھا تھا۔ حقیقتاً اس نے آج پہلی بار ہی اپنی ماں کی الماری کھولی تھی۔ جوزفین کو اپنے سارے کام خود انجام دینے کی عادت تھی اس لیے کبھی ایسی نوبت نہیں آئی تھی کہ کپڑے..... وغیرہ رکھنے یا نکالنے کے لیے کبھی اسے الماری کھولنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ وہ جیولری باکس ہاتھ میں لیے جوزف کے پاس پہنچ گئی۔

''یہ جوزفین نے تمہارے لیے رکھا تھا۔ اس کے اندر جو کچھ ہے، وہ تمہاری لائف کو ایزی بناتا ہے یا کمپلیکیٹڈ..... یہ تم پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ اسے تم تک پہنچا کر اپنی رسپانسیبلٹی پوری ہوگئی۔'' جوزف نے جیولری باکس اس سے لینے کے بجائے اسے بتایا اور پھر بے نیاز ہو گیا۔ اسے رخ بدلتے دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اب جوزف اس سے مزید بات نہیں کرے گا چنانچہ جیولری باکس ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے اس جیولری باکس کو الماری میں رکھ دیا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس جیولری باکس میں اس کی ماں کی وہ جیولری ہو سکتی تھی جو اس نے اس کے لیے رکھی ہوگی۔ شاید وہ اس کی شادی کے موقعے پر اسے یہ سب دیتی لیکن اسے موقع نہیں مل سکا تھا اور جولیٹ کے حساب سے اب اس کی شادی کا کوئی امکان نہیں تھا اس لیے اسے کسی زیور وغیرہ کی ضرورت

بھی نہیں تھی۔ ہاں کسی مالی مسئلے کو حل کرنے کے لیے وہ اس جیولری کو استعمال کر سکتی تھی لیکن فی الحال تو ایسی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے باکس کو کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حقیقتاً اگر اس کا ذہن بے انتہا الجھا ہوا نہیں ہوتا تو وہ جوزف کے الفاظ پر ضرور غور کرتی اور اس جیولری باکس کو کھولنے میں دلچسپی لیتی لیکن اب تو وہ ایک الماری سے دوسری الماری میں منتقل ہوکر نامعلوم مدت کے لیے ایک بار پھر مقفل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ریل گاڑی بمبئی کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی تھی اور اس عرصے میں وہ سب ہی اپنے، اپنے طور پر ایڈجسٹ بھی ہوگئے تھے۔ فاروق نے اوپر برتھ سنبھال لی تھی اور آنکھیں موندے نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ اس سے قبل جب بھی اسے سفر درپیش ہوتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی کتاب ساتھ رکھ کر چلتا تھا تاکہ دوران سفر مطالعہ کر سکے۔ اب بھی گولو اس کے سامان کے ساتھ دو تین کتابیں رکھ لایا تھا لیکن کیتھرائن نے اسے مطالعے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ مطالعہ کرنے کی صورت میں سر کا درد شروع ہوسکتا ہے چنانچہ فاروق نے قدرے بیزاری کی کیفیت میں برتھ سنبھال لی تھی اور گولو کی لائی ہوئی کتابوں سے کیتھرائن نے مستفید ہوتے ہوئے اپنے لیے ایک انگریزی ناول منتخب کرلیا تھا۔ وہ نشست پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی۔ اس کے بالکل سامنے والی نشست پر ربن بیٹھا ہوا مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا حالانکہ دن ڈوبنے کے بعد اب بیرونی مناظر بے حد مبہم ہوگئے تھے اور نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کوئی شخص اس دھندلے منظر سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ شاید وہ کھلی آنکھوں کے سامنے موجود مناظر سے زیادہ دماغ میں ابھرتے خیالات اور مسائل میں الجھا ہوا تھا اور اس کی ان الجھنوں میں کسی ہم سفر کی شراکت داری نہیں تھی۔ اس کے بالکل برابر میں گولو موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا جسے وہ بہت دھیمی آواز میں کھولے ہوئے تھا اور وقتاً فوقتاً اسٹیشن بدل کر اپنے کان سے لگا لیتا تھا۔ ان چاروں کے علاوہ فرسٹ کلاس کے اس ڈبے میں ایک جوڑا اور بھی موجود تھا۔ یہ نوجوان جوڑا تھا۔ لڑکی برقعے میں ملبوس تھی جس کا جھجکا اور قدرے گھبرایا ہوا سا انداز دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے پہلی بار ریل میں سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کے ساتھ موجود نوجوان البتہ خاصا بااعتماد تھا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس کلین شیو نوجوان خاصا خوش شکل تھا۔ وہ لڑکی کے ساتھ بالکل جڑ کر بیٹھا ہوا تھا اور دونوں آپس میں گفتگو بھی بہت آہستہ آہستہ آواز میں تقریباً سرگوشیوں میں کرتے تھے۔ وہ بمبئی سے ان کے ساتھ ہی سوار ہوئے تھے۔ ریل کے چلنے کے بعد کیتھرائن اور گولو نے اس جوڑے سے سلام دعا کی تھی جس کا بہت سرسری انداز میں جواب دیا گیا تھا اور یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ اپنے ہم سفروں سے بے تکلف ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔ ان کی اس خواہش کو سمجھتے ہوئے وہ لوگ بھی پیچھے ہٹ گئے تھے اور اب اپنے، اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔

''کھانا نکال لے رے گولو...... جلدی کھالیں گے تو طبیعت پر بوجھ نہیں پڑے گا۔'' کھڑکی سے باہر دیکھتے ربن کا حکم سنتے ہی گولو فوراً مستعد ہوگیا اور جھٹ اپنے کان کے ساتھ لگا ریڈیو بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ کھانا بجو نے اچھی خاصی مقدار میں تیار کر کے ان کے ساتھ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ چاند بانو والا توشے دان بھی تھا۔ گولو جو کہ کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا، دونوں ہی توشے دان نکال کر بیٹھ گیا اور دسترخوان بچھا کر اس پر برتن سجانے لگا۔ کیتھرائن بھی اس کی مدد کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر آگئی۔ پہلے بجو کا تیار کردہ توشہ کھولا گیا۔ توشے دان کے ہر ڈبے میں فاروق اور ربن کی پسند کے مطابق کھانے موجود تھے۔ فاروق کا بے حد پسندیدہ لوکی کا حلوا بھی موجود تھا۔ ان سب کھانوں کو دسترخوان پر سجانے کے بعد گولو نے چاند بانو کا بھجوایا گیا... توشے دان کھولا تو فضا مہک سی گئی۔ ایک ڈبے میں شامی کباب تھے۔ دوسرے میں زعفران میں رنگی مرغی کی بوٹیوں سے تیار کردہ پلاؤ، تیسرے میں گول گول سی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں اور چوتھے میں کچھ سموسے سے ملتی جلتی شکل کی چیز بھری ہوئی تھی۔ پانچویں ڈبے میں چھوٹی چھوٹی ڈھکن والی کٹوریوں میں رائتہ اور دو طرح کی چٹنیاں موجود تھیں۔

''فاروق بھائی جلدی آجائیں۔ دیکھیں تو کیا کیا نعمتیں اتری ہیں دسترخوان پر۔'' گولو نے اوپر برتھ پر لیٹے فاروق کو آواز دی تو وہ بھی نیچے اتر آیا اور ہاتھ دھو کر .... دسترخوان پر بیٹھنے سے قبل اپنے ہم سفر جوڑے کو کھانے کی دعوت دی۔

''شکریہ...... ہم ڈائننگ کار سے کھالیں گے۔'' نوجوان نے قدرے رکھائی سے انکار کیا۔

''ڈائننگ کار سے کھانے کی کیا ضرورت ہے بھائی...... ہمارے پاس اتنی وافر مقدار میں کھانا ہے کہ آپ

دونوں کی شمولیت کے بعد بھی بہت سا بچ جائے گا۔ تکلف مت کیجیے اور ساتھ شامل ہو جائیں۔ سفر میں تو اس طرح کے معاملات چلتے ہی ہیں۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ آپ ذرا عجلت میں سفر کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔'' فاروق نے خود سے عمر میں کچھ کم ہی اس نوجوان کو بڑے مہذب انداز میں دوبارہ اصرار کر کے دعوت دی۔

''جی...... جی ہاں...... ہم ذرا جلدی میں گھر سے نکلے تھے۔ ایچ کلی چندی گڑھ سے ان کے خالو کا تار آیا تھا کہ خالہ بہت بیمار ہیں، آ کر مل جاؤ اس لیے ہم تار ملتے ہی پہلی ہی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔'' نوجوان نے جلدی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ لوگ واقعی خاصی بے سرو سامانی کی حالت میں تھے۔ لڑکی کی گود میں رکھے ایک بڑے سے پرس اور لڑکے کے پاس رکھے ایک بیگ کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا حالانکہ اتنے لمبے سفر میں لوگ بستر بند اور توشے دان ضرور ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ خالہ صاحبہ کو صحت عطا فرمائے۔ آئیں آپ ہمارے ساتھ دسترخوان پر آجائیں، میری ساتھی خاتون آپ کی بیگم کے ساتھ علیحدہ کھانا کھا لیں گی۔'' برقع پوش لڑکی کے پردے دار ہونے کا احساس کر کے فاروق نے ایک نئے انداز میں اپنی پیشکش دہرائی۔ اسے لگا تھا کہ پردہ دار شریکِ سفر کی موجودگی کی وجہ سے نوجوان ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے میں تکلف سے کام لے رہا ہے اس لیے اپنے طور پر اس مسئلے کو بھی حل کر دیا تھا۔ اس کے اس قدر اصرار کے بعد تو جوان اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکا اور کچھ جھجکتا ہوا ان کے ساتھ دسترخوان پر آن بیٹھا۔ کیتھرائن فاروق کے کچھ کہے بغیر ہی اپنے اور خاتون ہم سفر کے لیے برتنوں میں کھانا نکالنے لگی۔

''پلاؤ اور کباب تو معلوم ہیں، پر یہ دونوں کیا چیزیں ہیں اپن کی سمجھ میں نہیں آرہا۔'' نوجوان کو ایک پلیٹ پیش کرتے ہوئے گولو نے چاند بانو والے توشے دان سے نکلنے والی باقی دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے الجھن کا اظہار کیا تو فاروق اس طرف متوجہ ہوا اور بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''کھا کر دیکھو گولو میاں...... ایسی چیزیں ہیں کہ کھا کر اش اش کر اٹھو گے۔''

''پر معلوم بھی تو ہو کہ یہ ہیں کیا؟'' وہ اپنے سوال پر قائم تھا۔

''یہ جو گول بسکٹ نما ٹکیاں نظر آرہی ہیں، یہ سوجی کی میٹھی ٹکیاں ہیں جنھیں حیدر آباد کے لوگ کھجوریں بھی کہتے ہیں جبکہ یہ دوسری چیز میوہ بھری پوریاں ہیں۔ یہ بھی...... حیدرآبادی سوغات ہے۔ بادام، پستے، کھوپرا اور دوسرے میوہ جات بھر کر بنائی گئی ان پوریوں کے ساتھ کھیر بھی تیار کی جاتی ہے اور کھیر کے ساتھ ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ لمبے سفر پر جانے والوں کو یہ کھجوریں اور پوریاں بطورِ خاص اس لیے تیار کر کے دی جاتی ہیں کہ یہ ہفتوں رکھنے پر خراب نہیں ہوتیں، بس انہیں ہوا لگنے سے بچایا جائے۔ ہوا لگنے سے یہ نرم پڑ جاتی ہیں اور ذائقہ آدھا رہ جاتا ہے لیکن خراب پھر بھی نہیں ہوتیں۔'' فاروق نے اسے تفصیلی جواب دیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

اس کے بعد کھانے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ کھانا معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے خوب تھا۔ البتہ چاند بانو کا بھجوایا کھانا لذت میں بجو کے کھانے پر ذرا سبقت لے گیا۔ شاید اس لیے کہ اس میں عورت کے ہاتھوں کا مخصوص رنگ اور سلیقہ موجود تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ کھانا چاند بانو نے خود تیار کیا ہے یا اس کے بالا خانے پر ملازمت کرنے والی کسی ماما نے۔ پکانے والی بھلے کوئی بھی رہی ہو لیکن بہر حال کھانا خوب تھا اور اس وجہ سے مزید سراہے جانے کے لائق تھا کہ اسپتال سے واپس بالا خانے پہنچ کر یہ کھانا تیار کر کے اسٹیشن پر بھجوانے کے لیے بہت کم مہلت مل سکی ہو گی۔ اتنی کم مہلت میں اسے کھانے تیار کر کے، وہ بھی پورے اہتمام کے ساتھ بھجوانا کمال ہی تھا اور یہ بات بہر حال طے تھی کہ پکانے والی چاہے ایک رہی ہو، اسے ایک سے زیادہ مددگاروں کا تعاون حاصل رہا ہو گا۔ خصوصاً میوہ بھری پوریاں بنانا ایک فرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ نمکین کے بعد میٹھے کا سلسلہ شروع ہوا تو سب ہی نے نہایت رغبت سے پوریاں کھائیں۔ بجو کا تیار کردہ لوکی کا حلوا بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ بڑی مشکل سے ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے والا ہم سفر نوجوان بھی کھانا شروع کرنے کے بعد اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور رغبت سے ہر چیز نوش کی۔ ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھی خواتین بھی پیچھے نہیں رہی تھیں اور کھانے سے بھرپور انصاف کیا تھا۔ کھانے کے بعد دسترخوان سمیٹ کر گولو نے چائے کا تھرماس نکال لیا۔ سبز چائے کا قہوہ پیالیوں میں نکالا تو ڈبا مہک اٹھا۔ بجو نے عقلمندی کی تھی کہ تھرماس میں عام چائے کے بجائے سبز چائے رکھی تھی۔ اتنے مرغن کھانے کے بعد سبز چائے ہی مناسب تھی۔

''آپ لوگ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

قہوے کا دور چل رہا تھا جب نوجوان نے فاروق سے دریافت کیا۔ کھانے میں ساتھ شامل ہونے کے بعد اس کے لیے پہلے جیسا لیا دیا رویہ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا اور وہ اخلاقیات نبھانے پر مجبور تھا۔

''ہم بھی چندی گڑھ ہی پر اتریں گے پھر وہاں سے آگے بائی روڈ شملہ جائیں گے۔'' فاروق نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ شروع سے وہ ہی اس نوجوان سے گفتگو کر رہا تھا۔ گولو تو کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد کھانے اور کھلانے کے علاوہ مشکل ہی سے کسی بات میں دلچسپی لیتا تھا اور ربن کا بھی اپنا ہی موڈ تھا۔ مرضی ہوتی تو گفتگو کرتا ورنہ خاموش رہتا اور اس سفر میں تو وہ شروع سے ہی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

''شملہ بہت خوب صورت پلیس ہے، میری وائف کی خالہ کی طبیعت سنبھل گئی تو ہم لوگ کبھی شملہ کا چکر لگائیں گے۔'' نوجوان نے تبصرہ کیا۔

''اگر ایسا ہو تو آپ ہماری طرف ضرور آیئے گا۔ ہمارا شملہ میں قدرے طویل قیام کا ارادہ ہے۔ آپ وہاں آئیں تو بھائیہ سیٹھ کی رہائش گاہ ڈھونڈنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ وہ خاصے مشہور آدمی ہیں۔'' فاروق نے فوراً ہی اسے دعوت دے ڈالی پھر ہنس کر بولا۔

''ابھی تک ہم نے ایک دوسرے سے اپنا انٹروڈکشن تو کروایا ہی نہیں...... آپ شملہ آئے تو گیٹ پر موجود چوکیدار سے کیا کہیں گے کہ کون ہیں اور کس سے ملنے آئے ہیں؟''

''واقعی...... یہ تو آپ نے درست فرمایا۔'' نوجوان اس کی بات سن کر ہنسا پھر اپنا تعارف کروانے لگا۔ ''میرا نام ماجد علی ہے، بمبئی کا ہی رہنے والا ہوں اور تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوں۔ آپ فرمایئے آپ کا اسم گرامی کیا ہے اور کیا شغل فرماتے ہیں۔'' وہ دیکھنے میں کم عمر لگتا تھا اور تھا بھی بمبئی کا رہائشی لیکن شاید تعلیم یافتہ ہونے اور خاندانی پس منظر کا اثر تھا کہ بہت شستہ اردو بول رہا تھا۔

''مجھے فاروق کہتے ہیں، یہ میرے سرپرست رب نواز صاحب ہیں اور یہ میرا چھوٹا بھائی صابر عرف گولو...... ہمارے ساتھ موجود خاتون سسٹر کیتھرائن ہیں۔ پچھلے دنوں میرے سر پر ایک چوٹ لگ گئی تھی اور آج کل میں زیر علاج ہوں بلکہ ہمارا شملہ جانا بھی میرے علاج کا ہی ایک سلسلہ ہے اور اسی لیے سسٹر کیتھرائن ہمارے ساتھ جا رہی ہیں۔''

فاروق نے اسے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف

کروا دیا لیکن شغل والی بات گول کر کے ایک ایسا موضوع چھیڑ بیٹھا جس نے ماجد علی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''اوہ ... ان کے بارے میں سن کر افسوس ہوا... کیا حادثہ پیش آیا تھا؟ چوٹ لگی تھی؟'' ... سب تو نہیں وہ اس کی عادات میں الجھ گیا۔

''سیڑھیاں اترتے ہوئے ... سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا تھا۔ جسم پر آنے والی چھوٹی موٹی چوٹیں تو ٹھیک ہو گئیں لیکن سر پر لگی چوٹ مسئلہ بن گئی ہے۔ ڈاکٹرز کی ہدایات کے مطابق علاج کا سلسلہ جاری ہے۔ اب دیکھیے کب مکمل صحت یابی نصیب ہوتی ہے۔'' فاروق نے اسے ایک سوچا سمجھا جواب دیا۔ اجنبی ملاقاتیوں کے لیے یہی طے ہوا تھا کہ سر کی چوٹ کا سبب سیڑھیوں سے گرنا بتایا جائے گا کیونکہ پولیس کے تشدد کا حوالہ ہر ایک کو دینا ممکن نہیں تھا۔

''اللہ تعالیٰ جلد صحت عطا فرمائے اور گھر والوں کی پریشانی دور ہو۔'' ماجد علی نے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

''پریشانی میں تو تو بھی ہے۔ اپنے واسطے بھی دعا کر۔'' بہت اچانک ہی ربن نے گفتگو میں دخل دیا تو ماجد علی بوکھلا گیا۔

''جی میں... مجھے کیا پریشانی ہے؟''

''کیوں، تجھے خالہ ساس کی بیماری کی فکر نہیں ہے کیا؟'' ربن نے اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مزید شپٹا گیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

''جی، جی...... وہ تو ہے، بس میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔''

''لگتا ہے خالہ ساس کی بیماری کے علاوہ بھی کوئی اور پریشانی ہے اس لیے پہلے دھیان سیدھا ادھر نہیں گیا تھا۔'' بظاہر بے نیازی سے لیکن حقیقتاً بہت کھوج لیے ہوئے ربن کے ان سوالات نے فاروق کو بھی چونکا دیا۔ وہ ربن کے اس انداز سے واقف تھا۔ وہ بلاوجہ اتنی تفتیش کرنے والا آدمی نہیں تھا اور اگر ماجد علی سے اتنی پوچھ تاچھ کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''جی نہیں، کوئی اور پریشانی تو نہیں، بس میں فوری طور پر آپ کی بات کا مطلب سمجھ نہیں سکا تھا۔'' ماجد علی نے اب بھی تہذیب کے دائرے میں اسے جواب دیا لیکن اب اس کے لہجے میں قدرے رکھائی آ گئی تھی۔

''چندی گڑھ میں کدھر جانا ہے؟'' اس کے لہجے کی رکھائی کی پروا کیے بغیر ربن نے سوال جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

''آپ کو بتایا تو ہے کہ اپنی خالہ ساس کی مزاج پرسی کے لیے جا رہا ہوں۔'' اس کے لہجے کا روکھا پن اور بڑھا۔

''خالہ ساس چندی گڑھ میں کدھر ہی رہتی تھیں۔ کوئی خاص جگہ تو ہو گی نا؟'' ربن اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''آپ تو ایسے پوچھ رہے تھے جیسے آپ وہ میرے ساتھ جانا ہے۔'' اس بار وہ واضح طور پر برا مان گیا۔

''ابھی تو نے اپنے شہزادے سے اس کا سب آگا پیچھا پوچھا تو اپن نے تو تیرے سے نہیں کہا کہ تجھے کون سا علاج کرنا ہے جو اتنا سب پوچھ رہا ہے۔'' ربن اس کے برا ماننے کو خاطر میں نہ لایا۔

''غلطی ہو گئی قبلہ...... آئندہ یہ جسارت نہیں ہو گی۔ اب آپ میری جان بخشیے۔'' اس نے قہوے کی پیالی پٹخنے کے انداز میں ہاتھ سے رکھی اور اٹھ کر اپنی سابقہ جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی اس لیے اس کی بیوی کے ساتھ محو گفتگو کیتھرائن اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر اس نے بھی فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی اور واپس ان لوگوں کی طرف پلٹ آئی۔ فاروق نے اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ربن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور ماجد علی کو عجیب سلگانے والی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا پھر اس نے نظروں کا رخ بدلا اور اپنی نشست سنبھال لینے والی کیتھرائن کو اشارے سے اپنی طرف بلا کر ساتھ بیٹھے گولو کے شانے پر ہاتھ مارا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ گولو اپنی جگہ چھوڑ دے۔ چنانچہ وہ اپنا ریڈیو سنبھال کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کیتھرائن خاموشی سے ربن کے برابر میں جا بیٹھی۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں آپس میں سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ فاروق کو ایسا لگا کہ ربن نے اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ وقت آنے پر خود ہی اس پر معاملہ کھل جائے گا اس لیے زیادہ تجسس کا اظہار کیے بغیر اپنی برتھ پر واپس چلا گیا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

آخری بار

تنویر ریاض

ظالم بھول جاتا ہے کہ ظلم ہمیشہ انتقام اور بغاوت کی پرورش کرتا ہے اور بغاوت نرمی اور شائستگی کی دشمن ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بے حد نفیس خاتون تھی لیکن ناامیدی نے اسے اس دوراہے پر لاکھڑا کیا تھا کہ اپنے خوب صورت رشتوں کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی لہٰذا اس تباہی کا رخ اس نے اپنی طرف موڑ لیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سب آخری بار کا تماشا ہے۔

غلط حقائق کے نتائج پر مشتمل ایک حیرت انگیز منظر

اس نے گول مول الفاظ میں بات کی تھی لیکن جین کو اس کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ ایک منٹ تک خاموش بیٹھی اس کے شاندار دفتر کو دیکھتی رہی۔ بڑی سی میز، گھومنے والی کرسی، کتابوں کی الماری اور ایک کونے میں رکھا ہوا بڑا سا پیتل کا گل دان...... دوسرے فرانسیسی ڈاکٹروں کی طرح اس نے بھی کنسلٹنگ روم اپنے گھر میں ہی بنا رکھا تھا، بہرحال ٹیسٹ دوسری جگہ ہوتے تھے۔ اس نے فرانسیسی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سورج کی روشنی بتدریج کم ہو رہی تھی

اور آسمان کی نیلاہٹ مزید گہری ہوگئی تھی۔ دن چھوٹے ہو رہے تھے اور سردیوں کی آمد آمد تھی۔

اس نے ڈاکٹر سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مزید کتنا عرصہ زندہ رہے گی۔ درحقیقت وہ یہ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ بے چارہ ستر سالہ بوڑھا ڈاکٹر جس کے بال مکمل طور پر سفید ہوچکے تھے، اپنے جھریوں بھرے چہرے کو میز پر پڑے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر میں چھپانے کی کوشش کررہا تھا اور اس کی نظریں بے ترتیب میز پر جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس سے یوں نگاہیں چرا رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میز پر پڑے ہوئے کاغذوں پر تمباکو کے دھبے پڑے ہوئے تھے جبکہ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

وہ اس وقت سے اس ڈاکٹر کے پاس آرہی تھی... وہ پچیس سال پہلے جوانی کے دور میں پیرس آئی تھی۔ اب اس کی بیٹی ستائیس سال کی ہوچکی تھی۔ وہ آرٹسٹ تھی جبکہ چون سالہ جین اب ایک چھوٹے لڑکے کی نانی بن چکی تھی۔ جین دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے پھر اس نے سوچا کہ اس طرح کے کیس میں ڈاکٹر عموماً ایسا ہی محسوس کرتے ہیں جبکہ وہ خود یہ ظاہر کررہی تھی کہ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کررہی۔ ایک خالی پن اس کی روح میں سما گیا تھا۔

جین نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس لمحے وہ تھوڑا سا لڑکھڑائی لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رکی اور اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تو اسے یوں لگا جیسے ڈاکٹر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم دن ہو یا رات، کسی وقت بھی مجھے فون کرسکتی ہو۔'' پھر اس کی براؤن آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی اور وہ بولا۔ ''تم آج کی رات اکیلے مت رہنا۔''

جین نے سوچا کہ شاید ڈاکٹر کی عمر اس پیشے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہوگئی ہے، تبھی وہ ایسی باتیں کررہا ہے۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے کس طرح مطمئن کرے کہ ڈاکٹر نے اس کا بازو پکڑا اور انتظار گاہ تک لے آیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے بیرونی دروازے تک چھوڑنے بھی آیا۔ باہر نکل کر اسے ستمبر کی ٹھنڈی ہوا میں بڑا سکون محسوس ہوا۔ گوکہ وہ اس وقت اپنے خالی اپارٹمنٹ میں نہیں جانا چاہ رہی تھی اور نہ ہی وہ اپنی بیٹی کو فون کرکے یہ خبر سنانا چاہتی تھی حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا۔ وہ تو اس وقت بیٹی کے فون کا جواب دینے کے موڈ میں بھی نہیں تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے شوہر کے بارے میں سوچا جیسے وہ اب بھی اس کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہو حالانکہ وہ پانچ سال پہلے انتقال کرچکا تھا۔ وہ برنارڈ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ اس سے کہتی ...... ''ڈارلنگ میں مرنے والی ہوں''۔ اور وہ مثبت انداز میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہتا......

''ہم سب کو جلد یا بدیر جانا ہے'' جبکہ اس کے جانے کا وقت بہت قریب آگیا تھا۔ اس طرح کے کیسز میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر نے افسردگی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے جو کچھ کہا، اس کا مفہوم یہی تھا۔

اس نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کیا۔ دکانوں میں سجی قیمتی اشیا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر رہی تھی۔ ڈیزائنرز کے تیار کردہ ملبوسات، جیولری، نازک اور نفیس جوتے، میک اپ کا سامان، پرفیومز وغیرہ۔ وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی اور دکان کے بیرونی شیشوں کو ہاتھ لگا کر آگے بڑھ جاتی۔ وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ شاید وہ آخری بار یہ سب دیکھ رہی ہے اور یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دوبارہ اس سڑک پر آنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ اچانک ہی اس کے دل میں یہ خواہش ابھری کہ اس کے پاس جو تھوڑا بہت وقت رہ گیا ہے، اس میں وہ دنیا بھر کی اچھی چیزیں جمع کرلے۔ اس نے ایک کتاب میں ایسی ہی ایک عورت کے بارے میں پڑھا تھا جو مر رہی تھی اور اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام خوب صورت کپڑے خریدنے میں صرف کردیے۔ اس وقت اسے یہ بات بہت عجیب لگی تھی لیکن وہ آج خود اسی کیفیت سے دوچار تھی۔

وہ گھر جانے کے بجائے اس عمارت کے دروازے پر پہنچ گئی جہاں اس کی دوست اینا رہتی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اسے تھکن اور تھوڑی سی سردی محسوس ہورہی تھی۔ وہ کافی فاصلہ پیدل چل کر آئی تھی حالانکہ پیرس میں یہ ایک عام بات تھی۔ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دوسری منزل پر واقع اینا کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی۔ شاید اینا گھر پر ہو تو وہ اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے گی اور اس سے ایک کپ چائے کے لیے کہے گی اور اگر وہ ڈرنک کے لیے باہر جانا چاہے تو وہ سڑک کے آخری کنارے .... تک بھی چلی جائے گی اور اسے یہ خبر بھی سنا دے گی۔

اینا نے فوراً ہی انٹرکام پر اس کی کال کا جواب دیا جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ ''اندر آجاؤ ڈارلنگ...... میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔'' اینا کا شوہر مائیکل ہمیشہ دیر سے گھر آتا تھا۔ جین کی نظر میں وہ ایک ناقابلِ بھروسا روسی نژاد شخص تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اینا اس کے ساتھ کیسے رہ رہی ہے۔

اینا نے بیرونی دروازہ کھولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وسیع ہال میں لے گئی جہاں خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ اس انیسویں صدی کے اپارٹمنٹ میں کئی سال سے رہ رہی تھی۔ اس میں ایک بہت بڑا استقبالیہ کمرا تھا جس کی فرانسیسی کھڑکیاں باغ میں کھلتی تھیں۔ ہال سے متصل ایک طویل راہداری تھی جو عقب میں بنے ہوئے بیڈ رومز تک جاتی تھی۔ اس اپارٹمنٹ میں ایک عقبی دروازہ بھی تھا جو عام طور پر نوکروں کے استعمال میں رہتا تھا۔

اینا اسے لیونگ روم میں لے گئی جس میں خوب صورت فرانسیسی فرنیچر سجا ہوا تھا۔ اس نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور اپنے شوہر کو ایک موٹی سی گالی دی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ جین سوچنے لگی کہ اب اس کے شوہر نے کیا کر دیا؟

''ڈارلنگ! کچھ بتاؤ تو سہی...... بات کیا ہے؟'' وہ اس کے برابر بیٹھ گئی اور اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا۔

جین اپنی دوست اینا کو گزشتہ پچیس برس سے جانتی تھی جب وہ پہلی بار 1968ء میں پیرس آئی۔ ان دنوں فرانس میں طلبا کے ہنگامے زوروں پر تھے۔ ان کی ملاقات ایک مشترکہ دوست کے توسط سے ہوئی تھی۔ اینا اور اس کا شوہر مائیکل، نیولی میں واقع جین کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرے جہاں وہ ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہ جوڑا اس وقت طلبا کے فسادات کی وجہ سے مشکل میں تھا اور وہ اپنے گھر بھی نہیں جاسکتے تھے جہاں گلیوں میں ہر وقت آنسو گیس کے بادل چھائے رہتے۔

جین کو اینا کی آمد کا منظر یاد تھا۔ اس کے لمبے سنہری بال پانی سے محروم تھے اور اس کے پیر گندے ہو رہے تھے۔ جین اور اس کا شوہر ان دونوں کو اندر لے گئے۔ انہیں کھانا کھلایا اور اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ دی، جب تک ہنگامے ختم نہ ہوجاتے...... جبکہ وہ ان دونوں سے برائے نام واقف تھی۔ تب سے وہ اور اینا گہری دوست بن گئی تھیں اور کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کے اپارٹمنٹ میں سونے کے لیے آجاتیں۔ جب جین کے شوہر کا انتقال ہوا تو اینا اس کے پاس پانچ دن رہی اور وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر سوئیں۔

جین جانتی تھی کہ اینا کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ اس کا شوہر دوسری عورتوں کا رسیا تھا اور ان دونوں کے درمیان اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اس بار بھی کہانی کچھ ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اینا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''وہ ایک بار پھر اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ چلا گیا ہے اور اس بار تو ایک عالی شان ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ کیا تم اس کا تصور کرسکتی ہو؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ وہ یہ سب تمہارے پیسے پر کر رہا ہے۔''

اینا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اور نہیں تو کیا۔''

''کیا اس نے تمہیں فون کر کے بتایا کہ وہ کہاں ہے؟'' جین جانتی تھی کہ وہ اینا کو اپنی آمدورفت کے بارے میں باخبر رکھتا ہے کیونکہ وہ سچ بولنے پر یقین رکھتا ہے لیکن کرتا وہی ہے جو اس کا دل کرتا ہے۔

اینا نے کہا۔ ''وہ میرے لیے ایک خط چھوڑ گیا تھا جس پر اس کا پتا درج تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس خط کو ہنگامی حالت کے بغیر نہ کھولا جائے لیکن میں نے اسے کھول لیا۔''

اینا اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس وقت اس نے گرے ٹراؤزر اور سلک شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ایک پُرکشش اور ذہین عورت تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پچپن سال ہوگی۔ جین حیران تھی کہ اس خوب صورت عورت نے اپنے لیے کوئی اور ساتھی کیوں نہیں چن لیا؟ وہ جانتی تھی کہ اینا کی شادی بہت کم عمری میں ہوگئی تھی اور اس نے اپنی ساری جائداد شوہر کے حوالے کردی تھی۔ وہ بہت اچھی دوست تھی اور ہر ایک کی مدد کے لیے تیار رہتی تھی۔ اگر اس کی شادی کسی اور شخص سے ہوئی ہوتی تو وہ زیادہ خوش رہ سکتی تھی لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اس شخص سے نجات حاصل کرسکتی تھی۔

جین حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ اتنا سنگدل کیسے ہوسکتا ہے؟''

''وہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔'' اینا نے کہا۔

''تم اس سے کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ وہ تمہاری زندگی سے چلا جائے؟''

اینا نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''یہ بات تم ہمیشہ کہتی ہو۔'' پھر اس کی نظر جین کے چہرے پر گئی اور وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''معاف کرنا۔ میں اپنا قصہ لے بیٹھی۔ تمہارا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو..... تمہیں چائے چاہیے یا کچھ اور؟''

''کوئی سی بھی وھسکی لے آؤ۔ میں بہت دور سے چل کر آرہی ہوں۔ باہر کافی خنکی ہے۔''

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اینا کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان تھی۔ ایسی صورت میں اسے اپنے بارے میں یہ بتانا ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ وہ مرنے والی ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسے لیلیے کا کینسر ہے جو بہت تیزی سے پھیلتا ہے گو کہ وہ اپنے آپ کو بیمار محسوس نہیں کر رہی تھی البتہ اس کا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا اور اسی لیے ڈاکٹر نے اسے ٹیسٹ کروانے کے لیے کہا تھا لیکن وہ ہمیشہ سے ہی کم خوراک لیتی تھی اور ساری زندگی دبلی ہی رہی۔ وہ اب بھی صبح سویرے لکسمبرگ گارڈن میں دوڑ لگاتی تھی۔

اس نے شکریہ کے ساتھ وھسکی کا گلاس لیا۔ اینا نے ایک خوب صورت پلیٹ میں نٹ بھی رکھ دیے تھے۔ وہ وھسکی کے گھونٹ لینے کے ساتھ ساتھ اینا کی باتیں بھی سن رہی تھی۔ اینا نے کمرے کی بتیاں روشن کر دیں اور ایک گہری سانس لے کر اس کے برابر میں ہی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال سنہری تھے لیکن پچپن سال کی ہونے کے باوجود ان میں سفیدی نہیں آئی تھی۔ جین نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اینا کا خاندان سوئڈن سے امریکا آیا تھا جہاں اس کے باپ نے بڑی لمبی چوڑی جائداد بنائی تھی۔

''میں یقین نہیں کرسکتی کہ وہ تمہارے ساتھ اس طرح کرتا ہوگا۔'' جین نے کہا لیکن اسے اینا کی باتیں سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اینا نے اپنی دولت کا کنٹرول مائیکل کے ہاتھ میں دے دیا تھا جسے وہ... بے دردی سے خرچ کر رہا تھا۔

جین کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ''کچھ کھانے کو ہو تو لے آؤ۔ خالی پیٹ تو وھسکی بھی مزہ نہیں دے رہی۔''

''اوہ...... میں تو بھول ہی گئی۔'' اینا ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں ضرور کچھ کھانا چاہیے۔ تم ویسے ہی بہت دبلی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے جین کا ہاتھ پکڑا اور ڈائننگ روم سے ہوتی ہوئی کچن تک لے گئی۔ اس نے جین کو کچن کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر فریج سے انڈے نکالے اور آملیٹ بنانے لگی۔ چند منٹوں بعد ہی اس نے آملیٹ کے ساتھ سبز سلاد اور وائن کا ایک گلاس جین کے سامنے رکھ دیا۔ وہ دونوں ڈائننگ روم میں آمنے سامنے بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ جین کو یوں محسوس ہوا کہ وہ آخری بار اپنی دوست کے ساتھ بیٹھ کر کھا رہی ہے۔ وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے بعد اسے یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

''جی چاہتا ہے، اس کا گلا گھونٹ دوں۔'' اینا نے ایک بار پھر اپنے شوہر کا ذکر چھیڑ دیا۔

جین نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ یہ عورت اپنی تمام تکلیفوں اور دکھ کے ساتھ زندہ رہے اور میں مرجاؤں، یہ تو زیادتی ہوگی پھر اس نے کہا۔ ''ہاں اگر وہ مرجائے تو کم از کم اپنی دولت پر تمہارا کنٹرول ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ فرانسیسی قانون کے مطابق سب سے قریبی وارث ہونے کی بنا پر بھی تم اس کے اثاثوں میں نصف کی حق دار ہوگی۔''

اینا نے جین کو دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اگر جیل جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسے قتل کرنے میں بالکل بھی نہیں ہچکچاتی۔''

اسے قہقہہ لگاتے دیکھ کر جین بہت خوش ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جین کی موجودگی اور مائیکل کے قتل کے موضوع نے اینا کی طبیعت بحال کر دی ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی دوست کی خوشیاں لوٹانے کے لیے کچھ کرسکتی ہے تو اسے ضرور کرنا چاہیے۔ ویسے بھی اس کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے اور اس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ان کے تمام مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

جب اس نے ڈاکٹر سے اپنے ٹیسٹوں کی رپورٹ کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا پھر بولا۔ ''اگر کوئی ایسا کام ہے جس کی تمہیں ہمیشہ سے خواہش رہی ہے تو میرا مشورہ ہے کہ اسے کسی تاخیر کے بغیر کر ڈالو۔'' وہ ڈاکٹر کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ ایسے کئی کام تھے جو وہ کرنا چاہ رہی تھی مثلاً وہ ایک بار پھر جزیرے میں ساحل پر واقع اس خوب صورت ہوٹل میں جانا چاہتی تھی جہاں اس نے ایک مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون کے دنوں میں قیام کیا تھا۔ وہ آخری بار سمندر کے صاف اور پرسکون پانی میں تیرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹی اور نواسے کو بھی لے جانا چاہ رہی تھی لیکن یہ سب کچھ اس کی استطاعت سے باہر تھا۔

''اگر تم اسے خود قتل نہ کرو تو تمہارے جیل جانے کا

کوئی امکان نہیں۔'' جین نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' اینا اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سیدھی سی بات ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور اسے قتل کردے۔ کوئی ایسا شخص جس کے پاس اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو۔''

''تمہارا اشارہ کرائے کے قاتل کی جانب ہے؟'' اینا نے پوچھا۔

''نہیں، وہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ پکڑے جانے کی صورت میں وہ سب اگل دیں گے۔ اس کام کے لیے کوئی ایسا فرد مناسب رہے گا جس پر تم بھروسا کرسکو۔''

''تمہارا مطلب ہے کوئی دوست؟''

''ہاں..... کوئی بہت ہی پرانی دوست۔''

اینا نے اسے دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''وہ تو تم ہی ہو۔ کیا تم یہ کام کروگی؟''

جین نے آتش دان پر رکھی تصویر کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ مرنے سے پہلے اس کے پاس اتنی رقم ہونی چاہیے جس سے اس کے پس ماندگان کی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ اس کی موجودہ آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی اور نواسے کے لیے کچھ پس انداز کرسکے۔ اس کا نواسا جیمس دو سال پہلے پیدا ہوا تھا لیکن شروع سے ہی اس کی زبان میں کچھ نقص تھا۔ فرینی اور اس کا شوہر تصویریں بناتے تھے اور ان کا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا جس کی وجہ سے فرینی اکثر پریشان رہتی تھی۔

''چلو، فرض کرلو کہ وہ میں ہی ہوں۔'' جین نے کہا۔

اینا ہنستے ہوئے بولی۔ ''کیا شاندار منصوبہ ہے۔ تمہارے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ تمہارے پاس عقبی دروازے کی چابی ہوگی اور میں یہ اطمینان کرلوں گی کہ وہ گھر میں اکیلا گہری نیند سو رہا ہو۔ تمہیں صرف ٹریگر دبانا ہوگا۔''

''ہاں، تم اس کے سرہانے پانی کا گلاس رکھ دینا جس میں خواب آور دوا شامل ہو۔ میں ڈیڈی کا ریوالور لے کر عقبی دروازے سے آؤں گی۔ مجھے اس کے استعمال کا طریقہ آتا ہے۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ میں اسے گولی مار کر خاموشی سے نکل جاؤں گی۔ تم میرے اپارٹمنٹ میں انتظار کرنا۔ البتہ ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ عمارت کا پہرے دار اس سے پہلے ہمیں ایک ساتھ اندر آتے دیکھ چکا ہو۔''

''تاکہ تم جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرسکو؟'' اینا نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا پھر جین کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟ تم میں یہ کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہے پھر میری خاطر خطرہ کیوں مول لے رہی ہو؟''

جین اسے کیا بتاتی کہ وہ یہ سب کس لیے کررہی ہے؟ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی بیٹی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے نواسے سے بھی بہت محبت تھی جو بہت ہی پیارا بچہ تھا اور فرینی اسے بولنا سکھا رہی تھی۔ اسے آنے والے اخراجات کی بھی فکر تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ان دنوں علاج پر کتنا خرچہ آتا ہے۔ اگر اسے اسپتال میں اپنی زندگی کے آخری ایام گزارنا پڑے تو اچھا خاصا بل بن جائے گا۔ اسے لازماً ڈاکٹر سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔

جین اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں نے کس طرح یہ کام کردیا۔''

اس رات اپنے ڈبل بیڈ پر لیٹی جین سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی اس کام کی صلاحیت رکھتی ہے؟ اسے یاد تھا کہ وہ رہوڈیشیا میں باپ کے ساتھ فارم پر شکار کے لیے جایا کرتی تھی۔ وہ کبھی کبھار چیتے کی تلاش میں جایا کرتا جو ان کی بھیڑیں کھا جاتا تھا اور سال میں ایک مرتبہ وہ ہرن کا شکار بھی کرتے تھے۔ جین کو یاد تھا کہ وہ اس پر باپ سے احتجاج کرتی اور معصوم ہرن کو جان بچانے کے لیے دوڑتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ باپ سے کہتی۔ ''انہیں مت مارو۔''

اس کا باپ جواب میں کہتا۔ ''انہیں مارنا ضروری ہے۔ ان کی وجہ سے فطرت کا توازن خراب ہوتا ہے۔ یہ اپنے ساتھ بیماریاں لے کر آتے ہیں۔'' تو کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ مائیکل بھی فطرت کے حسن میں بگاڑ پیدا کررہا تھا اس لیے اس کو راستے سے ہٹانا ضروری ہے؟ اس کی موت سے کئی مسائل حل ہوجائیں گے۔ اینا کا شوہر ایک قابلِ نفرت شخص تھا، اس میں روسیوں والی ساری خاصیتیں موجود تھیں۔ مصیبت کے وقت رونا، اپنی اصلاح کا وعدہ کرنا اور اس کے بعد دوبارہ وہی حرکتیں شروع کردینا، اسے عیاشی کی زندگی پسند تھی۔ وہ عمدہ لباس پہنتا، اچھے ہوٹلوں میں غیر عورتوں کے ساتھ قیام کرتا اور اینا کی دولت بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ اس نے اینا کو دکھ کے علاوہ کچھ نہیں دیا تھا جبکہ وہ ایک بہتر زندگی کی حق دار تھی۔ اگر اس

نے اینا کو گھر سے نکال کر اس کی دولت پر قبضہ کر لیا تو وہ کیا کرے گی...... اپنی زندگی کیسے گزارے گی؟ اسے تو کسی کام کا تجربہ بھی نہیں ہے۔

انہوں نے جو منصوبہ بنایا، وہ بہت سادہ تھا۔ جین اپنی پریشانی بھول کر اس میں لگ گئی اور اس نے اپنی موت کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو وہ کبھی اس کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ مرنے کے قریب تھی اور اس کے پاس ندامت، پچھتاوے یا جیل میں بقیہ زندگی گزارنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ البتہ اس کے مرنے کے بعد فریئی اور اس کے شوہر کو کچھ رقم مل سکتی تھی۔ جین جانتی تھی کہ اینا بہت فیاض ہے گو کہ ابھی تک اس نے اینا کو اپنی متوقع موت کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر سے ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ نہیں کیا تھا۔

جین بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ لاشعوری طور پر اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس طرح کا کام نہیں کر پائے گی گو کہ انہوں نے ایک بے حد سادہ اور فول پروف منصوبہ تیار کیا تھا لیکن وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ صبح اسے اپنی بیٹی کو یہ خبر ضرور بتا دینی چاہیے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا پھر اسے اگلے دن پر ملتوی کر دیا۔ اس کے بعد ایک دن اور گزر گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو ٹیلی فون پر یہ خبر سنانے کے قابل نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آخری بار بیٹی کو لے کر کسی خوب صورت مقام پر جائے اور اسے اپنے بازوؤں میں لے کر خوب پیار کرے۔

ایک ہفتے بعد نصف شب کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جین نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا۔ اسے ڈر تھا کہیں یہ فریئی نہ ہو جسے اس نے ابھی تک فون نہیں کیا تھا لیکن دوسری جانب سے اینا پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری ساری دولت لے گیا۔ اس نے ساری سونے کی سلاخیں نکال لیں اور انہیں دوسرے بینک میں اپنے نام سے رکھوا دیا۔''

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟'' جین نے پوچھا۔

''اکاؤنٹنٹ نے ابھی فون کر کے مجھے ساری کہانی سنائی ہے۔'' اینا نے روتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہماری دولت کا بڑا حصہ سوئٹزرلینڈ کے ایک بینک کے مشترکہ اکاؤنٹ میں ہے۔ ایک ہفتہ پہلے مائیکل نے یہ تمام رقم اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرا دی تھی۔ اکاؤنٹنٹ سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس نے مجھے ابھی فون کر کے بتایا ہے کہ مائیکل نے کیا حرکت کی ہے۔''

جین اس سے پہلے کئی مرتبہ اینا سے کہہ چکی تھی کہ وہ اپنے پیسوں کے بارے میں کچھ کرے لیکن اینا اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایسے گھر میں پرورش پائی جہاں پیسوں کی ریل پیل تھی اور اس بارے میں بات کرنا برا سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے اثاثوں کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی تھی جنہیں اس کا شوہر بتدریج چرا رہا تھا۔

''یہ اپارٹمنٹ کس کا ہے؟'' جین نے پوچھا جس کے خوب صورت کمروں کو اینا نے فرانسیسی فرنیچر سے سجا رکھا تھا اور جہاں جگہ جگہ فرانسیسی مصوری کے شاہکار آویزاں تھے۔

''سب کچھ اسی کے نام پر ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ٹیکس کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ مجھے گھر سے بھی نکال سکتا ہے۔ شاید وہ ایسا کرنے اور موجودہ محبوبہ کو گھر میں لانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس کا نام کولیٹ ہے اور وہ بمشکل اکیس سال کی ہوگی۔''

''میں کل صبح ناشتے پر آؤں گی اور پھر ہم کوئی منصوبہ بنائیں گے۔ تم اکیلے کچھ نہیں کر سکتیں، اب سو جاؤ۔''

اس نے اینا کو تو سونے کی تاکید کر دی لیکن خود نہیں سوئی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ کیا مرنے سے پہلے یہ ایک مفید اور اچھا عمل ہوگا...... یا اس پر بھی مجرم ہونے کا داغ لگ جائے گا؟

اینا کے کچن میں ناشتے کے دوران میں انہوں نے ایک منصوبہ بنا لیا۔ ان کی عمارتوں میں تجارتی افراد اور عملے کے لوگوں کے لیے الگ الگ سیڑھیاں تھیں۔ دروازے پر موجود پہرے دار عموماً رات دس بجے کے بعد زیادہ چوکنا نہیں ہوتے تھے اور عقب میں بنے ہوئے اپارٹمنٹس میں جا کر آرام کرتے تھے۔ جین کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ایک بار اپنی چابیاں گھر میں بھول گئی تھی اس لیے اسے اینا کے گھر جانا پڑ گیا لیکن اتنی رات کو وہ گھنٹی بجا کر اینا کو جگانا نہیں چاہ رہی تھی چنانچہ وہ دیوار پر چڑھ کر عقبی سیڑھیوں تک پہنچ گئی اور اینا کے گھر کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

جین نے کہا۔ ''یہ بہت ہی آسان ہوگا کہ میں رات کو گھر سے باہر نکلوں اور عقبی سیڑھیوں سے تمہارے اپارٹمنٹ تک پہنچ جاؤں۔ اس طرح پہرے دار مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔''

''لیکن فائر کی آواز تو دور تک سنی جائے گی؟'' اینا نے کہا۔

''تمہارے اپارٹمنٹ کی دیواریں بہت موٹی ہیں۔ کیا اس کے باوجود بھی کوئی یہ آواز سن سکتا ہے؟''

''مائیکل رات دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتا ہے اور اکثر اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ اگر میں اس کی آواز بڑھا دوں؟''

''میں کسی کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جاؤں گی۔'' جین نے کہا۔

اینا نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں بآسانی یہ بندوبست کرسکتی ہوں کہ وہ گھر میں اکیلا گہری نیند سو رہا ہو۔ اس کے بعد میں ٹیلی ویژن کی آواز بڑھا کر وہاں سے نکل کر تمہارے پاس آجاؤں گی۔ اس دوران میں تم اپنا کام کر کے عقبی سیڑھیوں کے ذریعے تیزی سے واپس آجاؤ، پھر ہم تمہارے فلیٹ میں ایک ساتھ رات گزاریں گے۔ تمہارا پہرے دار یہ گواہی دے گا کہ ہم دونوں اس واقعے سے بہت پہلے تمہارے گھر آچکے تھے۔ اس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ آتے ہوئے ضرور دیکھا لیکن ہم میں سے کسی ایک کو نصف شب کے قریب عمارت سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

جین نے کئی سالوں سے اپنے ڈیڈی کا پستول استعمال نہیں کیا تھا لیکن وہ اسے چلانے کا طریقہ جانتی تھی اور یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ وہ بھول جاتی۔ پہلے اسے باپ نے سکھایا پھر بھائی مشق کرواتا رہا۔ اس نے کولمبیا کے کالج میں تعلیم کے دوران بھی شوٹنگ کی پریکٹس جاری رکھی تھی۔ تاہم اسے جو خدشات تھے، اس نے ان کا برملا اظہار اینا سے کردیا۔ ''اگر میں یہ کام کرتے ہوئے پکڑی جاؤں اور مقدمہ چلنے یا جیل جانے سے پہلے یا اس کام کے فوراً بعد میری موت واقع ہوجائے تو تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ تم میری بیٹی فرینی کا خیال رکھو گی اور اسے اتنی رقم دے دو گی کہ وہ میرے بعد بقیہ زندگی آرام سے گزار سکے۔''

''کیوں نہیں ڈارلنگ!'' اینا نے کہا۔ ''تم جو چاہتی ہو، میں وہی کروں گی لیکن بے فکر رہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''ایک کام اور...... تم مجھے اولیبا کے دو ٹکٹ اور پورٹو کیرو کے قریب ہوٹل میں ایک ہفتے کے قیام کا بندوبست کردو۔ جہاں میں برنارڈ کے ساتھ شادی کے بعد گئی تھی۔ کیا تم یہ کرسکتی ہو؟''

''بالکل...... کم از کم یہ تو کر ہی سکتی ہوں۔ تم وہاں دو ہفتے یا ایک مہینے بھی ٹھہر سکتی ہو۔''

اس نے جین سے یہ بھی کہا کہ وہ آتش دان پر رکھی ہوئی پزارو کی قیمتی پینٹنگ اور اس کی ہیرے کی انگوٹھی، جو وہ بستر پر چھوڑ دے گی، وہ بھی لے جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ قتل کی واردات کسی چور نے کی ہے۔'' اس کے لیے تمہیں ایک چھوٹا بیگ اپنے ساتھ لانا ہوگا۔'' وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے ساری عمر قتل کی منصوبہ بندی کرتی رہی ہے۔

بہرحال سب کچھ اس طرح نہیں ہوا جیسا کہ انہوں نے پلان کیا تھا۔ منصوبے کا پہلا حصہ بڑے ہموار طریقے سے عمل میں آیا۔ جیسے جین کوئی خواب دیکھ رہی ہو بلکہ وہ خود ایک خواب کا حصہ لگ رہی تھی۔ وہ جین تھی، برنارڈ کی بیوہ، فرینی کی ماں اور جیمس کی نانی، ایک شریف عورت جس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تھا اور جو کسی بھی وقت موت کو گلے لگا سکتی تھی۔ اس لمبی اور دبلی پتلی عورت نے اپنے شوہر کا ایک پرانا جوڑا نکال کر پہنا جس کی پتلون اسے ڈھیلی تھی۔ اس نے بیلٹ باندھ کر اسے کس لیا اور آستینیں موڑ لیں پھر اس نے الماری میں سے ایک پرانی ٹوپی نکال کر اس طرح سر پر رکھی کہ اس کا چہرہ چھپ جائے پھر اس نے سیاہ دستانے ہاتھوں پر چڑھائے اور آئینے کے سامنے پوز بنا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی اور لیونگ روم میں ٹہلتے ہوئے اینا کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

اینا نے پروگرام کے مطابق رات دس بج کر کچھ منٹ پر اس کے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بلیو جینز اور اسی رنگ کے سوئٹر میں بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ جین نے اسے کئی سالوں بعد اتنا خوش اور خوب صورت دیکھا۔ یقیناً اس نے آنے سے پہلے چند گلاس وھسکی کے لیے ہوں گے۔ اس نے جین کو بتایا کہ سب کچھ بڑی خوش اسلوبی سے منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔ اس نے مائیکل کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور تھوڑی سی وھسکی لی۔ اس نے جھومتے ہوئے کہا۔ ''کافی عرصے بعد ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر اتنا عمدہ کھانا کھایا ہے۔''

اس نے مائیکل سے کہا کہ وہ رات جین کے ساتھ

گزارے گی جس پر اس نے خلافِ معمول کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ کہنے لگا۔ ''تم شوق سے جاؤ اور جین کے ساتھ دل کھول کر باتیں کرو۔'' اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی جلدی سونے کے موڈ میں ہے۔

وہ اسے گہری نیند میں سوتا ہوا چھوڑ کر آئی تھی۔ ''میں نے اسے واڈکا میں نیند کی دوا ملا کر دی ہے۔ اس نے اچھے بچوں کی طرح گلاس پیا اور چند لمحوں میں ہی گہری نیند سو گیا۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ یہ کام اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔''

وہ سانس روکے بغیر بول رہی تھی۔ اسے خود بھی اپنی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے گھر سے نکلتے وقت ٹیلی ویژن کی آواز اونچی کر دی اور عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر آ گئی۔ چوکیدار کے کیبن کے پاس آ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہ رہی تھی کہ چوکیدار اسے عمارت سے باہر جاتا ہوا دیکھ لے۔ چوکیدار نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔ اس نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا اور مرکزی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

یہی حرکت اس نے جین کی عمارت میں داخل ہوتے ہوئے کی۔ چوکیدار جانتا تھا کہ وہ اکثر اپنی سہیلی کے پاس رہنے کے لیے آتی ہے۔ پھر بھی اینا نے لفٹ کے بجائے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ یہاں بھی چوکیدار نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اب اینا مطمئن تھی۔ ان دو آدمیوں کی گواہی جائے وقوعہ سے اس کی غیر موجودگی ثابت کرنے کے لیے کافی تھی تاہم اب بھی اسے یقین نہیں تھا کہ جین یہ کام کر سکے گی۔

''کیا تمہیں یقین ہے ڈارلنگ کہ تم اسے قتل کر سکو گی؟'' اس نے جین کی طرف دیکھ کر فکر مندی سے کہا۔

جین نے بے دھیانی میں سر ہلا دیا لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ جب اینا نے دوبارہ یہی بات کہی تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''شش...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تمہیں سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔''

اینا جھینپ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک مرد کی طرح شاندار لگ رہی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے جین کے گال کا بوسہ لیا اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم مرد ہوتیں تو میں تم سے شادی کر لیتی۔''

جین نے اسے دیکھا اور پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔

''جانے سے پہلے ایک ڈرنک ہو جائے تاکہ تمہاری ہمت بحال ہو سکے۔ تمہارا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔'' اینا نے کہا تو جین نے دو گلاسوں میں وہسکی ڈالی۔ انہوں نے آپس میں گلاس ٹکرائے اور وہسکی حلق میں انڈیلنا شروع کر دی۔

اس وقت وہ اپنے آپ کو ایک ایسا تماشائی سمجھ رہی تھی جو کوئی ڈراما دیکھ رہی ہو۔ ایک عورت اور مرد چھوٹے سے کچن میں وہسکی سے شغل کر رہے ہیں۔ مرد نے ایک پرانی سلیٹی رنگ کی پتلون، سیاہ قمیص اور سر پر سیاہ ٹوپی پہن رکھی ہے جبکہ خوب صورت عورت نیلے سویٹر اور جینز میں ملبوس ہے۔

جین نے اپنا بیگ اٹھایا جو وہ شاپنگ کے لیے استعمال کرتی تھی اور بولی۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو تمہیں وہی کرنا ہوگا جو ہمارے درمیان طے ہو چکا ہے۔''

اینا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ''ڈارلنگ، میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔ تم میری زندگی بچانے جا رہی ہو۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے لیے اتنا کچھ کر سکتی ہو۔''

''اوہ...... ایک ضروری چیز تو میں بھول ہی گئی۔'' جین نے کہا اور جلدی سے اپنی گن میز کی دراز سے نکال کر جیب میں رکھ لی پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر اپارٹمنٹ سے باہر چلی آئی۔ اس بار اس نے نیچے جانے کے لیے عقبی دروازے کا انتخاب کیا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اترتی ہوئی چوکیدار کی کوٹھری کے پاس سے گزری جہاں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے پچھلی گلی میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ اس نے اپنے اطمینان کے لیے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔

پھر اس نے اینا کے اپارٹمنٹ کی دیوار سے اندر چھلانگ لگا دی۔ وہ کچھ دیر دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی رہی۔ احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ وہ کچرے کے ڈرم کے پاس سے گزرتی ہوئی عقبی سیڑھیوں تک پہنچی۔ وہاں بھی تاریکی تھی وہ دیوار پر ہاتھ جمائے اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی زینے کی لائٹ روشن نہ کر دے۔ عقبی دروازے کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور اندھیرے میں دروازے کا تالا ٹٹولنے لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے کامیابی ہو گئی۔ اس نے چابی تالے میں گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی پھر اس نے بڑی خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ چند سیکنڈ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ اپارٹمنٹ میں گھپ اندھیرا تھا۔ البتہ ٹیلی ویژن چل رہا

تھا۔ اس وقت کوئی ڈراما چل رہا تھا جس میں کرداروں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ مائیکل ابھی تک گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ اندھیرے میں دبے پاؤں آگے بڑھی۔ وہ دیوار کا سہارا لیے بڑی احتیاط سے قدم رکھ رہی تھی کہ کہیں کسی چیز سے نہ ٹکرا جائے۔ راہداری عبور کر کے وہ ہال میں پہنچی جہاں ماسٹر بیڈروم سے آنے والی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا جو غالباً اینا نے جان بوجھ کر کھلا چھوڑ دیا ہوگا۔ ٹیلی ویژن کی آواز اب اور زیادہ تیز محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بیڈروم میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر رکھے اینا کے زیورات پر گئی جو لیپ کے ساتھ ہی رکھے ہوئے تھے۔ مائیکل بستر پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں ویسے ہی مردہ لگ رہا تھا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ جین نے اس کے قریب پہنچ کر جیب سے گن نکالی۔ اس لمحے وہ اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کے گھٹنوں میں جان نہ رہی ہو۔ منہ خشک ہو گیا تھا اور وہ بمشکل سانس لے پا رہی تھی۔ وہ اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ رکھا ہوا ٹیلی ویژن پوری آواز سے چل رہا تھا۔ فضا میں اینا کے پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی لیکن اسے تو وہاں سے گئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے تو پھر یہ خوشبو مائیکل کے جسم سے پھوٹ رہی ہوگی۔ اس معاملے میں وہ بھی بہت باذوق تھا۔

سوتے ہوئے وہ بہت معصوم اور جوان لگ رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک مضبوط اور توانا شخص تھا۔ اس کا جسم کسی ایتھلیٹ کی طرح متناسب تھا۔ اچانک ہی وہ اسے بے گناہ نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ یہ بھی محض ایک انسان ہے جو ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ کیا ہم سب ایسا نہیں کرتے؟ اس کی کئی مرتبہ مائیکل سے بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔ وہ ایک ذہین اور دلکش انسان تھا جو بڑے منفرد انداز میں باتیں کرتا تھا۔ جین کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم غیر معمولی طور پر ذہین عورت ہو۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے؟“

یقیناً اس کے پاس بھی سنانے کے لیے کوئی کہانی ہوگی۔ وہ اس کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور اس کا گن والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ہر انسان کی زندگی منفرد

اور قیمتی ہوتی ہے۔ یہ میں کیا کرنے جارہی ہوں؟ میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں کون ہوتی ہوں اس کی جان لینے والی؟ مجھے فوراً واپس گھر جانا چاہیے۔

پھر اس نے فرنٹ ڈور کھلنے کی آواز سنی۔ دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور زور سے بند ہوگیا۔ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کی ایڑی کی ٹھک ٹھک ہال کے فرش پر گونج رہی تھی۔ وہ مارے خوف کے اپنی جگہ پر منجمد ہوکر رہ گئی۔ پہلے اس نے سوچا کہ شاید یہ اینا ہو اور یہ کہنے آئی ہو کہ وہ گولی نہ چلائے کیونکہ اس نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ ہم قاتل نہیں کہلانا چاہتے لیکن وہ اینا نہیں تھی۔

وہ مائیکل کی محبوبہ کولیٹ تھی۔ ان دونوں نے وہ رات ایک ساتھ گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ اسی لیے مائیکل نے بخوشی اینا کو جین کے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ جیسے ہی کولیٹ کی نظر اس پر گئی، اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن گن پر نظر پڑتے ہی وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ جین بھی اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ عین وقت پر اس کی آمد نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اس نے میکانکی انداز میں نشانہ لیا اور جیسا کہ اس کے باپ نے ہرن کا شکار کرتے وقت اسے سکھایا تھا کہ ہمیشہ دونوں آنکھوں کے بیچ کا نشانہ لینا چاہیے۔ اس نے گولی چلائی اور وہ لڑکی فرش پر گر پڑی۔

فائر کی آواز سن کر مائیکل اٹھ گیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہوتا، جین نے اس کے سر کا بھی نشانہ لے لیا گو کہ اس لمحے وہ اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی اور اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا پھر بھی اس نے پوری قوت مجتمع کر کے گولی چلا دی۔ دوسرا فائر اس نے مائیکل کے سینے پر کیا۔ جب اسے مائیکل کے مرنے کا یقین ہوگیا تو اس کی کھوئی ہوئی قوت لوٹ آئی۔

وہ گھوم کر بستر کی دوسری جانب گئی۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے اینا کے زیورات اپنے بیگ میں رکھے پھر وہ ڈائننگ روم میں آئی اور آتش دان پر رکھی ہوئی تصاویر اپنے بیگ میں ڈال لیں۔ یہاں تک کہ اس نے میز پر رکھی ہوئی چاندی کی ایش ٹرے بھی نہیں چھوڑی۔ یہ سب چیزیں سمیٹ کر وہ عقبی سیڑھیوں سے نیچے اتری اور جس راستے سے آئی تھی، اسی سے واپس سڑک پر آگئی۔ خوش قسمتی سے اب تک اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گن گندے نالے میں پھینک دی۔

☆☆☆

وہاں وہ ان کا آخری دن تھا۔ جین، فرینی اور اس کا نواسا، سمندر کے گرم پانی میں تیر رہے تھے۔ ننھا جیمس اس کے کندھے پر سوار تھا۔ اکتوبر کی نرم دھوپ نے ماحول کو... بے حد خوشگوار بنا دیا تھا۔

”اوہ ممی...... اس بار تو آپ نے فضول خرچی کی انتہا کردی۔ واقعی یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔“ فرینی نے کہا۔ وہ اس وقت ساحل پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔

”آپ ان دو ہفتوں کے اخراجات کہاں سے ادا کریں گی؟ کیا آپ کی کوئی لاٹری نکل آئی ہے یا کوئی خزانہ ہاتھ آگیا ہے؟“

”میں صرف یہ چاہتی تھی کہ اس بار ہم سب اکٹھے ہوجائیں...... آخری بار۔“ جین نے کہا۔ اب اسے فرینی کو یہ خبر سنا دینی چاہیے۔ وہ مزید انتظار نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی سہ پہر میں انہیں وہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ فرینی چونکتے ہوئے بولی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ماں نے آخری بار کیوں کہا۔

جین نے سوچا کہ وہ اسے ایسی خبر کیسے سنا سکتی ہے جس سے اس کی ساری خوشی غارت ہوجائے۔ وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ دوبارہ اس طرح کی تفریح افورڈ کرسکوں۔“

اس کا نواسا اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور بار بار زمین پر پاؤں مار کر پانی پانی، کہہ رہا تھا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے، اس نے کم از کم تین نئے لفظ بولنا سیکھ لیے تھے جو اس کی ماں کی خوشی کے لیے کافی تھے۔ جین سوچ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کتنی خوش ہے۔ وہ بار بار اپنا سر پیچھے کرتی اور بالوں کو ایک خاص انداز میں جھٹکتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب وہ آخری بار دیکھ رہی ہے، اسی لیے اس نے بیٹی سے ملنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد اپنی بیٹی اور نواسے کے پاس پہنچنا چاہ رہی تھی اسی لیے اس روز صبح سویرے پیرس سے پہلی پرواز لی اور روم پہنچ گئی جہاں اسے بیٹی سے ملنا تھا۔ اس رات وہ بالکل نہیں سوئی اور اینا سے باتیں کرتی رہی۔ صبح

سویرے وہ اینا کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ اینا نے فون کر کے ائرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسی منگوائی اور عمارت کے چوکیدار سے کہا کہ وہ جین کا سامان ٹیکسی میں رکھنے میں ان کی مدد کرے پھر اس نے گلے لگا کر جین کو رخصت کیا اور واپس اپارٹمنٹ میں چلی گئی۔ چوکیدار متاثر کن انداز میں یہ منظر دیکھتا رہا۔ یہ گویا ایک اور گواہی تھی کہ وقوعہ کی شب وہ دونوں جین کے اپارٹمنٹ میں تھیں۔

پہلے روز وہ ہوٹل کے ٹیرس میں بیٹھی ناشتا کر رہی تھیں۔ فرینی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا اور چونکتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ نے یہ خبر پڑھی؟''

جین کو ہلکی سی جھرجھری آئی لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ''نہیں...... کیا ہوا؟''

''اوہ، میرے خدا...... یہ تو اینا کا اپارٹمنٹ ہے۔'' اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا اور بہ آوازِ بلند پڑھنے لگی۔ ''ریو گوئٹر کے اپارٹمنٹ نمبر 125 میں چوری کی واردات۔ مالک اور ایک نوجوان عورت اپارٹمنٹ میں مردہ پائے گئے۔ چور اپنے ساتھ زیورات اور قیمتی پینٹنگز لے گیا۔''

یہ کہہ کر فرینی نے اخبار ماں کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔ ''اینا تو خیریت سے ہے نا؟''

''ہاں، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ خوش قسمتی ہے اس شب وہ میرے پاس ہی تھی۔ میری صبح روم کی پرواز تھی اس لیے وہ مجھ سے ملنے چلی آئی اور ہم دونوں رات بھر باتیں کرتے رہے مجھے اس کے شوہر کی موت کا افسوس ہے۔ میں جلد ہی اسے فون کروں گی۔''

اس نے اینا کو فون نہیں کیا کیونکہ ان کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک ایک دوسرے کو فون کریں گی، نہ ہی ملنے کی کوشش کریں گی گو کہ ان کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہی نہیں تھی اور نہ ہی کسی نے جین کو اینا کے اپارٹمنٹ میں آتے یا واپس جاتے دیکھا تھا...... اس کے باوجود وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

سہ پہر میں ائرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے جین کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ اس وقت تک ان کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ سامان باندھا جا چکا تھا اور وہ سفر کے لیے لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ جین نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فون اٹھایا اور سوچنے لگی کہ یہاں اسے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ صرف اینا کو معلوم ہے کہ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں لیکن وہ مجھے کیوں فون کرے گی؟ کہیں پولیس کو تو کوئی سراغ نہیں مل گیا؟

دوسری طرف سے بات کرنے والی اینا تھی اور نہ ہی پولیس بلکہ یہ اس کا بوڑھا ڈاکٹر تھا جو ایک ہی سانس میں بولے جا رہا تھا۔ ''میں بہت خوش ہوں کہ بالآخر تمہیں تلاش کر ہی لیا۔ تمہیں ڈھونڈنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ تمہارے لیے میرے پاس ایک شاندار خبر ہے۔''

''شاندار خبر؟'' جین ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑتے ہوئے بولی۔ اسے بہت زور کا چکر آیا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ پورا کمرا اور اس میں رکھی ہوئی ہر چیز گھوم رہی ہو۔

''ہاں، میں نہیں جانتا کہ اتنی بڑی خبر تمہیں کیسے سناؤں۔'' ڈاکٹر نے اس مرتبہ قدرے پرسکون انداز میں کہا۔ ''دراصل ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے اطمینان اور تصدیق کے لیے تمہارے ٹیسٹ دوبارہ کروائے اور میں بڑی مسرت کے ساتھ تمہیں اطلاع دے رہا ہوں کہ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ تم بالکل صحت مند ہو۔ تم زندہ رہو گی...... ایک لمبے عرصے تک۔''

''نہیں۔'' وہ زور سے چلائی اور ریسیور اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس کی چیخ سن کر فرینی دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر جاتی، اس نے ماں کو سنبھال لیا اور سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی کہ کس کا فون تھا اور ایسی کیا بات ہوگئی کہ آپ اتنے زور سے چلانے پر مجبور ہوگئیں لیکن جین نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مائیکل کا معصوم چہرہ اور اس کی محبوبہ کی خوف میں ڈوبی ہوئی نیلی آنکھیں گھوم رہی تھیں۔ اس وقت اسے اپنے مجرم ہونے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دو بے گناہ انسانوں کا خون کیا تھا۔ وہ قاتلہ تھی۔ کیا وہ اس احساسِ جرم کے ساتھ ایک طویل عمر جی سکے گی؟

پورٹر نے دروازے پر دستک دی۔ ٹیکسی آچکی تھی۔

وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئی۔ پیرس پہنچ کر اس نے آخری بار اپنی بیٹی اور نواسے کو گلے لگا کر پیار کیا اور ان سے رخصت ہو کر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی آئی۔ اس نے اینا کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لیونگ روم میں آئی اور پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اگر وہ مر جاتی تو یہ جرم بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا لیکن وہ اس احساسِ جرم کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

عدل وانصاف

مرزا امجد بیگ

زیادہ کا لالچ، تھوڑے کو بھی گنوا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بعض اوقات بینائی ہونے کے باوجود اصل منظر نہیں دیکھ پاتا۔ دورِ حاضر میں لوگوں نے چہرے پر اتنے نقاب ڈالے ہوئے ہیں کہ اصل چہرہ جانے کہاں گم ہوگیا ہے... اور جب کبھی سامنے آجائے تو اس قدر بدہیت ہوتا ہے کہ دیکھنے والے ایک نظر سے دوسری نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتے... اور یہ کوئی ایک ذات نہیں بلکہ کبھی کبھی گروہ کے گروہ ایسے مل جاتے ہیں کہ پورا معاشرہ ان کی زد پر آجاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سیر کے لیے سوا سیر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اس گروہ کے لیے بیگ صاحب ایسے ہی سوا سیر ثابت ہوئے کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں۔

معاشرتی ناسوروں کو بے نقاب کرتی سبق آموز تحریر

بعض لوگوں کو گھما پھرا کر بات کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ان کے کہے کو سمجھنے کے لیے اپنی سمجھ کو بھی تھوڑا ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے جبھی جا کر ان کا مطمعِ نظر کہیں بھیجے میں بیٹھتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔

''جناب وکیل صاحب!'' وہ میرے سامنے بیٹھنے کے بعد اضطراری لہجے میں بولا۔ ''آپ عموماً کس نوعیت کے کیس لیتے ہیں؟''

اس کا سوال خاصا احمقانہ تھا تاہم کلائنٹ، کلائنٹ ہی ہوتا ہے۔ جیسے موت اور گاہک کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا، ایسے ہی کلائنٹ کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ وہ آپ کے سامنے بیٹھ کر کسی وقت کوئی بھی.... بے تکی بات... کرسکتا ہے۔ میں نے اپنے مذکورہ بالا کلائنٹ کے سوال کو تحمل سے سنا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں عموماً اور خصوصاً ہر نوعیت کے کیس لیتا ہوں۔''

''آپ سمجھے نہیں وکیل صاحب!'' وہ کسی ہیڈ ماسٹر کے سے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اصل میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔''

''اصل میں یا نقل میں......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں، بس جلدی سے پوچھ ڈالیں۔''

''میرا مطلب یہ تھا کہ میرا کیس خاصا سنگین نوعیت کا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے میں کیس کا ذکر کرنے سے پہلے اپنی تسلی کرلینا چاہتا تھا۔''

''جب کوئی بھی معاملہ سنگین صورت اختیار کرجاتا ہے تبھی لوگوں کو کسی وکیل کی خدمات کا خیال آتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ہر قسم کی سنگینی اور سنسنی سے بھرپور خطرناک نوعیت کے کیس لیتا ہوں۔ اگر آپ کی تسلی ہوگئی ہو تو بسم اللہ کریں......''

"جی....." اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "کیا کریں؟"

"بسم اللہ!" میں نے اپنے اندرونی جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "مطلب یہ کہ اگر آپ کا اطمینان ہوگیا ہو تو اپنے کیس کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کریں؟"

میں نے بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے اس عجیب وغریب اور خبطی شخص کی طرف دیکھا تو وہ نگاہیں گھما کر میرے آفس کے درودیوار کو ایسے تکنے لگا جیسے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہاں بیٹھ کر بات کرنا مناسب بھی ہے نا۔ کہیں ان کھڑکیوں، دیواروں اور دروازے کے کان تو نہیں جو اس کی رازدارانہ باتوں کو سن کر کہیں اور کسی کے سامنے اگل دیں گے۔

"میرا کیس عام لوگوں کے کیس سے خاصا مختلف ہے۔ آپ اسے ایک پیچیدہ کیس کہہ سکتے ہیں۔" وہ بات کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ "بہتر یہ ہوگا کہ آپ ساتھ ساتھ پوائنٹ نوٹ کرتے جائیں تاکہ بعد میں مجھے کوئی بات دہرانا نہ پڑے۔ اس طرح آپ کے لیے خاصی آسانی ہوجائے گی۔"

میں نے اس کے زریں مشورے پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے رف پیڈ کو اپنے قریب کھسکا لیا اور قلم کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے سوالیہ نظر سے اپنے اسپیشل کلائنٹ کی جانب دیکھا اور کہا۔ "جی ارشاد؟"

"آپ کو میری ہر بات بڑی توجہ اور غور سے سننا ہوگی۔ اصل میں مسئلہ ایک گاڑی کا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رکا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"گاڑی.....؟"

"جی گاڑی..... میرا مطلب ہے، کار۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کی کار کو کیا ہوگیا ہے؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کوئی ایکسیڈنٹ یا چوری وغیرہ کا معاملہ ہے.....؟"

"کار ایکسیڈنٹ اور چوری تو بہت معمولی باتیں ہیں جناب!" وہ دونوں ہاتھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "میرا معاملہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ میں نے کہا ہے نا، یہ بہت ہی پیچیدہ کیس ہے وکیل صاحب۔"

"ٹھیک ہے....." میں نے جرح وبحث میں وقت برباد کرنے کے بجائے گیند کو اسی جھکی آدمی کی کورٹ میں پھینکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "تو اپنی کسی کار کے بارے میں بتا رہے تھے آپ.....؟"

"جی ہاں کار!" وہ تائیدی انداز میں آنکھوں کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ایک سال پہلے ہم نے قسطوں پر ایک کار خریدی تھی۔ وہ سفید رنگ کی ایک نئی کار تھی۔ خیر، اب تو کسی بھی قیمت پر اسے نیا نہیں کہا جاسکتا اگرچہ اس عرصے کے دوران میں وہ بہت کم روڈ پر نکالی گئی ہے لیکن جناب..... نئی کار تو نئی ہی ہوتی ہے نا!"

"جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ اپنی کار کی کتھا کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس اس کار کے تمام کاغذات بھی ہیں بلکہ کار کی فائل میں اپنے ساتھ لایا ہوں....." اس نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے تھیلے کو تھپتھپایا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں یہ فائل آپ کو بھی دکھاؤں گا پھر آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا۔"

تھیلے یعنی "بیگ" کو تھپتھپا کر اس نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ متذکرہ بالا فائل اس تھیلے کے اندر موجود ہے۔ میں نے سوچا اگر میں اس کے بولنے کا منتظر رہا تو شاید آج کسی اور کلائنٹ کی باری ہی نہ آئے۔ وہ جس رفتار اور انداز میں اپنی کہانی سنا رہا تھا اس میں کام کی باتیں کم اور غیر ضروری معاملات کچھ زیادہ ہی دخیل ہورہے تھے لہٰذا میں نے اسے اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

"تو آپ نے ایک سال پہلے کوئی نئی کار قسطوں پر خریدی تھی.....؟"

"جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے جلدی سے پوچھ لیا۔ "کمپنی کا نام؟"

"کمپنی.....!" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ "آپ کس کمپنی کی بات کررہے ہیں وکیل صاحب؟"

"میں نے اس کمپنی کا نام پوچھا ہے جس سے آپ نے قسطوں پر وہ گاڑی خریدی تھی۔" میں نے فوراً وضاحت کردی۔

"اوہ اچھا....." وہ سکھ کی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا آپ کار کی کمپنی کا نام جاننا چاہتے ہیں۔"

آخری جملہ اس اللہ کے بندے نے کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا جیسے گاڑی کا میک یا اس کی کمپنی کا نام پوچھنا کوئی اچنبھے کی بات ہو۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دونوں ہی کا نام بتا دیں تو اچھا ہے اگر کوئی حرج نہ ہوتو ؟"

"نہیں جناب، کوئی حرج نہیں۔ آپ تو ویسے بھی میرے وکیل ہیں۔ آپ سے کوئی بھی بات چھپانا مناسب نہیں ہوگا۔" وہ کمال مہربانی سے بولا۔ "تو جناب! گاڑی تو سوزوکی سوئفٹ ہے اور قسطوں والی اس کمپنی کا نام ہے...... شاہین ٹریڈنگ کمپنی۔ میں سارے کاغذات ساتھ لایا ہوں۔ آپ انہیں غور سے دیکھیں گے تو ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔"

سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی تک کچھ بھی میرے پلے میں پڑا تھا۔ وہ شخص گزشتہ دس منٹ سے بیٹھا انٹ کا شنٹ بولے جارہا تھا اور میں ابھی تک یہ نہیں جان سکا تھا کہ اسے اپنی قسطوں والی کار کے لیے ایک وکیل کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی۔

"آپ کی اس کار کے سلسلے میں، میں کیا خدمات انجام دے سکتا ہوں؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے جناب...... " وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کے قیمتی وقت کا لحاظ کرتے ہوئے میں اسے مختصر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"بہت نوازش ہے آپ کی۔" میں نے تہ دل سے کہا۔

"میں نے...... بلکہ ہم نے یہ سوزوکی سوئفٹ کار جس کمپنی سے لی تھی اس کے مالک کا نام اشفاق بخاری ہے۔" وہ وضاحت کرنے والے انداز میں بولا۔ "کمپنی کا تو اب نام ہی باقی رہ گیا ہے، وجود تو کہیں نظر نہیں آتا......"

وہ بات کرتے کرتے اچانک بولا تو میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کمپنی کا وجود کہیں نظر نہیں آتا، اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ "شاہین ٹریڈنگ کمپنی" اب لگ بھگ ختم ہی ہو چکی ہے۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بتایا۔ "آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے قسطوں پر چیزوں کا کاروبار کرنے والی کمپنیاں برساتی کھمبیوں کے مانند نکل آئی تھیں۔ اخبارات میں ہر طرف انہی کمپنیوں کے اشتہارات دیکھنے کو ملتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں سے بہت سی کمپنیاں منظرِعام سے غائب ہوگئیں...... " لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے گھر والوں کو منع کیا تھا کہ وہ قسطوں کے چکر میں نہ پڑیں مگر کسی نے میرے مشورے پر کان نہیں دھرے اور خوامخواہ ایک مصیبت مول لے لی۔ ہم نے کمپنی کو بیس ہزار روپے ایڈوانس منی کے طور پر دیے۔ باقی کی رقم تین ہزار روپے ماہانہ قسط کی صورت ادا کرنا تھی۔ ہم نہایت پابندی کے ساتھ چھ ماہ تک قسطیں ادا کرتے رہے لیکن پھر ایک نیا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا......"

اتنا بتانے کے بعد اس نے ایسے انداز سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں سوال کروں، کون سا معاملہ؟ میں نے فوراً اس کی خواہش پوری کردی۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا نیا معاملہ؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے۔" وہ بے اعتنائی سے بولا۔ "لیکن چونکہ اس کہانی کا تعلق بھی "شاہین ٹریڈنگ کمپنی" کے مالک اشفاق سے جڑا ہوا ہے اس لیے آپ کے علم میں لانا ضروری ہے۔"

"یا اللہ خیر......!" میں نے دل ہی دل میں کہا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"اشفاق بخاری نے "بخاری انویسٹرز" کے نام سے ایک اور کمپنی بھی کھول رکھی تھی بلکہ اس کا آفس اب بھی موجود ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس نوعیت کی کھمبی مارکا کمپنیاں جب ایک ایک کرکے منظرِعام سے ہٹنے لگیں تو مجھے بھی فکر لاحق ہوگئی کیونکہ ہم نے "بخاری انویسٹرز" میں پچاسی ہزار روپے لگا رکھے تھے۔"

اس کے نئے انکشاف نے مجھے سیدھا ہوکر بیٹھنے پر مجبور کردیا اور میں قلم کو پیڈ پر رکھ کر سوالیہ نظر سے اپنے انوکھے کلائنٹ کو دیکھنے لگا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جب کھمبی مارکا کمپنیوں کے مالکان غائب ہونے لگے تو ہم نے جاکر بخاری صاحب کو پکڑلیا۔ انہوں نے الٹا ہم پر غصہ کیا کہ وہ دوسروں کی طرح فراڈیے نہیں ہیں جو لوگوں کی رقمیں کھاکر کہیں غائب ہوجائیں گے۔ ہم نے ان سے بحث مناسب نہ سمجھی اور بڑے ادب سے کہا کہ ہم انہیں بے ایمان نہیں سمجھتے۔ بس، بات یہ ہے کہ ہمیں رقم کی ضرورت ہے اس لیے ہم اپنی رقم نکالنا چاہتے ہیں۔ اس پر پتا ہے، انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا......؟"

مجھے نہیں پتا تھا اس لیے میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نن...... نہیں!"

"انہوں نے ہمارے چکر لگوانا شروع کردیے۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "کبھی کہیں صبح آؤ، کبھی شام، کبھی کل، کبھی پرسوں۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ انویسٹ کی رقم

پچاسی ہزار روپے واپس کرنے میں حیل وحجت سے کام لے رہے ہیں اور یہ کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں تو ہم نے ان کے سامنے ایک تجویز رکھی۔

''بخاری صاحب! ہم وہائٹ سوئفٹ کار کی مد میں آپ کو اب تک اڑتیس ہزار روپے ادا کر چکے ہیں۔ ہمارے انویسٹ والے پچاسی ہزار میں سے آپ گاڑی کی باقی قیمت کاٹ کر جو بچے وہ ہمیں دے دیں۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!''

''پھر انہوں نے کیا کہا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''انہوں نے ہماری بات مان لی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس طرح ہماری رقم پچاسی ہزار میں سے گاڑی کی باقی رقم کاٹ کر ہمیں رقم کی ادائیگی کی رسید بنا دی۔''

''کچی یا پکی؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''کچی......!''

''اور ڈاکیومینٹس!'' میں نے کہا۔ ''مطلب، گاڑی کے کاغذات؟''

''بخاری صاحب نے کاغذات ہمیں نہیں دیے۔'' اس نے بتایا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''جب آپ گاڑی کی پوری قیمت ادا کر چکے تو پھر انہوں نے کاغذات آپ کو کیوں نہیں دیے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی کی رجسٹریشن ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کے نام تھی جو ہائر پرچیز کے اصول کے مطابق، گاڑی کی پوری قسطیں ادا ہونے کے بعد ہمارے نام ہونا تھی۔ بخاری صاحب نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ چند روز میں گاڑی ہمارے نام ٹرانسفر کرا دیں گے......''

''لیکن......'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔ ''جب آپ لوگوں کے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ یکمشت ادائیگی کر کے آپ وہ گاڑی خرید سکتے تھے تو پھر قسطوں پر گاڑی نکلوانے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''انسانی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''انسان کی فطرت میں دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ لالچ کا عنصر بھی شامل ہے۔ ہم بھی لالچ میں آ گئے تھے۔ ہمیں بخاری صاحب پچاسی ہزار کی رقم پر اتنا پرافٹ دے رہے تھے کہ ہم گاڑی والی تین ہزار کی قسط ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچا لیتے تھے۔ گھر والے اس لالچ میں آ گئے کہ ایک ہاتھ سے پچاسی ہزار کا پرافٹ وصول کریں گے اور دوسرے ہاتھ سے گاڑی کی قسط ادا کر دیں گے۔ نہ صرف قسط ادا ہو جائے گی بلکہ تھوڑی بہت رقم ایکسٹرا بھی مل جائے گی۔ اس طرح کچھ عرصے کے بعد گاڑی کی قسطیں ختم ہو جائیں گی اور ہماری اصل رقم یعنی انویسٹمنٹ والے پچاسی ہزار اپنی جگہ پر جوں کے توں پڑے رہیں گے اور گاڑی ایک طرح سے ہمیں صرف بیس ہزار میں مل جائے گی۔ وہی بیس ہزار جو ہم نے گاڑی کی مد میں شاہین ٹریڈنگ کمپنی کو ایڈوانس پیمنٹ کی تھی۔''

''آئیڈیا تو ٹھیک ہی تھا مگر لالچ کی وجہ سے برائی گلے پڑ گئی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''برائی بھی کوئی ایسی ویسی جناب۔'' وہ دیدے گھماتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے کہتے ہیں...... لالچ بری بلا ہے! یہ بلا ایسی ہمارے گلے پڑی کہ اب تک بھگت رہے ہیں۔''

اس خوف سے کہ وہ پٹری سے اتر کر کوئی نئی داستان نہ شروع کر دے، میں نے اسے یاد دلانا بہت ضروری سمجھا۔ ''بخاری صاحب نے چند روز میں گاڑی آپ کے نام ٹرانسفر کرانے کا وعدہ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا؟''

''اگر انہوں نے وعدہ پورا کیا ہوتا تو آج میں کسی وکیل کے سامنے بیٹھ کر اپنی بپتا نہ سنا رہا ہوتا۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے تو ہماری باقی ماندہ رقم بھی نہیں دی تھی۔ اس کی ادائیگی کا وعدہ بھی گاڑی کے ٹرانسفر کے ساتھ ہی تھا۔ ہم صبح شام بخاری صاحب کے دفتر کے چکر لگاتے رہے مگر وہاں کی صورت حال روز بروز بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ بخاری صاحب کا بزنس تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا تھا۔ اس چکر میں کوئی اکیلے ہم ہی نہیں پھنسے ہوئے تھے اور بھی بہت سے لوگ پھیرے لگا رہے تھے۔ ان میں کچھ تو قسطوں کی گاڑیوں والے تھے جبکہ اکثریت ان افراد کی تھی جنہوں نے ''بخاری انویسٹرز'' میں بڑی بڑی رقمیں لگا رکھی تھیں۔ ہر روز وہاں کوئی جھگڑا پھڈا ہو جاتا تھا۔ بخاری صاحب بھی دفتر سے غائب رہنے لگے تھے۔ ایک روز بخاری صاحب ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس دن آفس میں بڑی ہنگامہ آرائی دیکھنے کو ملی۔ چند جوشیلے افراد بخاری صاحب کو اغوا کر کے لے گئے۔ دفتر میں توڑ پھوڑ کی گئی اور بخاری صاحب کے ساتھ ہی دفتر کا سارا کاغذی ریکارڈ بھی لے گئے۔ ان کاغذات میں ان تمام گاڑیوں کے ڈاکیومینٹس بھی تھے جو لوگوں نے ہائر پرچیز کے اصولوں پر ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے قسطوں پر

خریدی تھیں اور ہماری گاڑی کے کاغذات بھی انہی کاغذات میں شامل تھے......''

''اوہ......!'' میں نے ہمدردی بھرے انداز میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا جی۔'' وہ افسردہ سے لہجے میں بولا۔ ''اشفاق بخاری کو تو میری نظر کے سامنے چند مشتعل افراد اٹھا لے گئے تھے۔ دفتر کے دیگر اسٹاف کو بھی انہوں نے زدوکوب کیا تھا لہٰذا اگلے روز سے دفتر پر تالے پڑ گئے۔''

''اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا اشارہ خاص طور پر آپ کی طرف ہے؟''

''ہم صبر کر کے گھر بیٹھ گئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔''اتنا اطمینان تو تھا کہ جو وہائٹ سوئفٹ ہم نے ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے قسطوں پر خریدی تھی وہ کم از کم ہمارے گھر میں ہماری نظروں کے سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہے مگر ایک روز یہ اطمینان بھی غارت ہو کر رہ گیا۔''

''کیا مطلب......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''کیا وہ کار کسی نے چرالی؟''

''وکیل صاحب! اگر وہ گاڑی ہمارے گھر سے چوری ہو جاتی تو شاید ہم اتنے پریشان نہ ہوتے جتنے اس وقت ہیں۔'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔''اس صورت میں، میں کسی قانون داں کے پاس نہیں بلکہ سیدھا پولیس اسٹیشن جا کر اس گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کراتا۔''

''پھر کیا ہوا تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

ابتدا میں وہ شخص مجھے جھکی اور خبطی لگا تھا۔ باتیں تو وہ اب بھی اسی انداز میں کر رہا تھا تاہم صاف گوئی یہ ہے کہ مجھے آپ اس کی داستانِ غم میں خاصی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک بات کا مجھے ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ''اشفاق بخاری'' نام کا کردار کوئی بہت ہی بڑا دھوکے باز اور فراڈ شخص تھا۔ میں نے انویسٹ منٹ کمپنیوں کے کئی ''کارنامے'' سن اور دیکھ رکھے تھے۔ ان دنوں بہت زیادہ پرافٹ کے لالچ میں لوگوں کو گھیر گھار کر انویسٹمنٹ کی طرف راغب کیا جا رہا تھا۔ بعض عاقبت نااندیش قسم کے لوگوں نے تو اپنے گھر بار اور طلائی زیورات بیچ کر ان کمپنیوں میں لگا دیے تھے۔ رنگ برنگ کے جال بچھا کر بیٹھی ہوئی یہ انویسٹمنٹ کمپنیاں ماہانہ پانچ پرسنٹ تک پرافٹ دے رہی تھیں یعنی ایک لاکھ ان کے پاس رکھواؤ اور ہر ماہ اس رقم پر پانچ ہزار پرافٹ حاصل کرتے رہو۔ لوگ تو یہی سوچ کر اس سنہرے جال میں پھنس رہے تھے کہ بیس مہینے میں ایک لاکھ روپے پرافٹ کما لیں گے اور ان کے ایک لاکھ بھی اپنی جگہ محفوظ رہیں گے۔ یہ ایک ہائی پرافٹ مارجن تھا جو دل میں گدگدی کو جگاتا تھا کہ جیب اور گھر میں جو بھی رکھا ہے وہ ان کمپنیوں میں انویسٹ کر ڈالو لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد ان سنہری کمپنیوں کی قلعی کھل گئی تھی اور لوگ سر پر بازو رکھ کر اور دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ دو چار ماہ تک باقاعدگی سے پرافٹ دینے کے بعد کمپنی اچانک غائب ہو جاتی تھی۔ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی انہی کالے ناگوں کا ڈسا ہوا تھا۔

یہاں پر میں بار بار ''پرافٹ'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ یہ لفظ میں نے ایجاد نہیں کیا بلکہ انویسٹمنٹ کمپنیوں نے معصوم اور سادہ لوح بہ الفاظ دیگر بے وقوف قسم کے لوگوں کو اپنے دام میں لانے کے لیے اس لفظ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا سرجن بھی کتے کا آپریشن کر کے اسے بکری نہیں بنا سکتا تو سچی بات یہ ہے کہ...... یہ ''پرافٹ'' درحقیقت ''سود'' تھا۔ انگلش الفاظ سے دھوکا کھانے والے تسلیم کریں یا نہ کریں، ان کی مرضی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا ایمان اس بات پر بہت پختہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود کا کاروبار کرنے والوں کی سختی سے مذمت کی ہے بلکہ خود کو ایسے لوگوں کا دشمن قرار دیا ہے۔ میں نے آج تک سود کے کاروبار میں ملوث کسی شخص کو خوش اور مطمئن نہیں دیکھا۔ جس کا دشمن خدا ہو وہ بھلا کیسے پنپ سکتا ہے۔

''ہونا کیا تھا جناب! ہم ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے۔'' وہ میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔''ایک روز صبح ہی صبح دو افراد ہمارے گھر پہنچے۔ میرے چھوٹے بھائی نے گیٹ کھولا تو سامنے دو اجنبی افراد کھڑے دیکھ کر وہ چونکا اور پوچھا۔

''آپ کون لوگ ہیں؟''

ان میں سے ایک پستہ قامت، بھاری بھرکم اور کرخت چہرے والا تھا۔ اس نے اپنے جثے کی مناسبت ہی سے کنگ سائز مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں۔ صورت سے وہ کوئی غنڈا اور بھڈے باز شخص دکھائی دیتا تھا جبکہ اس کا ساتھی دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ اس نے ہلکی ہلکی سی لکیر نما مونچھیں رکھی ہوئی تھیں تاہم اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھی جو تاثر جھلکتا تھا وہ کسی امن پسند اور شریف النفس انسان کا ہرگز نہیں تھا۔ میرے چھوٹے بھائی عابد باری کے مطابق وہ دونوں خطرناک موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔

''ہم اپنے بارے میں تو بعد میں بتائیں گے۔'' مونچھیل

اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا اور پوچھا۔ ''اس گھر میں کون رہتا ہے؟''

''ظاہر ہے، یہ گھر ہمارا ہے تو یہاں ہم ہی رہتے ہیں۔'' عابد باری نے جواب دیا۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''ہمیں اپنی گاڑی سے ملنا ہے۔'' دراز قامت شخص نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''گاڑی سے ملنا ہے۔'' عابد باری نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''ہم سفید رنگ کی سوئفٹ کی بات کر رہے ہیں۔'' پستہ قامت غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''ہماری گاڑی پچھلے دنوں چوری ہوگئی تھی۔''

''لیکن آپ کی چوری ہونے والی گاڑی سے ہمارا کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے بھائی۔'' دراز قامت شخص نے عابد باری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ گاڑی آپ کے پاس ہے۔''

''آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' میرے چھوٹے بھائی نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہم کیا آپ کو گاڑیاں چرانے والے لگتے ہیں......؟''

دراز قامت نے میرے بھائی کی بات سننے کے بعد ذومعنی انداز میں اپنے ہٹے کٹے ساتھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یار! اس نوجوان کا دماغ تو خاصا گرم ہے۔ لگتا ہے، گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا۔''

پستہ قامت گینڈے نے سمجھانے والے انداز میں عابد باری سے کہا۔ ''دماغ کی گرمی انسان کو ہمیشہ نقصان ہی پہنچاتی ہے اور تم تو اوپر سے زبان دراز بھی ہو......''

''تو......؟'' عابد باری کے غصے میں اضافہ ہوگیا۔

''تو یہ کہ تمہارا رویہ تمہیں کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا ہے۔'' پستہ قامت گٹھیل پھنکارا۔ ''ہم ایسے ہی منہ اٹھا کر تمہارے دروازے پر نہیں چلے آئے۔ ہمارے پاس پکی اطلاع ہے کہ جس گاڑی کی ہمیں تلاش ہے وہ اس وقت تمہارے گھر کے اندر کھڑی ہے...... کھڑی ہے یا نہیں؟''

''کھڑی ہے مگر...... وہ ہماری اپنی گاڑی ہے۔'' عابد باری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ہم نے اسے کہیں سے چرایا نہیں بلکہ رقم دے کر خریدا ہے۔''

گیٹ پر یہ بحث بحثی چل ہی رہی تھی کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اصل میں علی الصباح ان لوگوں نے جب ہمارے دروازے کی گھنٹی بجائی تھی تو اس کی آواز میں نے بھی سنی تھی۔'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے خالد باری نے اس قصے دلچسپ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ عابد دروازہ کھولنے گیا تھا چنانچہ جب پانچ منٹ تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو مجھے گہری تشویش نے گھیر لیا تھا اور میں یہ دیکھنے گیٹ پر چلا آیا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میری شکل بڑی حد تک اپنے بھائی عابد باری سے ملتی جلتی ہے۔ پستہ قامت نے بہ غور مجھے دیکھا اور بولا۔

''تم دونوں مجھے سگے بھائی لگتے ہو......!''

''لگتے ہو کا کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں باری باری ان دونوں غنڈا صورت اجنبی افراد کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہم حقیقت میں سگے بھائی ہیں مگر آپ کون ہو......؟''

''کیا زہرہ بیگم اسی گھر میں رہتی ہیں؟'' اس نے میرے سوال کو نظر انداز کرکے الٹا مجھ ہی سے پوچھ لیا۔

اس کے استفسار پر مجھے غصہ تو بہت آیا تاہم صورتِ حال کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں نے قدرے تحمل آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں، زہرہ بیگم ہماری والدہ کا نام ہے اور ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہتی ہیں مگر آپ کون لوگ ہو اور ہماری والدہ کے بارے میں یہ صبح صبح کس قسم کی پوچھ گچھ کرتے پھر رہے ہو؟''

ان دونوں میں سے کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عابد باری نے مختصر الفاظ میں مجھے سچویشن سے آگاہ کیا۔ اپنے بھائی کی بات سن کر تو میرا دماغ ہی الٹ گیا۔ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''آپ لوگوں کو کوئی شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی نے آپ کو ہماری گاڑی کے بارے میں غلط اطلاع دی ہے۔ اندر جو سفید سوزوکی سوئفٹ کھڑی ہے وہ ہماری ذاتی ملکیت ہے۔''

دراز قامت شخص نے اپنے ساتھی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار شہبازی! یہ بھائی تو کچھ زیادہ ہی سیانا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ لوگ شرافت سے نہیں مانیں گے۔''

''کاکا......!'' پستہ قامت نے سنگین مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر شرافت کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی تو خود ہی پچھتائیں گے۔ بہرحال، ایک اور کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں......''

مجھے ان دونوں غنڈا صورت افراد کی باہمی گفتگو سے کسی گہری سازش کی بو محسوس ہوئی تو میں نے درشت لہجے

میں کہا۔
''یہ تم لوگ کیا بکواس کررہے ہو......؟''
''ابھی تک تو ہم نے کوئی بکواس نہیں کی۔'' پستہ قامت شہبازی نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اور تمہارے لیے بہتر بھی یہی ہے کہ ہمیں کسی قسم کی بکواس پر مجبور نہ کرو......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی جیب میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ''ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجاتا ہے۔''
میں الجھن زدہ انداز میں اس کے ہاتھوں کی حرکت کو دیکھنے لگا اس نے مذکورہ کاغذ کو کھول کر میری جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''کیا اسی نمبر کی گاڑی تمہارے گھر کے اندر کھڑی ہے؟''
میں نے وہ نمبر دیکھا تو چونک اٹھا۔ کاغذ پر مارکر کی مدد سے جو نمبر لکھا گیا تھا۔ وہ ہماری سفید سوئفٹ کا نمبر تھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں، بالکل یہ اسی گاڑی کا نمبر ہے جو اندر کھڑی ہے مگر یہ ہماری گاڑی ہے۔''
''اگر یہ گاڑی تمہاری ہے تو پھر تمہارے پاس اس گاڑی کی ملکیت کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہوگا؟'' شہبازی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔
اس کی دیکھا دیکھی دراز قامت کاکا نے بھی پوچھ لیا۔
''مثلاً گاڑی کی رجسٹریشن وغیرہ کے کاغذات......؟''
جب سے میں گیٹ پر پہنچا تھا، عابد باری چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔ ان لوگوں کی ساری گفتگو مجھ ہی سے ہورہی تھی۔ ان کے استفسارات کے جواب میں، میں نے مستحکم انداز میں کہا۔
''ہاں، ہیں ہمارے پاس اس گاڑی کے مکمل کاغذات۔''
میرے جواب پر شہبازی اور کاکا نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کاکا نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو سارا جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ آپ وہ کاغذات لاکر ہمیں دکھادو۔ بات ادھر ہی ختم ہوجائے گی اور ہم چپ چاپ واپس چلے جائیں گے۔''
انسان اندر سے کسی بھی حوالے سے کمزور ہو تو یہ کمزوری اور ضعف اس کے چہرے سے بھی چغلی کھاتا ہے اور اس کے رویے سے بھی جھلکتا ہے اور اضطرار بن کر اس کے انداز سے بھی ٹپکتا ہے۔ ان لمحات میں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ظاہر ہے، سفید سوئفٹ کے حوالے سے ایسے کوئی ڈاکومینٹس ہمارے پاس موجود نہیں تھے جن کی مدد سے ہم اس پر حق ملکیت جتاسکیں۔ اس بے بسی نے میرے جواب میں برہمی بھردی اور میں نے کہا۔
''میں تمہیں اپنی گاڑی کے کاغذات کیوں دکھاؤں۔ تم لوگوں کا اس گاڑی سے کیا تعلق واسطہ؟''
''بہت گہرا تعلق اور واسطہ ہے۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ہم اس گاڑی کے مالک ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یہ گاڑی چوری ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کا سراغ لگاکر ہم تمہارے گھر تک پہنچے ہیں۔ ہماری گاڑی تمہارے گھر کے اندر کھڑی ہے۔ ہم تو اسے لے کر ہی جائیں گے۔''
''لیکن......'' میری الجھن جھنجلاہٹ میں بدل گئی۔ ''تم لوگوں کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ گاڑی تمہاری ہے؟''
''بہت ہی پکا اور دستاویزی ثبوت ہے۔'' کاکا عجیب سے لہجے میں بولا پھر اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شہبازی! یہ لوگ ثبوت دیکھے بغیر ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ ان دونوں بھائیوں کو سفید سوئفٹ کے ڈاکومینٹس دکھادو۔''
شہبازی نے کاکا کے اشارے پر اپنی جیب سے رجسٹریشن بک نکالتے ہوئے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نہیں دکھاتے تو چلو ہم دکھا دیتے ہیں۔'' پھر اس نے رجسٹریشن بک میری طرف بڑھاتے ہوئے اشارہ کیا۔ ''لو، اچھی طرح دیکھ کر اپنی تسلی کرلو۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے......''
میں نے کھول کر اچھی طرح رجسٹریشن بک کا معائنہ کیا۔ وہ انہی کی گاڑی کی رجسٹریشن بک تھی۔ انجن نمبر، چیسز نمبر وغیرہ سب درست۔ گاڑی کا نمبر بھی درست تھا۔ میں مخمصے میں پڑگیا۔ یہ بات بھی الجھادینے والی تھی۔ جو گاڑی ہم نے شاہین ٹریڈنگ کمپنی سے قسطوں پر خریدی تھی اس کی ملکیت کے کاغذات ان لوگوں کے پاس تھے۔
مجھے تذبذب کا شکار دیکھ کر کاکا نے کہا۔ ''کن سوچوں میں گم ہو بھائی۔ اگر اس رجسٹریشن بک سے تمہاری تسلی ہوگئی ہے تو وہ گاڑی ہمارے حوالے کردو جو اندر کھڑی ہے۔ بات خاموشی سے یہیں ختم ہوجائے گی۔ ورنہ ہم پولیس کو لے کر آئیں گے اور ہماری پولیس کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو......''
لمحاتی توقف کرکے اس نے بڑے مضحکہ خیز انداز میں آنکھ ماری پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''یہ گاڑی تو وہ ہمیں دلائیں گے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تم دونوں بھائیوں کو کارچوری کے الزام میں

گرفتار کر کے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ادھر سوالات میں وہ لوگ اور گاڑیوں کے جھوٹے کیس میں تمہاری ایسی خاطرداری کریں گے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور جب لات جوتا کھلانے کے بعد بھی پولیس مبینہ لاتعداد گاڑیاں تمہارے اندر سے برآمد نہیں کرا سکے گی تو یہی سمجھ لیا جائے گا کہ تم نے وہ تمام کی تمام گاڑیاں کسی دوسرے شہر اسمگل کر دی ہیں۔ اس طرح تم تھانے میں گزرنے والی ایک دو راتوں ہی میں ''کارچور'' سے ''اسمگلر'' کے رتبے پر فائز ہو جاؤ گے اور باقی کی زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزرے گی تم دونوں بھائیوں کی...... کیا سمجھے؟''

اس دبلے پتلے دراز قامت کاکا نے ہمارے مستقبل قریب اور مستقبل بعید کا جو رنگین اور سنگین نقشہ کھینچا تھا وہ بدن پر تھرتھری طاری کر دینے والا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں چکرا کر رہ گیا۔ پھر قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ان کاغذات کی تیاری میں کسی کلرک سے غلطی ہو گئی ہے......''

''کیسی غلطی؟'' شہبازی نے گھور کر مجھے دیکھا۔

''اس میں رجسٹریشن بک کے دیگر مندرجات تو درست ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر گاڑی کے نمبر کی جگہ ہماری گاڑی کا نمبر لکھ دیا گیا ہے اور یقیناً کسی کلرک ہی کی غلطی ہے۔''

''بھائی! بات صرف گاڑی کی نمبر پلیٹ تک محدود نہیں ہے۔'' شہبازی برہمی سے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ گاڑی کا انجن نمبر اور چیسز نمبر بھی وہی ہے جو اس بک میں درج ہے۔''

شہبازی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں بغور رجسٹریشن بک میں یہ چیزیں چیک کر چکا تھا اور سردست میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔ میں نے ایک اور زاویے سے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھیں بھائی صاحب! اندر جو سفید سوئفٹ کھڑی ہے وہ ہم نے ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے قسطوں پر خریدی تھی۔ پچھلے ماہ ہی اس کی ادائیگی مکمل ہوئی ہے۔ یہ گاڑی گزشتہ پانچ چھ ماہ سے ہمارے قبضے میں ہے۔''

''بھائی! اگر تم سچے ہو تو اس گاڑی کے کاغذات لا کر ہمیں دکھا دو۔'' کاکا نے بدتمیزی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر تم لوگوں نے رجسٹریشن بک حاصل کیے بغیر تو مکمل ادائیگی نہیں کی ہوگی۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب......'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ہم نے یہ سفید سوئفٹ ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے خریدی ہے۔ اس کمپنی کے مالک ہیں اشفاق بخاری۔ بخاری صاحب کی ایک انویسٹمنٹ کمپنی بھی ہے جس کا نام ''بخاری انویسٹرز'' ہے۔ ہم نے چھ ماہ پہلے گاڑی کا قبضہ تو حاصل کر لیا تھا اور یہ ہمارے استعمال میں آ گئی تھی لیکن اس کی رجسٹریشن بک تیار ہونے سے پہلے ہی ایک سنگین واقعہ پیش آ گیا تھا۔''

کاکا قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''کیسا واقعہ؟''

''کچھ لوگوں نے بخاری صاحب کو اغوا کر لیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بخاری صاحب کے ساتھ ہی دفتر کا سارا ریکارڈ بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہی کاغذات کے اندر ہماری گاڑی کی رجسٹریشن بک بھی تھی۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے پاس اس گاڑی کے کاغذات نہیں ہیں؟'' کاکا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اور ہمارے پاس ہیں۔'' شہبازی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''لہٰذا جس کے پاس گاڑی کی ملکیت کے کاغذات ہوں گے یہ گاڑی اسی کی ملکیت کہلائے گی۔ تم شرافت سے گاڑی ہمارے حوالے کر دو تو اچھا ہے ورنہ یہ کام ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں، اس بات کا اندازہ تو تم لوگوں کو ہمارے تیور دیکھ کر ہو ہی گیا ہوگا۔''

''دیکھیں، آپ لوگ جلدی نہ کریں۔'' میں نے بات بنانے کی غرض سے کہا۔ ''بخاری صاحب کو بدمعاشوں کی قید سے واپس آ جانے دیں۔ میں خود آپ لوگوں کو لے کر ان کے پاس جاؤں گا۔ وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ یہ گاڑی میں نے اس کی ٹریڈنگ کمپنی سے خریدی تھی، پھر آپ کی تسلی ہو جائے گی۔''

''تو آپ کا یہ خیال ہے کہ بخاری بدمعاشوں کی قید میں ہے؟'' کاکا مجھے تیز نظر سے گھورتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں۔ بالکل۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا۔ انہیں غنڈے اغوا کر کے لے گئے تھے۔''

کاکا نے معنی خیز انداز میں شہبازی سے کہا۔ ''یار شہبازی! یہ بندہ ہمیں ڈاکو اور بدمعاش کہہ رہا ہے۔''

''میں نے آپ لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔'' میں نے حیرت بھری نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو بخاری صاحب کو اغوا

کر کے لے گئے تھے۔''

''بخاری کو کسی نے اغوا نہیں کیا بھائی اور نہ ہی ہم غنڈے اور بدمعاش ہیں۔'' شہبازی غصیلے لہجے میں بولا۔ ''یہ حساب کتاب کا معاملہ ہے۔ دس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔''

''اس کا مطلب ہے تم ہی لوگوں نے اپنی رقم وصول کرنے کے لیے اشفاق بخاری کو اغوا کیا ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم خوامخواہ کی بحث میں پڑ کر معاملے کو الجھا رہے ہو۔'' شہبازی نے اپنے پہلو کو تھپتھپاتے ہوئے درشتی سے کہا۔ ''بخاری کو فی الحال جہنم میں ڈالو اور وہ گاڑی ہمارے حوالے کرو جو اندر کھڑی ہے۔''

شہبازی نے اپنے جس پہلو کو دانستہ تھپتھپایا تھا وہاں مجھے ایک واضح ابھار نظر آیا۔ ایسا ہی ایک ابھار کاکے کے پہلو میں بھی تھا جس کا مطلب تھا، ان کے لباس کے نیچے آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ شہبازی کا پہلو کو تھپتھپانا ایک طرح کی خطرناک دھمکی تھی۔ اگر ہم نے ان کے مطالبے پر من وعن عمل نہ کیا تو وہ کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں۔

دونوں کی باہمی گفتگو سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اشفاق بخاری کو اغوا کرنے میں انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ شہبازی نے دس لاکھ کی بھاری رقم کا بھی ذکر کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں نے ''بخاری انویسٹرز'' میں دس لاکھ روپے لگا رکھے ہوں گے۔ بخاری کے ڈوبتے ہوئے کاروبار کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی رقم پوری کرنے کے لیے وہ اغوا والی ہنگامی کارروائی کی تھی۔ بخاری صاحب کے اغوا کے ساتھ ہی وہ تمام دفتری ریکارڈ بھی اٹھا لے گئے تھے جن میں قسطوں پر فروخت کی جانے والی گاڑیوں کے کاغذات بھی تھے۔ علاوہ ازیں اغوا کاروں نے آفس میں موجود کیش پر بھی ہاتھ صاف کر دیا تھا۔

حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے ان کے ساتھ الجھنا مناسب نہ سمجھا اور مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھائی صاحب! بخاری صاحب کے ساتھ جو بھی ہوا مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے آپ میری بات کا یقین کر لیں، ہم نے اس گاڑی کی پوری قیمت ادا کی ہے لہٰذا یہ ہماری ملکیت ہے۔''

''یہ بات تم پہلے بھی دو تین مرتبہ دہرا چکے ہو۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''اگر تم لوگوں نے گاڑی کی پوری قیمت ادا کر دی ہے تو اس ادائیگی کا کوئی ثبوت بھی تو ہونا چاہیے نا تمہارے پاس.....''

جب ہمارے درمیان گیٹ پر کھڑے یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں، اندر سے امی کی آواز آئی۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کو پکارا تھا۔

''عابد! باہر کون آیا ہوا ہے اور...... خالد کہاں چلا گیا..... تم لوگ باہر کیا کر رہے ہو......؟''

''امی! ایک منٹ...... میں آرہا ہوں۔'' عابد باری نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''تم ادھر ہی ٹھہرو۔'' میں نے عابد سے کہا۔ ''میں امی سے بات کر کے آتا ہوں۔''

میرے اس دلچسپ کلائنٹ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس گھر میں وہ دونوں بھائی اور ان کی والدہ زہرہ بیگم رہتی تھیں۔ ان کے باپ مظفر باری کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ مظفر باری کے انتقال کے بعد گھر کا نظم ونسق زہرہ بیگم ہی چلا رہی تھیں۔ مذکورہ سوزوکی سوفٹ بھی زہرہ بیگم کے نام پر ہی خریدی گئی تھی اور پچاسی ہزار روپے بھی امی کے نام پر ''بخاری انویسٹرز'' میں لگائے گئے تھے۔

خالد باری مجھے مزید تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اندر جا کر امی کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ یہ سب سنتے ہی پریشان ہو گئیں۔ امی کی طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں سانس کا بہت پرانا مرض ہے۔ ابو کے انتقال کے بعد تو اس مرض میں اور بھی شدت آ گئی ہے۔ اب امی زیادہ تر گھر ہی میں رہتی ہیں اور......''

''آپ کی امی نے اس ساری صورتِ حال پر کیا کہا؟'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے سوال کر دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے خالد باری کو ذرا بھی ڈھیل دے دی تو وہ اپنی والدہ کی بیماری کی تفصیل میں گم ہو جائے گا اور اصل معاملہ جوں کا توں رکھا رہ جائے گا۔

''امی پریشان تو ہو گئی تھیں مگر انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی۔'' خالد باری نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''انہوں نے مجھ سے پوچھا۔''

''وہ رجسٹریشن بک کہاں ہے جس کی بنا پر یہ لوگ گاڑی کی ملکیت کا دعویٰ کر رہے ہیں؟''

''جی وہ بک تو اسی بندے کے پاس ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تم نے اس رجسٹریشن بک کو دیکھا ہے؟'' امی نے سوال کیا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''بک میں ہماری گاڑی ہی کا نمبر درج ہے؟'' امی

نے پوچھا۔

''جی امی۔'' میں نے کہا۔'' بک کے اندر انجن نمبر اور چیسز نمبر بھی درج ہے۔''

''اور تمہیں یقین ہے کہ وہ نمبرز بھی اسی گاڑی کے ہیں جو ہمارے گھر میں کھڑی ہے؟''

''اس بندے کا تو یہی دعویٰ ہے امی......!''

''کل کو کوئی ہمارے دروازے پر آکر دعویٰ کرے گا کہ یہ گھر اس کی ملکیت ہے تو تم آنکھیں بند کر کے اس کی بات پر یقین کر لو گے۔'' امی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ ''اور یہ گھر، اپنے مرحوم باپ کی آخری نشانی اس کے حوالے کر دو گے؟''

''بات آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کی نہیں امی۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔'' میں نے گاڑی کا انجن اور چیسز نمبر کوئی زبانی یاد نہیں کر رکھا جو رجسٹریشن بک دیکھتے ہی تصدیق کر دیتا۔''

''تو تم نے محض گاڑی کی نمبر پلیٹ والا نمبر دیکھ کر ان کی بات مان لی کہ......''

''امی! آپ بھی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔'' میری جھنجلاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔'' میں اس کی بات کیسے مان سکتا ہوں۔ یہ گاڑی ہماری ہے۔ ہم نے ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے قسطوں پر خریدی ہے۔ اس شخص نے تو مجھے پیشکش بھی کی تھی کہ میں اندر جا کر گاڑی کا انجن اور چیسز نمبر چیک کر کے اپنی تسلی کر لوں لیکن جب میں نے اس کام کے لیے اس سے رجسٹریشن بک مانگی تو اس نے ایک عجیب و غریب مطالبہ کر دیا۔''

''کیسا مطالبہ؟'' امی نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''وہ بولا...... میں کوئی الو کا پٹھا نہیں ہوں جو اپنی گاڑی کی رجسٹریشن بک تمہارے حوالے کر دوں۔'' میں نے امی کو بتایا۔'' اس بندے نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ...... میں بھی تمہارے ساتھ اندر چلوں گا۔ جب اس نے گھر کے اندر داخل ہونے کی بات کی تو مجھے شک ہوا کہ وہ کسی بہانے گھر کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں چونکہ اسے ایسی اجازت نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔'' امی نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔

''امی! وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ان کے لباسوں کے نیچے اسلحے کی جھلک دیکھ لی ہے۔ اس لیے انہیں بلانے کی غلطی میں کسی بھی قیمت پر نہیں کر سکتا تھا۔''

''کیا تمہیں یاد ہے کہ اس رجسٹریشن بک کے اندر گاڑی کے مالک کا کیا نام لکھا ہوا ہے؟'' امی نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''مرزا یاسر بیگ!'' میں نے جواب دیا۔

''اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ گاڑی میرے نام پر خریدی گئی تھی۔'' امی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی بالکل، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔'' اگرچہ اشفاق بخاری صاحب نے ہمیں گاڑی کے کاغذات نہیں دیے تھے اور گاڑی کی رجسٹریشن بک بھی انہی کے پاس تھی مگر یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ گاڑی آپ ہی کے نام پر خریدی گئی تھی اور گاڑی کی قسطیں بھی ہم آپ ہی کے نام سے ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کو ادا کرتے رہے ہیں۔''

''بس، تو پھر سمجھ لو کہ یہ لوگ فراڈ ہیں۔'' امی نے حتمی لہجے میں کہا۔'' اگر ان کے پاس گاڑی کے اصلی کاغذ ہوتے تو وہاں میرا نام درج ہونا چاہیے تھا۔''

''آپ کی امی شاید ایک بات کو نظر انداز کر رہی تھیں۔'' میں نے خالد باری کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''گاڑی کی رجسٹریشن بک میں اگر کسی مرزا یاسر بیگ کا نام درج ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے گاڑی اپنے نام ٹرانسفر کرائی ہوگی۔ ہائر پرچیز کے اصول کے مطابق جب تک گاڑی کی تمام قسطیں ادا نہ ہو جائیں وہ خریدار کے نام نہیں ہو سکتی۔''

''آپ ہی ٹھیک کہہ رہے ہوں گے وکیل صاحب!'' وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔'' مجھے تو ان قانونی معاملات کا نہ تو زیادہ علم ہے اور نہ ہی تجربہ......!''

''پھر اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے بیان کے اس سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''امی نے مجھ سے پوچھا کہ اب تم کیا کرو گے؟'' وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔'' میں نے کہا کہ میں انہیں ان رسیدوں کی فائل لے جا کر دکھاتا ہوں جن کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ گاڑی ہم نے شاہین ٹریڈنگ کمپنی سے قسطوں پر خریدی تھی۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' امی نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔'' اور وہ پوائنٹ بھی اٹھانا میرے نام والا......''

''جی امی!'' میں یہ کہہ کر ان کے پاس سے اٹھ آیا۔

جب میں مذکورہ فائل لے کر باہر آیا اور ان لوگوں سے قسطوں کی رسیدوں اور گاڑی کی ایڈوانس پیمنٹ کی رسید کا ذکر کیا تو شہبازی بھتے سے اکھڑ گیا۔

''یہ کیا مذاق ہے......'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔''ہم نے ان رسیدوں کا اچار نہیں ڈالنا۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم گاڑی لے کر ہی باہر نکلو گے اور تم...... یہ ردی کاغذ اٹھا لائے؟''

شہبازی کی اس برہمی پر کا کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں ''ہی ہی'' کر کے ہنسنے لگا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔''ذرا وہ رجسٹریشن بک مجھے دوبارہ دکھانا۔''

شہبازی نے ایک بار پھر مذکورہ بک میری جانب بڑھا دی۔

میں نے وہ صفحہ نکال لیا جہاں پر گاڑی کے مالک کا نام درج تھا پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔''تم دونوں کے اصلی نام کیا ہیں؟''

ابھی تک وہ ایک دوسرے کو''شہبازی'' اور''کا کا'' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور یقیناً یہ ان کے اصلی نام نہیں ہو سکتے تھے۔ ان لمحات میں ایک نکتہ اچانک ہی میرے ذہن میں ابھر کر روشن ہو گیا تھا۔

''میرا نام شاہ نواز شہبازی ہے۔'' شہبازی اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بڑے فخر سے بولا پھر کا کا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید بتایا۔''اور یہ میرا ساتھی شہزاد عرف کا کا ہے۔''

''شاہ نواز اور شہزاد......'' میں نے زیرلب دہرایا پھر باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔''گاڑی کی رجسٹریشن بک میں مالک کا نام مرزا یاسر بیگ لکھا ہوا ہے۔ یہ گاڑی آپ دونوں میں سے کسی کی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''بیگ صاحب ہمارے سیٹھ صاحب ہیں۔'' شہبازی نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔''ہم دونوں انہی کے لیے کام کرتے ہیں اور انہی کے بھیجنے پر یہاں آئے ہیں۔ تم شرافت سے سیٹھ کی گاڑی ہمارے حوالے کرتے ہو یا......!''

شہبازی نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں ایک ٹھوس پوائنٹ پر کھیلتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھائی! ہمارے گھر کے اندر جو گاڑی کھڑی ہے وہ سو فیصد ہماری ملکیت ہے اور تم لوگ جس رجسٹریشن بک کی بنا پر اس گاڑی کا مالک ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو تو اس کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں تو اس موضوع پر تم لوگوں سے بات بھی کرنے کو تیار نہیں۔ ہاں البتہ......''

میں سانس لینے کے لیے رکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''میں اس شخص سے بات کر سکتا ہوں جس کا نام اس رجسٹریشن بک میں درج ہے یعنی تم لوگوں کا سیٹھ مرزا یاسر بیگ!''

''ہمیں سیٹھ ہی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔'' شہبازی نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سوری!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔''ہم اس گاڑی کے سلسلے میں صرف مرزا یاسر بیگ ہی سے بات کر سکتے ہیں اور کسی ایرے غیرے یا نتھو خیرے سے نہیں۔''

جب انہوں نے میرا اٹل انداز دیکھا تو پہلے تو انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو خفیہ اشارے کیے پھر شہبازی نے مجھ سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ اب ہم سیٹھ صاحب کو ساتھ ہی لے کر آئیں گے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ گاڑی آپ لوگوں کے پاس سیٹھ صاحب کی امانت ہے۔'' وہ تنبیہی انداز میں میری جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''اس میں کوئی گڑبڑ یا خرابی نہیں پیدا کر دینا۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''وہ دھمکی آمیز انداز میں ہمیں گھورتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے تو میں نے سکھ کی سانس لی اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ یہ ہے اب تک کی داستان۔ اس سے آگے کیا ہو گا، میں کچھ نہیں جانتا وکیل صاحب۔''

خالد باری اپنی بپتا سنانے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔''یہ کتنا عرصہ پہلے کا واقعہ ہے؟''

''جی کون سا واقعہ......؟'' وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر بولا۔

''شہبازی اور کا کا کی تمہاری گھر آمد والا واقعہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''جب وہ تمہاری گاڑی پر کسی مرزا یاسر بیگ کا حقِ ملکیت جتانے آئے تھے؟''

''یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا ان دو دنوں میں شہبازی اور کا کا نے دوبارہ بھی کوئی چکر لگایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔''اکیلے یا اپنے سیٹھ کے ساتھ؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ''اس دن کے بعد وہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔''

بات ختم کرتے ہی خالد باری نے اپنے بیگ میں سے وہ تمام کاغذات نکال کر میرے حوالے کر دیے جو کسی نہ کسی حوالے سے اس سفید سوئفٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے مذکورہ کاغذات کا جائزہ لیا۔

ان میں ایک رسید تو وہ تھی جو گاڑی کے ایڈوانس کی رقم یعنی بیس ہزار روپے کی تھی۔ اس کے بعد وہ چھ رسیدیں بھی موجود تھیں جو ماہانہ قسط کے ذیل میں تھیں یعنی تین، تین ہزار روپے ادا... کی چھ رسیدیں۔ ان کے علاوہ ایک کچی رسید باسٹھ ہزار روپے والی تھی۔ کچی اور پکی رسید میں آپ یہ فرق سمجھیں کہ پکی رسیدیں وہ تھیں جو ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کی باقاعدہ پرنٹڈ رسید بک سے جاری کی گئی تھیں اور ان پر نام، تاریخ کے علاوہ کمپنی کی مہر بھی ثبت تھی البتہ میں نے جس کچی رسید کا ذکر کیا ہے وہ سادہ کاغذ پر باسٹھ ہزار روپے وصولی کی رسید تھی۔ یہ رسید بخاری کی طرف سے باسٹھ ہزار روپے وصول کرنے کے ضمن میں دی گئی تھی جس پر اشفاق بخاری نے اپنے دستخط بھی کیے تھے تاہم اس رسید سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ رقم اشفاق کو کس مد میں دی گئی تھی۔ دراصل خالد باری اینڈ کمپنی نے وہ گاڑی کل قیمت ایک لاکھ روپے میں ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' سے خریدی تھی۔ بیس ہزار ایڈوانس اور باقی رقم تین ہزار روپے ماہانہ قسط کی صورت میں ادا کرنا تھے جو کہ صرف چھ ماہ تک اٹھارہ ہزار ہی ادا کیے گئے تھے۔ اس طرح افراتفری سے پہلے ان لوگوں نے شاہین ٹریڈنگ کمپنی کو بیس جمع اٹھارہ یعنی اڑتیس ہزار ادا کیے تھے۔ باقی کے باسٹھ ہزار بخاری نے انویسٹمنٹ والے پچاسی ہزار میں سے کاٹ لیے تھے اور تئیس ہزار انہیں واپس کر دیے تھے۔ عام اور سادہ حساب کے مطابق ان لوگوں نے پورے ایک لاکھ ادا کر کے وہ گاڑی خریدی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ نہ تو ان کے پاس گاڑی کے کاغذات تھے اور نہ ہی رجسٹریشن بک۔ یہ تمام چیزیں ڈاکو اشفاق بخاری کے ساتھ ہی لے گئے تھے البتہ وہ فتنہ پرور وہائٹ سوئفٹ خالد باری کے گھر میں کھڑی تھی جسے بقول اس کے بہت کم روڈ پر نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے تھے وہ آپ خالد باری کی زبانی بڑی تفصیل سے سن چکے ہیں۔

میں نے ان کاغذات کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد خالد باری سے پوچھا۔ ''اب بتائیں، کیا کرنا ہے؟''

''کرنا تو آپ کو ہے وکیل صاحب۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''میں نے تو سارے حالات آپ کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔''

''اشفاق بخاری کی کوئی خیر خبر ہے......؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''جب سے اسے ڈاکوؤں نے اغوا کیا ہے، میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں اس کی تلاش میں اس کے گھر بھی گیا تھا لیکن وہ لوگ بھی بخاری صاحب کی وجہ سے پریشان ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ بخاری صاحب کے منیجر ارشد ملک نے نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف اغوا کی رپورٹ بھی درج کرا رکھی ہے۔''

''نامعلوم ڈاکو......'' میں نے الجھن زدہ انداز میں خالد باری کی طرف دیکھا۔ ''منیجر تو بخاری کے ایک ایک کلائنٹ کو جانتا ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ جن لوگوں نے بخاری کو دفتری ریکارڈ کے ساتھ اغوا کیا تھا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ''بخاری ٹریڈرز'' میں بڑی بڑی رقمیں لگا رکھی تھیں پھر منیجر کی نظر میں وہ نامعلوم کیسے ہو گئے؟''

''بخاری انویسٹرز جناب۔'' وہ میری تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ بخاری کے انویسٹرز ہی میں سے کسی نے وہ ہنگامی کارروائی کی تھی اور اس وقت میں بھی موقع پر موجود تھا لیکن اتفاق یہ ہے کہ اس دن منیجر صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی اور وہ آفس نہیں آئے تھے۔''

''اس سارے معاملے میں اتفاقات بہت سے نظر آتے ہیں۔'' میں نے خالد باری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اس بات میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی کہ بخاری کا اغوا انویسٹرز ہی میں سے کسی نے کیا ہے اور اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ وہ شخص بھی مرزا یاسر بیگ ہی ہوگا۔ اس کی طرف دو بڑے ہی واضح اشارے جاتے ہیں۔''

''کون سے دو اشارے جناب؟'' اس نے پوچھا۔

خالد باری کا یہ سوال میری نظر میں انتہائی احمقانہ تھا کیونکہ میں نے جن دو واضح اشاروں کا ذکر کیا تھا وہ اسی کی زبانی مجھ تک پہنچے تھے۔ بہرحال، میں چونکہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا... ''احمق کہیں کا!'' اس لیے گہری سنجیدگی سے کہا۔

نمبر ایک...... آپ نے بتایا ہے کہ جب آپ نے شہبازی اور اس کے ساتھی کاکا کے سامنے بخاری کے اغوا کا ذکر کیا اور اغوا کاروں کو ڈاکوؤں سے تعبیر کیا تو یہ سن کر انہیں غصہ آ گیا تھا اور انہوں نے آپ پر واضح کرنے کی کوشش کی تھی، یہ اغوا کا نہیں بلکہ حساب کتاب کا معاملہ ہے۔ یہ بھی

باور کرایا تھا کہ دس لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی، یہ
بات ظاہر کرتی ہے کہ مرزا یاسر بیگ ہی نے اپنے دس لاکھ
وصول کرنے کے لیے بخاری کو کمپنی کے ریکارڈ سمیت اٹھالیا
تھا۔'' میں نے کہا۔ ''نمبر دو... آپ کی گاڑی کی رجسٹریشن
بک ان لوگوں کے پاس ہے بلکہ آپ کی گاڑی مرزا یاسر
بیگ کے نام ٹرانسفر بھی ہو چکی ہے۔ اغواکار جب بخاری کو
ریکارڈ سمیت اٹھا کر لے گئے تھے تو آپ کی گاڑی کے
کاغذات بھی اسی ریکارڈ کے ساتھ اغواکاروں کی تحویل میں
چلے گئے تھے اور اب...'' میں نے لمحاتی توقف کر کے
ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''جب آپ کی گاڑی کے کاغذات ان لوگوں کے
ہاتھوں میں نظر آرہے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ
بخاری کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں مرزا یاسر بیگ
ہی کا ہاتھ ہے بلکہ......''
''کیا بلکہ؟'' میں بولتے بولتے رکا تو خالد باری نے
سوال کر دیا۔
''میں تو ایک اور امکان پر بھی غور کر رہا ہوں۔'' میں
نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ''کون سا امکان وکیل صاحب؟''
''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ سب بخاری اور بیگ
صاحب کی ملی بھگت کا نتیجہ ہو۔'' میں نے ڈرامائی انداز
اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کل جس انداز میں لوگ
اندھا دھند انویسٹمنٹ کمپنیوں میں رقم لگا رہے ہیں اس کے
مطابق تو بخاری صاحب نے لوگوں کے کروڑوں سمیٹ
رکھے ہوں گے پھر ان کی گاڑیوں کی ایجنسی الگ تھی۔ عین
ممکن ہے، اس دن آپ نے بخاری صاحب کے آفس میں
ان کے اغوا اور توڑ پھوڑ کی جو واردات ہوتے دیکھی تھی وہ
ایک سوچا سمجھا ڈراما ہو۔ اسی لیے دفتر کا بیشتر ریکارڈ بھی
غائب کر دیا گیا تاکہ بعد میں ان دستاویزات کی مدد سے
کوئی نیا گل کھلایا جاسکے، جیسا کہ آپ والا واقعہ بھی اسی سلسلے
کی ایک کڑی ہوسکتا ہے۔''
وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری بات سنتا رہا اور میرے
خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر اشفاق
بخاری اس وقت کسی ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیٹھا یا لیٹا
آرام کر رہا ہوگا۔''
''بالکل، یہ عین ممکن ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں
گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔''
''مثلاً...... برعکس کیا ہوسکتا ہے؟'' خالد باری سوالیہ
نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''مثلاً برعکس یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے
ہوئے کہا۔ ''یہ کام بخاری اور بیگ کے باہمی اشتراک سے
نہ ہوا ہو بلکہ بیگ نے اپنی رقم نکلوانے کے لیے بخاری کو اس
کے دفتری ریکارڈ سمیت کرائے کے غنڈوں سے اٹھوالیا
ہو۔ اسی اثنا میں کچھ گاڑیوں کے ڈاکیومینٹس اس کے ہاتھ
لگ گئے ہوں اور اس نے وہ گاڑیاں اپنے نام ٹرانسفر
کرانے کے بعد ایک نیا کھیل شروع کر دیا ہو۔ میں اس کھیل
کی بات کر رہا ہوں جو دو تین دن پہلے تجربہ آپ کے ساتھ
ہوا ہے۔ ایسے ہی ناخوشگوار تجربات بیگ کے بندے
دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی کر رہے ہوں......''
''یہ صورتِ حال تو خاصی گمبھیر ہے۔'' وہ پریشانی
سے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، ہمارا واسطہ خطرناک قسم کے
لوگوں سے پڑا ہے۔''
''جو لوگ دھوکا دہی اور فراڈ کی دکانیں سجا کر بیٹھے
ہیں وہ یقیناً خطرناک ہی کہلائیں گے۔'' میں نے تائیدی
انداز میں کہا۔ ''اسی لیے ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے لوگوں
کو پولیس یا پھر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے لیکن اس
سلسلے میں ان سے ایک ایسی سنگین بھول ہوجاتی ہے کہ کیس
بگڑ کر رہ جاتا ہے۔''
''آپ کس بھول کا ذکر کر رہے ہیں وکیل صاحب؟''
اس کے کان کھڑے ہوگئے۔
میں نے کہا۔ ''پہلے لوگ شوق شوق سے مگرمچھ کے
منہ میں بازو ڈال دیتے ہیں تاکہ اس کے معدے میں سے
سونے کے انڈے نکال کر اپنی زندگی کو بھی سنہری بنا سکیں
لیکن جب وہ انڈے سمیٹ کر ہاتھ باہر نکالنے کا ارادہ
کرتے ہیں تو مگرمچھ جبڑے کس دیتا ہے، جب تک شکنجے
میں پھنسے ہوئے شخص کی فریاد کسی کے کانوں تک پہنچتی،
مگرمچھ کے خون آشام دانت اس کے بازو کا ستیاناس مار
چکے ہوتے ہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی
آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔ ''باری صاحب! آپ میری
بات تو سمجھ گئے ہیں نا؟''
''جی ہاں، بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا ہوں۔''
وہ منتشر لہجے میں بولا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''ہماری پوزیشن کیسی
ہے اس کیس میں؟''
''بہت کمزور۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب ہے، ہم ان بدمعاشوں کے سامنے

ہار جائیں گے؟'' وہ شکستہ دل کے ساتھ بولا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

''جی..... کیا مطلب؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''باری صاحب! اگر کوئی انسان کسی بھی وجہ سے کمزور ہوجاتا ہے تو وہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے، ڈاکٹری معائنے کے بعد اس کی کمزوری کی وجوہات کو تلاش کرلیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر اس شخص کے لیے کمزوری دور کرنے والا کوئی مجرب نسخہ لکھ کر خصوصی ہدایات کے بعد اسے اپنے کلینک سے رخصت کردیتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟''

''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''مگر آپ کی اس مثال کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت ہی گہرا اور اٹوٹ تعلق ہے باری صاحب۔''

میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس میں آپ کی پوزیشن خاصی کمزور ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے آپ عدالتوں کے ڈاکٹر یعنی میرے پاس آئے ہیں۔ میں نے آپ کے کیس کا طبی معائنہ کرلیا ہے۔ اب اگر میری ہدایات کے مطابق آپ میرا تجویز کیا ہوا نسخہ استعمال کریں گے تو آپ کے کیس کی ساری کمزوری جاتی رہے گی اور یہ کیس آپ جیت جائیں گے۔''

''کیا واقعی!'' وہ حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا۔

''صد فیصد!'' میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''مگر شرط وہی ہے کہ آپ میری ہدایات کے مطابق چلیں گے۔''

''منظور ہے.....'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر کسی شخص کا کیس بہت مضبوط ہو تو اسے لڑنے کے لیے کسی وکیل کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے۔ مدعی خود بھی کھڑا ہوکر عدالت میں حقیقت حال بیان کرنا شروع کردے تو عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ وکیل کی ضرورت عموماً کمزور اور الجھے ہوئے کیس میں پیش آتی ہے۔ میری ایک اور بات ذہن میں رکھ لیں خالد باری صاحب!

میں نے دانستہ توقف کرکے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ جلدی سے بولا۔

''کون سی بات وکیل صاحب؟''

''انسان اگر سچائی پر قائم ہو اور اپنی کھوپڑی میں اوسط درجے کی عقل رکھتا ہو تو اس کے ہر عمل کے ساتھ قدرت کا تعاون بھی شامل ہوتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگرچہ آپ لوگ ایک لالچ میں آکر اشفاق بخاری کے چنگل میں پھنس گئے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا اور یہ کہ آپ حق پر ہیں لہٰذا میرے پیشہ ورانہ تعاون کے ساتھ ساتھ قدرت کی تائید اور مدد بھی آپ کو حاصل ہوگی چنانچہ اس کیس کا فیصلہ بھی آپ ہی کے حق میں ہوگا انشاءاللہ!''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔''

وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''تو پھر بسم اللہ کریں اور حکم کریں، مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟''

کچھ دیر پہلے میں نے ''بسم اللہ'' کریں والا محاورہ بولا تھا تو یہ اس کے سر سے گزر گیا تھا۔ اب وہ خود یہی محاورہ استعمال کررہا تھا۔ سو، میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میری بات توجہ سے سنیں باری صاحب! آپ کو چند ضروری کام کرنا ہیں تاکہ میں آپ کے کیس کو مضبوط سے مضبوط بنا سکوں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ''جی بتائیں.....!''

''نمبر ایک..... آپ کسی طرح کوشش کرکے اشفاق بخاری کو تلاش کرنے کی کوشش کریں اور اگر آپ کو اس تلاش میں کامیابی حاصل ہوجائے تو اس بندے کو ساری صورتِ حال بتا کر کار کی فل پے منٹ کی پکی رسید بنوالیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نمبر دو..... آپ رجسٹریشن آفس جاکر متعلقہ لوگوں کو بتائیں کہ آپ کی سوزوکی سوئفٹ ایک غلط آدمی کے نام ٹرانسفر کردی گئی ہے۔ انہیں گاڑی کی ایڈوانس پیمنٹ اور ماہانہ قسطوں کی ادائیگی والی رسیدیں بھی دکھائیں۔ عین ممکن ہے، وہ ان شواہد کی روشنی میں مرزا یاسر بیگ کے نام ٹرانسفر کو فوراً منسوخ کردیں۔ نمبر تین..... گاڑی کی جگہ تبدیل کردیں۔ مطلب یہ کہ اسے اپنے گھر سے نکال کر کسی اور کے گھر میں کھڑا کردیں۔ چند دن کے لیے..... نمبر چار آپ ان دو بندوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں جو آپ کے گھر گاڑی لینے آئے تھے اور خود کو مرزا یاسر بیگ کا ملازم بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ بیگ کس قماش کا بندہ ہے اور اس کا ذریعۂ آمدنی کیا ہے.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ آپ جب میری مطلوبہ معلومات جمع کرکے لے آئیں گے تو میں ان کی بنا پر مرزا

یاسر بیگ اور اشفاق بخاری کے نام لیگل نوٹس بھجوادوں گا۔ پھر وہ لوگ اس نوٹس کا جو بھی جواب دیں گے اس کے مطابق عدالتی کارروائی کی جائے گی۔''

''آپ نے اگرچہ خاصے مشکل کام بتائے ہیں لیکن میں انہیں کرنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بڑے عزم کے ساتھ بولا۔ ''اگر اس دوران میں شہبازی اور کاکا وغیرہ ہمیں ڈرانے دھمکانے دوبارہ گھر پر آئیں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

اس نے ایک اہم سوال کیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ پہلی فرصت میں تو گاڑی کو کہیں اور شفٹ کردیں تاکہ وہ انہیں آپ کے گھر میں کھڑی نظر نہ آئے۔ اس کے بعد اگر ان دونوں میں سے کوئی آپ کے گھر کا رخ کرے تو آپ ان سے یہی کہیں کہ آپ نے ان کے خلاف علاقے کے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہے۔ گاڑی بھی تھانے والے لے گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ شہبازی، کاکا اور مرزا یاسر بیگ کو تھانے بلا کر اس معاملے کی تفتیش کریں گے لہٰذا ان کو اگر گاڑی چاہیے یا وہ لوگ کچھ کہنا چاہیں تو تھانے چلے جائیں۔''

''یہ تو آپ نے بہت اچھی ترکیب بتائی ہے وکیل صاحب۔'' وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد وہ یقیناً ہمیں تنگ نہیں کریں گے۔''

''وکیل کا کام مفید اور کارآمد ترکیبیں بتانا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لیں۔ اس کارڈ پر میرے آفس اور گھر کا نمبر درج ہے۔ اگر وہ غنڈا صفت عناصر پولیس کے نام پر بھی شرپسندی سے باز نہ آئیں تو آپ کسی طرح ان کی مجھ سے بات کرا دیجیے گا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور فیس کی بابت پوچھا۔

میں نے اس سلسلے میں کبھی تردد یا تکلف سے کام نہیں لیا لہٰذا خالد باری کو اپنی فیس کے بارے میں بتا دیا۔

وہ فیس ادا کر کے میرے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دوسرے کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ اگرچہ خالد باری نے میرا اچھا خاصا وقت لے لیا تھا لیکن میں اس ملاقات کو وقت کا زیاں ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں کیس کی ایک مخصوص اور واضح شکل نکل کر سامنے آگئی تھی۔

☆☆☆

تین روز کے بعد خالد باری ایک بار پھر آفس میں میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آج وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ پہلے دن سے کہیں زیادہ اور آج وہ دن ہی میں میرے پاس آگیا تھا۔ میں ابھی آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ وہ آن ٹپکا تھا۔ اس وقت میری سیکریٹری اور آفس بوائے کے سوا اور کوئی بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ خالد باری آج کا پہلا کلائنٹ تھا۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

''کیا بات ہے باری صاحب! آپ خاصے الجھے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت کہاں ہے وکیل صاحب۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''کل خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''کل رات شہبازی اور کاکا دوبارہ ہمارے گھر آئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت ہی خطرناک قسم کی دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔''

''مثلاً......؟'' میں نے مختصراً پوچھا۔

''انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم انہیں ہلکا نہ لیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''وہ کوئی سیدھے سادے شریف لوگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق مجرموں کے ایک خطرناک گروہ سے ہے۔ شہر میں قتل، اغوا اور ڈکیتی کی جتنی وارداتیں ہو رہی ہیں وہ انہی کے گروہ کے کارنامے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کی بات مان لیں تو اچھا ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ان کا مطالبہ ہے کہ یا تو ہم گاڑی ان کے حوالے کردیں یا پھر ایک لاکھ روپے انہیں دیں۔''

''یہ کیسا عجیب وغریب مطالبہ ہے۔'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''میں نے آپ کو جو ترکیب سجھائی تھی، آپ نے اس پر عمل نہیں کیا؟''

''جی کیا......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''پھر؟'' میں نے سوالیہ انداز میں خالد باری کی طرف دیکھا۔ ''انہوں نے کیا ردعمل ظاہر کیا؟''

''بالکل الٹا جناب......'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے تعجب خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''میری باتیں سن کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے تھے۔'' خالد باری نے بتایا۔ ''انہوں نے تحقیر بھرے انداز میں کہا کہ وہ پولیس وغیرہ سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہم انہیں

بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کریں۔''

''وہ لوگ آپ کی سادگی اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اول تو جو لوگ چور، ڈکیت اور دیگر سنگین نوعیت کے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں وہ یوں علی الاعلان اپنی بدمعاشی اور غنڈا گردی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے پھرتے اور...... وہ ہر حال میں پولیس سے ڈرتے ضرور ہیں۔''

''پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا کہ کل وہ تھانے سے پولیس لے کر آئیں گے۔'' خالد باری نے کہا۔ ''پھر ہمیں ان کی بات ماننا ہی پڑے گی یا تو ہم گاڑی ان کے حوالے کریں گے اور یا پھر اس گاڑی کی قیمت یعنی پورے ایک لاکھ روپے انہیں دینا پڑیں گے۔''

''یہ سب انہوں نے آپ کو خوفزدہ کرنے کے لیے کہا ہے اور آپ واقعی خوف زدہ ہوگئے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''ایسے لوگ اسی قسم کے ہتھکنڈوں سے شریف لوگوں کو دبا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''وکیل صاحب! وہ کہہ رہے تھے کہ دو چار بندوں کی لاشیں گرانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر ہم نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ ہمیں قتل کرکے خاموشی سے گاڑی لے جائیں گے۔''

''سب بکواس ہے......'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''انہوں نے کل کتنے بجے آنے کو کہا ہے؟''

''وہ کل رات کوئی دس بجے ہمارے گھر آئے تھے۔'' خالد باری نے بتایا۔ ''اور آج بھی دس بجے ہی آنے کو کہا ہے اسی لیے میں دن ہی میں آپ کے پاس آگیا ہوں تاکہ آپ ان کا کوئی سدباب کرسکیں۔''

''سمجھ لیں، سدباب ہوگیا۔'' میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''جی...... وہ کیسے ہوگیا؟'' وہ حیران ہوکر مجھے تکنے لگا۔

''جب آج رات وہ لوگ آپ کے گھر آئیں گے تو میں پہلے سے وہاں موجود ہوں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پھر میں خود ان کو سنبھال لوں گا۔ آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''یہ تو آپ بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہیں جناب۔'' اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''امی بھی کئی بار آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرچکی ہیں لیکن ان کی صحت کی وجہ سے میں انہیں آپ کے دفتر نہیں لاسکا چلیں، اسی بہانے آپ سے ان کی ملاقات ہوجائے گی۔''

''آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس نوٹ کرادیں۔''

اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

میں نے کہا۔ ''میں لگ بھگ ساڑھے نو بجے آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا اور بالفرض، اگر وہ اس سے پہلے آدھمکیں تو آپ انہیں باتوں میں لگا کر میری آمد کا انتظار کیجیے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے جناب......'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں عموماً نو بجے تک اپنے آفس میں موجود رہتا تھا۔ خالد باری نے مجھے اپنے گھر کا جو ایڈریس لکھوایا تھا وہاں

میں بہ آسانی پندرہ سے بیس منٹ میں پہنچ سکتا تھا اسی لیے میں نے احتیاطاً اسے ساڑھے نو کا ٹائم دیا تھا۔

''اب ذرا اس طرف آجائیں جو کام میں نے آپ کے ذمے لگائے تھے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''خالد صاحب! آپ اپنے مشن میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟''

''جناب! آپ نے میرے ذمے چار کام لگائے تھے۔ بھاگ دوڑ کے بعد میں اس مشن میں جس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کی تفصیل یہ ہے......'' وہ لمحے بھر کو رکا۔ ایک گہری سانس خارج کی پھر بتانے لگا۔

''اشفاق بخاری کا تو کچھ پتا نہیں چل رہا وکیل صاحب۔ میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈ کر دیکھ لیا ہے۔ اس سلسلے میں، میں بہت سے لوگوں سے بھی ملا ہوں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ دفتر کے بھی کئی چکر لگائے ہیں۔ وہاں تو اس توڑ پھوڑ والے واقعے کے بعد تالے پڑے ہوئے ہیں۔ منیجر ارشد ملک صاحب سے بھی ملاقات کی ہے۔ وہ بھی سخت پریشان ہیں۔ بخاری صاحب کی کوئی خیر خبر یا اطلاع کسی کو بھی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ بندہ ابھی تک اغوا کنندگان کی تحویل میں ہے۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ تحویل خود ساختہ بھی ہوسکتی ہے اور جبری بھی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ اسے ریکارڈ سمیت اٹھا کر لے گئے تھے انہوں نے اب تک بخاری کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔''

''اور وہ لوگ مرزا یاسر بیگ وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں؟''

''بالکل ہوسکتے ہیں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''باقی میں گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس بھی گیا تھا۔'' وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے متعلقہ افسر کو جا کر اپنی داستان سنائی ہے۔ اس شخص نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میں جو کاغذات اپنے ساتھ لے گیا تھا ان کا بھی جائزہ لیا اور مجھ سے وعدہ لیا کہ وہ بہت جلد مرزا یاسر بیگ کے نام ایک نوٹس جاری کردیں گے جس میں محکمے کی جانب سے اسے کاغذات سمیت حاضر ہونے کا حکم دیا جائے گا۔''

''یہ ایک اچھا کام ہوا ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ نے رجسٹریشن آفس والوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ اشفاق بخاری گاڑیوں کے ریکارڈ کے ساتھ اغوا کرلیے گئے ہیں؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی بالکل، پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس بات کے لیے وہ میرے شکر گزار بھی ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ میں پہلی شکایت لے کر پہنچا ہوں۔ اگر بخاری صاحب کو گاڑیوں کے ریکارڈ سمیت کسی نے اغوا کیا ہے تو اس کا مطلب ہے اور بھی گاڑیوں کو اسی طرح غلط لوگوں کے نام ٹرانسفر کرایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہماری گاڑی کے حوالے سے ایک بہت اہم بات بھی بتائی ہے۔''

وہ ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سی اہم بات باری صاحب؟''

''یہ کہ اس گاڑی کو کسی تگڑی سرکاری سفارش کے زور پر مرزا یاسر بیگ کے نام ٹرانسفر کیا گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''گاڑی تو آپ نے ٹھکانے لگادی ہے نا؟''

''ٹھکانے لگادی......'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ گاڑی کو میری ہدایت کے مطابق اپنے گھر سے کہیں اور شفٹ کردیا ہے نا؟''

''جی ہاں، بالکل شفٹ کردیا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ہماری پچھلی گلی میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں نے گاڑی اس کے گھر میں کھڑی کردی ہے۔''

''اور مرزا یاسر بیگ کے بارے میں کیا پتا چلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بندہ عجیب و غریب خصلت کا مالک اور جوڑ توڑ کا ماہر ہے۔'' خالد باری نے جواب دیا۔ ''میں صحیح طور پر جان نہیں سکا ہوں کہ اس کا اصل کاروبار کیا ہے۔ ویسے وہ میری معلومات کے مطابق بہت سے کام کرتا ہے جن میں کباڑ کا کاروبار، اسکریپ کی ٹھیکے داری، اندرونِ سندھ سے مال مویشی منگوا کر انہیں کراچی کی مارکیٹ میں فروخت کرنا۔ تعمیراتی کام کے ٹھیکے لینا وغیرہ وغیرہ۔ اس کی دوستی زیادہ تر غنڈا صفت لوگوں سے ہے یا پھر مختلف سرکاری افسروں سے جن کی مدد سے وہ اپنے کام نکلواتا رہتا ہے جیسا کہ ہماری گاڑی کا اپنے نام ٹرانسفر......!''

''باری صاحب! آپ نے کافی مفید معلومات جمع کرلی ہیں۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''شہبازی اور کاکا کو دیکھ کر ہی مرزا یاسر بیگ کے قماش کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جب غنڈے بدمعاش اس کے

اشاروں پر ناچتے ہوں تو وہ خود کس درجے کا لفنگا ہوگا اس کا بہ خوبی حساب لگایا جاسکتا ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے وکیل صاحب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اب جو بھی کرنا ہے، وہ مجھے ہی کرنا ہے۔ آپ بے فکر ہوجائیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آج رات کو میں ذرا شہبازی اور کاکا کا دیدار کرلوں اس کے بعد ہی کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

رات کو ٹھیک پونے دس بجے میں خالد باری کے گھر میں بیٹھا تھا۔

اس گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے یعنی خالد باری، اس کا چھوٹا بھائی عابد باری اور ان کی والدہ زہرہ بیگم۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، خالد باری کے والد کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوچکا تھا اور اب اس گھر کا نظام زہرہ بیگم کے ہاتھ میں تھا۔

زہرہ بیگم ایک خوش اخلاق، سمجھ دار اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ انہیں سانس کا عارضہ یعنی دمہ تھا۔ بات کرتے کرتے اچانک ان کی سانس الجھ جاتی تھی۔ خالد باری مجھے گھر کے اندرونی حصے میں زہرہ بیگم کے پاس لے گیا تھا۔ ہمارے بیچ کافی دیر تک موجودہ صورت حال پر گفتگو ہوتی رہی۔ زہرہ بیگم اگرچہ ہمت والی خاتون تھیں مگر اس معاملے نے انہیں خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ جب پالا غنڈوں اور بدمعاشوں سے پڑ جائے تو ہر شریف آدمی پریشان ہوجاتا ہے۔ میں نے ان تینوں ماں بیٹوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ انہیں کسی بھی حوالے سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں عدالت میں ان لوگوں سے بہ آسانی نمٹ لوں گا۔

اسی دوران میں ڈور بیل بجی۔ خالد باری نے نگاہ اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک ٹھیک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''شاید شہبازی اور اس کا ساتھی آگئے ہیں......''

''بھئی! یہ تو بہت ہی اصول پرست اور ٹائم کے پابند غنڈے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''باری صاحب! آپ انہیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھائیں اور جیسا میں نے سمجھایا ہے، ان سے بات شروع کریں۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔''

استاد۔ ''موسلا دھار کا مطلب بتاؤ؟''
شاگرد۔ ''لگاتار۔''
استاد۔ ''اسے جملے میں استعمال کرو۔''
شاگرد۔ ''آج میں موسلا دھار بھاگا۔''

☆☆☆

پہلا دوست۔ ''یار! یہ امن و آشتی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''
دوسرا۔ ''پتا نہیں یار! میں تو خود کراچی میں رہتا ہوں۔''

مرسلہ۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ کا مطلب ہے، انہیں گھر کے اندر لے آؤں؟''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''مگر پہلی اور آخری بار۔''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کیوں ذہن کو الجھا رہے ہیں۔ میں ہوں نا...... جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کریں۔''

وہ اٹھا اور بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

زہرہ بیگم نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوجائے گی نا......؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میں ساری گڑبڑ ختم کرنے کے لیے ہی یہ سب کررہا ہوں۔ اب سانپ کے دانت توڑنے کا وقت آگیا ہے۔''

وہ مطمئن انداز میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

میں مزید اتنی دیر تک زہرہ بیگم کے پاس رکا جب تک خالد باری ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا نہیں دیتا۔ اس کے بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

''السلام علیکم!'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا اور ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

ان لوگوں نے میرے سلام کا جواب تو دیا تاہم اس کے ساتھ ہی وہ شک زدہ نظر سے مجھے گھورنے بھی لگے تھے۔

''یہ ہمارے مہمان ہیں امجد بھائی!'' خالد نے میری طرف دیکھتے ہوئے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ ''کچھ ضروری بات کرنے آئے ہیں۔''

''تو پھر میں چلتا ہوں......'' میں نے اٹھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ ضروری بات کرلیں۔

میں پھر آجاؤں گا۔"

"ارے نہیں امجد بھائی! ایسی بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔" خالد باری نے دوستانہ انداز میں کہا۔" آپ بیٹھیں۔ میں پانچ منٹ میں فارغ ہوجاؤں گا۔ پھر آپ سے گپ شپ ہوگی۔"

میں جم کر بیٹھ گیا۔

خالد باری نے مجھے شہبازی اور کاکا کے جو حلیے بتائے تھے ان کی روشنی میں مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان میں سے کون شہبازی ہے اور کون کاکا۔ شہبازی مجھے نظرانداز کرتے ہوئے براہ راست خالد باری سے مخاطب ہوا۔

"ہاں بھائی! ہمارے کام کا کیا ہوا؟"

"میں نے بخاری صاحب کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے مگر......"

خالد باری نے بولنا شروع ہی کیا تھا کہ شہبازی اس کی بات کاٹ کر بولا۔" بخاری کو ایسا بخار ہوگیا ہے کہ وہ اب کسی کو نہیں ملے گا۔ تم اور کوئی بات کرو۔"

شہبازی کی بات سے مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ اشفاق بخاری ان لوگوں کے "پنجے" میں ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو وہ ان کی کسٹڈی میں بے بسی کے لمحات گزار رہا ہے اور یا پھر وہ انہی کا ساتھی ہے اور اس وقت کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھا انجوائے کر رہا ہے۔

"اور کون سی بات کروں بھائی صاحب۔" خالد باری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" میں اپنی گاڑی کی فل پیمنٹ کر چکا ہوں، بس بخاری صاحب سے رسید لینا باقی تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے گاڑی کے ڈاکیومینٹس دے دیتے اور رجسٹریشن آفس جا کر میں یہ گاڑی اپنی والدہ کے نام پر رجسٹر کرالیتا۔" وہ میرے پڑھائے ہوئے سبق کو مرزا یاسر بیگ کے گماشتوں کے سامنے دہرا رہا تھا۔" بخاری صاحب کہیں مل ہی نہیں رہے تو میں کیا کروں۔"

"بخاری...... بخاری...... بخاری!" شہبازی طیش میں آگیا۔" جہنم میں ڈالو بخاری کو۔ ہم جس گاڑی کا مطالبہ کر رہے ہیں اس...... کی رجسٹریشن بک اور تمام ڈاکیومینٹس ہمارے پاس ہیں اس لیے قانون کی رو سے وہ گاڑی ہماری ہے۔ گاڑی ہمارے حوالے کردو یا ایک لاکھ روپے دو۔ آج ہم فیصلہ کرنے آئے ہیں۔ یا تو تمہیں ہماری ان دو باتوں میں سے ایک بات ماننا ہوگی یا پھر ہم تم سب کو گولیوں سے چھلنی کر کے گاڑی لے جائیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے ابھرے ہوئے پہلو کو تھپتھپایا جہاں لباس کے نیچے یقیناً کوئی گن وغیرہ موجود ہوگی۔ میں نے پوزیشن کو سنبھالتے ہوئے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ شہبازی سے سوال کیا۔

"آپ نے ابھی قانون کی بات کی ہے۔ ذرا مجھے بتائیں گے کہ کس قانون کے تحت وہ گاڑی آپ کی ہے؟"

"وہی قانون جو اس ملک میں چلتا ہے۔" وہ رکھائی سے بولا اور ناپسندیدہ نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

میری مداخلت اسے ناگوار گزری تھی مگر مجھے اس کی گواری یا ناگواری کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی لہٰذا ترکی بہ ترکی پوچھا۔" کہیں تم اس قانون کا تذکرہ تو نہیں کر رہے جس کی رو سے تم لوگ گاڑی کا مطالبہ کر رہے ہو...... غنڈا گردی اور زور زبردستی کا قانون؟"

اب کی بار شہبازی نے اسپیشل توجہ سے مجھے دیکھا اور آنکھیں سکوڑ کر استفسار کیا۔" آپ کون ہو؟"

"تمہارا دادا......" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ جھلا کر بولا۔

"بکواس نہیں کر رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"تم ہمارے بیچ میں نہ ہی بولو تو یہ تمہارے لیے اچھا ہوگا۔" وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی دھمکی کی پروا کیے بغیر کہا۔" میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہوں۔"

"مگر تم ہو کون؟" وہ چڑ کر بولا۔" پہلے تو کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔"

"تم اس گھر کے اندر آئے ہی کتنی بار ہو جو مجھے دیکھتے؟" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

میرا یہ تجربہ ہے کہ غنڈا گردی کرنے والے دبنے والوں کو اور دباتے ہیں۔ ان کا تمام تر "کاروبار" دھونس دھاندلی پر ہی چل رہا ہوتا ہے۔ صلح صفائی اور شرافت کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ قدرے نرمی سے بولا۔

"بھائی! آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہو، میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ آپ ہو کون؟"

"اور میں بتا چکا ہوں کہ میں کون ہوں۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔" لیکن لگتا ہے، تمہاری یادداشت بہت ہی کمزور ہے۔ میرا مفت مشورہ یہ ہے کہ تم روزانہ صبح نہار منہ سات کاغذی بادام کھایا کرو۔"

لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر

ان الفاظ میں اضافہ کیا۔
''آخری بار بتا رہا ہوں۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو۔ میں تم دونوں کا دادا اور تمہارے سیٹھ کا باپ مرزا امجد بیگ ہوں۔ خالد باری میرا کزن ہے اور ان کی والدہ محترمہ زہرہ بیگم میری آنٹی ہیں۔ آئی بات سمجھ میں؟''
''تم ہمیں چکر دینے کے لیے اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''مگر ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ یا چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ ہم صرف اس سے ضروری باتیں کرنے آئے ہیں۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے خالد باری کی طرف اشارہ کردیا۔
''تم بھی کمال کرتے ہو۔'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''جب بتا دیا ہے کہ میں خالد باری کا کزن ہوں تو پھر اس کے معاملے میں تو مجھے بولنا ہی پڑے گا نا۔''
''ابھی تو ہم شرافت سے بات کررہے ہیں۔'' اس نے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ''اگر یہ گاڑی ہمارے حوالے نہ کی گئی یا اس کے بدلے ایک لاکھ روپے ادا نہ کیے گئے تو ہم ابھی پولیس کو فون کرکے بلالیں گے۔'' بات کے اختتام پر اس نے ڈرائنگ روم کے کونے میں اسٹینڈ پر رکھے فون سیٹ کی طرف دیکھا۔
''ٹھیک ہے، کرو پولیس کو فون۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اب تو تمہیں یہ گاڑی پولیس کے ذریعے ہی برآمد کرانا پڑے گی۔''
میرے انداز نے اسے یہ تو باور کرا دیا تھا کہ ان کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں لہٰذا وہ خالد باری کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔
''بھائی...... آج ہم گاڑی لے کر ہی جائیں گے۔''
خالد باری کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر ان کے بیچ کود پڑا۔ ''تم کون سی گاڑی کی بات کررہے ہو بھائی؟''
''سوزوکی سوئفٹ!'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔
''جو اس گھر میں کھڑی ہے۔''
''مگر میں نے تو اس گھر میں کبھی کوئی گاڑی نہیں دیکھی۔'' میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر خالد باری سے پوچھ لیا۔ ''یار! تم لوگوں نے گاڑی لے لی اور مجھے بتایا تک نہیں۔ یہ کیا غضب کردیا یار......''
شہبازی اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے سیٹھ کا باپ نہ سہی مگر اس کا باپ ضرور ثابت ہو رہا ہوں۔ اسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اس سے کھیلنے کی کوشش کررہا ہوں۔

''یہ تم لوگ اپنے حق میں اچھا نہیں کررہے ہو۔'' شہبازی نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج ہم اپنی گاڑی لیے بغیر نہیں نکلیں گے۔''
''مجھے ٹالنا آتا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر کہو گے تو تمہاری ناف بھی ٹال دوں گا۔''
''تم خوامخواہ ہمارے بیچ میں نہ بولو۔'' وہ چلایا۔
''خوامخواہ والی تو کوئی بات ہی نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ میری آنٹی کا گھر ہے۔ ان کے گھر کا ایک اہم معاملہ ڈسکس ہو رہا ہے۔ میں بھلا کیسے نہیں بولوں گا اور جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔
''تو...... فرض کرلو کہ وہ گاڑی چوری ہوگئی ہے۔''
''کیسے فرض کرلوں۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ ''میں نے اپنی گاڑی کو خود اس گھر کے اندر کھڑے دیکھا تھا۔''
''دیکھا تھا نا......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً دیکھا ہوگا۔ اب تو وہ گاڑی چوری ہوگئی۔ اگر میری بات کا یقین نہیں آرہا تو میں تمہیں پورے گھر کا وزٹ کرا دیتا ہوں۔ اس گھر سے کوئی گاڑی برآمد ہوجائے تو تمہاری۔''
''تم لوگ کوئی نئی کہانی سنانے کی کوشش کررہے ہو۔'' وہ شک زدہ نظر سے مجھے اور خالد باری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً تم لوگوں نے گاڑی کو کہیں اور شفٹ کردیا ہے اسی لیے اتنے اعتماد کے ساتھ یہ بات کررہے ہو۔''
اس وقت یہ تمام تر گفتگو میرے اور شہبازی کے درمیان ہو رہی تھی۔ میں خالد باری کا وکیل تھا اس لیے وہ مجھے ہی زیادہ بولنے کا موقع فراہم کررہا تھا جبکہ کاکا خاموشی سے ایک طرف بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا تاہم اس نے بھی اپنے دائیں ہاتھ کو پہلو میں الرٹ رکھا ہوا تھا تاکہ بوقت ضرورت وہ کسی آتشیں اسلحے کی نمائش کرسکے۔ اتنی دیر میں، میں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ دونوں غنڈے دھونس دھاندلی اور گن کے زور پر ہی سب کچھ کرتے تھے۔
''ہم سچے ہیں اس لیے بات تو اعتماد ہی سے کریں گے نا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔
''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔'' وہ قدرے مصلحت کوش لہجے میں بولا۔ ''گاڑی واقعی اس گھر سے چوری ہوگئی ہوگی مگر......''
''اگر مگر کچھ نہیں......'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے

سے پہلے ہی اسے لتاڑ ڈالا۔ ''اگر تم نے تسلیم کرلیا ہے کہ گاڑی چوری ہو چکی ہے تو پھر تم بھی پُھنا کھاؤ...... چلو اٹھو......'' میں نے چٹکی بجائی۔ ''چلتے پھرتے نظر آؤ......شاباش!''

''ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''تو کیا تم یہاں کوئی کھلونا گاڑی لینے آئے تھے جو تمہارے ہاتھوں میں سما جاتی اور تم خالی ہاتھ واپس نہ جاتے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس مقصد کے لیے تم کسی بھی ٹوائے شاپ پر چلے جاؤ۔ تمہاری روح کو کافی اور جگر کو شافی سکون ملے گا۔''

وہ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر گاڑی کو تم لوگوں نے ادھر ادھر کر دیا ہے تو ہمیں پورے ایک لاکھ روپے دو۔''

''یہ بات تم پہلے بھی دو تین مرتبہ کر چکے ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''مگر ہم تمہیں کس بات کے ایک لاکھ روپے دیں۔ کیا یہاں اندھی لگی ہوئی ہے؟''

وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔ ''وہ گاڑی ہمارے سیٹھ کی تھی۔ اس کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے۔ تم لوگوں نے گاڑی غائب کر دی ہے تو اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔''

''کیا تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے جس کی بنا پر تم دعویٰ کر سکو کہ وہ گاڑی تمہارے سیٹھ مرزا یاسر بیگ کی تھی؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں ہے، بہت ہی پکا ثبوت۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''خالد کو ہم نے دکھایا تھا...... لو تم بھی دیکھ لو......'' وہ یکدم جذباتی ہو گیا تھا۔ ''تمہیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔''

پھر اس نے اپنی جیب میں سے گاڑی کی رجسٹریشن بک نکال کر میری جانب بڑھا دی۔

میں نے مذکورہ بک کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد فتویٰ صادر کر دیا۔ ''یہ تو ایک دم نقلی اور بوگس بک ہے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو بھائی۔'' وہ تلملا کر بولا۔ ''یہ ایک نمبر اصلی بک ہے۔'' پھر اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ...... ادھر دو۔''

''یہ تو اب واپس رجسٹریشن آفس جائے گی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' شہبازی تپتے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

''میں نے کوئی بکواس نہیں کی۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی رجسٹریشن آفس ہی میں کام کرتا ہوں اس لیے اصلی اور نقلی کا فرق بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ خالد باری نے مجھے تم لوگوں کی چار سو بیسی کے بارے میں بتا دیا تھا اسی لیے آج میں ادھر آیا ہوں۔ اس بک کو ثبوت کے طور پر استعمال کر کے میں تم دونوں اور تمہارے سیٹھ مرزا یاسر بیگ کو جیل کی دیواروں کے پیچ سڑا سکتا ہوں۔''

شہبازی نے یک بارگی گن نکال لی اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''بک میرے حوالے کر دو ورنہ میں تم دونوں کو گولی سے اڑا دوں گا۔''

اس کی دیکھا دیکھی کاکا نے بھی پسٹل نکال لیا تھا۔ اس دوران میں وہ دونوں اٹھ کر کھڑے بھی ہو گئے تھے۔ آتشیں اسلحے کی خطرناک جھلک دیکھ کر خالد باری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے سنبھالا دیا۔

''یار خالد!'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''ان لوگوں کو اندر بلانے سے پہلے تم نے صوفوں کے نیچے چھپائے ہوئے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن تو آن کر دیا تھا نا......؟''

خالد باری کے لیے میرا یہ سوال غیر متوقع تھا مگر خیریت گزری کہ اس نے میکانکی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور جلدی سے بولا۔ ''جی، بالکل ٹیپ میں ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔''

''اوکے!'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''ثبوت کے لیے یہ کیسٹ ہی کافی ہوگی۔ میرا خیال ہے، رجسٹریشن بک انہیں واپس کر دیتے ہیں۔ یہ تو ویسے بھی جعلی ہی ہے۔ ہم اسے رکھ کر کیا اچار ڈالیں گے۔''

بات کے اختتام پر میں نے مذکورہ بک شہبازی کی سمت اچھال دی۔ اس نے جلدی سے بک کو کیچ کیا پھر اسے جیب میں رکھنے کے بعد سکھ کی سانس لی اور گن کو لہراتے ہوئے بولا۔

''یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ بہت جلد تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا......'' پھر وہ کاکا کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے......''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے بھائی!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جاتے جاتے میرا وزیٹنگ کارڈ تو لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے، تمہیں زندگی میں کبھی میری مدد کی ضرورت پیش آجائے۔ ویسے یہ بات تم نے خوب کہی کہ بہت جلد نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ بس، اس جملے میں ایک ہی خرابی ہے کہ ''ہمیں'' نہیں بلکہ تمہیں یہ نتیجہ بھگتنا پڑے گا اور وہ بھی عدالت میں......''

''عدالت میں......'' اس کی بھویں تن گئیں۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔''

اس نے سرسری انداز میں وزیٹنگ کارڈ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''تو آپ وکیل ہو؟''

''صرف وکیل نہیں بلکہ مسز زہرہ بیگم کا وکیل۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ اس کیس میں، میں ان کے ساتھ کمٹمنٹ کرچکا ہوں۔ ہاں اگر......'' میں نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر طنزیہ نظر سے شہبازی کو دیکھا پھر دوستانہ انداز میں کہا۔

''اگر کسی اور کیس میں تم یا تمہارا سیٹھ مرزا یاسر بیگ میری خدمات حاصل کرنا چاہے گا تو میں حاضر ہوں۔ سیٹھ کے ساتھ تو میں فیس میں تھوڑی بہت رعایت بھی کردوں گا کیونکہ اس کے نام کے ساتھ بھی ''مرزا'' اور ''بیگ'' لگے ہوئے ہیں۔''

وہ دونوں پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئے۔

خالد باری نے گیٹ کو اچھی طرح بند کیا اور ہم ایک بار پھر اندرونی کمرے میں زہرہ بیگم کے پاس جا بیٹھے۔ خالد نے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کردیا۔ مجھے یقین ہے، اب وہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔''

''ایسا سوچنے سے پہلے ہی میں انہیں عدالت کا رخ کرادوں گا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''بیٹا!'' زہرہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''آپ نے بڑی ذہانت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو یہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا ہے لیکن ایک مرحلے پر تو میں بالکل ڈر گئی تھی۔''

میں نے سوالیہ نظر سے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کس مرحلے پر؟''

''جب اس شیطان کی اولاد نے گن نکال لی تھی۔'' انہیں نے جواب دیا۔

''تو اس کا مطلب ہے......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ سمجھدار خاتون فوراً سے پیشتر میری بات کی تہ میں پہنچ گئی اور ترت بولی۔ ''جی ہاں...... میں اور عابد ڈرائنگ روم سے باہر کھڑے تم لوگوں کی باتیں سن رہے تھے۔ میں ایسے زاویے پر تھی کہ وہ کمبخت شہبازی مجھے نظر آرہا تھا مگر وہ ڈرائنگ روم کے اندر بیٹھے بیٹھے مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔''

''خاتون! شہبازی اور کاکا کی کیٹیگری کے غنڈے ہڈی خور کتوں کے مانند ہوتے ہیں۔ ان کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان سے خوفزدہ ہوجانا یا ان کی کوئی بات مان لینے کا مطلب ہے کہ ہم نے انہیں ہڈی ڈال دی۔ جس گھر سے انہیں ایک بار کھانے کو ہڈی مل جاتی ہے اس دہلیز کا پیچھا یہ کبھی نہیں چھوڑتے چنانچہ......'' میں نے تھوڑی دیر رک کر ان تینوں ماں بیٹوں کو دیکھا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں ہر وقت اپنے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈنڈا اٹھا کر رکھنا چاہیے تاکہ ایسے جانوروں کو آسانی سے کھدیڑا جاسکے اور بہ وقتِ ضرورت وہی ڈنڈا ان کے سر پر بھی برسانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔''

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے بیگ صاحب؟'' خالد باری نے پوچھا۔

''ہمارے لیے یا صرف آپ کے لیے؟'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''چلیں، میرے لیے ہی بتادیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''آپ فوراً ڈرائنگ روم میں جائیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ یکایک اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''جی بتائیں، ڈرائنگ روم سے کیا لانا ہے؟''

''لانا نہیں، بند کرنا ہے۔'' میری سنجیدگی میں کوئی کمی نہ آئی۔

''کیا بند کرنا ہے؟'' اس کی حیرت میں الجھن بھی شامل ہوگئی۔

''ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہاں پر خالی کیسٹ چل رہی ہوگی......''

کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

تھوڑی دیر پہلے وہاں جو خوف و ہراس، پریشانی اور گمبھیرتا دیکھنے کو مل رہی تھی وہ میرے اس معصوم سے لطیفے سے یکدم کافور ہوگئی تھی۔ اب زہرہ بیگم، عابد باری اور خالد باری کے چہرے فتح اور شادمانی کے تاثرات سے دمک رہے تھے۔ میری حکمتِ عملی نے ان کی اداس اور سراسیمہ زندگی میں امید، یقین اور خوشی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔

میں نے دل میں دعا کی کہ یہ مختصر سا گھرانا اسی طرح ہنستا مسکراتا رہے اور وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

تین روز کے بعد خالد باری میرے پاس آیا تو اس

کے چہرے کے تاثرات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ رسمی علیک میں پڑے بغیر میں نے اس سے براہِ راست ہی پوچھ لیا۔

''ان خبیثوں نے دوبارہ تو آپ لوگوں کو تنگ نہیں کیا؟''

''خبیثوں'' سے میری مراد مرزا یاسر بیگ کے ہرکارے شہبازی اور کاکا تھے۔ خالد نے ایک رجسٹرڈ پوسٹ لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ان خبیثوں کے سیٹھ کی طرف سے آج صبح ہی موصول ہوا ہے۔''

میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا۔ وہ ایک سمن تھا۔ سمن تھا تو یقیناً عدالت کی طرف سے آیا تھا اور زہرہ بیگم کے نام آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عرضیِ دعویٰ کی ایک نقل بھی منسلک تھی جس کے مطابق مرزا یاسر بیگ نے زہرہ بیگم کو عدالت میں گھسیٹ لیا تھا۔ مطلب یہ کہ ان پر کیس کر دیا تھا۔ اس عرضیِ دعویٰ کا مضمون اردو میں کچھ اس طرح تھا۔

''درخواست گزار کے مطابق اس نے کچھ عرصہ قبل ''بخاری انویسٹرز'' میں مبلغ دس لاکھ روپے شراکت کی بنیاد پر لگائے تھے۔ بخاری انویسٹرز کے مالک کی ایک اور کمپنی ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کے نام سے بھی تھی جس میں کمپنی کے مالک اشفاق بخاری قسطوں پر کاریں وغیرہ فروخت کرتے تھے اور درخواست گزار کا سرمایہ ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' میں بھی استعمال ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اشفاق بخاری کا بزنس تباہ ہو گیا۔ انہیں مجبوراً کاروبار بند کرنا پڑا لہٰذا درخواست گزار کو اس کا حصہ کچھ نقد اور کچھ گاڑیوں کی صورت میں ملا۔ بخاری صاحب نے درخواست گزار کو دو لاکھ روپے نقد اور آٹھ ایسی گاڑیاں دیں جن کی قیمت لگ بھگ آٹھ لاکھ بنتی تھی اور یہ قیمت ابھی واجب الوصول تھی۔ انہی آٹھ گاڑیوں میں ایک سفید سوزوکی سوئفٹ مسز زہرہ بیگم کی تحویل میں تھی۔ معاہدے کی رو سے یہ کاروبار ہائر پرچیز سسٹم کے تحت کیا جا رہا تھا اور خریداروں کو گاڑیاں اسی سسٹم کی بنیاد پر دی گئی تھیں۔ ''ہائر پرچیز سسٹم'' کے اصول کے مطابق جب تک متعلقہ گاڑی کی پوری قیمت ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کو ادا نہ کر دی جاتی، اس وقت تک گاڑی کو ''ہائر'' یعنی کرائے پر سمجھا جاتا اور اگر کوئی خریدار لگاتار تین ماہ تک گاڑی کی قسطیں ادا نہ کرتا تو قواعد و ضوابط کی رو سے اس کا سودا خود بخود ختم ہو جاتا اور ہائر پرچیز سسٹم کے تحت خریدار کو دی جانے والی گاڑی دوبارہ ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کی ملکیت بن جاتی۔ اس دوران میں خریدار قسطوں کی صورت میں جتنی رقم کمپنی کو ادا کر چکا ہوتا، وہ شرائط کی روشنی میں کرائے کی مد میں شمار ہوتی۔ مسز زہرہ بیگم نے اس کیس کے فائل ہونے تک لگ بھگ آٹھ ماہ سے کمپنی کو قسطیں ادا نہیں کی تھیں۔ جب کمپنی کا نمائندہ گاڑی کا قبضہ لینے کے لیے ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے اپنے دو بیٹوں اور ان کے دوستوں کی مدد سے نمائندے کو زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا۔ (یہاں کمپنی سے مراد مرزا یاسر بیگ کا بزنس تھی) ان حالات کی روشنی میں درخواست گزار عدالت سے استدعا کرتا ہے کہ مدعا علیہا مسز زہرہ بیگم سے اس کی سفید سوزوکی سوئفٹ واپس دلائی جائے۔''

مرزا یاسر بیگ کی چار سو بیسی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس نے اشفاق بخاری کو اغوا کیا تھا یہ ان بدمعاشوں کی ملی بھگت تھی، یہ طے تھا کہ اب کسی بھی وقت وہ منظرِ عام پر آنے والا تھا کیونکہ اس عرضیِ دعویٰ کے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرزا یاسر بیگ کو یہ کیس جیتنے کے لیے اشفاق بخاری کی گواہی کی ضرورت پیش آتی اور اب تک میں نے مرزا کے جو ''لچھن'' دیکھے تھے ان کے مطابق وہ بے وقوف ہرگز نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ کیس لانچ کیا تھا۔ اگر اشفاق بخاری اس کی دسترس میں نہ ہوتا تو عرضیِ دعویٰ کا مضمون ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ اشفاق بخاری اور مرزا یاسر بیگ میں خاصا مضبوط گٹھ جوڑ ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

میں نے ان کاغذات کو ایک طرف رکھا اور نگاہ اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے خالد باری کی طرف دیکھا۔ اس کی صورت پر بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا۔

''کیا ہو گیا باری صاحب! اس سمن کو دیکھ کر آپ پریشان ہو گئے ہیں......''

''بات ہی پریشانی کی ہے جناب۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہو گیا۔ مرزا یاسر بیگ نے ہم پر ہی کیس کر دیا ہے۔ اس سے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''اس نے آپ پر کیس کر دیا ہے تو ہم اس پر کیس کر دیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جوابِ دعویٰ دائر کر کے۔'' میں نے جواب

دیا۔'' یہ تو بہت ہی اچھا ہوگیا کہ معاملہ عدالت میں جا پہنچا۔ اس طرح ہمیں اپنے حق کے لیے لڑنے میں بہت آسانی ہوجائے گی اور ایک خاص بات شاید آپ نے نوٹ نہیں کی۔''

''کون سی بات جناب؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ نے اس عرضی دعویٰ کو غور سے پڑھا ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''دو تین مرتبہ پڑھا ہے لیکن میں سمجھ نہیں پایا کہ آپ کون سی خاص بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔''

''میرا اشارہ اشفاق بخاری کی جانب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مرزا یاسر بیگ کو اپنا دعویٰ سچا ثابت کرنے کے لیے بخاری کی گواہی کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ بخاری صاحب کو عدالت تک لانے میں کامیاب ہوجائے گا......؟''

''جی ہاں، بالکل کامیاب ہوجائے گا۔'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''بلکہ یہ کیس مرزا نے بخاری سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی عدالت میں پہنچایا ہے۔''

''اوہ......!'' وہ ایک تشویش بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تو ہمارا خیال بالکل درست تھا۔ بخاری صاحب کا اغوا ایک ڈراما تھا۔''

''جی...... موجودہ حالات انہی حقائق کی جانب اشارہ کررہے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''اس عرضی دعویٰ میں ہائر پرچیز سسٹم کے سلسلے میں جو قواعد وضوابط بیان کیے گئے ہیں کیا آپ نے انہی اصولوں کی بنیاد پر سفید سوئفٹ خریدی تھی؟''

''جی ہاں۔ بخاری صاحب نے یہ ساری باتیں ہمیں کھول کر بتادی تھیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ شرائط تو اس ایگریمنٹ پر بھی درج ہیں جو ہمارے اور ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کے بیچ گاڑی کی خریداری کے سلسلے میں ہوا تھا۔''

''آپ لوگوں نے لگ بھگ آٹھ ماہ سے گاڑی کی قسط جمع نہیں کرائی جب ہائر پرچیز سسٹم کی رو سے اگر کوئی خریدار لگاتار تین ماہ تک گاڑی کی قسط جمع نہیں کرائے گا تو ازروئے قانون ہائر پرچیز ڈیفالٹر ہوجائے گا۔ گویا آپ لوگ ڈیفالٹر ہوچکے ہیں۔'' میں نے خالد باری کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ڈیفالٹر ہونے کی صورت میں گاڑی واپس کمپنی کی ملکیت تصور کی جائے گی۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ لوگ... ڈیفالٹر کیوں ہوگئے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جبکہ آپ کی والدہ صاحبہ تو خاصی سمجھدار جہاں دیدہ خاتون ہیں۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب بخاری صاحب کی کمپنیاں زوال کا شکار ہونے لگیں اور دفتری حالات سے یہ واضح ہوگیا کہ یہ بزنس کسی وقت بھی بند ہوجائے گا تو دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح ہم نے بھی قسط بھرنا بند کردی تھی۔ حالات ایسے غیر یقینی تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔''

''بہرحال، ایک چھوٹی سی کوتاہی نے آپ لوگوں کو نادہندہ بنادیا۔'' میں نے کہا۔

''اب کیا ہوگا بیگ صاحب!'' وہ فکرمندی سے بولا۔ ''ہمارے پاس جو کار کے ایڈوانس کی اور چھ قسطوں کی ادائیگی کی جو رسیدیں رکھی ہیں وہ اس سلسلے میں کام نہیں آئیں گی؟''

''نہیں۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''ان رسیدوں کی موجودگی سے آپ کی ''نادہندگی'' کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا البتہ وہ پکی رسید کسی حد تک کام آسکتی ہے جو بخاری صاحب کو فل پیمنٹ کے ذیل میں دی تھی۔''

''اب مجھے کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''انتظار......!''

''کس کا انتظار؟'' وہ متعجب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''میری طرف سے جوابی کارروائی کا انتظار۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ایک دو روز میں جواب دعویٰ داخل کردوں گا۔''

''آپ کو یقین تو ہے نا کہ ہم یہ کیس جیت جائیں گے؟''

''کیوں نہیں......؟''

''ہم خاصی کمزور سائڈ پر ہیں نا......اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''کمزور سائڈ کو طاقتور بنانا میرا کام ہے۔ آپ بس وہ کرتے جائیں جس کی میں ہدایت کروں۔''

''ہم اب تک یہی کرتے چلے آرہے ہیں جناب۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''مگر میں اپنی تسلی کے لیے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر آپ کون سا چمتکار کرنے والے ہیں؟''

''بہت ہی خوب اور موزوں لفظ استعمال کیا ہے آپ نے...... چمتکار!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''میں

واقعی ایک چمتکار کرنے والا ہوں۔''

''کون سا چمتکار؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے رف پیڈ پر لگ بھگ تین انچ لمبی لائن لگائی پھر وہ پیڈ خالد باری کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس لائن کو کاٹے یا مٹائے بغیر چھوٹا کر سکتے ہیں؟''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے جناب۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''اس لائن کو چھوٹا کرنے کے لیے یا تو کاٹنا پڑے گا یا پھر مٹانا پڑے گا۔''

''لیکن میرے پاس ایک ایسا چمتکار ہے کہ میں اس لائن کو ٹچ کیے بغیر چھوٹا کرسکتا ہوں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کس طرح؟'' اس کی دلچسپی ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ ''کر کے دکھائیں......''

میں نے رف پیڈ پر موجود تین انچ لمبی لائن کے پہلو میں ایک اور لائن کھینچ دی جو لمبائی میں پہلی والی لائن سے دو انچ زیادہ تھی یعنی پانچ انچ لمبی تھی پھر خالد باری سے پوچھا۔

''لائن چھوٹی ہوئی کہ نہیں؟''

ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''لائن تو اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی مگر دوسری کے مقابلے میں چھوٹی نظر آرہی ہے۔''

''نظر آرہی ہے......'' میں نے اس کے آخری الفاظ دہرائے اور کہا۔ ''اس دنیا کا سارا کھیل ''نظر آنے'' پر ہی بنیاد کرتا ہے۔ آپ اگر لوٹے کو لوٹا سمجھتے ہیں تو وہ لوٹا ہے ورنہ وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ گھاس آپ کو گھاس نظر آتی ہے تو گھاس ہے ورنہ وہ کچھ اور بھی ہوسکتی ہے۔''

''آپ کا فلسفہ تو سمجھ میں آرہا ہے۔'' وہ بہ دستور الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''لیکن اس کا ہمارے کیس سے کیا تعلق؟''

''بہت ہی گہرا تعلق ہے۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں، اس کیس میں ڈاکومینٹس کے حوالے سے ہم کمزور پوزیشن میں ہیں یعنی ہائر پرچیز سسٹم کے قواعد وضوابط ہمیں نادہندہ یعنی ڈیفالٹر کرتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوریاں ہیں یا یوں سمجھیں یہ چھوٹی لکیر ہے۔'' میں نے رف پیڈ پر تین انچ والی لکیر پر قلم کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''ہمارے مدمقابل کوئی شریف النفس انسان نہیں ہیں۔ بخاری اور مرزا اس معاشرے کے چھٹے ہوئے بدمعاش لوگ ہیں جو قدم قدم پر ڈیفالٹر نظر آتے ہیں یعنی وہ پانچ انچ والی بڑی لکیر ہیں۔'' ایک بار پھر میں نے پیڈ پر قلم رکھ کر نشان دہی کی۔ ''یہ لائن جس نے پہلی لائن کو چھوٹا کردیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ تاہم چہرے کے تاثرات سے بھی لگتا تھا کہ اس کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کیس میں ہم خوبیوں کا مقابلہ خوبیوں سے نہیں کریں گے بلکہ خرابیوں کا مقابلہ خرابیوں سے کریں گے، جس کی خرابیوں کی تعداد یا کمزوریوں کا وزن دوسرے کے مقابلے میں کم نکلے گا، وہی اس کیس کا فاتح ہوگا۔ مثلاً......'' میں نے ایک بار پھر توقف کیا اور اپنی بات کو ان الفاظ میں مکمل کیا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ باقاعدگی کے ساتھ قسطیں ادا نہ کرنے کی وجہ سے آپ نادہندہ ہوچکے ہیں اور ایگری منٹ کے اصولوں کی رو سے اب وہ گاڑی ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' کی ملکیت ہے جو اس وقت آپ کی کسٹڈی میں ہے۔ اس سے آپ کی مجبوری اور کوتاہی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی بھی حوالے سے آپ مجرم نہیں ٹھہرائے جاسکتے جبکہ دوسری طرف بخاری اور مرزا کے کھاتے میں اتنے جرائم درج ہیں کہ وہ بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ میں ان کے ایک ایک کارنامے کو اس طرح کھول کر بیان کروں گا بلکہ اس طرح اچھالوں گا کہ ان کے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔ ہماری تین انچ والی لائن کے سامنے ان کے جرائم کا گراف تین سو بلکہ تین ہزار انچ بلند ہوجائے گا۔''

''اب میں سمجھا آپ کی بات۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ تو بہت دور کی لائے ہیں۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔''

''عدالت کا کمرا ایک اکھاڑے کی طرح ہوتا ہے خالد صاحب۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہاں وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی دو پہلوانوں کی طرح شواہد، ثبوت، منطق، دلیل اور قانون کی طاقت کے بل پر مختلف پینترے آزماتے ہوئے ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیت اسی کے حصے میں آتی ہے جس کے پاس داؤ زیادہ ہوتے ہیں یا پھر جس کا داؤ چل جاتا ہے۔ ایک بات اور......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے پوچھا۔

''اور کون سی بات؟''

''آپ شاہین ٹریڈنگ کمپنی کے کوئی اکیلے ڈیفالٹر تو نہیں ہیں نا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی طرح اور بھی بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو باقاعدگی سے گاڑیوں کی قسطیں ادا نہیں کر پائے اور گاڑیاں اپنے پاس رکھنے کے باوجود بھی وہ ان کے مالک نہیں ہیں۔ ایسی آٹھ گاڑیوں کا ذکر تو درخواست گزار کی عرضیِ دعویٰ میں بھی موجود ہے جن میں ایک گاڑی آپ کی ہے...... ہے کہ نہیں؟''

''جی بالکل ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کسی طرح باقی سات افراد کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ سات نہ ملیں تو ان میں سے دو تین ہی کو ٹریس کرلیں، خاص طور پر وہ جو آپ کی طرح پوری پیمنٹ تو ادا کر چکے ہیں مگر اس ادائیگی کا ان کے پاس کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔ بخاری نے انہیں کچی رسیدوں پر ٹرخا رکھا ہے، بالکل آپ کی طرح......'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ اس کیس میں گواہی دے کر آپ کی طاقت میں اضافہ کریں گے۔ عین ممکن ہے، آپ کو ایک دو ایسے افراد بھی مل جائیں جنہیں آپ کی طرح مرزا نے عدالت میں گھسیٹنے کے لیے کوئی لیگل نوٹس دے رکھا ہو۔''

''یہ کام اگرچہ اتنا آسان نہیں لیکن میں کرنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''کوشش کرنے سے کام آسان ہوجاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے، آپ یہ کرلیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو اس پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے۔ جہاں اشفاق بخاری کے منیجر ارشد ملک نے اس کے اغوا کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ مجھے اس ''ایف آئی آر'' کی ایک کاپی چاہیے۔''

''کیا وہ لوگ ایف آئی آر کی نقل آسانی سے دے دیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''پولیس کے محاذ پر کسی کام کو آسان کرنے کے لیے بابائے قوم کی سفارش کی ضرورت پیش آتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دو چار بابائے قوم اپنی جیب میں رکھ کر ساتھ لے جایئے گا۔ اللہ خیر کرے گا۔'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی سمجھ گیا۔'' وہ زیرِ لب مسکرایا۔ ''بالکل سمجھ گیا۔''

''آپ اپنی والدہ کو میرے آفس لا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت وکیل صاحب......!''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آج جواب دعویٰ تیار کرلوں گا۔ اس پر ان کے دستخط کرانا ہوں گے اور وکالت نامے پر بھی ان کے دستخط کی ضرورت ہے۔ گاڑی ان کے نام پر خریدی گئی تھی اور عدالت کی طرف سے لیگل نوٹس بھی انہی کے نام آیا ہے لہٰذا جوابِ دعویٰ میری وکالت میں انہی کے نام سے دائر کیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں کل انہیں لے آؤں گا آپ کے پاس۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''وکیل صاحب! اس طرح خاصی مشکل نہیں ہوجائے گی؟''

''کیسی مشکل باری صاحب؟''

''اگر جواب دعویٰ امی کی طرف سے دائر کیا جائے گا تو پھر کیس کی پیروی کے لیے ہر پیشی پر انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔'' وہ اپنی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ جانتے ہیں، ان کی صحت اس بات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔''

''ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن آپ کو اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی والدہ کو بار بار کورٹ کے چکر نہیں لگانا پڑیں گے۔ میں آپ کے نام ''پاور آف اٹارنی'' تیار کرادوں گا۔ اپنی والدہ کی جگہ ہر پیشی پر آپ عدالت میں حاضر ہوا کریں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے......!'' وہ ننھے بچوں کی طرح خوش ہوگیا۔

اگلے روز میں نے جوابِ دعویٰ کا پروسیس مکمل کرلیا پھر اپنے وکالت نامے کے ساتھ عدالت میں دائر کردیا۔ تین دن کے بعد فریقین کو پہلی پیشی پر عدالت میں حاضر ہونا تھا یعنی وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی کو تاکہ عدالتی کارروائی کا آغاز ہوتا۔

☆☆☆

میرا اندازہ صد فیصد درست نکلا تھا۔ استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی جو فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی اس میں ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' اور ''بخاری انویسٹرز'' کے روحِ رواں اشفاق بخاری کا نام بھی شامل تھا۔ گویا یہ سارا ڈراما ''بخاری اینڈ مرزا'' کمپنی کا ہی رچایا ہوا تھا۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی تو استغاثہ کی جانب سے، سب سے پہلے شاہ نواز شہبازی کو گواہی کے لیے پیش

کیا گیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان قلم بند کرادیا پھر وکیلِ استغاثہ وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اس نے کچھ اس انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔
''مسٹر شہبازی! تم گاڑی کی بازیابی کے لیے اکیلے ہی زہرہ بیگم کے گھر جاتے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا تھا؟''
''میرے ساتھ کمپنی کا ایک اور نمائندہ شہزاد بھی وہاں جایا کرتا تھا۔'' اس نے مختصر الفاظ میں جواب دیا۔
شہبازی اور شہزاد سے میں خالد باری کے گھر ایک بار مل چکا تھا لہٰذا میں ان کے لیے اور وہ دونوں میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ شہبازی مجھے عدالت میں ایک وکیل کے روپ میں دیکھ کر حیران تو ہوا تھا مگر اس نے اپنی حیرت کو بڑی کامیابی سے چھپالیا تھا اور کچھ ہونہ ہو لیکن ان لمحات میں اسے یہ دھڑکا ضرور لگا ہوگا کہ میں کہیں وہ ''کیسٹ'' بطور ثبوت عدالت میں پیش نہ کردوں جس میں اس کی کھلم کھلا بدمعاشی کے ثبوت ریکارڈ کیے گئے تھے۔ اگرچہ میں نے خالد باری اور اس کے گھر والوں کو ان غنڈوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ''ٹیپ ریکارڈ'' والا جھوٹ بولا تھا تاہم شہبازی کو تو حقیقت کا علم نہیں تھا نا۔ ویسے بھی وہ اس وقت نہایت ہی شریف النفس انسان ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔
''یہ وہی شہزاد ہے نا جو ''کاکا'' کے نام سے جانا جاتا ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔
''جی ہاں۔ بالکل وہی۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''تم لوگ جب گاڑی لینے مسز زہرہ بیگم کے گھر جاتے تھے تو تمہارے ساتھ وہاں کیا سلوک کیا جاتا تھا؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔
''جناب! پہلے تو یہ لوگ بہانے بازی سے کام لیتے رہے۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''کبھی زہرہ بیگم گھر میں نہیں ہوتی تھیں، کبھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تھی اور کبھی کوئی اور بہانہ۔ اس دوران میں ہم لوگ پیار سے انہیں حالات کی نزاکت کے بارے میں بتاتے رہے لیکن ہماری کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔''
''کیا کبھی مسز زہرہ بیگم خود بھی آپ لوگوں کے سامنے آئیں؟''
''کبھی نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمیشہ ان کے دو بیٹوں ہی سے ملاقات ہوتی تھی۔''
''کیا ان لوگوں سے آپ کی مار پیٹ بھی ہوئی تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''جی ہاں...... '' وہ معصومیت سے بولا۔ ''جب آخری مرتبہ ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے ہم پر چڑھائی کردی۔ ہم اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا انہوں نے ہمیں خوب مارا پیٹا اور دھمکی دی کہ اگر ہم دوبارہ ان کے گھر کے سامنے دکھائی دیے تو وہ ہمیں جان سے مار ڈالیں گے۔'' لحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔
''اس کے بعد ہی مرزا صاحب نے قانونی چارہ جوئی کا راستہ اختیار کیا اور آج یہ کیس عدالت میں ہے۔''
''تو آپ کو زدوکوب کرنے والے کل چار افراد تھے۔'' وکیلِ استغاثہ نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''دو مسز زہرہ کے بیٹے اور دو ان کے دوست اور وہ دونوں دوست آپ کے لیے اجنبی تھے؟''
''جی...... ہم نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔
''اگر دوبارہ وہ آپ کے سامنے آئیں تو آپ انہیں پہچان لیں گے؟''
''جی بالکل پہچان لیں گے۔'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلادی۔
وکیلِ استغاثہ نے مزید دو تین ضمنی سوالات کے بعد جرح ختم کردی۔
میں جج کی اجازت سے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ چند لمحات تک میں گواہ کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
''شہبازی! مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم پہلے بھی کبھی مل چکے ہیں۔ کیا آپ کو بھی ایسا ہی لگتا ہے؟''
''نہیں...... بالکل بھی نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔
''آپ میرے لیے ویسے ہی اجنبی ہیں جیسے وہ دو افراد تھے جنہوں نے مسز زہرہ کے بیٹوں کے ساتھ مل کر تمہیں زدوکوب کیا تھا۔''
''اوکے......!'' میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔ ''شہبازی! کیا یہ درست ہے کہ تم کسی مرزا یا سربیگ کے لیے کام کرتے ہو؟''
''جی ہاں، بالکل درست ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''تمہارا سیٹھ یاسر بیگ کس قسم کا بزنس کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے پھر وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مرزا صاحب قسطوں پر سامان فروخت کرتے ہیں۔''
''قسطوں پر سامان فروخت کرتے ہیں۔'' میں نے اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے پوچھا۔ ''مثلاً کس قسم کا سامان؟''
''پنکھے، استریاں، ایئرکنڈیشنرز اور......''
''اور کاریں......'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔
''جی، جی ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ قسطوں پر گاڑیاں بھی فروخت کرتے ہیں۔''
''مرزا کس نام سے یہ بزنس کرتے ہیں؟''
''وہ اپنے نام ہی سے بزنس کرتے ہیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔
''میں نے ان کی کمپنی کا نام پوچھا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔
''جی......مرزا اینڈ کمپنی کے نام سے۔''
یہ نام گواہ نے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت فوری طور پر گھڑا تھا ورنہ اس نام کی کسی کمپنی کا مرزا یاسر بیگ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔ میری تحقیق کے مطابق، مرزا کا باقاعدہ کوئی بزنس نہیں تھا اور وہ بہتر قسم کے الٹے سیدھے دھندوں میں بھی ٹانگ پھنسائے بیٹھا تھا۔ یہ ''قسطوں پر گاڑیاں فروخت کرنے کا بزنس'' حال ہی میں اس کے ہتھے چڑھا تھا۔
''شہبازی! اگر تمہارا سیٹھ لوگوں کو قسطوں پر کاریں فروخت کرتا ہے تو اس نے کہیں اپنا شوروم بھی بنا رکھا ہوگا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔
''شوروم تو کوئی نہیں ہے جناب......'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔
''اور ''مرزا اینڈ کمپنی'' کا دفتر کہاں واقع ہے؟''
''جی...... دفتر بھی نہیں ہے۔'' اس کی الجھن دوگنا ہوگئی۔
''تمہارے سیٹھ نے نہ تو کوئی دفتر بنا رکھا ہے اور نہ ہی کوئی شوروم۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''پھر وہ کیا ہوا میں بزنس کرتا ہے؟''
''جی ہم لوگ گھر ہی میں کاروبار کرتے ہیں۔''

''کس کے گھر میں؟''
''مرزا صاحب کے گھر میں۔'' اس نے بتایا۔
''پکا......؟''
''جی...... ایک دم پکا۔'' وہ اپنے الفاظ میں اعتماد بھرتے ہوئے بولا۔
میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''شہبازی! تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟''
''جی...... میں بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہوں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''انگریزی کی تحریر بھی آسانی سے پڑھ لیتا ہوں۔''
''ویری گڈ......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے میٹرک کس سال کیا تھا؟''
''جناب! خواہش تو میری بہت تھی کہ میٹرک کروں مگر گھر کے مالی حالات نے اس کی اجازت نہیں دی......'' وہ مسکین سی صورت بناتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے میری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔''
عدالت کے کمرے میں ایک شور سا اٹھا۔ گواہ کے احمقانہ جواب پر وہاں موجود لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ گواہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہاں کون سا ''بم'' پھوٹ چکا ہے البتہ وکیلِ استغاثہ مجھے خاصا نروس دکھائی دیا۔
میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں سوال کیا۔ ''اگر کبھی تمہیں زندگی نے موقع دیا اور مالی حالات اچھے ہوئے تو تم میٹرک کرنے کے بارے میں سوچو گے؟''
''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ بڑے جوش سے بولا۔ ''یہ تو میری دیرینہ خواہش ہے۔''
عدالت کے کمرے میں اب کی بار ہلکے پھلکے قہقہوں کی مخصوص آوازیں بھی سننے کو ملی تھیں۔ یہ حاضرین عدالت کا ''خراجِ تحسین'' تھا۔
''آرڈر......آرڈر......'' جج نے اپنی مخصوص آواز میں کہا۔ ''عدالت کے وقار کا لحاظ رکھا جائے۔''
ایک دم چہار سو خاموشی چھا گئی۔ میں دوبارہ گواہ سے ''لپٹ'' گیا۔ ''شہبازی! تمہارا سیٹھ نئی گاڑیوں کا بزنس کرتا ہے یا پرانی؟''
''نئی گاڑیوں کا......'' اس نے اعتماد سے خالی لہجے میں بتایا۔
''اس وقت تم لوگوں کے اسٹاک میں کُل کتنی

گاڑیاں ہیں؟''

''سات آٹھ تو ہوں گی ہی۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اسے کاسٹک سوڈا سے دھونے کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''سیٹھ صاحب کی یہ حاضر اسٹاک سات آٹھ گاڑیاں اس وقت کہاں کھڑی ہوں گی؟''

وہ میرے پے در پے چبھتے ہوئے سوالات سے خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ اس پر حاضرین کے تمسخرانہ انداز نے اسے اچھا خاصا نروس کر دیا تھا لہٰذا میرے سوال کے جواب میں وہ جھنجلا کر بولا۔

''گاڑیوں کو کہیں بھی کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ آپ تو خوانخواہ بال کی کھال نکال رہے ہیں......''

''میری بات کان کھول کر سنو مسٹر شہبازی!'' میں نے گواہ کی جانب انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں خوانخواہ کوئی کام نہیں کرتا ہوں۔ سچائی کو عدالت کے سامنے لانے کے لیے بال کی کھال تو کیا، میں تمہاری کھال کے بال بھی کھینچ سکتا ہوں۔''

وہ قدرے سہم کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وکیلِ استغاثہ اس کی مدد کو دوڑتا، میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''میرے سوال کا جواب دو، تمہارے سیٹھ کی گاڑیاں اس وقت کہاں کھڑی ہیں؟''

''ان کے گھر پر......'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''گھر کا ایڈریس کیا ہے؟''

''جی مجھے ایڈریس معلوم نہیں......''

''راستہ معلوم ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''میں کبھی سیٹھ صاحب کے گھر نہیں گیا۔''

وہ مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا اور یہ بات جج سمیت حاضرین عدالت میں سے کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ ''چور کو اس کے گھر تک پہنچا کر آنا چاہیے'' کے مصداق میں نے اپنے تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے سیٹھ کا کوئی دفتر نہیں ہے۔ تم نے اس کا گھر بھی نہیں دیکھ رکھا پھر وہ کس طرح اپنے ملازموں سے رابطے میں رہتا ہے۔ تم اس سے کس طرح احکام لیتے ہو؟''

''سیٹھ صاحب ہم سے کہیں بھی مل لیتے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''کبھی کہیں، کبھی کہیں۔''

''ماشاءاللہ!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہارا باس تو بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ میں نے چلتے پھرتے پرزہ قسم کے لوگ تو دیکھے تھے، یہ چلتا پھرتا کاروباری سیٹھ بھی مزے کا ہے۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے گواہ کی حمایت میں کہا۔ ''جناب عالی! مدعی کسی ایک جگہ بیٹھ کر بزنس کرتا ہے یا اس کا نیٹ ورک ایسا ہے کہ وہ اسے چلتے پھرتے ہینڈل کر لیتا ہے، یہ زیرِ سماعت کیس کا ایشو نہیں ہے۔ میرے فاضل دوست الٹے سیدھے سوالات کر کے استغاثہ کے معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

جج نے میرے جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ مدعی مرزا یاسر بیگ کے طریقہ کاروبار کو فی الحال زیرِ بحث نہ لائیں۔''

''جو حکم جنابِ عالی......!'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

جج کی ہدایت پر وکیلِ استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا ہو۔ میں اس کی عقل پر دل ہی دل میں ماتم کرتے ہوئے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''تو مسٹر شہبازی! تمہارے بیان کے مطابق، تمہارا سیٹھ سات آٹھ گاڑیاں اپنے گھر میں کھڑی کرتا ہے؟''

''جی...... جی ہاں......'' اس نے بے دھڑک جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مرزا یاسر بیگ کا گھر اتنا بڑا ہے کہ وہاں بیک وقت آٹھ دس گاڑیاں کھڑی کی جا سکتی ہیں...... میرا مطلب ہے، ایک آدھ گاڑی تو انہوں نے اپنے استعمال کے لیے بھی رکھی ہوگی نا؟''

''جی ہاں، انہوں نے اپنی ذاتی گاڑی بھی رکھی ہوئی ہے۔'' وہ روا روی میں بول گیا۔ ''اور جہاں تک باقی سات آٹھ گاڑیوں کا تعلق ہے تو ان میں سے تین چار گھر کے اندر کھڑی رہتی ہیں اور باقی باہر گھر کی دیوار کے ساتھ۔''

''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ......'' میں نے نہایت ہی ادب کے ساتھ سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''جو گاڑی سیٹھ مرزا یاسر بیگ کے استعمال

میں ہے وہ کون سی ہے، اس کا میک کیا ہے اور وہ کتنے سی سی کی گاڑی ہے؟''

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، بے حد پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ بھی پتا نہیں......''

''تمہیں سب پتا ہے مگر تم بتانا نہیں چاہتے ہو۔'' میں نے جارحانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''صرف اتنا بتا دو کہ اور کتنے جھوٹ بولو گے؟''

''میں نے ابھی تک کوئی بھی جھوٹ نہیں بولا۔'' اس کی ڈھٹائی قابلِ دید تھی۔

عدالت میں ایک بار پھر کھسر پھسر کی آوازیں ابھرنے لگیں چنانچہ جج کو اپنے مخصوص آرڈر سے ایک دفعہ پھر حاضرینِ عدالت کو خاموش کرانا پڑا۔ اس کے بعد وہ گواہ کی جانب دیکھتے ہوئے خفگی آمیز انداز میں بولا۔

''تم نے پے در پے جتنے سچ اور جتنے جھوٹ بولے ہیں وہ سب عدالت کے ریکارڈ پر آ رہے ہیں۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ جو بھی بولو، خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر بولو۔''

پھر جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر شہبازی! تم اپنے سیٹھ کے لیے کس قسم کی خدمات انجام دیتے ہو؟''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے وضاحت کر دی۔ ''مطلب یہ کہ سیٹھ کی کمپنی میں تمہارا عہدہ کیا ہے؟''

''میں قسطوں کی وصولی کے لیے جاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یا پھر اگر کسی گاڑی کا قبضہ لینا ہو تو سیٹھ مجھے بھیجتا ہے۔''

''گویا تم سیٹھ کے کلیکشن اینڈ ریکوری آفیسر ہو؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

پتا نہیں، میری بات اس کے پلے پڑی کہ نہیں البتہ اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''معزز عدالت کو بتاؤ کہ تمہیں قسطوں کی وصولی کے لیے کتنے افراد کے پاس جانا پڑتا ہے؟''

''پانچ...... دس لوگوں کے پاس جانا پڑتا ہے۔'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''پانچ یا دس؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔

اس کے چہرے پر موجود پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

''آپ پانچ، چھ، سات سمجھ لیں۔ صحیح تعداد ابھی مجھے یاد نہیں آ رہی۔''

''او کے، جب یاد آ جائے تو بتا دینا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''قسط کی وصولی کے بعد رسید بھی تم ہی دیتے ہو؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''جو شخص رقم وصول کرے گا وہی رسید بھی دے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا کہ قسط کی وصولی کے بعد تم ہی رسید دیا کرتے ہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر سوال کیا۔ ''کیا وہ رسید سادہ کاغذ پر ہوتی ہے یا کمپنی کے چھپے ہوئے صفحے پر؟''

''کمپنی کے چھپے ہوئے صفحے پر!''

''تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ تم نے بارہ جماعتوں تک تعلیم حاصل کی ہے، گویا لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتے ہو۔ میں تمہارے میٹرک والے نازک پہلو کو نہیں چھیڑوں گا۔ بس اتنا بتا دو کہ تم قسط وصول کرنے کے بعد جو رسید دیتے ہو اس پر کس کمپنی کا نام چھپا ہوا ہے؟''

''نام......'' وہ بے حد پریشان لہجے میں بولا۔ ''مرزا اینڈ کمپنی......''

اس نے افراتفری میں میرے سوال کا جواب تو دے دیا تھا لیکن اب الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''مرزا اینڈ کمپنی......'' میں نے اس کے جواب کو دہرایا پھر سوال کیا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کمپنی کے کتنے مالک ہیں؟''

''ایک ہی مالک ہے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مرزا یاسر بیگ ان کا نام ہے اور میں مرزا صاحب کے لیے ہی کام کرتا ہوں۔''

''تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ تم انگلش پڑھ اور سمجھ لیتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو تمہیں 'مرزا اینڈ کمپنی' کا مطلب بھی پتا ہو گا؟''

''بتایا تو ہے...... مرزا یاسر بیگ کی کمپنی۔'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

''تمہارے جواب سے معزز عدالت کی تسلی نہیں ہوئی۔'' میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''مرزا اینڈ کمپنی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کمپنی میں مرزا صاحب کے علاوہ کوئی اور بھی شراکت دار ہے اور تم کہتے ہو کہ مرزا یاسر بیگ اس کمپنی کے اکیلے ہی مالک ہیں۔''

''اب اتنی باریک باتوں پر میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''یہ سوال آپ مرزا صاحب سے کریں۔''

''ضرور کروں گا۔ بس مرزا صاحب ذرا اس کٹہرے میں آجائیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ تم پانچ چھ یا سات افراد سے گاڑیوں کی قسطیں وصول کرنے جاتے ہو۔ کیا تم ان میں سے صرف تین افراد کا نام بتا سکتے ہو۔ ظاہر ہے، رسید پر نام بھی لکھا جاتا ہوگا۔''

ان لمحات میں وہ بے حد پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے اپنی شاطر جرح سے اسے اس طرح باندھ کر رکھ دیا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اب تک لاتعداد جھوٹ بولے تھے اور مزید بھی بولنے کا ارادہ تھا کیونکہ جھوٹ کی یہ خاصیت ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں اور شہبازی کے ایک ایک جھوٹ کا عدالتی ریکارڈ مرتب ہو رہا تھا۔

میں نے اسے گہرے تذبذب میں دیکھا تو تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''کسی بھی شخص کا نام لینے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا کیونکہ میں عدالت سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے مذکورہ افراد کو عدالت میں بلایا جائے۔''

میری اس تنبیہہ پر فوراً اس کی یادداشت چلی گئی۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''اس وقت...... مجھے کسی کا نام یاد نہیں آرہا۔''

''تمہیں اپنا نام تو یاد ہے نا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں شہبازی ہوں۔''

''تم شہبازی نہیں، الو ہو......'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم معزز عدالت کے روبرو اتنے جھوٹ بول چکے ہو کہ یہاں سے سیدھے جیل بھی جا سکتے ہو......'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

شہبازی کے بعد اس کا جوڑی دار شہزاد گواہی دینے کے لیے آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور وکیلِ استغاثہ اس سے سوال جواب کرنے لگا۔

''تم بھی شہبازی کی طرح مرزا صاحب کے ملازم ہو؟''

''جی وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں ایک ساتھ ہی پیسوں کی وصولی کے لیے جایا کرتے ہیں۔''

''یہ زہرہ بیگم کا کیا قصہ ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''جناب! زہرہ بیگم بہت ہی چالاک اور چالباز عورت ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس نے مرزا صاحب سے قسطوں پر ایک کار خریدی تھی لیکن چند ماہ کے بعد اس نے قسطیں دینا بند کر دیں۔ ہم مرزا صاحب کے حکم پر جب اپنی کار واپس لینے اس کے گھر گئے تو اس کے بیٹوں نے ہمیں پکڑ لیا اور دھکے مار کر وہاں سے بھگا دیا۔''

''اوہ......'' وکیلِ استغاثہ نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تم بھی تو دو تھے پھر ان دو بھائیوں سے پٹ کیسے گئے؟''

''جناب! ان دو کے ساتھ ان کے دو دوست بھی تھے۔'' شہزاد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے ہمیں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ویسے بھی مرزا صاحب نے ہمیں خاص طور پر ہدایت کر رکھی ہے کہ کلائنٹس کے ساتھ مار پیٹ یا دنگا فساد نہیں کرنا۔''

''کیا تم ان چار افراد کو پہچان سکتے ہو جنہوں نے اس روز تمہیں اور تمہارے ساتھی شہبازی کو زدوکوب کیا تھا؟''

''میں صرف زہرہ بیگم کے بیٹوں خالد باری اور عابد باری کو پہچان سکتا ہوں۔'' گواہ نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔ ''ان کے دوستوں کے چہرے مجھے یاد نہیں ہیں۔''

مزید ایک دو سوالات کے بعد وکیلِ استغاثہ نے جرح موقوف کر دی۔

میں نے اپنی باری پر جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ شہزاد سے استفسار کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ لوگ تمہیں کاکا کے نام سے بھی جانتے ہیں؟''

''جی درست ہے۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں ''کاکا'' کے نام سے مشہور ہوں لیکن میرا اصل نام شہزاد ہی ہے۔''

''کاکا! تمہیں مرزا اینڈ کمپنی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''لگ بھگ ایک سال۔'' اس نے جواب دیا۔

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ایک سال اچھا خاصا عرصہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب، تم اپنے سیٹھ مرزا یا سربیگ کو تو اچھی طرح جانتے ہو گے؟''

''جی ہاں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''معزز عدالت کو بتاؤ کہ مرزا صاحب کس قسم کے

گھر میں رہتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ چار کمروں والے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔''

''کیا تم بھی ان کے فلیٹ پر گئے ہو؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تین چار مرتبہ گیا ہوں۔''

''مرزا صاحب کا فلیٹ کس فلور پر واقع ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''سیکنڈ فلور پر۔''

''اس فلیٹ کے علاوہ مرزا صاحب کا کوئی اور گھر بھی ہے؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''شہزاد کا بیان شہبازی کے بیان کی نفی کرتا ہے جناب عالی!'' میں نے کرسیِ انصاف پر بیٹھے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شہبازی کے بیان کے مطابق اس وقت مرزا یاسر بیگ کے حاضر اسٹاک میں سات آٹھ گاڑیاں موجود ہیں جن میں سے تین چار گاڑیاں گھر کے اندر اور باقی گھر سے باہر گلی میں دیوار کے ساتھ کھڑی رہتی ہیں جبکہ شہزاد کاکا نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ مرزا یاسر بیگ کسی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر واقع چار کمروں والے ایک فلیٹ میں رہتا ہے۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ اس اہم نکتے کو نوٹ کیا جائے۔''

جج نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔ میں دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کاکا! تم اور شہبازی مرزا اینڈ کمپنی کے لیے کیا کیا کام کرتے ہو؟''

''ہم لوگ سامان وغیرہ خریدتے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ ''بعض لوگوں کے گھر جا کر قسط کی رقم وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی قرض دار پیسے واپس نہ کر رہا ہو تو اس کے پاس بھی جاتے ہیں۔''

''ذرا سوچ کر بتاؤ، اس وقت مرزا یاسر بیگ کے پاس کتنی گاڑیاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان کے پاس تو کوئی بھی کار نہیں ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

کاکا کا یہ بیان بھی شہبازی کے بیان کے برعکس تھا کہ مرزا کے گھر میں سات آٹھ گاڑیاں موجود ہیں۔ دونوں گواہوں کے بیانات میں اتنا زیادہ تضاد نکل آیا تھا کہ ان کی گواہی اصولی طور پر معتبر نہیں رہی تھی اور یہ ہمارے حق میں بہت بہتر تھا۔

میں نے مزید چند سوالات کے بعد جرح ختم کر دی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' اینڈ ''بخاری انویسٹرز'' کا مالک اشفاق بخاری کھڑا تھا۔ اشفاق بخاری کو چند روز پہلے مبینہ طور پر اغوا کر لیا گیا تھا جو میرے خیال میں ''بخاری اینڈ مرزا گٹھ جوڑ'' کا شاخسانہ تھا۔ میں نے بخاری کو اچھی طرح دھونے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

اشفاق بخاری کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ ایک باریش کاروباری شخص دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اچھی خاصی وضع قطع کا آدمی سود کے کاروبار میں ملوث تھا۔ دولت کی ہوس نے اس کے کردار کو آلودہ کر رکھا تھا۔ ایسے ہی افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے...... صورت مومناں، کرتوت کافراں!

اشفاق بخاری نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مرزا یاسر بیگ نے شراکت کی بنیاد پر کچھ رقم اس کے کاروبار میں لگائی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر کاروبار میں نقصان ہو گیا اور مرزا نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ بخاری کا سرمایہ چونکہ کاروبار میں لگا ہوا تھا لہٰذا مرزا کے اصرار پر اس نے دو لاکھ نقد اور آٹھ گاڑیاں اس کے حوالے کر دی تھیں۔

وکیلِ استغاثہ نے کچھ اس طرح جرح کا آغاز کیا۔

''بخاری صاحب! آپ نے جو آٹھ گاڑیاں مرزا کو دی تھیں وہ آپ کے اسٹاک میں موجود تھیں یا گاہکوں کے استعمال میں تھیں؟''

''یہ تمام گاڑیاں گاہکوں کے تصرف میں تھیں۔'' بخاری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور یہ سب گاڑیاں قسطوں پر فروخت کی گئی تھیں۔''

''کیا انہی گاہکوں میں زہرہ بیگم بھی شامل تھی؟''

''جی ہاں۔'' بخاری نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور جرح ختم کر کے اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

''بخاری صاحب!'' میں نے وٹنس باکس کے قریب آ کر گواہ کو مخاطب کیا۔ ''اس کیس کے ضمن میں آپ کی دو کمپنیوں کا ذکر آیا ہے۔ نمبر ایک شاہین ٹریڈنگ کمپنی، نمبر دو بخاری انویسٹرز۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا یہ کمپنیاں

پبلک لمیٹڈ ہیں یا پرائیویٹ لمیٹڈ؟''
''دونوں پرائیویٹ لمیٹڈ ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''کیا یہ درست ہے کہ ''بخاری انویسٹرز'' لوگوں سے سرمایہ جمع کرتی تھی اور ''شاہین ٹریڈنگ کمپنی'' لوگوں کو قسطوں پر کاریں فروخت کرتی تھی؟''
''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''
''بخاری صاحب! اس کیس کے مدعی مرزا ایاسر بیگ نے اپنے بیان میں دعویٰ کیا ہے کہ اس نے آپ کی کمپنی ''بخاری انویسٹرز'' میں مبلغ دس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی تھی۔ کیا مرزا صاحب کا یہ بیان درست ہے؟''
''جی ہاں، مرزا صاحب نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' بخاری نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
''بخاری صاحب! کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نفع ونقصان کی بنیاد پر لوگوں سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں؟'' میں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے سوال کیا۔
اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی بالکل، یہ عین اسلامی طریقہ ہے۔ ہمارے ایگری منٹ فارم میں یہ شرط واضح طور پر موجود ہے۔''
''آپ سب انویسٹرز کے ساتھ ایک جیسا ہی ایگری منٹ کرتے ہیں یا مختلف افراد کے ساتھ ایگری منٹ کی نوعیت مختلف بھی ہوتی ہے؟''
''وکیل صاحب! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عین شرعی اور اسلامی طریقے سے کاروبار کرتا ہوں۔'' وہ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا مختلف قسم کے ایگری منٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چاہے کوئی ایک ہزار روپے انویسٹ کرے یا ایک کروڑ، سب کا ایگری منٹ ایک جیسا ہی ہوگا۔''
''بخاری صاحب! آپ نے اپنے حلفیہ بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ اس وقت آپ کی کمپنی خسارے میں جارہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کتنے فیصد خسارہ ہوا ہے؟''
''میں آپ کو بالکل درست ہندسہ تو نہیں بتا سکتا۔'' وہ چالاکی سے بولا۔ ''لیکن میرا اندازہ ہے کہ اوسطاً پچیس فیصد سے زیادہ خسارہ ہے۔''
''بخاری صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ چند ہفتے پہلے آپ کو دفتر سے اغوا کرلیا گیا تھا اور اغوا کنندگان اپنے ساتھ دفتر کا سارا ریکارڈ بھی اٹھا لے گئے تھے؟''
''جی، ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔
''کیا یہ صحیح ہے کہ اغوا کاران لوگوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے جنہوں نے ''بخاری انویسٹرز'' میں رقوم لگا رکھی ہیں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔
''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ رکھائی سے بولا۔
''کچھ جانتے نہیں یا بتانا نہیں چاہتے؟''
''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔
''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ بہت کچھ جانتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن کسی مصلحت کے پیشِ نظر زبان نہیں کھولنا چاہتے۔ اینی ہاؤ......'' میں نے ذرا توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''بخاری صاحب! آپ کے اغوا کے سلسلے میں جو ایف آئی آر کاٹی گئی ہے، اس کا مضمون یقیناً آپ کے علم میں ہوگا؟''
میں نے خالد باری کی مدد سے مذکورہ ایف آئی آر کی ایک کاپی حاصل کرلی تھی۔ خالد باری نے تھانے میں کچھ رقم خرچ کی تھی اور ہمارا کام ہوگیا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔
''وہ رپورٹ میرے منیجر ارشد ملک نے کروائی تھی۔''
''رپورٹ کسی نے بھی درج کرائی ہو، میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ آیا آپ اس رپورٹ کے مندرجات سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں؟''
میرے اصراری انداز سے بخاری نے بھانپ لیا کہ مذکورہ ایف آئی آر کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ اگر وہ ایف آئی آر کے مضمون سے اختلاف کرتا تو یہ بات یقیناً اغوا کے کیس پر اثرانداز ہوسکتی تھی۔ سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے کہا۔
''جی، میں اس رپورٹ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔''
''بخاری صاحب! آپ کے اغوا پر منیجر ارشد ملک نے جو رپورٹ درج کرائی تھی۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ اغوا کنندگان کا تعلق انہی لوگوں سے ہے جنہوں نے آپ کی کمپنی میں رقمیں لگا رکھی تھیں۔'' میں نے کرید نے والے انداز میں کہا۔ ''اغوا کنندگان جاتے ہوئے دفتر کا گاڑیوں والا سارا ریکارڈ بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کیا

یہ سچ ہے کہ وہ لوگ دو لاکھ کیش بھی لے گئے تھے؟''
چونکہ یہ بات بھی ایف آئی آر میں درج تھی لہٰذا بخاری کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''جی، یہ سچ ہے۔''
''بخاری صاحب!'' میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے طور پر آپ کے اغوا کے کیس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں جس کے مطابق پولیس ابھی تک اغوا کنندگان کو گرفتار نہیں کر سکی لہٰذا گاڑیوں کے کاغذات، دو لاکھ کیش اور دیگر دفتری ریکارڈ کی بازیابی نہیں ہو سکی۔ کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟''
میں نے اس کے لیے اختلاف کے سارے دروازے بند کر دیے تھے لہٰذا اسے میری اس بات سے بھی اتفاق کرنا پڑا۔ میں اس کے بہت قریب چلا گیا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔
''بخاری صاحب! اغوا کنندگان اس روز آپ کے دفتر سے جو گاڑیوں کے کاغذات اور دیگر ریکارڈ اپنے ساتھ لے گئے تھے اس کا ایک حصہ اس کیس کے مدعی مرزا یاسر بیگ کے پاس کیسے پہنچ گیا؟''
''م......'' وہ بوکھلا گیا۔ ''مجھے...... کیا معلوم......!''
''ابھی سب معلوم ہو جائے گا بخاری صاحب!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ زہرہ بیگم نامی ایک خاتون نے آپ سے قسطوں پر ایک نئی سوزوکی سوئفٹ کار خریدی تھی؟''
''جی ہاں، انہوں نے شاہین ٹریڈنگ کمپنی سے ایک لاکھ مالیت کی ایک نئی سوئفٹ کار قسطوں پر خریدی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بیس ہزار روپے ایڈوانس پیمنٹ کی تھی اور پھر چھ ماہ تک تین ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے اٹھارہ ہزار روپے ادا کیے تھے۔''
''کیا یہ بھی درست ہے کہ اسی زہرہ بیگم نے آپ کی کمپنی میں یعنی ''بخاری انویسٹرز'' میں پچاسی ہزار روپے بھی لگا رکھے تھے؟''
''جی...... بالکل۔''
''بخاری صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قواعد و ضوابط کے مطابق ہر ممبر کے حقوق اور اختیارات یکساں ہیں خواہ اس نے ایک ہزار روپے انویسٹ کر رکھے ہوں یا ایک کروڑ......؟''
''جی ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اور حقیقت بھی یہی ہے۔''
''جب حقیقت یہی ہے تو پھر مرزا یاسر بیگ اور زہرہ بیگم کے اختیارات اور حقوق الگ الگ کیوں؟'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔
''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بخاری صاحب! کیا یہ درست ہے کہ آپ نے اپنے اغوا سے قبل زہرہ بیگم کے جمع شدہ پچاسی ہزار میں سے سوئفٹ کار کی باقی ماندہ رقم یعنی باسٹھ ہزار روپے وضع کر کے تئیس ہزار روپے انہیں واپس کر دیے تھے؟''
''زہرہ بیگم کا بڑا بیٹا خالد باری میرے پاس آیا تھا اور......''
''تفصیل نہیں بخاری صاحب!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''صرف ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دیں۔''
وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جی بالکل، میں نے خالد باری کی درخواست پر انویسٹ منٹ کی رقم میں کار کی قیمت ایڈجسٹ کر لی تھی۔''
''بخاری صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ مذکورہ سوزوکی سوئفٹ کی قیمت وضع کرنے کے باوجود آپ نے اس کار کے کاغذات مرزا یاسر بیگ کے حوالے کیوں کیے؟''
''میں نے وہ کاغذات......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ سارے کاغذات تو میرے دفتر سے اغوا کنندگان اپنے ساتھ لے گئے تھے......''
''تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے اغوا کنندگان کا مرزا یاسر بیگ سے گہرا تعلق ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ انہی کاغذات کے سہارے مرزا کے بندے زہرہ بیگم اور اس کے بیٹوں کو پریشان کرتے رہے ہیں۔''
''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ...... کو جو...... بھی پوچھنا ہے...... مرزا سے پوچھیں......''
''مرزا کی باری پر ان سے بھی بہت کچھ پوچھا جائے گا۔ فی الحال، آپ اپنی باری کو بھگتانے کی کوشش کریں۔''

میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ مرزا ایاسر بیگ نے اپنے بیان میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے دس لاکھ روپے آپ کی کمپنی میں انویسٹ کیے تھے۔ پھر جب آپ کی کمپنی خسارے میں جانے لگی تو مرزا نے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ آپ کے پاس اس وقت دس لاکھ کی رقم نہیں تھی لہٰذا آپ نے مرزا کو دو لاکھ روپے کیش پکڑائے اور آٹھ ایسی گاڑیوں کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے جن کی مجموعی مالیت آٹھ لاکھ کے اریب قریب تھی۔ گویا آپ نے مرزا ایاسر بیگ کا حساب چکتا کر دیا تھا۔''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہمارے درمیان اسی قسم کی ڈیل ہوئی تھی۔''

''گڈ......'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اب اس امر کی بھی وضاحت کر دیں کہ زہرہ بیگم والی گاڑی کے کاغذات آپ نے مرزا ایاسر بیگ کے حوالے کیوں کیے تھے جبکہ آپ اس گاڑی کی مکمل پیمنٹ وصول کرنے کے بعد خالد باری کو رقم کی ادائیگی کی رسید بھی دے چکے تھے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ نہیں کہیے گا کہ زہرہ بیگم والی گاڑی کے کاغذات اغوا کنندگان اپنے ساتھ لے گئے تھے ورنہ عدالت یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ اپنے اغوا کا ڈراما آپ نے خود ہی رچایا تھا۔ اس مکروہ کھیل میں مرزا ایاسر بیگ آپ کا پارٹنر ہے۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ شکست خوردہ لہجے میں اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں آپ کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ آپ نے بڑی مہارت سے مجھے کارنر کر دیا ہے لیکن اب میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا کیونکہ مجھے اپنی جان کی سلامتی عزیز ہے۔ جب انسان کو تحفظ دینے والے ادارے بے بس اور لاچار نظر آتے ہوں تو پھر بندہ خود ہی کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی جو کچھ کیا، اپنی جان کی سلامتی کے لیے مجبوری میں کیا ہے۔''

''آپ کی جان کو کس قسم کا خطرہ تھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

وہ ضدی لہجے میں بولا۔ ''اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

''مسٹر بخاری! جواب تو آپ کو دینا پڑے گا۔'' جج نے سرزنش آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ عدالت کا کمرا ہے، تمہارا ڈرائنگ روم نہیں۔''

''سر! میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔

''آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے، عدالت میں کہیں۔'' جج نے اس کی درخواست رد کرتے ہوئے کہا۔

اشفاق بخاری ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت سے دوچار تھا۔ فرار کے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ میری جرح نے اسے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اقبال جرم کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ پھر اس نے سب کچھ اگل ڈالا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر جج نے فریقین کے وکلا کے دلائل سنے۔ ہمارا کیس بہت واضح اور مضبوط تھا۔ گزشتہ پیشی پر اشفاق بخاری کے اقراری بیان نے ہمارے حق میں راستہ ہموار کر دیا تھا۔ یہ سارا کھٹ راگ مرزا اینڈ بخاری کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ وہ دونوں اندر سے ملے ہوئے تھے اگرچہ بخاری نے یہ کہہ کر اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس گھناؤنے کھیل میں مرزا نے زبردستی اسے گھسیٹ لیا تھا۔ وہ دونوں جائیں جہنم میں۔ اہم بات یہ تھی میری جرح نے زہرہ بیگم کو حق پر ثابت کر دیا تھا۔

مسز زہرہ اور ان کے دونوں بیٹے اس کامیابی پر بے انتہا خوش تھے۔ خالد باری نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ واقعی، چھوٹی اور بڑی لکیر والا فلسفہ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔''

''باری صاحب! دنیا میں کوئی چیز چھوٹی بڑی نہیں ہوتی۔ ان کے کردار انہیں دراز قامت اور پستہ قامت بناتے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس لیے کسی چیز کو چھوٹا دیکھ کر حقارت کی نگاہ سے نہیں تکنا چاہیے اور نہ ہی کسی قد آور شے کو دیکھ کر فوراً متاثر ہو جانا چاہیے۔''

''جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' زہرہ بیگم نے تائیدی انداز میں کہا۔

وہ کافی دیر تک عدل و انصاف کے موضوع پر مجھ سے بات کرتے رہے پھر مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

''عدل و انصاف'' واقعی، انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جب یہ حرکت میں آجائیں تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر ہی رہتا ہے جیسا کہ اس کیس میں ہوا۔

(تحریر: مُسلم بٹ)

بھید

سلیم انور

کسی بھی انسان کے لیے کوئی بھی ایسی شے جس سے اسے خوشی اور شادمانی کا احساس ملتا ہو... وہ دنیا کی ہر متاع سے زیادہ قیمتی ہوسکتی ہے۔ اس کے پاس بھی ایک ایسا ہی راز تھا جسے وہ اپنے سائے سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا مگر... اس بھید کی وہ زیادہ دیر حفاظت نہ کرسکا۔

ایک غریب کی متاعِ حیات کا ماجرا جس سے اس کی ہر خوشی وابستہ تھی

اس چھوٹے سے پراسرار ڈبے میں کیا تھا؟ جون بیکسٹر کو اس کا علم تھا لیکن وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی سفر کرتا، یہ ڈبا ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کسی کو بھی حتیٰ کہ اس کی اپنی فیملی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس ڈبے کے اندر کیا ہے۔
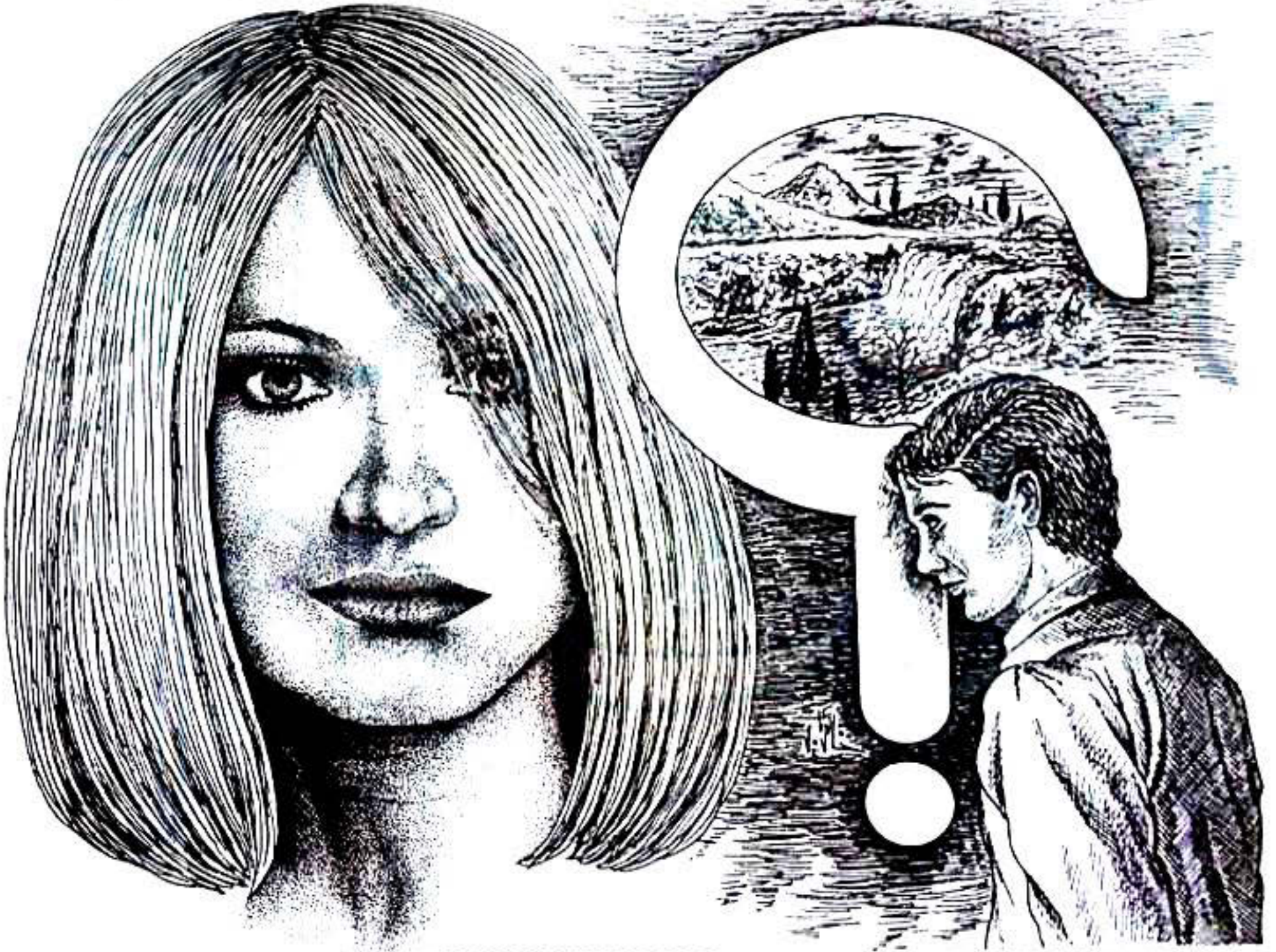
ایک روز جون بیکسٹر شراب خانے میں داخل ہوا تو وہاں موجود ہر فرد اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ سب کی نظریں اس کے ہاتھ میں موجود ڈبے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے قبل کہ جون اپنا منہ کھولتا، بارٹینڈر تیزی سے اس کے پاس آگیا۔

''سر! اس بکس میں کیا ہے؟'' بارٹینڈر نے پوچھا۔

''خوشی اور شادمانی کا راز۔'' جون نے جواب دیا۔
''خوشی اور شادمانی کے راز سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''
''اگر میں نے تمہیں بتا دیا کہ اس سے میرا کیا مطلب ہے تو پھر یہ کوئی راز نہیں رہے گا..... کیا خیال ہے؟'' جون نے کہا۔
''ہاں، میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو لیکن کیا یہ قدرے عجیب سا نہیں کہ تم اس بکس کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کوئی بم بھی تو ہوسکتا ہے..... ہے نا؟''
''مسٹر! تمہارے اس الزام پر میں نے بُرا منایا ہے۔'' جون نے جواب دیا۔
''میں نے تم پر کسی قسم کا کوئی الزام لگانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ میں تو صرف اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں۔ یہاں پر کچھ نہایت... تشدد پسند قسم کے گاہک بھی آتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ بکس دیکھ لیا تو وہ کسی بھی اوچھی حرکت پر اتر سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ بڑے شرم کی بات ہے لیکن میں کیا کہوں۔ ہم سخت گیر قسم کے لوگوں کو یہاں آنے سے روک نہیں سکتے۔ یہ پبلک پلیس ہے۔'' بارٹینڈر نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔
''مسٹر! کیا تم سیدھی طرح اپنا مدعا بیان نہیں کرسکتے؟'' جون نے کہا۔
''اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہ بکس کسی اور جگہ لے جاتا۔'' بارٹینڈر نے جواب دیا۔
''کیوں؟''
''جیسا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں، کوئی اسے چوری بھی کرسکتا ہے۔''
''میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں۔'' جون نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''تھینک یو۔''
''او کے، اگر تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے۔'' بارٹینڈر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور دوسری جانب چل دیا۔
بارٹینڈر کے جانے کے بعد جون بیٹھنے کے لیے خالی میز کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا لیکن اس سے قبل کہ وہ آگے بڑھتا، ایک عورت نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ وہ عورت بلاشبہ نشے میں دھت تھی۔
''ہے ہنی..... اس بکس میں کیا ہے؟'' عورت نے پوچھا۔
''خوشی اور شادمانی کا راز۔'' جون نے جواب دیا۔
''تمہارا مطلب ہے کہ اگر مجھے اس بکس کے اندر جھانکنے کا موقع مل جائے تو میں خوش ہوجاؤں گی؟''
''میرا خیال ہے، تم یہ بات کہہ سکتی ہو۔''
''تو کیا میں اس کے اندر دیکھ سکتی ہوں؟''
''اگر تمہیں پتا چل گیا کہ اس کے اندر کیا ہے تو پھر یہ کوئی راز نہیں رہے گا۔'' جون نے کہا۔
''مجھے اندازہ لگانے دو۔'' عورت نے کہا اور سوچنے لگی پھر بولی۔ ''کیا اس بکس کے اندر کوکین کے بلوری، تند، نشہ آور ریزے ہیں جو مجھے مست کرسکتے ہیں..... ہیں نا؟''
''تم نے قیاس کیسے لگایا؟'' جون نے جاننا چاہا۔
''اس لیے کہ یہ مجھے خوشی اور شادمانی عطا کریں گے۔'' عورت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ تمہارے پاس اس بکس میں کوکین ہے؟'' عورت نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔
''میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' جون نے جواب دیا۔
''دیکھو مین! میں تمہارے اس کھیل سے اکتا گئی ہوں۔ میں یہاں اس لیے نہیں آئی ہوں کہ کوئی مجھ سے خواہ مخواہ مخول کرتا رہے۔ میں یہاں پینے پلانے، مستیاں کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے آئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم اس معاملے میں میری مدد کرو گے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ تم میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ بہرحال کوئی مسئلہ نہیں۔ میں لطف اندوز ہونے کے لیے کوئی اور مرد تلاش کرلوں گی۔'' عورت نے پھنکارتے ہوئے کہا اور پلٹ کر دوسری جانب چل پڑی۔
اس بات کا احساس ہونے پر کہ وہ بکس اس کے لیے غیر ضروری توجہ کا باعث بن رہا ہے، جون شراب خانے سے باہر آگیا پھر اس سے پیشتر کہ وہ اپنی کار تک پہنچتا، ایک شخص نے بڑھ کر اس کا بازو جکڑ لیا۔
جون نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ اسے روکنے والا کوئی بے رحم بازاری بندہ ہے۔
''ارے، تم کہاں جارہے ہو؟'' اس غنڈے نے کہا۔
''میں اپنی کار کی طرف جارہا ہوں۔'' جون نے جواب دیا۔
''تم اپنی کار کی طرف کیوں جارہے ہو؟ کیا تمہیں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے؟'' غنڈے نے کہا۔ جون خاموش رہا۔
''سنو خوش پوش، تمہیں اطمینان اور سکون کی ضرورت ہے۔ اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میرا کیا مطلب ہے تو پھر کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے آپس میں گپ شپ کرلیں؟''

''تم کس بارے میں گپ شپ کرنا چاہتے ہو؟'' جون نے پوچھا۔

''مثال کے طور پر اس بکس کے بارے میں جو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔'' اس شخص نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''اوسوالڈ، کیون اوسوالڈ...... اور تمہارا کیا نام ہے؟'' غنڈے نے پوچھا۔

''جون...... جون بیکسٹر۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ کوئی خاص تخلیقی نام نہیں ہے، ہے نا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہ کوئی خاص یا اچھوتا نام نہیں ہے..لیکن میرا بس یہی نام ہے۔'' جون نے بتایا۔

''تو پھر اس بکس میں کیا ہے؟''

''خوشی اور شادمانی کا راز۔'' جون نے جواب دیا۔

''خوشی اور شادمانی کا راز کیا ہے؟''

''یہ تو تمہارے اپنے اوپر منحصر ہے۔''

''سنو حرام زادے......'' غنڈا گالیوں پر اتر آیا۔ ''میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ تم نے اس بکس میں رقم چھپا کر رکھی ہوگی، ہے نا؟ یقیناً یہ رقم ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ دولت ہی وہ واحد شے ہے جو ہر ایک کو خوشی عطا کرتی ہے۔ ویل اب جبکہ میں نے تمہارا راز دریافت کرلیا ہے تو کیا میں یہ بکس کھول سکتا ہوں؟''

''سر! یقین کریں بکس کھولنے سے آپ کو خوشی ہرگز نہیں ہوگی۔'' جون نے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ یہ بکس خوشی اور شادمانی کی کنجی ہے، کیا تم جھوٹے ہو؟''

''اس میں خوشی اور شادمانی کا بھید چھپا ہوا تھا لیکن صرف اس صورت میں اگر آپ کو علم ہو کہ آپ کو کیا شے خوشی عطا کرے گی۔'' جون نے قدرے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''فضول بکواس بند کرو اور یہ بکس مجھے دے دو۔''

جون نے قدرے تردد کیا تو کیون اوسوالڈ کے صبر کا پیمانہ مزید لبریز ہوگیا۔ اس نے جھپٹ کر جون کی گردن دبوچ لی اور اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ جون نے ہاتھ پیر مارنا شروع کردیے لیکن خود کو کیون کی مضبوط گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

کیون اوسوالڈ نے اپنی گرفت اس وقت ڈھیلی کی جب جون کا دم نکل گیا۔

پھر کیون نے وہ بکس اٹھالیا اور پوری طاقت سے اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا بالآخر بکس کھل گیا۔

جب کیون نے بکس کے اندر دیکھا تو وہاں کوئی ایسی قابلِ ذکر شے موجود نہیں تھی جو کہ چوری کیے جانے کے لائق ہو۔ اس کے اندر نہ تو منشیات تھی، نہ جواہرات اور نہ ہی کوئی اور قیمتی شے...... حتیٰ کہ کوئی رقم یا نقدی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک چھوٹی سی تصویر پڑی تھی۔

یہ تصویر جون کی بیوی کی تھی جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور وہ جہاں کہیں بھی جاتا تھا، اس تصویر کو ساتھ لے جاتا تھا...... اور اپنی بیوی سے محبت ہی صرف اور صرف اس کی خوشی اور شادمانی کا راز تھا۔

محفلِ شعر و سخن

* محمد ادریس...... اسلام آباد

حصولِ منزلِ جاں کا ہنر نہیں آیا
وہ روشنی تھی کہ کچھ بھی نظر نہیں آیا

* ثنا...... ناظم آباد، کراچی

تیرے وعدے کی پاسداری میں
عمر گزری ہے بے قراری میں
زندگی مختصر ہی اچھی ہے
کیا مزہ اس کی پائیداری میں

* دانش عمیر...... گلستان جوہر، کراچی

یوں تو میرے خلوص کی قیمت بھی کم نہ تھی
کچھ لوگ کم شناس تھے دولت پہ مر گئے

* ظفر اقبال ظفر...... کاسرہ شرقی

عمر بھر ساتھ دیں گے سدا چاہیں گے
صرف الفاظ ہیں الفاظ میں کیا رکھا ہے

* قاری محمد رمضان حسرت الحسنی...... خوشاب

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں جہاں تک دیکھوں
حسنِ یزداں سے حسنِ بتاں تک دیکھوں
اک حقیقت ہی سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نپٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

* ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... ہارون آباد

پلتی ہے تقدس کے لبادے میں حقارت
بجتے ہیں حوادث کے گجر شہر میں تیرے

* اطہر حسین...... کراچی

سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں جیسے دولتِ کونین پا گئے

* داؤد اشفاق...... اوکاڑہ

جن میں دریا رہا کرے کوئی
ایسی آنکھوں کا کیا کرے کوئی
میں تو خود میں الجھ گیا ہوں بہت
مجھ کو مجھ سے جدا کرے کوئی

* ٹیلر سجاد حسین کھارا...... خوشاب

لوٹ آئے نہ کسی روز وہ آوارہ مزاج
کھول رکھتے ہیں اس آس پہ در شام کے بعد

* سجاد علی ترگوی...... عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی

شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں
دل ہی کافی ہے تیری یاد میں جلنے کے لیے

* کمال انور...... اورنگی ٹاؤن، کراچی

کبھی نرمی کبھی سختی کبھی عجلت کبھی دیر
وقت اے دوست بہرحال گزر جاتا ہے
لمحہ لمحہ نظر آتا ہے کبھی اک اک سال
کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے

* مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص

یہ کائنات ہے منہ بولتا ثبوت اس کا
کسی دلیل کی حاجت نہیں خدا کے لیے

❁ چودھری محمد یعقوب...... کمبوہ نگر، خانیوال
جنوں بھی خود کو تو نہ چن سکوں اب
کہ تیری تلاش میں ایسا بکھر گیا ہوں میں
گر کر تیری نگاہ سے ہوا ہے یوں محسوس
فرازِ عرش سے جیسے اتر گیا ہوں میں

❁ سید محی الدین اشفاق...... فتح پور، لیہ
کاٹ کر ہاتھ میرے رکھ دیے میرے آگے
کوئی تاوان نہیں اجرِ ہنر مانگا تھا
نہ جانے کس لیے وقت خفا ہے مجھ سے
میں نے سوکھے ہوئے پیڑوں سے ثمر مانگا تھا

❁ مرحا گل، رمنا گل...... درابن کلاں
میں تیرے ملنے کو معجزہ کہہ رہا تھا
تیرے بچھڑنے کا سانحہ بھی کمال گزرا
ہراس، بارود، موت، شب خون کا خوف محسن
نہ پوچھ کتنی اذیتوں میں یہ سال گزرا

❁ ایم عمران جونانی...... رنچھوڑ لائن، کراچی
وہ جس کے ہونے سے زندگی نغمہ سرائی ہے
اسے کہنا کہ بھیگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے

❁ اشفاق شاہین...... کراچی
اس کی خوشبو مرے اندر ہی سے آئی ہوگی
اس کا سایہ مرے احساس کا دھوکا ہوگا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی
چل میرے ساتھ کبھی تو کسی ویرانے میں
میں تجھے شہر کے ماحول سے ہٹ کر دیکھوں
مجھ کو ضد ہے مری بینائی رہے یا نہ رہے
تیرے چہرے کی نقابیں تو الٹ کر دیکھوں

❁ ملائکہ حریم...... اوکاڑہ
میرے گھر کی اداسیوں کے سبب
چاند آنگن میں رات بھر ٹھہرا

❁ ماہین فاطمہ...... اوکاڑہ
ان کے چہرے پہ کئی رنگ سہانے دیکھے
یونہی شب بھر مری آنکھوں نے خزانے دیکھے

❁ عبدالغفور خان ساغری...... چھب، ضلع اٹک
ہم نے سوچا تھا کہ بتائیں گے سب دکھ درد تم کو
پر تم نے تو اتنا بھی نہ پوچھا کہ خاموش کیوں ہو

❁ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
کسی کے شوق میں خود کو گنوا کر کچھ نہیں ملتا
کہ پھولوں کو کتابوں میں سجا کر کچھ نہیں ملتا
مزین کردے رنگوں سے اگر تصویر کیا کہنے
مصور کو فقط خاکے بنا کر کچھ نہیں ملتا

❁ ادریس علی...... سرگودھا
وہ میری دسترس میں آگئے ہیں
ستارے اپنے بس میں آگئے ہیں
تعاقب، خواہشوں کا کھیل ٹھہرا
عجب شہرِ ہوس میں آگئے ہیں

❁ ناہید اختر...... اسلام آباد
ہر ایک اپنے آپ ہی سے محوِ گفتگو
دورِ کمالِ فکر میں طوفاں اٹھا رہا
گزری ہماری زیست عجب انتظار میں
ہر لمحہ احتساب کا دھڑکا لگا رہا

❁ راجہ افتخار علی افی...... چکوال، موہڑہ راجگان
نہ میں قابلِ تعریف ہوں نہ قابلِ تحسین
اک بکھرا ہوا انسان ہوں الجھے ہوئے مزاج کا

❁ اظہر حسین پچار...... ہزاری، جتوئی
محبت تکمیل ہے قسمت کا اسے کہنا
کبھی یوسف نہیں ملتا زلیخا نام رکھنے سے

❁ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان
اپنے کردار کو موسم سے بچائے رکھنا
لوٹ کر پھول میں واپس نہیں آتی خوشبو

❁ ظفر احمد...... راولپنڈی
خوف کا پہرا لگا ہے آج پھر
کوئی فاقوں سے مرا ہے آج پھر
لال آندھی آج کتنی تیز ہے
خون انساں کا بہا ہے آج پھر

❁ رضوان تنولی کریڑوی...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
آخری ہچکی تیرے زانو پہ آئے
موت بھی شاعرانہ چاہتا ہوں

❁ اللہ نواز افق کلاچی...... ڈیرہ اسماعیل خان
سالِ گزشتہ آہ و فغاں میں گزر گیا
اللہ کرے سالِ رواں سازگار ہو

❊ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
چاند کی دلکشی زمین سے ہے
چاند پر چاندنی نہیں ہوتی

❊ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ..... ضلع خانیوال
ہمیں پھنسا کے یہاں فاصلوں کی الجھن میں
زمین ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

❊ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے لاچار جی سے ہم

❊ زرین آفریدی..... پٹھان کالونی، حیدرآباد
کہا میں نے اسے مجھے اپنی مٹھی میں بند کرلو
کہا اس نے تمہیں کیوں ریت سا گرتا بھی دیکھوں

❊ مہتاب احمد..... حیدرآباد
کسی کے دل کو نہ چھیڑو زبان کے نشتر سے
جدا کرے جو دلوں کو وہ گفتگو نہ کرو

❊ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ
اجنبی شہر میں اجنبی راستے میری تنہائی پر مسکراتے رہے
میں بہت دیر تک یونہی چلتا رہا تم بڑی دیر تک یاد آتے رہے

❊ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
لب پہ سجا لیے تھے یونہی اجنبی سے نام
دل میں تمام زخم کسی آشنا کے تھے

❊ محمد رشید سیال..... روہڑی، ضلع سکھر
تو جب سے بے درد ہوا ہے دل کا غنچہ زرد ہوا ہے
رشتے ناتے سب تھے اپنے، غم بھی گھر کا فرد ہوا ہے

❊ نورین..... گجرانوالہ
دریچے تو سارے کھلے ہیں مگر
دھواں ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں

❊ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف بائی پاس
جانے والوں کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اس کو لوٹ آنا ہے

❊ عتیق الرحمٰن، عمیر ارشد..... فیصل آباد، سمندری
جس کی نہ پانے میں سرگرداں رہے برسوں دماغ
باتوں باتوں میں وہ خفیہ چال چل جاتا ہے دل

❊ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
سنا ہے حشر میں کوئی کسی کا نہ ہوگا
مگر یہ رسم ابھی سے ہے عروج پر کیوں؟

❊ مدحت..... کراچی
مدت کے بعد کی جو اس نے لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

❊ محمد آصف جام..... بھکر
شب حیات میں اس مہربان کا مہمان تھا
جو شہر چھوڑ گیا شہر میں بلا کے مجھے

❊ ریاض بٹ..... حسن ابدال
تو کیسے سرد ہاتھوں سے میرے بال چھوتا تھا
دسمبر میں مجھے یہ تیری شرارت یاد آتی ہے

❊ معراج محبوب عباسی..... ہری پور، ہزارہ
گنگناتے ہوئے لگتے ہیں موسم
یہ نیا چاند، یہ نیا سال کیسا ہے

❊ وقار حسن..... راولپنڈی
دسمبر کی شب آخر نہ پوچھ کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں پھول بھیجے گا

❊ شازیہ..... کراچی
خود اپنے ہی اندر سے ابھرتا ہے وہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

❊ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
یاد رہے گا یہ دورِ حیات بھی ہم کو
کہ زندگی میں ہی ترسے ہیں زندگی کے لیے

❊ مہوش علی..... حیدرآباد
جو رد ہوتے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

درمیانہ قامت، بڑی بڑی مگر یاسیت سے بھرپور
آنکھیں عمر بیس سال، رنگ سیاہی مائل تھا اور یہی دکھ اس کی
عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا کہ وہ گوری پیدا کیوں
نہیں ہوئی۔ اسے بخوبی علم تھا کہ کالی لڑکیوں کے رشتے نہیں
آتے۔ سانولی مائل گندمی رنگت کو مختلف کریموں کے
ذریعے تھوڑا بہت گورا بنایا جاسکتا تھا مگر یہاں تو پیدائشی
تاریکی اس کے نصیب میں لکھی تھی حالانکہ زیبو کی اماں کافی
گوری اور خوب صورت تھی۔ باپ البتہ اس جیسی رنگت کا

اندھیرا

زبیر سلیمانی

آگ پیٹ کی ہو یا جہنم کی، اس سے بچنے کے لیے قدم یا تو بہت سوچ سمجھ کر اٹھائے جاتے ہیں یا انتہائی نادانی میں غلط سمت میں... مگر اس کا انحصار انسان کے شعور وادراک پر ہے جو... ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو وہ بھی اس آگ سے نجات کے لیے اس راہ پر ہرگز نہ چلتی جس نے اس کے ماضی، حال اور مستقبل کو اندھیروں کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔

نسل در نسل اتارے جانے والے زہر کی تباہ کاریاں
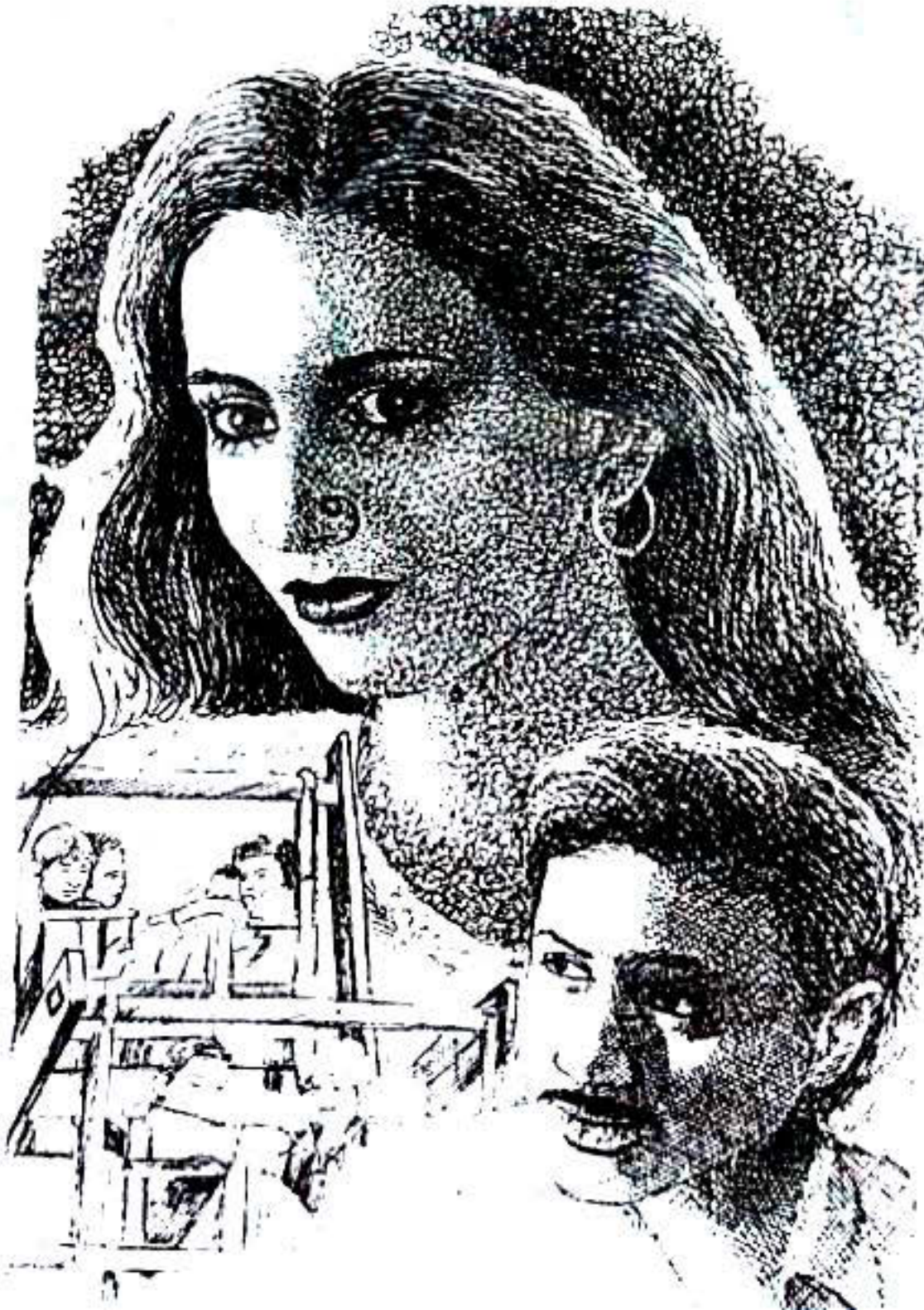
مالک تھا جبکہ زیبو کی باقی دونوں چھوٹی بہنیں رنگت اور حسن میں ماں پر گئی تھیں۔

زیبو کا باپ منشی فیروز سبزی منڈی میں ایک آڑھتی کے پاس سو روپے روزانہ پر منشی گیری کرتا تھا اور ماں آس پاس کے متمول گھروں میں جھاڑ پونچھ اور صفائی کا کام کرتی تھی۔ مزید ظلم اس کے ساتھ یہ ہوا کہ میٹرک کے امتحان سے پہلے ہی اسے اسکول سے ہٹا لیا گیا۔ وجہ یہ پیش کی گئی کہ گھر کو سنبھالنا بھی ضروری ہے، گھر کے کام کاج کون کرے گا۔ دو کمروں کے اس کرائے کے مکان میں ضروریاتِ زندگی کے لیے کچھ نہیں تھا بس تین چارپائیاں تھیں اور کچن میں کچھ مسالے کے ڈبے۔ کسی زمانے میں ٹی وی ہوتا تھا جو ایک روز چوری ہو گیا۔ منشی فیروز دین صبح کی اذان کے ساتھ بستر سے اٹھتا اور ایک کپ چائے پینے کے بعد منڈی چلا جاتا۔ وہاں سے صبح دس بجے ہی ایک پرائیویٹ اسکول چلا جاتا جہاں پر وہ پانچ ہزار ماہانہ پر چپڑاسی تھا۔ عمر تو اس کی پچاس سال تھی مگر خرابی صحت کے باعث ساٹھ کا لگتا تھا۔ زیبو کی ماں البتہ چالیس سال کی عمر میں بھی پینتیس کی لگتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے نکل جاتی اور سہ پہر کو لوٹتی تھی۔ کھانے پینے کا سامان وہ مختلف گھروں سے لے آتی تھی اس لیے کچھ پکانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

سونے والے کمرے کے ایک کونے میں چارپائی پر بستروں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ قریب ہی دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا کتا بندھا ہوا تھا مگر مجال ہے جو آج تک کسی اجنبی کے آنے پر بھونکا ہو۔ وہ اتنا بزدل کتا تھا کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتا تھا۔

اس روز منشی فیروز دین خرابی طبیعت کے باعث منڈی نہ جاسکا۔ اس کی بیوی جب ہلکا پھلکا میک اپ کر کے اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا کے اپنے کام پر جانے لگی تو منشی فیروز کی آنکھوں میں کچھ شک اور کچھ غیرت سی جاگ اٹھی۔

''کیا تو روزانہ یوں ہی بن ٹھن کے جاتی ہے؟'' اس نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

''اپنے یاروں سے ملنے جاتی ہوں نا...... اس لیے بن ٹھن کے جاتی ہوں...... اور کچھ کہنا ہے تو وہ بھی کہہ دے۔''

منشی فیروز دین نے مزید کچھ نہیں کہا بس خاموش رہا۔ بیوی کے جانے کے بعد منشی فیروز اپنی جگہ سے اٹھا اور زیبو سے مخاطب ہوا۔ ''میں کام سے جا رہا ہوں، دروازہ بند کر لے۔''

''ابا تجھے بخار ہے آج تو چھٹی کر۔'' زیبو اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''چھٹی کروں گا تو ایک دن کی دہاڑی کٹ جائے گی۔ گولی کھا لی ہے ابھی بخار اتر جائے گا۔'' اس نے کھانستے ہوئے جواب دیا اور پھر وہ باہر نکل گیا۔ دونوں بہنیں پہلے ہی اسکول جا چکی تھیں۔ اس وقت وہ حسب معمول اکیلی تھی۔

دس بجے کے قریب اس کے دروازے پر ہلکی سی سیٹی بجی۔ زیبو نے فوراً تکیے میں چھپائی ہوئی لپ اسٹک اٹھائی اور ہونٹوں پر لگانے لگی۔ یہ لپ اسٹک اس نے ایک ریڑھی والے سے ایک مسکراہٹ کے عوض خریدی تھی۔ لپ اسٹک لگانے کے بعد اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ ظفر اس کے دروازے کے سامنے اپنی بائیک پر بیٹھا تھا۔

''کیا حال ہے زیبو؟''

''بس ٹھیک ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''آج تو اپنی قسم توڑ کے اندر آنے دے۔ ایمان سے کچھ نہیں کہوں گا، صرف باتیں کریں گے۔'' وہ منت کرنے والے انداز میں بولا۔

''مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو اماں سے کہہ میرا رشتہ مانگنے آ جائے۔'' زیبو ماتھے پر رکھی ہوئی لٹ ہٹاتے ہوئے بولی۔

''وہ بھی آ جائے گی فکر کیوں کرتی ہے۔ اندر آنے دے گلی میں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔'' وہ دوبارہ دھیرے سے بولا۔

''نہیں جو کہنا ہے یہیں پر کہہ...... اگر کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔''

''موبائل نہیں ہے تیرے پاس؟'' اس نے سوال کیا۔

''ایک تھا پر اس میں پانی چلا گیا، اب کسی کام کا نہیں۔'' زیبو نے جواب دیا۔

''اگر پندرہ منٹ کے لیے اندر آنے دے تو تجھے نیا موبائل گفٹ کروں گا۔'' وہ دانہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہاں تاکہ میرے پاس نیا موبائل دیکھ کر میری ماں میری کھال اتار دے۔ مجھے نہیں چاہیے موبائل۔ تجھے اگر مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتا؟'' وہ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولی۔

''بس تیری تو ہر بات شادی پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ میں چلا۔'' وہ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''خفا ہو گئے ہو؟'' زیبو نے پوچھا۔

''تو اور کیا۔ تو جو اتنے نخرے کرتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے بلالے گی تو تجھے کھا تو نہیں جاؤں گا۔'' وہ امید بھرے انداز میں بولا۔

''بس مجھے ڈر لگتا ہے۔ ورنہ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ تجھے بلاؤں۔ اچھا اب خفا تو نہ ہو، میں معافی مانگتی ہوں۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کر ظفر۔''

''او یار! اندر نہیں آنے دیتی تو جانے دے۔'' ساتھ کھڑا ہوا رشید ظفر سے مخاطب ہوا۔ وہ قریب ہی کھڑا تھا جس کو زیبو نے نہیں دیکھا تھا۔ گویا وہ دونوں ہی اندر آنا چاہتے تھے۔ زیبو دل تھام کے رہ گئی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اندر آکر وہ گھر کی صفائی میں مشغول ہوگئی۔ وہ ظفر سے اس امید پر بات کرتی تھی کہ شاید وہ رشتے کے لیے اپنی امی کو بھیجے گا۔ وہ جانتی تھی کہ غربت سے بھرے ہوئے اس کرائے کے گھر میں ایک عام سی صورت والی لڑکی کو کوئی بھی بیاہنے نہیں آئے گا۔

دونوں کمروں میں جھاڑو دیتے ہوئے اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس گھر کو آگ لگ جائے اور وہ بھی ناکارہ قسم کے سامان کے ساتھ جل کر بھسم ہو جائے۔ نہ یہ زندگی ہوگی اور نہ ہی زندہ رہنے کے خواب ہوں گے۔ پتا نہیں مجھے اللہ نے کیوں پیدا کر دیا؟ اس نے خود سے سوال کیا مگر اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ جھاڑو پھینک کر دروازے کے پاس آئی۔ ''کون ہے؟'' اس نے دروازہ کھولے بنا پوچھا۔

''زہرہ کا یہی گھر ہے۔'' اجنبی نے سوال کیا۔ زہرہ اس کی امی کا نام تھا۔

''جی ہاں، یہی گھر ہے مگر وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ آپ کو کیا کام ہے؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''میں پرلے محلے سے آیا ہوں، بیوی بیمار ہے۔ گھر کے کام کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ کب آئے گی وہ؟'' اجنبی نے سوال کیا۔

''جی وہ تو شام ہونے سے ذرا پہلے آتی ہیں۔ آپ مغرب کے بعد آجائیں۔''

''ان کا موبائل نمبر ہے تو نمبر دے دیں۔ میں خود بات کرلوں گا۔''

''جی نمبر تو مجھے یاد نہیں، بس آپ شام کو آجائیں۔''

زیبو اس کی آواز کے مطابق اس کی عمر کا اندازہ لگاتے ہوئے بولی۔ آواز سے وہ نوجوان ہی لگ رہا تھا۔

''ایک گلاس پانی مل جائے گا۔'' وہ دروازے کے بالکل قریب آکر بولا۔

''جی ضرور۔'' یہ کہہ کر وہ پانی لینے چل دی۔ گلاس میں پانی ڈالنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹ دیکھے پھر بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر جمائی اور دروازہ کھول کر گلاس آگے کر دیا۔ اس بار اس نے تقریباً آدھا دروازہ کھولا تھا۔ اس نے پانی لیتے ہوئے بھرپور نظروں سے زیبو کو دیکھا۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' وہ پانی پینے سے پہلے بولا۔

''نام کیوں بتاؤں؟'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''نام کا کیا کرو گے، اچار ڈالو گے؟'' یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اچھا جی نہ بتاؤ۔ کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ غٹاغٹ پانی پی گیا۔

زیبو کو یہ چانس بھی مس ہوتا ہوا نظر آیا۔ پانی پی کر اس نے گلاس واپس تھما دیا۔

''میں شام کو آؤں گا، نذیر نام ہے میرا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

زیبو کو وہ کافی معقول آدمی نظر آیا تھا۔ عمر اس کی چالیس کے آس پاس ہوگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی بیوی کی سوکن بننے کا سوچا۔ اگر مجھے اماں اس کے گھر میں کام کاج کے لیے بھیج دے تو ہوسکتا ہے یہ مجھ سے شادی کرلے۔ بیمار بیوی ہے۔ ویسے بھی بیمار بیویوں کے مرد دوسری شادی کی کچھ زیادہ ہی خواہش رکھتے ہیں۔ اس نے اللہ سے دعا کی کہ اماں خود نہ جائے بلکہ اس کے ذمے اس گھر کی صفائی وغیرہ لگا دے۔

دوپہر کے وقت دونوں چھوٹی بہنیں اسکول سے آگئیں۔ پھر تین بجے منشی فیروز آیا اور آتے ہی چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔ تقریباً چار بجے اس کی ماں زہرہ بھی آگئی۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی تھکن کے آثار نہیں تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرکے نہیں آئی ہو بلکہ کسی شادی کی تقریب سے آئی ہو۔ گھر آتے ہی اس نے مختلف گھروں سے لایا ہوا کھانے کا سامان سب کے آگے رکھ دیا۔

تینوں بہنیں اور باپ کھانے میں مصروف ہوگئے۔ منشی فیروز کھانا کھانے کے دوران مشکوک نظروں سے اپنی حسین و جمیل بیوی کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

''یہ جو تو زیادہ بن ٹھن کے جاتی ہے نا...... یہ مجھے پسند نہیں۔'' وہ ٹھنڈے پلاؤ میں ہاتھ مار کر بوٹی تلاش

کرتے ہوئے بولا۔
زہرہ نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔
''تجھے دونوں جگہوں سے جو تنخواہ ملتی ہے نا اس سے گھر کا کرایہ اور بجلی کا بل بھی پورا نہیں ہوتا۔ میں اگر نہ کماؤں تو تم لوگ بھوکے ہی مر جاؤ۔ آئندہ منہ سنبھال کے بات کرنا۔''
باہر گلی میں سیٹی کی آواز گونجی۔
''یہ روزانہ ہمارے ہی دروازے پر اس وقت سیٹی کیوں بجتی ہے؟'' منشی فیروز مشکوک نظروں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''مجھے مت دیکھ، اپنی اس کلموہی سے پوچھ۔ یہ سارا دن اکیلی ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں جا گھسی۔
منشی فیروز سر جھکا کر کھانا کھانے میں دوبارہ مگن ہوگیا۔ کھانا کھانے کے بعد زیبو نے کمرے میں بندھے ہوئے کتے کو کھولا اور باہر صحن میں باندھ دیا۔ چھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔
منشی فیروز گھر پر نہیں تھا، زہرہ نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر نذیر کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی پھر اس نے دروازہ بند کردیا۔ زیبو جو پاس ہی کھڑی تھی، ماں سے مخاطب ہوئی۔ ''اماں! یہ آدمی آج صبح کو بھی آیا تھا۔ تو اتنے گھروں میں کام کرتی ہے کیا یہاں بھی جائے گی؟''
''دیکھوں گی۔ ابھی تو میں نے اس کو ہاں نہیں کی۔ کل سوچ کر اس کو جواب دوں گی۔ تو ٹھیک کہتی ہے، میں مزید گھر نہیں سنبھال سکتی۔'' اس کی ماں کمر کو پکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''کتنے پیسے دے گا؟'' زیبو نے سوال کیا۔
''تین ہزار ماہانہ۔ صرف برتن دھونے ہیں اور صفائی کرنی ہے مگر تو کیوں پوچھ رہی ہے؟'' ماں نے سوال کیا۔
''اماں! میں سارا دن گھر میں بور ہوتی ہوں۔ تو کہے تو تیری جگہ میں یہاں کام پر چلی جایا کروں ہے؟''
''کرلے گی؟'' ماں نے سوال کیا۔
''ہاں کیوں نہیں، یہ کام تو میں روزانہ اپنے گھر میں بھی کرتی ہوں۔'' زیبو ماں کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''ٹھیک ہے کل سے چلی جانا۔ پتا تجھے میں سمجھا دوں گی لیکن..... اپنا خیال رکھنا۔ یہ بنگلوں کوٹھیوں والے ہم کام کرنے والی عورتوں کو دنیا کی سب سے سستی چیز سمجھتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بیٹے سب ہی بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ جا ذرا ایک کپ چائے بنا دے۔ آج تو میرا سر درد کررہا ہے۔'' ماں سر پر پٹی باندھتے ہوئے بولی۔
اور زیبو چائے بنانے چل دی۔

☆☆☆

نذیر نے زیبو کو اس کے کام سے آگاہ کردیا۔
بہت مختصر سی فیملی تھی۔ بیوی جوان تھی مگر فالج کی وجہ سے چارپائی سے لگی ہوئی تھی۔ دو بچے تھے جو اسکول جاتے تھے۔ نذیر خود ایک ہارڈویئر کی دکان کا مالک تھا۔
زیبو تفویض کردہ دونوں کام دو گھنٹے میں کر کے واپس آجاتی تھی۔ اپنے گھر کو وہ تالا لگا کے جاتی تھی۔ دس بجے جاتی اور دونوں بہنوں کے اسکول سے واپس آنے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاتی تھی۔
آج اس کے کام کو تیسرا دن تھا۔ حسب معمول وہ نذیر کے گھر پہنچ گئی۔ بیگم صاحبہ بیڈ پر بے سدھ لیٹی تھیں۔ زیبو سیدھا کچن میں پہنچ گئی۔ نذیر کے گھر وہ اچھے کپڑے پہن کے جاتی تھی۔ ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرلیتی تھی۔ ابھی وہ برتن دھو رہی تھی کہ نذیر کچن میں داخل ہوا۔ وہ آج پہلی بار کچن میں آیا تھا۔
''برتنوں سے فارغ ہوکر اوپر والے کمرے میں آجانا۔ وہاں جھاڑو لگا دینا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ برتنوں سے فارغ ہوکر وہ اوپر والے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں نذیر صوفے پر نیم دراز تھا۔
''ادھر آؤ۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔
''جی۔'' وہ صوفے کے قریب آکر بولی۔
''ذرا ٹانگیں دبا دو۔'' وہ ٹانگیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ زیبو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جس میں آج شیطانیت جھانک رہی تھی۔
''میں یہ کام نہیں کرتی جی۔ صرف گھر کے کام کرتی ہوں۔'' زیبو دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
نذیر نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سارے نوٹ نکالے اور اس میں سے پانچ سو کا نوٹ زیبو کے آگے کردیا۔ ''یہ لے اور آجا۔'' وہ اس کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ یہ کام تو بیویاں کرتی ہیں۔'' وہ دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے بولی۔

جنوری 2016ء کے دلکش اور رعنائیوں سے بھرپور پاکیزہ کے ساتھ سال نو کا شاندار استقبال
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نگہت سیما اور دُرِ ثمن بلال کے دل گداز ناولوں کی اگلی اقساط
قیصرہ حیات نے آخری امید میں روشن کیے امیدوں کے دیے
نایاب جیلانی کا دلنشیں منی ناول دیارِ صبح کے اجالوں میں
ناھید سلطانہ اختر کی ایک اور خوب صورت تحریر تقدیر، شبینہ گل،
سعدیہ عزیز آفریدی اور سمیرا یونس ھارون کی خصوصی کاوشیں
پودوں کے بارے میں معلومات دیتی ھما بیگ کی خصوصی تحریر......
نامور مصنفہ سیما یاسمین مجتبیٰ سے بھرپور ملاقات
اختر شجاعت اور
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
کے روح پرور اسلامی مضامین
اس کے علاوہ
نامور رائٹرز...... جیسے اُمِ ثمامہ، نزھت جبیں، ھاجرہ ریحان،
سیما بنت عاصم، ندا حسنین و دیگر کی بے انتہا دل پزیر تحریریں
اس کے ساتھ ساتھ تفریحی معلومات...... نت نئے مضامین اور دیگر تعمیری اور اصلاحی سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

''زیادہ نخرے کرنے کی ضرورت نہیں۔ قیمت تو تیری دوسو سے زیادہ نہیں مگر میں ترس کھا کے پانچ سو دے رہا ہوں۔ جلدی آ پھر میں نے دکان پر بھی جانا ہے۔''

''میں چلتی ہوں جی، یہ کام آپ کسی اور سے کرائیں، میں نہیں کروں گی۔''

''میں نے سنا ہے تیری ماں تو بہت ''سخی'' ہے۔ جتنے پیسے دو دیکھے بنا گریبان میں رکھ لیتی ہے۔ تو بھی اس کی بیٹی ہے، بس اپنی قیمت بڑھا رہی ہے۔ یہ لے چھ سو روپے ہیں۔ جلدی سے آجا۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

زیبو نے نفرت بھری ایک نگاہ اس پر ڈالی اور سیڑھیاں اترتے ہوئے تیزی سے نیچے آگئی۔

اگلے دو تین منٹوں بعد وہ اپنے گھر کا تالا کھول رہی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی ماں کے بارے میں اتنا گندا تبصرہ اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا مگر وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی ماں کے تو کئی سال لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بس کسی کمزور لمحے میں وہ بھی ٹوٹ کر بکھر گئی ہوگی۔ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ باہر سیٹی بجی۔ اس نے جھٹ سے آئینے میں خود کو سنوارا اور دروازے کی چٹخنی کھول دی۔

باہر ظفر موجود تھا۔ زیبو نے اس کے آس پاس دیکھا۔ آج وہ اکیلا تھا۔ ''کیا بات ہے زیبو...... کس کو دیکھ رہی ہے؟'' ظفر قریب آکر بولا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ کہیں آس پاس تیرے دوست تو موجود نہیں۔'' زیبو اطمینان سے بولی۔

''ارے میری جان! ہم اپنی محبت کا ڈھنڈورا تھوڑا ہی پیٹتے ہیں۔ ایمان سے تیری کسی بات کا ذکر آج تک کسی سے نہیں کیا۔'' پھر اس نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا اور مزید قریب آکر بولا۔

''یہاں کھڑے ہوکر باتیں کرنا عجیب سا لگتا ہے۔ گھر میں بیٹھتے ہیں۔''

''دیکھ ظفر! میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ تجھے اندر بلالیا تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ جو کہنا ہے یہیں کہہ دے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ اس کی اس وقت شدت سے خواہش تھی کہ ظفر اندر آجائے مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لڑکے ایک بار جس لڑکی سے تنہائی میں مل لیں اس سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے اور وہ اس چانس کو مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اتنی شریف کا ہے کو بنتی ہے تو۔'' ظفر...... خالص بازاری انداز میں بولا۔

''بات شریف ہونے کی نہیں ہے ظفر، دیکھ گلی میں سے کتنے لوگ گزر رہے ہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو میرے لیے مصیبت آجائے گی۔''

''اس گلی کی ستر فیصد لڑکیاں کس کس کے ساتھ فٹ ہیں، میں سب جانتا ہوں مگر تیری طرح کوئی شریف زادی بننے کی کوشش نہیں کرتی، چلتا ہوں۔'' وہ زیر لب ایک گندی گالی نکالتے ہوئے بولا۔

''ایک تو تم خفا بہت جلدی ہوجاتے ہو۔ مجھ سے ملنے کی اتنی زیادہ خواہش ہے تو اس کا ایک طریقہ ہے جو میں نے تجھے پہلے بتادیا تھا۔ اپنی امی کو بھیج دے۔ ایمان سے تیرے سارے گھر کی غلامی کروں گی۔ تیری امی کے پاؤں دھودھو کر پیوں گی۔''

''اپنا ابھی شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بائیک کو کک لگائی اور یہ جا وہ جا۔

زیبو نے دروازہ بند کردیا۔ دو بجے سے پہلے اس کی بہنیں آگئیں اور پھر باری باری امی ابو بھی آگئے۔ اس کا باپ آج قدرے جلدی آگیا تھا۔ زیبو باپ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''آج جلدی کیوں آگئے ہو ابا؟''

''آج کچھ طبیعت خراب تھی، ویسے بھی بارشوں کی وجہ سے منڈی میں مال کافی کم آرہا ہے۔ تو ایسا کر ڈسپرین کی ایک گولی دے اور چائے بھی بنادے۔'' اس کا باپ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''تیری ماں ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ چار تو کب کے بج چکے ہیں۔'' وہ شک بھرے انداز میں بولا۔

''اماں تو آپ سے پہلے آگئی تھیں۔ وہ باہر صحن میں ہیں۔'' زیبو نے جواب دیا۔ پھر ایک گولی اور پانی کا گلاس باپ کے ہاتھ میں تھمادیا۔ تھوڑی دیر بعد زہرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے کھانے کا شاپر وہیں ان کے سامنے رکھ دیا۔

''کتنے گھروں میں کام کرتی ہے تو؟'' وہ اپنی بیوی کے لپ اسٹک زدہ ہونٹوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

''پانچ یا چھ گھر ہیں اور بیگمات کو راضی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ کسی کام سے خوش ہی نہیں ہوتیں۔'' وہ نیچے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''لگتا تو ایسے ہے جیسے گھروں میں کام کرکے نہیں بلکہ کسی بیوٹی پارلر سے آرہی ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے شاپر میں ہاتھ ڈال کر چاول کھانے شروع کردیے۔

زہرہ نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا

اور خاموش رہی۔ ''نوکرانیوں کو اس قسم کے کپڑے زیب نہیں دیتے لوگ سو طرح کی باتیں کرتے ہوں گے۔'' وہ پھر بولا۔

اس بار زہرہ پھٹ پڑی۔

''لوگوں کی......'' وہ ایک گندی گالی دیتے ہوئے بولی۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ تو خود بڈھا ہو گیا ہے اور تیری عقل بھی جواب دے گئی ہے۔ اتنی ہی غیرت ہے تو کل سے سارے گھر کا خرچہ تو سنبھال میں گھر میں بیٹھ جاتی ہوں۔''

یہ بات سن کر منشی فیروز نے پھر کوئی بات نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد زیبو چائے کا کپ لے کر آگئی اور باپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سر دبا دوں ابا؟'' وہ باپ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹا دبا دے۔'' وہ ماتھا پکڑتے ہوئے بولا اور زیبو نے سر دبانا شروع کر دیا۔

''ابا! ایک بات کہوں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ہاں بیٹا بول''۔ باپ نے جواب دیا۔

''ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ کوئی سیکنڈ ہینڈ مل جائے تو لا دو نا۔ سارا سارا دن گھر میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔''

''ہاں بیٹا ٹی وی تو ہونا چاہیے۔ سنا ہے کچھ ہفتوں بعد فٹ بال کا ورلڈ کپ بھی ہو رہا ہے۔ اچھا تو بے فکر رہ میں تجھے ٹی وی لا دوں گا۔ بس اب کچھ آرام آگیا ہے۔ تو بھی آرام کر...... میں بھی تھوڑی سی نیند کر لوں۔'' یہ کہہ کر وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

''تو کام پہ گئی تھی آج!'' ماں نے سوال کیا۔

''ہاں اماں مگر کل سے نہیں جاؤں گی۔ وہ کمینہ بہت جلدی اپنی اوقات پر آگیا۔'' زہرہ خاموش رہی۔

زیبو نے بغور ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ماں کے حسن پر بہت رشک کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ رشک حسد میں بھی تبدیل ہو جاتا تھا۔ کاش میری رنگت میری ماں جیسی ہوتی۔ اس نے دل میں سوچا پھر خالی کپ اٹھا کر کچن میں آگئی۔

وہ شام بھی بہت جلد رات میں بدل گئی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ سردی آہستہ آہستہ اپنے جوبن پر آ رہی تھی۔ کروٹ پر کروٹ بدلنے کے باوجود جب اس کو نیند نہ آئی تو وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی۔ صحن میں لگے ہوئے املی کے

مچھروں کا ذوق

دنیا میں مچھروں کی اڑھائی ہزار قسمیں ہیں۔ (ان میں ڈینگی وائرس شامل نہیں ہے) لوگوں کے گھروں میں رہنے اور کاٹنے والے مچھر گیارہ بارہ قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس مچھر نے آپ کو دن میں کاٹا ہے، وہی رات کو بھی کاٹے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ عورتوں کو مچھر زیادہ کاٹتا ہے کیونکہ عورتیں خوشبو والے اسپرے اور عطر استعمال زیادہ کرتی ہیں۔ سنا ہے کاٹنے کا کام مادہ کرتی ہے، نر تو صرف بھیں بھیں کرنا جانتے ہیں۔

اسے بھی پڑھیے

☆ محبت شادی کی سحر ہے اور شادی محبت کی شام۔

☆ کسی کے چہرے پہ مت جاؤ کیونکہ انسان ایک بند کتاب کے مانند ہے، جس کا سرورق کچھ اور ہوتا ہے اور تحریر کچھ اور۔

☆ تجربہ وہ کنگھی ہے جو زندگی ہمیں اس وقت دیتی ہے جب ہمارے سر کے بال جھڑ جاتے ہیں۔

☆ جس آدمی کے پاس کتاب ہو، وہ اکیلا نہیں ہوتا۔

خبر

ایک صحافی اپنا کام مکمل کر کے گھر واپس جا رہا تھا کہ اچانک کسی کے دریا میں گرنے کی آواز آئی۔ وہ بھاگا بھاگا دریا کے کنارے پہنچا۔ اس نے پکار کر پوچھا۔ ''کیا کوئی ڈوب رہا ہے؟'' دریا میں سے ایک کمزور سی آواز آئی۔

''ہاں، میں ڈوب رہا ہوں۔''

اس پر صحافی نے کہا۔ ''تم غلط وقت پر ڈوب رہے ہو، اب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ابھی ابھی میں اخبار کی آخری کاپی بھیج کر واپس جا رہا ہوں۔ اب تمہارے ڈوبنے کی خبر کل کے اخبار میں چھپے گی۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

درخت کے پار ادھورا چاند ایک عجیب سا طلسمی ماحول بنائے ہوئے تھا۔ سوگوار سی چاندنی زیبو کو اور بھی سوگوار کر رہی تھی۔ یکبارگی ظفر کے خیال نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی بکھیر دی۔ ''پتا نہیں ظفر میرے نصیب میں ہے کہ نہیں۔'' اس نے خود سے سوال کیا'' اور پتا نہیں اس دڑبے والی زندگی سے کب نجات ملے گی کیا میں ظفر کے ساتھ فرار ہو جاؤں؟'' ایک باغیانہ سوچ وارد ہوئی۔ ''نہیں ظفر قابل اعتبار لڑکا نہیں ہے ویسے بھی یہ سوچنا بھی گناہ ہے۔'' وہ چلتے چلتے باہر رکھی ہوئی جھلنگا سی چارپائی پر نیم دراز ہوگئی اور وہیں پر اس کو نیند آگئی۔

اگلی صبح حسب معمول سب باری باری چلے گئے۔ سب کے چلے جانے کے بعد زیبو نے گھر کی صفائی کی اور ظفر کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ مگر آج اپنے مقررہ وقت کے گزر جانے کے باوجود اس کی سیٹی نہ بجی۔ وہ کمرے میں بے تابی سے ٹہلنے لگی۔ دفعتاً ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' اس نے قریب آکر سوال کیا۔

''میں رشید ہوں ظفر کا دوست۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''کیابات ہے؟'' وہ قدرے بے رخی سے بولی۔

''بازار سے گزر رہا تھا۔ تیرے لیے پرفیوم لے آیا ہوں۔ تو، تو ظفر پہ مرتی ہے اور میں تیرا دیوانہ ہوں۔'' وہ عاشقانہ لہجے میں بولا۔

''یہ پرفیوم جا کر اپنی بہن کو دے دینا۔ یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

''اری زیبو! دروازہ تو کھول...... کسی کا تحفہ نہیں ٹھکرایا کرتے۔'' وہ ہمت ہارے بغیر بولا۔ ''ظفر سے تجھے کوئی وفا نہیں ملے گی۔ اسی گلی کی تین چار لڑکیوں سے اس کا یارانہ چل رہا ہے۔ ہم سے دل لگا، وفا نہ کروں تو کہنا کسی انسان کی نہیں جانور کی اولاد ہوں۔ چل دروازہ کھول۔ بس اپنا گفٹ لے لے پھر میں چلا جاؤں گا۔'' زیبو نے کچھ سوچا پھر بولی۔

''وہ اگر لوفر ہے تو، تو بھی تو اس کا دوست ہے۔ تو کون سا حاجی قاضی ہے۔ چل دفع ہو یہاں سے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر صحن میں آگئی۔

ظفر کی ان عادتوں کا اس کو پہلے سے پتا تھا۔ اس لیے یہ بات اس کو بری نہیں لگی۔ ''فلرٹ وہ باقی لڑکیوں سے کرتا ہے مگر پیار تو میرے ساتھ کرتا ہے نا۔'' وہ دل میں مسکرائی اور املی کے درخت سے لگی ہوئی پینگ پر بیٹھ کر جھولا جھولنے لگی۔ دن رات گھڑی کی سوئی کی طرح گزرتے رہے۔

اس روز بھی حسب معمول سب چلے گئے اور وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' زیبو نے پوچھا۔

''دروازہ کھول...... میں ہوں۔''

زیبو نے ماں کی آواز سن کر جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ زہرہ اندر داخل ہوگئی۔

''خیریت تو ہے آج اتنی جلدی آگئیں تم؟'' زیبو نے سوال کیا۔

''طبیعت خراب تھی۔ صرف شیخ صاحب کے گھر کے کام کیے ہیں لیکن پروفیسر کلیم کے گھر کا کام کرنا ہے۔ باقی تین گھروں سے میں نے آج چھٹی لی ہے۔ تو ایسا کر پروفیسر کلیم کے گھر چلی جا برتن دھونے ہیں اور جھاڑو لگانی ہے۔ جا بیٹا میرے سر میں درد نہ ہوتا تو تجھے نہ کہتی۔ پروفیسر صاحب کا گھر تو دیکھا ہے نا؟''

''جی اماں اگلے چوک کے دائیں ہاتھ پر تیسرا گھر ہے نا تو نے خود ہی تو بتایا تھا۔'' زیبو نے جواب دیا۔

''ہاں بالکل...... تو ابھی چلی جا تاکہ جلدی فارغ ہو سکے۔''

''چائے بنا دوں تجھے؟'' زیبو نے پوچھا۔

''دل نہیں ہے۔ میں ذرا آرام کرتی ہوں، رات بھی تیرے باپ کے خراٹوں نے سونے نہیں دیا اور ہاں ان کے فریج میں جو نیلے رنگ کا شاپر ہوگا، وہ لیتی آنا۔ میں نے رکھا تھا۔''

زیبو نے چادر لپیٹی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

پروفیسر کے گھر پہنچتے ہی اس نے تیزی سے کام شروع کر دیا اور دو گھنٹے میں فارغ ہوگئی پھر اس نے فریج میں سے اپنا شاپر اٹھایا اور واپسی کی راہ لی۔ جب وہ اپنی گلی میں پہنچی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی وہ اپنے گھر سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی کہ اس نے ظفر کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھا۔ زیبو کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور پاؤں جیسے چلنا بھول گئے۔ ظفر نے بھی اس کو دیکھ لیا تھا پھر وہ بائیک اسٹارٹ کر کے اس کے پاس آیا۔

''تو، تو چائے تک نہیں پلاتی مگر تیری ماں نے بڑی خدمت کی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

زیبو خود کو گھسیٹتے ہوئے گھر تک آئی۔

''تو اتنی جلدی کیسے آگئی؟'' زہرہ نے آنکھیں

چراتے ہوئے پوچھا۔
''جلدی میں اس لیے آئی ہوں کہ اللہ نے آج مجھے تیرے کالے کرتوت دکھانے تھے۔'' وہ شعلہ بار نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''کیا فضول بکواس کیے جارہی ہے۔'' ماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
''تو گھر میں اکیلی ہے پھر یہ ظفر یہاں کیوں آیا تھا؟'' وہ پھنکاری۔
''وہ بجلی کا سوئچ خراب تھا نا...... وہ ٹھیک کرانا تھا۔'' وہ آنکھیں چراتے ہوئے بولی۔
'اماں! سوائے میرے باپ کے تو ہر مرد پر مہربان ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک جو تو بن ٹھن کے جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میرے باپ کا شبہ بالکل صحیح تھا۔ تو نے آج اپنی ہی بیٹی کے حق پر بھی ڈاکا ڈال دیا۔ تو تو ڈائن سے بھی بڑی ڈائن نکلی۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
''میری طرف دیکھ!'' زہرہ نے اپنی اس بیٹی کو غور سے دیکھا جس کے سانولے رنگ نے اس کے اندر کی خوب صورتی پر بڑا گہرا پردہ ڈال دیا تھا مگر...... وہ تو ماں تھی...... اسے اپنی بیٹی کے دل کی خوب صورتی اور ویرانی نے خون کے آنسو رلا دیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے گریبان سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کے آگے لہراتے ہوئے بولی۔
''میری بچی میں بہت بدقسمت ہوں...... تجھے کیا خبر اگر آج یہ پیسے مجھے نہ ملتے تو تیری دونوں بہنوں کو اسکول سے نکال دیا جاتا اور...... مجھے تین گھروں سے نکال دیا گیا ہے۔ جب کوئی محنت کش ڈھنگ سے نہ کرنے دے تو...... میری مجبوری مجھے اس مقام پر لے آئی مگر...... مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ تو اور ظفر......'' اس نے ہتھیلی سے گالوں پر بہتے آنسو بے دردی سے رگڑ ڈالے۔
زیبو نفرت بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل بالکل راضی نہ تھا ماں کو معاف کرنے کے لیے۔
''میں تو سمجھی تھی کہ تو ہمارے پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے گھر گھر جاکر محنت کرتی ہے مگر...... مجھے خبر نہ تھی کہ تو ہمارے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھر رہی ہے۔''
''نہ میرا بچہ...... مجھے یوں ذلیل نہ کر...... اگر اتنی محنت نہ کرتی تو زندگی کی گاڑی نہ چلا پاتی...... تیرے باپ کی مزدوری سے تو یہ آگ بجھنے سے رہی......'' زہرہ نے اپنا دفاع کرنا چاہا۔ اچانک زیبو کو اپنے باپ کی صحت کا خیال آیا تو دل بھر آیا......
''نہیں اماں...... میں نہیں مانتی تیری محنت کو...... انسان سیدھے راستے سے کمانا چاہے تو وہ رازق اسے سیدھے راستے سے ہی رزق پہنچاتا ہے۔ میرا باپ جسے نہ اپنے بڑھاپے کا خیال نہ بیماری کا اور نہ ہی موسم کی سختیاں اسے محنت کرنے سے روک سکتی ہیں...... محنت تو وہ کرتا ہے۔ نفس کی غلامی کرنے والے کیا محنت کریں گے...... میرا سر شرم سے جھکا دیا تو نے...... مجھے ہمیشہ سے میری سانولی رنگت نے احساس کمتری میں مبتلا کیے رکھا...... تیرے حسن پر مجھے رشک ہوتا تھا مگر کیا خبر تھی کہ تیرا من انتہائی میلا ہے...... آج سے میری ماں مرگئی میرے لیے...... تو نے تو میرے دل میں بھی اندھیرا پھیلا دیا اماں۔'' یہ کہہ کر زیبو نے رخ پھیر لیا۔ پیچھے زہرہ کی آواز آئی۔
''دعا کر خدا مجھے معاف کرے۔ میں کچھ اور گھروں میں کام تلاش کرتی ہوں تو دروازہ بند کردے۔''
زیبو نے دروازہ بند کردیا۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ اس کے بعد کسی نے زیبو کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بس مشین کی طرح گھر کے کام کرتی تھی۔ کھانا بھی واجبی سا کھاتی۔ فارغ وقت میں بس خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی۔
وہ ایک اداس سی صبح تھی۔ سب لوگوں کے جانے کے بعد وہ کام کاج میں مصروف ہوگئی۔ ظفر کی سیٹی کا نہ تو پھر اس نے انتظار کیا اور نہ ہی سیٹی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔
''کون ہے؟'' اس نے مرے مرے انداز میں پوچھا۔
''میں ظفر ہوں۔ دروازہ کھول تیرے لیے ایک گفٹ لے کر آیا ہوں۔''
زیبو نے کچھ دیر سوچا پھر پورا دروازہ کھول دیا۔ ظفر ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ زیبو پھٹ پڑی۔
''بے غیرت، کمینے...... تیرے جیسے لوفر لفنگوں کی بہنیں نہ جانے کن کن لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور تو خود کو تیس مار خان سمجھتا ہے۔ چلا جا یہاں سے آج کے بعد اگر تو نے سیٹی بجائی یا دروازے پر دستک دی تو میں اینٹ مار کر تیرا سر کھول دوں گی۔ دفع ہو جا مردود!''
ظفر اس اچانک افتاد سے گھبرا اٹھا اور بائیک اسٹارٹ کرکے بھاگ کھڑا ہوا۔ زیبو نے دروازہ بند کردیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

ماروی

محی الدین نواب

چھبیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چھپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہوجائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی حنائیں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی مٹی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرے باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تمارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا اشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔۔۔ ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی نے محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کینڈی بھی آگیا۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹمی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد... دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا اور میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ

لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ڈاکٹر ممی سن نے مراد کی نئی شکل جو بنائی تھی، وہ اس کے لیے وبال بن گئی۔ وہ مرینہ سے نکاح پڑھانے کے معاملات طے کرنے گیا تاہم وہاں اسے موجودہ شکل میں دیکھ کر کچھ لوگ اسے اپنا رشتہ دار سمجھنے لگے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مراد کی شادی کرنا چاہتے تھے تاہم وہ شادی نہ ہوسکی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرلیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دولفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے اب وہ غبارے مغرب کی سمت جارہے تھے۔ ادھر ماسٹر کو جب غباروں کا پتا چلا تو اس نے مراد کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کتے کو اس کی اترن سونگھاتا اور مراد تک پہنچ جاتا۔ وہ انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ اب شمال مغرب کی سمت جارہا تھا اور مراد اس بات سے بے خبر تھا کہ جہاز ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایک بھاری بھر کم پہلوان نما شخص نے طیارے کے پائلٹ کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا باقی ایک ائرہوسٹس، ایک اسٹیوارڈ اور ایک کو پائلٹ دوسرے دو گن مینوں کے نشانے پر تھے۔

وہ اغوا کرنے والے تعداد میں پانچ تھے۔ اس وقت دو گن مین اپنے ہتھیاروں کو چھپا کر مسافروں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ خود کو ابھی ظاہر نہیں کررہے تھے۔ انہیں ایکشن میں آنے کے لیے اپنے لیڈر ڈیم برگ کے احکامات کا انتظار تھا۔

ڈیم برگ نے پائلٹ کو نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جہاز کی سمت بتاؤ؟“

پائلٹ نے کہا۔ ”میں نے تمہارے حکم کے مطابق اسے شمال مغرب کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہم اگلے دو گھنٹے میں ازبکستان کے شمال مشرقی بارڈر کو کراس کریں گے اور یہ غیر قانونی انٹری ہوگی۔“

”کنٹرول ٹاور سے رابطہ کرو۔ اس سے بولو۔ ہائی جیک ہونے والا یہ طیارہ وہاں لینڈ کرے گا۔ رن وے کو کلیئر رکھا جائے۔ اسے بتاؤ کہ جہاز میں دو سو دس مسافر سوار ہیں۔ ان میں اہم سیاسی شخصیات بھی ہیں۔“

پائلٹ نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے طیارے کے متعلق بتایا کہ انڈیا سے پرواز کرنے والا جہاز جو دبئی، استنبول اور لندن جانے والا تھا، اسے اغوا کیا جارہا ہے۔ اس کا رخ ازبکستان کی طرف ہے۔ اسے وہاں اُتارنے کی اجازت دی جائے۔

اس نے ڈیم برگ کے حکم کے مطابق کہا کہ طیارے میں ایندھن اتنا ہی ہے کہ وہ آگے نہیں جاسکے گا۔ اجازت نہ ملنے کی صورت میں دو سو دس مسافر جان سے جائیں گے۔ یہ ہائی جیکرز طیارے کو تباہ کردیں گے۔

ایک ہائی جیک ہونے والے طیارے نے ہلچل پیدا کردی۔ انڈیا سے لندن اور ازبکستان تک تمام متعلقہ حکمران اور اعلیٰ عہدیداران ہاٹ لائن پر بولنے لگے۔

نگارا خانم سو رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیارہ اسی کی ریاست کے جنوب مغربی ائرپورٹ کی سمت آرہا تھا۔ ہائی جیکرز کا یہ ضدی مطالبہ تھا کہ طیارے کو وہیں اُتارا جائے گا۔

وہ فون پر چیخ پڑی۔ ”وہ کون لوگ ہیں؟ میری ریاست میں کیوں آرہے ہیں؟ انہیں کسی طرح ٹال دو۔ کسی دوسرے ملک میں جانے کو کہو۔“

کنٹرول ٹاور سے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ہر ہائی نس...! وہ ہماری کوئی بات نہیں سن رہے ہیں۔ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں کہ فیول ختم ہورہا ہے۔ ہائی جیکرز پائلٹ سے جو کہہ رہے ہیں، بے چارہ وہی ہم سے کہہ رہا ہے۔ وہ وارننگ دے رہے ہیں۔ اگر ہم نے رن وے کلیئر نہ رکھا تو وہ طیارے کو شہری آبادی میں گرادیں گے۔

”وہ انتہا پسند ہیں۔ کہتے ہیں کہ سر سے کفن باندھ کر آئے ہیں۔ اپنے ساتھ دو سو دس مسافروں کو اور اہم سیاسی شخصیات کو لے مریں گے۔“

نگارا خانم سمجھ گئی کہ اسلام دشمن عناصر طیارے کو اغوا کرنے کا ڈراما پلے کر کے مسلمان قوم کو بدنام کررہے ہیں۔ ایسا پہلے بھی ہوچکا تھا۔

جہادی تنظیمیں جو اپنے دین کی نیک نامی کو بحال رکھنے کے لیے دشمن عناصر کے خلاف جہاد کررہی ہیں، انہیں طرح طرح سے بدنام کیا جاتا ہے۔

نگارا خوب سمجھ رہی تھی کہ اس طیارے کو اغوا کرنے والے مسلمان نہیں ہیں اگر ہیں تو وہ دو غلے اور زر خرید ہیں۔ مسلمانوں میں بھی ایسے موقع پرست اور زر پرست موجود ہیں۔

بڑے ممالک کی طرف سے نگارا خانم کو کہا جارہا تھا کہ ان ہائی جیکرز کو اپنی ریاست میں آنے دیں۔ پھر وہ دہشت گرد اپنے مطالبات پیش کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ کن مقاصد کے لیے طیارے کو اغوا کیا گیا ہے؟ اس نے طیارے کو وہاں اتارنے کی اجازت دے دی تھی اور اپنی آرمی کو حکم دیا تھا کہ وہ ائرپورٹ کے اندر اور باہر پوری طرح مستعد رہیں۔ اس ریاست کی آرمی میں لیڈیز افسران زیادہ تھیں۔ آرمی، پولیس اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں مردوں سے زیادہ جنگجو قسم کی خواتین نظر آتی تھیں۔

ایک عجیب سی بات یہ ہوئی کہ ایسے وقت نگارا خانم کی دائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ اسے ضعیف الاعتقاد کہنا چاہیے۔ وہ مانتی تھی کہ بائیں آنکھ کی پھڑکن مصیبت لاتی ہے اور دائیں آنکھ پھڑکے تو بہتری ہوتی ہے۔ کہیں سے خوشیاں ملنے کا اشارہ ملتا ہے۔

وہ سوچنے لگی۔ ’’تعجب ہے۔ قانون کے خلاف غیر ملکی طیارے کو مصیبت بنا کر لایا جارہا ہے۔ مسلح دہشت گرد اس کی زمین پر آرہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف عالمی پیمانے پر سازش ہورہی ہے اور میری دائیں آنکھ مسرتوں کی نوید دے رہی ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا میرا کوئی رکا ہوا کام پورا ہونے والا ہے؟ یا غیر متوقع خوشیاں حاصل ہونے والی ہیں؟‘‘

ہاں، اس کا ایک کام ہونے والا تھا۔ اس کی دلی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ وہ اتنی دور تک سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس مراد علی منگی کی تلاش میں وہ غباروں کے ذریعے ماروی تک پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ مطلوبہ راحتِ جاں اسی اغوا ہونے والے طیارے سے اس کے پاس چلا آرہا ہے۔

☆☆☆

جہاز کے اندر عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے سکون اور اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے یا سیٹ کی پشت کو آرام دہ بنا کر نیم دراز ہوگئے تھے۔ یہ اطمینان تھا کہ کسی مشکل یا رکاوٹ کے بغیر اپنی اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔ پائلٹ کے کیبن میں آرام حرام ہوگیا تھا۔ وہ جہاز اڑانے والے موت بردار اسلحے کے نشانوں پر تھے۔ اس ریاست کے کنٹرول ٹاور سے اجازت مل گئی تھی۔ وہ اگلے آدھے گھنٹے میں جہاز کو وہاں اُتار سکتے تھے۔ ہائی جیکرز کے لیڈر ڈئم برگ نے اپنے تین ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ مسافروں کے پاس جائیں اور انہیں بتادیں کہ ان کی زندگیاں ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ ہمارے خلاف کوئی حرکت کرنے کی حماقت نہ کریں۔ جو ایسا کرے گا، اسے گولی مار دی جائے گی۔

وہ تین ماتحت کیبن سے نکل کر مسافروں کے پاس آگئے۔ ان میں سے ایک جہاز کی فرسٹ کلاس میں رک گیا۔ وہاں کے مسافر وی آئی پی کہلاتے تھے۔ ان میں اہم سیاست دان بھی تھے۔ باقی دو ماتحت عام مسافروں کے پاس آگئے۔ مسافروں نے حیرانی سے ان کے ہاتھوں میں گنیں دیکھیں پھر یہ سنا کہ اس طیارے کو ہائی جیک کیا جارہا ہے اور وہ جہاز تیس یا چالیس منٹ کے بعد ایک ملک کی زمین پر اترنے والا ہے۔ یہ سنتے ہی عورتیں اور بچے رونے لگے۔ مرد پریشان ہوکر ان کی بندوقوں کو دیکھنے لگے۔ انہیں بتایا جارہا تھا کہ اس جہاز کا ناخدا ان کے نشانے پر ہے۔ اگر کوئی وہاں دلیری دکھانے کی حماقت کرے گا تو اس کے ساتھ دوسرے مسافر بھی مارے جائیں گے اور پائلٹ مرے گا تو جہاز ہزاروں فٹ نیچے زمین پر گرے گا۔

اپنے مسلز پھلانے والا دلیر جان بندوقوں کے سامنے اپنی دلیری بھول گیا تھا۔ اپنی گھر والی سے بول رہا تھا۔ ’’مم...... میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں ان لوگوں سے مقابلہ کرنے جاؤں تو مجھے نہ روکنا۔ میں خون کا دریا بہادوں گا۔‘‘

وہ سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے اسے جانے کا راستہ دیتے ہوئے بولی۔ ’’ابھی جاؤ۔ میں تمہیں روکوں گی۔‘‘

وہ بولا۔ ’’مجھے روکو، ورنہ بیوہ ہوجاؤ گی۔‘‘

’’تم شہید ہوجاؤ گے تو میں فخر کروں گی۔ پوری دنیا میں تمہاری دلیری کے چرچے ہوں گے۔‘‘

وہ اس سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ زیرِلب بڑبڑانے لگا۔ ’’میں پاگل نہیں ہوں کہ ہتھیار کے بغیر لڑنے چلا جاؤں۔‘‘

وہ دونوں گن مین ایک ایک مسافر کے پاس جاکر ان کا موبائل فون لے کر ایک شاپر میں ڈالتے جارہے تھے اور انہیں تسلیاں دے رہے تھے کہ وہ دشمن نہیں ہیں۔ ان کی دشمنی حکمرانوں سے ہے۔ وہ اپنے مطالبات منوانے کے بعد تمام مسافروں کو آزاد کردیں گے۔ پھر ان میں سے ایک جہاز کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ دوسرا پچھلے حصے میں آیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کھڑے رہ کر مسافروں پر نظر رکھنا چاہتے

تھے۔ پچھلے حصے میں آنے والے نے ٹوائلٹ کے بند دروازوں کو دیکھا۔ کچھ سوچا پھر آگے بڑھ کر ایک دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی پھر انتظار کیا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ اسے شبہ ہوا کہ کوئی ان سے چھپ رہا ہے اور آئندہ کوئی گڑبڑ کرسکتا ہے۔ اس نے پھر دستک دی۔ اس بار دروازہ کھل گیا۔ مراد طیارے کے اندر ایک اسلحہ بردار کو دیکھ کر یکلخت الرٹ ہوگیا۔ اس کے اندر کا جنگجو ہڑبڑا کر بیدار ہوگیا۔

اس نے مراد کو نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں بے! یہاں کب سے چھپا ہوا ہے؟''

مراد نے ٹوائلٹ سے باہر آکر عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''بھائی! ہماری عزت رکھ لو۔ اندر ایک شرمیلی لڑکی ہے۔ ہم چھپ کر یہاں قربت کے لمحات گزار رہے تھے۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''اندر کوئی اور بھی ہے؟''

اس نے فوراً ہی اُدھر کھلے دروازے کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اے باہر آؤ۔ ورنہ...''

ورنہ کہہ کر للکارنے والے کو پیچھے سے ایک زوردار لات پڑی۔ وہ باہر سے اندر ہوگیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کرنے کے باوجود اوندھے منہ کموڈ پر آکر گرا۔ موجودہ سچویشن میں پہلے گن پر قبضہ کرنا لازمی تھا۔ اگر وہ چل جاتی تو آواز سن کر اس کے دوسرے ساتھی دوڑے چلے آتے۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھنے والا تھا لیکن چیتے سے زیادہ پھرتیلا کون ہوسکتا ہے؟ مراد باہر سے ہی چھلانگ لگا کر اس کی گردن پر سوار ہوا تو منہ کموڈ کے اندر چلا گیا۔ گردن کی ہڈی جیسے ٹوٹ گئی۔ تکلیف کی شدت سے گن ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

مراد نے اسے لپک لیا۔ اس کی کنپٹی سے لگا کر بولا۔ ''کون ہو تم؟ یہ ہتھیار طیارے کے اندر کیسے لے آئے؟''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''اس جہاز کو ہائی جیک کیا جارہا ہے۔ اپنی سلامتی چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو۔''

مراد نے گن کے دستے سے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی تو اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اسے ٹوائلٹ سے فوراً نکلنا تھا ورنہ پکڑا جاتا۔ اس نے سیدھے کھڑے ہوکر اسے دیکھا۔ اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ اس کی جیبوں سے آٹھ بلٹس برآمد ہوئے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ان ہائی جیکرز کے پاس بڑے ہتھیار اور زیادہ بلٹس نہیں ہیں۔ پتا نہیں وہ کس طرح کم سے کم ہتھیار چھپا کر لے آئے تھے۔ وہ نیم مردہ سا پڑا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت زندہ ہوسکتا تھا۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے گولی نہیں چلائی جاسکتی تھی۔ اس نے گن کے دستے سے زوردار ضربیں لگائیں۔ اس واردات کو فی الحال چھپانے کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ دو تین ضربوں کے بعد ہی پھڑ پھڑا کر مر گیا۔ مراد گن اور بلٹس کو لباس میں چھپا کر باہر آیا۔ دروازے کو بند کیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنی سیٹ کی طرف آیا۔ ریشماں اور دلیر جان نے اسے اپنی سیٹ تک جانے کا راستہ دیا۔ اس وقت مسافروں کو اطلاع دی جارہی تھی کہ جہاز رن وے پر اترنے والا ہے۔ تمام مسافر سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔ تمام مسافر سہمے ہوئے تھے اور سیٹ بیلٹ باندھ رہے تھے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں منزل سے دور کسی انجانی جگہ اتارا جارہا ہے۔

ریشماں اور دلیر جان بھی پریشان تھے۔ مراد نے ان کی طرف جھک کر کہا۔ ''کیا پریشان ہونے سے مصیبت ٹل جائے گی؟''

دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اردو جانتا ہوں اور بہت ہی الو کا پٹھا ہوں۔''

وہ ندامت سے بولی۔ ''سوری، میں شرمندہ ہوں۔''

مراد نے دلیر جان کے بازو کے مسلز پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''کیا ان ہائی جیکرز سے فائٹ کرو گے؟''

وہ بولا۔ ''میں پاگل نہیں ہوں۔ ان کے پاس اسلحہ ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں اسلحے کے بغیر لڑتا ہوں۔ ایک ہائی جیکر کو ٹوائلٹ میں ہلاک کرکے آرہا ہوں۔''

دونوں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ اس نے اپنے لباس کے اندر سے اسلحے کی جھلک دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے میں نے دشمن سے چھینا ہے۔''

دونوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ مراد نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھی یہ پوچھتے پھریں گے کہ یہاں سے کون مسافر ٹوائلٹ میں گیا تھا اور ہر ایک کی تلاشی لی جائے گی۔ وہ اس گن کو ڈھونڈ لیں گے۔''

ریشماں نے کہا۔ ''او گاڈ! تم پکڑے جاؤ گے۔''

''وہ شاید عورتوں کی تلاشی نہیں لیں گے۔ تم اسے اپنے لباس میں چھپا لو۔''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''مم...... میں......''

دلیر جان نے کہا۔ ''اپنی مصیبت اپنے پاس رکھو۔ ہم خوامخواہ کی مصیبت اپنے سر نہیں لیں گے۔''

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں۔ جب وہ میرے پاس تلاشی لینے آئیں گے تو میں فوراً گولیاں چلانا شروع کردوں گا۔ وہ بھی فائر کریں گے۔ اس طرح کئی مسافر مارے

جائیں گے۔ تم دونوں میرے قریب ہو۔ میرے ساتھ تمہاری بھی شامت آجائے گی۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اس وقت جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ ریشماں نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔''لاؤ مجھے دو۔ میں اسے چھپاؤں گی۔''

مراد نے شاباش کہہ کر وہ گن اور بلٹس اسے دیے۔ اس نے سفری بیگ میں سے ایک چادر نکال کر اپنے اوپر ڈال لی۔ ایسے وقت پردہ لازمی تھا۔ مراد دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ریشماں نے اسے اپنے لباس کے اندر چھپالیا۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ مسلح فوجی دور تک نظر آرہے تھے۔ فوجی وردی میں عورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ ازبکستان میں ایک ایسی ریاست ہے جہاں عورتوں کی حکمرانی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید یہ وہی جگہ ہے۔

پائلٹ کیبن میں ہائی جیکرز کا لیڈر ڈئم برگ فون کے ذریعے مطالبات پیش کر رہا تھا کہ گوانتانا موبے کی جیل میں ان کے بیس ساتھیوں کو جب تک رہا نہیں کیا جائے گا، تب تک دو سو دس مسافر یہاں قیدی بن کر رہیں گے اور یہ مطالبہ تھا کہ بیس قیدیوں کی رہائی کے بعد ان ہائی جیکرز کے لیے ایک طیارہ فراہم کیا جائے۔ وہ اس طیارے میں چار بڑے اہم سیاست دانوں کو اور ان کی بیویوں اور بچوں کو لے کر اپنے ملک جائیں گے پھر وہاں پہنچ کر انہیں رہا کردیں گے۔ یہ دھمکی دی جارہی تھی کہ مطالبات ماننے سے انکار کیا جائے گا تو خونیں ڈراما شروع ہوجائے گا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ایک ایک مسافر کو گولی مار کر جہاز سے باہر پھینک دیا جائے گا۔

بیس قیدیوں کو رہا کر کے سیکڑوں مسافروں کی جانیں بچائی جاسکتی تھیں۔ مطالبات کو فوراً ہی مان لیا گیا لیکن ان پر عمل درآمد میں خاصا وقت لگنے والا تھا۔ جہاز کے تمام مسافر کم از کم چوبیس گھنٹوں تک یرغمالی بن کر رہنے والے تھے۔

ہائی جیکرز اپنے معاملات میں مصروف تھے۔ بڑی دیر بعد ایک نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔''نمروجا کہاں ہے؟ بڑی دیر سے دکھائی نہیں دے رہا ہے؟''

دوسرے ساتھی نے کہا۔''اس کی ڈیوٹی جہاز کے پچھلے حصے میں تھی۔ اُدھر وہ بڑی دیر سے نظر نہیں آرہا ہے۔''

انہوں نے مسافروں کو ٹوائلٹ جانے اور رفع حاجت سے روک رکھا تھا۔ اسی لیے اب تک بھید نہیں کھل رہا تھا۔ ایک ہائی جیکر نے کہا۔''میں جا کر دیکھتا ہوں۔ اسے ٹوائلٹ میں زیادہ دیر بیٹھنے کی عادت ہے اور خواہ مخواہ مسافروں کو روکا گیا ہے۔ انہیں بھی وہاں جانے کی اجازت دی جائے۔''

وہ مسافروں کے درمیان سے گزرتا ہوا جانے لگا۔ مراد نے ریشماں اور دلیر جان کی طرف جھک کر کہا۔''تیار رہو۔ اب ہنگامہ شروع ہونے والا ہے۔''

وہ ہائی جیکر مسافروں سے بولتا جارہا تھا۔''اب کوئی پابندی نہیں ہے۔ ٹوائلٹ جانے والے جاسکتے ہیں۔''

یہ سنتے ہی کئی مسافر اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور اس کے پیچھے جانے لگے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''رک جاؤ، پہلے مجھے چیک کرنے دو۔ ہمارا ایک ساتھی نظر نہیں آرہا ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کر ایک ٹوائلٹ کے دروازے کو کھول کر دیکھا۔ وہاں چار ٹوائلٹ تھے۔ وہ تیسرے کا دروازہ کھول کر چونک گیا بلکہ سہم گیا۔ رفع حاجت کے لیے آنے والوں کی طرف گن اٹھا کر بولا۔''پیچھے ہٹو۔ کسی نے نمروجا کا مرڈر کیا ہے۔'' وہ چیخ کر بولا۔''کون ہے وہ؟ سامنے آجائے ورنہ ایک ایک کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

عورتیں، مرد اور بچے سہم کر پیچھے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ اس نے فون پر نمبر پنچ کر کے ڈئم برگ سے رابطہ کیا پھر کہا۔''باس! یہاں ہمارا کوئی دشمن ہے۔ اس نے نمروجا کا مرڈر کیا ہے۔ اس کی لاش ایک ٹوائلٹ میں پڑی ہے۔''

اس اطلاع نے تمام ہائی جیکرز کے دماغوں میں خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ڈئم برگ پائلٹ کیبن میں تھا۔ فون پر غصے سے بولا۔''یہ کیسے ہوگیا؟ ہمیں خبر نہ ہوئی اور وہ مارا گیا۔ وہ قاتل جہاز کے اندر ہی ہوگا۔ اسے پکڑو۔''

کیبن میں اس کے دو ساتھی تھے۔ اس نے ایک سے کہا۔''تم پائلٹ کو نشانے پر رکھو، ہم ابھی آتے ہیں۔''

ڈئم برگ پائلٹ کو وہاں چھوڑ کر کو پائلٹ ائر ہوسٹس اور اسٹیورڈ کو دھکے مار کر کیبن سے باہر لے آیا۔ وہاں لاش کو دیکھنے والے ساتھی نے کہا۔''باس! میں نے نمروجا کی لاش کو چیک کیا ہے۔ اس کی گن اور بلٹس نہیں ہیں۔ وہ کوئی خطرناک شخص ہے۔ گن اب اس دشمن کے پاس ہے۔''

ڈئم برگ نے تمام ساتھیوں سے کہا۔''اسے تلاش کرو۔ وہ جہاز سے باہر نہیں جاسکتا اور اپنے پاس گن چھپا کر نہیں رکھ سکے گا۔ سب کے لباس کی اور سامان کی تلاشی لو۔''

وہ تعداد میں پانچ تھے۔ ایک ایک مسافر کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اپنے پاس بلا کر اس کے لباس کی تلاشی لینے

لگے۔ ان میں سے ایک نے ایک خاتون کی تلاشی لینی چاہی تو اس کے رشتے دار اعتراض کرنے لگے۔ انہوں نے اپنے اپنے ریوالوروں اور پستولوں کو ان کی کنپٹیوں سے اور سینوں سے لگا کر کہا۔ ''جو بولے گا وہ مارا جائے گا۔''

وہ تمام ہائی جیکرز جہاز کے اندر بڑے سائز کے ہتھیار نہیں لاسکے تھے۔ چھوٹے سائز کے اسلحے سے انہوں نے سب کو زیر کیا تھا۔ جس خاتون کے لباس کی تلاشی لی گئی، وہ حیا کی ماری رونے لگی تھی۔ یہ ضمیر کو جھنجوڑنے والی بات تھی۔

مراد نے تڑپ کر کہا۔ ''ابھی اور خواتین اور کنواری لڑکیوں کے ساتھ ایسی ہی شرمناک حرکتیں ہوں گی۔ میں اپنے ربّ سے معافی مانگتا ہوں۔ ایسا میری کمزوری کے باعث ہوگا اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔''

اس نے ریشماں سے کہا۔ ''مجھے گن اور بلنس دو۔''

وہ سہمی ہوئی تھی۔ اسے ریوالور اور بلنس دیتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا کرو گے؟ اچھی طرح سوچ لو۔ یہاں گولیاں چلیں گی تو ہم سب مارے جائیں گے۔''

''میں بھی مارا جاؤں گا' کوئی بات نہیں۔ لیکن دشمنوں کو کسی شریف زادی کے لباس تک پہنچنے نہیں دوں گا۔''

ریشماں نے اسے بڑی محبت سے اور عقیدت سے دیکھا۔ وہ تمام ہائی جیکرز جہاز کے پچھلے حصے میں مسافروں کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان سب کی تلاشی لے رہے تھے۔ مراد وہاں سے جھک کر چلتا ہوا سامنے پائلٹ کیبن کے دروازے پر آگیا۔ اسے اندازہ تھا کہ کیبن میں ایک یا دو سے زیادہ دشمن نہیں ہوں گے۔ پہلے ان سے نمٹنا آسان ہوگا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں تین بار ٹھک ٹھک کی دھیمی آواز سے دستک دی۔ اندر ایک ہی گن مین تھا۔ اس نے پائلٹ کو نشانے پر رکھتے ہوئے دروازے کے پاس آکر اسے ذرا سا کھولا۔ مراد نے باہر سے زوردار دھکا مارا تو اچانک دروازہ کھلنے کے باعث وہ ٹکرا کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔ اس پر اچانک افتاد آن پڑی تھی۔ وہ سنبھل کر اپنی گن چلاسکتا تھا۔ اس سے پہلے مراد نے اس کے ہاتھ پر ایک کک ماری۔ وہ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ پھر تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ مراد نے اسے نشانے پر رکھ لیا تھا۔ پائلٹ حیرانی سے اور بڑے اعتماد سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ ہائی جیکر نے کہا۔ ''کون ہو تم؟ بری طرح پچھتاؤ گے۔''

مراد نے کہا۔ ''ایک لفظ نہ بولو۔ دوسری طرف منہ کرو۔''

وہ دیوار کی طرف گھوم گیا۔ مراد نے ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ گولی چلاتا تو دشمن ادھر دوڑے چلے آتے۔ خاموشی سے جنگ لڑنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا۔ اس کے سر پر ایسا دھماکا ہوا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ فرش کی طرف جھکتا ہوا گرنے لگا۔ مراد نے بڑی بے رحمی سے دوسری تیسری ضربیں لگائیں تو وہ فرش پر گر کر ایک ذرا تڑپ کر مر گیا یا پھر بے ہوش ہوگیا تھا۔

اس نے دشمن کی گن اٹھا کر پائلٹ سے کہا۔ ''میں جارہا ہوں۔ دروازے کو اندر سے بند کرلو۔ اگر یہ ہوش میں آنے لگے تو پھر اس کے سر پر مارو۔ اسے آنکھیں کھولنے اور بولنے کے قابل نہ رہنے دو۔''

پائلٹ نے کہا۔ ''میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔ تم وہی ہو نا جس نے ایک اور دشمن کو ٹوائلٹ میں ہلاک کیا ہے؟''

مراد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس ہائی جیکر کا فون اس کی جیب سے نکال کر باہر آگیا۔ پائلٹ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ اس کیبن کے ساتھ ہی وی آئی پی مسافروں کا پورشن تھا۔ وہ سب سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ مراد کے ہاتھوں میں دو گنیں دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''آپ سیٹوں کے نیچے بیٹھ جائیں۔ کوئی سر اٹھا کر نہ دیکھے۔''

مرد اور عورتیں سب ہی اپنی سیٹوں کے درمیان فرش پر جھک کر بیٹھ گئے۔ مراد اکانومی کلاس میں مسافروں کے درمیان ایک سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ وہاں ڈیم برگ اپنے تین ماتحتوں کے ساتھ مسافروں کا لباس اور ان کا سامان چیک کررہا تھا۔ غصے میں گالیاں دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''سالا جو بھی ہے' کب تک چھپا رہے گا۔ کتے میں تو تیری ماں کے پیٹ سے تجھے نکال لاؤں گا۔''

مراد نے اس کے ماتحت کے فون پر نمبر پنچ کیے۔ دو نمبروں کو آزمانے کے بعد تیسرے نمبر نے اسے ڈیم برگ کے پاس پہنچا دیا۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہاں بول گا یکورا! کیا بات ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''نہ میں تیری گالیوں سے مروں گا، نہ گولیوں سے۔ اپنے آدمیوں کا حساب کر۔ تیرا دوسرا ساتھی بھی گیا۔ تو اس کے فون سے اپنے باپ کی آواز سن رہا ہے۔''

وہ غصے سے اچھل کر جہاز کے اگلے حصے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''وہ کیبن میں ہے۔ اس نے گا یکورا کو بھی مار ڈالا ہے۔ چلو اُدھر......''

اس نے تینوں ماتحتوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا پھر خود ان کے پیچھے چلنے لگا۔ مسافروں سے کہنے لگا۔ ''اب گولیاں چلیں گی، تم لوگ نیچے بیٹھ جاؤ۔''

سب ہی نیچے سیٹوں کے درمیان بیٹھنے لگے۔ مراد بھی ان کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ ڈئم برگ کے تین ماتحت پائلٹ کیبن کے دروازے پر دستک دے کر وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ دیوار سے لگ گئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''دروازہ کھول، نہیں تو ہم توڑ کر اندر آجائیں گے۔''

وہ دروازے پر لات مارتے ہی ایک طرف ہٹ گیا۔ یہ خوف تھا کہ مراد اندر سے گولیاں چلائے گا۔ ابھی وہ یہی کرنے والے تھے۔ دروازہ نہ کھلتا تو اس کے لاک پر گولیاں مار کر اسے توڑنے اور کھولنے والے تھے۔ اس سے پہلے مراد کے لیے گولی چلانا ضروری ہوگیا تھا۔ دروازہ ٹوٹنے سے بھید کھل جاتا کہ ان کا شکار کیبن میں نہیں ہے۔ وہ پھر مسافروں کے درمیان آکر اسے تلاش کرتے اور خواتین کے لباس کو ہاتھ لگاتے۔

وہ تینوں کیبن کے قریب دروازے کے آس پاس تھے۔ ان کا سرغنہ ڈئم برگ ان سے دور سیٹوں کی درمیانی راہداری میں کھڑا تھا اور مراد سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ سیٹوں کے درمیان فرش پر رینگتا ہوا راہداری میں آیا۔ وہاں سے نشانہ لے کر اس کے دائیں بازو میں گولی ماری پھر دوسرے ہی لمحے میں دوسرے بازو میں گولی اُتار دی۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر فرش پر گرگئی۔ اس کے دونوں زخمی ہاتھ اس قابل نہیں رہے تھے کہ اپنی گن اٹھا سکیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگنے لگا۔ تیسری گولی اس کی ٹانگ پر لگی۔ وہ اچھل کر گر پڑا۔ اپنے ساتھیوں تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے تینوں ساتھی اِدھر اُدھر چھپ کر دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ گولیاں چلانے والا دشمن کہاں ہے؟

وہ تین گولیاں چلانے کے بعد پھر رینگتا ہوا سیٹوں کے درمیان آکر چھپ گیا تھا۔ انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تینوں آگے اکانومی کلاس کی طرف آنے کی جرأت نہیں کررہے تھے۔

ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔ ''سامنے آؤ۔ نہیں تو ہم مسافروں پر گولیاں چلائیں گے۔''

وہ چیخ کر بولا۔ ''تمہارا یہ آدمی میرے سامنے زخمی پڑا ہے۔ ابھی زندہ ہے۔ کیا میں اسے مار ڈالوں؟''

ڈئم برگ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ وہ چیخ کر اپنے ماتحتوں سے بولا۔ ''گولیاں نہ چلانا۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔ اس سے سمجھوتا کرو۔ مجھے جلدی فرسٹ ایڈ پہنچاؤ۔''

مراد ان تینوں سے بولا۔ ''تم لوگ سن رہے ہو۔ اسے طبی امداد ملے گی تو یہ بچے گا۔ اسے زندہ رکھنا چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر سامنے آجاؤ۔''

پھر وہ چپ ہوکر فرش پر رینگتا ہوا سیٹوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اُدھر آیا جہاں سے اس بولنے والے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہاں تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر دو گن مین دکھائی دیے۔ وہ بھی سیٹوں کے درمیان چھپے ہوئے تھے۔ ایک نے وہاں سے سر نکال کر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اے، ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے۔ ہم سے دوستی کرو۔''

مراد نے نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ وہ اسی لمحے میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ دوسرے ماتحت نے سیٹوں کے درمیان سے ہاتھ بڑھا کر مراد کی سمت گولی چلائی۔ اس سے پہلے ہی ایک گولی آکر اس کے ہاتھ میں لگی۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر راہداری میں آگئی۔ اب اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ گولی کھانے کے لیے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس گن کو وہاں سے اٹھاتا۔

جب بھی گولیاں چلتی تھیں، عورتیں اور بچے خوف کے مارے چیخنے اور رونے لگتے تھے۔ جہاز کے باہر آرمی اور دیگر سیکیورٹی والے فائرنگ کی آوازیں سن رہے تھے۔ پائلٹ فون کے ذریعے ان سے کہہ رہا تھا کہ وہاں ایک ہی شخص تمام ہائی جیکرز کے لیے چیلنج بنا ہوا ہے۔ وہ تعداد میں چھ تھے۔ اس نے دو کو مار ڈالا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں کیبن کے اندر ہوں۔ اس اکیلے فائٹر نے مجھے دروازہ کھولنے سے منع کیا ہے۔ باہر فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہورہا ہے کہ وہ فائٹر ان کے مقابلے میں ابھی زندہ ہے۔''

سیکیورٹی کے منتظم اعلیٰ نے پوچھا۔ ''وہ کون سر پھرا ہے؟ کیوں ان سے لڑ پڑا ہے؟ کیا یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ فائرنگ کے نتیجے میں بے گناہ مسافر بھی مارے جارہے ہوں گے۔''

پائلٹ نے کہا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ عورتوں اور مردوں کی چیخوں سے اندازہ ہورہا ہے کہ انہیں بھی گولیاں لگ رہی ہیں۔''

منتظم اعلیٰ نے کہا۔ ''ہی از اے فرسٹ کلاس فول..... خود تو مارا جائے گا، اپنے ساتھ مسافروں کو بھی حرام موت دے رہا ہے۔ اگر وہ زندہ بچے گا تو ایک ایک مسافر کی ہلاکت کا ذمے دار ہوگا۔ ہم اسے گرفتار کرکے اس پر مقدمہ چلائیں گے۔''

پتا نہیں آئندہ مراد کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ ابھی تو وہ تمام ہائی جیکرز پر حاوی ہوچکا تھا۔ ان میں سے ایک کی لاش ٹوائلٹ میں تھی، دوسرے کی لاش پائلٹ کیبن میں پڑی

تھی۔ تیسرا مسافروں کے درمیان سیٹوں کے نیچے مارا گیا تھا۔ جو تھے کے زخمی ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ وہ تنہا ہو گیا تھا اور پانچواں ان کا سرغنہ ڈیم برگ تین گولیاں کھا کر طبی امداد کا محتاج ہو گیا تھا۔ وہ مفلوج ہو کر اسلحہ پکڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صرف ایک سلامت رہ گیا تھا۔

مراد نے اسے للکارا۔ ''ہتھیار پھینک کر سامنے آجاؤ تم اکیلے رہ گئے ہو۔ اپنے تمام ساتھیوں کا انجام دیکھ رہے ہو۔ اگر گرفتاری پیش کرو گے تو یہ تمام مسافر تمہاری حمایت میں بولیں گے۔ تمہارے لیے کم سے کم سزا کی گزارش کریں گے۔'' پھر مراد نے اور بلند آواز سے کہا۔ ''میری بہنو، اور بھائیو! اسے اپنی حمایت کا یقین دلاؤ۔''

تمام مسافر بولنے لگے کہ وہ ہتھیار پھینک دے۔ سب ہی اس کی حمایت میں بیان دیں گے۔ تنہا رہ جانے والے کے لیے یہی ایک بچاؤ کا راستہ رہ گیا تھا۔ وہ جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے نکل آیا۔ اس نے اپنی گن مسافروں کے درمیان راہداری میں پھینک دی۔ مراد نے فوراً ہی اپنی جگہ سے نکل کر راہداری میں پڑے ہوئے دو ریوالور اٹھا لیے۔ جس کا ہاتھ زخمی ہوا تھا، وہ بھی سامنے آگیا۔ تمام مسافر شیر ہو گئے۔ انہوں نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ کیبن کا دروازہ کھل گیا۔ پائلٹ اطلاع دے رہا تھا کہ تمام ہائی جیکرز کو زیر کرلیا گیا ہے۔ آرمی کے افسران طیارے میں آسکتے ہیں۔ نگارا خانم اپنے محل میں بیٹھی پل پل کی خبریں سن رہی تھی۔ پائلٹ کی اطلاع کے مطابق صرف ایک شخص نے ان ہائی جیکرز کی لاشیں گرائی تھیں۔ انہیں زخمی کیا تھا۔ جو بچ گئے تھے، انہیں اب آسانی سے گرفتار کیا جا رہا تھا۔

نگارا نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا ایک تنہا شخص نے ایسی دلیری دکھائی ہے؟'' اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ''لیکن کیسے؟ ایک تنہا شخص مسلح ہائی جیکرز سے کیسے لڑتا رہا ہے؟''

اسے کہا جا رہا تھا۔ ''ہر ہائی نس! انتظار فرمائیں۔ اس جنگ باز سورما کو باہر لایا جا رہا ہے۔ ابھی تفصیلات معلوم ہوں گی۔''

طیارے سے سیڑھی لگا دی گئی تھی۔ زندہ اور مردہ تمام ہائی جیکرز کو باہر لایا گیا تھا۔ جو مجرم زندہ اور زخمی تھے، ان کے بیانات لیے جا رہے تھے۔ وہ بیانات نگارا خانم تک پہنچ رہے تھے۔ یہ معلوم کر کے وہ شدید حیرانی میں مبتلا ہوئی تھی کہ مراد پہلے نہتا تھا۔ اس نے ان کے ہی اسلحے سے انہیں زیر کیا ہے۔ وہ تڑپ کر محل سے نکل آئی۔ اس نے مراد علی منگی کے متعلق ایسے کارنامے سنے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی ریاست میں آگیا ہے۔ اگر وہ نہیں بھی ہے تو اس جیسا کوئی آگیا ہے۔ اس کے ذہن میں بار بار یہی بات آرہی تھی کہ اس نے ایسی دلیری دکھائی ہے جو قصے کہانیوں میں پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ وہ مسلح ہائی جیکرز تعداد میں چھ تھے اور وہ نہ صرف تنہا تھا بلکہ نہتا بھی تھا۔

وہ ائر کنڈیشنڈ رولس رائس میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف جارہی تھی۔ اس ٹھنڈی گاڑی میں مراد کے متعلق سوچ رہی تھی۔ چھ ماہ پہلے اپنے پہلے شوہر کو طلاق دی تھی، تب سے اکیلی تھی۔ اب اتنے انتظار کے بعد وہ آسمان سے اڑتا ہوا اس کی زمین پر آیا تھا۔ ملکہ عالیہ نے مراد کے علاوہ قلندر شاہ کا چرچا سنا تھا۔ سوچا تھا کہ جب تک مراد کا سراغ نہ ملے اور وہ ہاتھ نہ آئے تب تک قلندر شاہ کو شوہر بنا کر گزارہ کرے گی۔ جب خوش قسمتی سے مراد ہاتھ آئے گا تو قلندر شاہ کی چھٹی کردے گی لیکن وہ پل چرخی جیل سے نکلنے کے بعد اس کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا پورا جسم ایسا نیم سوختہ تھا جیسے اسے آگ میں پکایا گیا ہو۔ ملکہ کے حکم سے اس کا علاج کیا جارہا تھا۔

مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔ تہذیب کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا چاہیے۔ غباروں کے ذریعے آنے والے لفافے کی تحریر نے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ جلد ہی ماروی کے ذریعے مراد تک پہنچ سکے گی اور وہ اس آئیڈیل کو پالینے کے لیے تمام ممالک کے تعاون سے اس منصوبے پر عمل کرنے والی تھی کہ غباروں کا تعاقب کرتی ہوئی ہیلی کاپٹر کے ذریعے ماروی تک پہنچے گی۔ ایسے وقت اغوا کیے جانے والے طیارے میں ایک سورما آگیا تھا۔ جو مراد علی منگی سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

وہ ائرپورٹ پہنچ گئی۔ اس کی آرمی کے جوان حدِ نظر تک الرٹ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک خاتون افسر نے سیلوٹ کر کے کار کا دروازہ کھولا پھر پوچھا۔ ''کیا ہر ہائی نس ان ہائی جیکرز کو دیکھنا چاہیں گی؟''

وہ بولی۔ ''پہلے اس سورما کو دیکھنا چاہوں گی جو اکیلا ایک آرمی کے برابر ہے۔''

افسر نے کہا۔ ''پلیز! میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔''

نگارا اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کے آگے پیچھے مسلح فوجی تھے۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ''سورما کا نام کیا ہے۔''

افسر نے کہا۔ ''جان محمد...... وہ دہلی سے آرہا

ہے اور لندن جانے والا ہے۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی سیکیورٹی افسر کے کمرے میں آئی۔ وہاں آرمی کے اعلیٰ افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد ایک طرف ملزم کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ نگارا خانم کو دیکھتے ہی سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک افسر نے مراد سے کہا۔ ''یہ ریاست کی ملکہ معظمہ ہیں۔ سر جھکاؤ، سلام کرو۔''

ملکہ نے پہاڑ جیسے قد آور شخص کو دیکھا۔ وہ سلام کرتے ہوئے بولا۔ ''سوری...... سر نہیں جھکاؤں گا۔''

ایک اعلیٰ افسر نے اس کے سامنے آ کر کہا۔ ''یو نان سنس...... تم ہر ہائی نس کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔''

اس نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مراد نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے کلائی چھڑا لے گا لیکن نہ چھڑا سکا۔ زور آزمانے لگا۔ آرمی میں جو ٹریننگ حاصل کی تھی، اس کے تمام داؤ پیچ آزمانے لگا۔ دوسرے دو افسران اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ نگارا خانم نے ڈانٹ کر کہا۔ ''اسٹاپ...... کوئی مداخلت نہ کرے۔''

وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ باقی افسران پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ ان کا ساتھی افسر اپنی کلائی چھڑا نہیں پا رہا تھا اور وہ سب اپنی انسلٹ محسوس کر رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ خود کو چھڑا نہیں سکے گا۔ اس نے اچانک گھوم کر مراد کو اپنی پیٹھ پر لاد کر دھوبی پاٹ مارنا چاہا۔ مراد اناڑی نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ مقابل کیسے کیسے داؤ آزما سکتا ہے۔ وہ پہلے سے تیار تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ ایک کلائی کے بعد گردن بھی شکنجے میں آ گئی تھی۔ نگارا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خواب خواب سی ہو گئی تھیں۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ ''یہی تو ہے جس کے انتظار میں مطلقہ ہو کر بیٹھی ہے۔ اِس کے سامنے وہ مراد علی منگی تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس نے حکم دیا۔ ''اسٹاپ......!''

اس افسر نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ رُک کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ نگارا خانم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''مسٹر جان محمد! میں چاہتی ہوں، تم اسے چھوڑ دو۔''

مراد نے فوراً ہی اسے چھوڑ کر دھکا دیا۔ وہ آگے کی طرف گرتے گرتے سنبھل گیا۔ نگارا خانم نے اسے حقارت سے کہا۔ ''یو لیزی سولجر... ! گیٹ آؤٹ۔''

وہ سر جھکا کر کمرے سے باہر چلا گیا پھر ملکہ نے تمام افسران پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''تم سب بیٹھے ہوئے تھے۔ جان محمد کیوں کھڑا ہوا تھا؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''ہر ہائی نس! ہم محاسبہ کر رہے ہیں۔ ہم ہائی جیکرز کے مطالبات مان کر دو سو دس مسافروں کو سلامتی دے چکے تھے لیکن اس نے ان کے ایک ساتھی کو ہلاک کر کے تمام مسافروں کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں ہم جہاز کے باہر سے سن رہے تھے۔''

ملکہ نے پوچھا۔ ''کتنے مسافر مارے گئے ہیں؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''مارا تو کوئی بھی نہیں گیا لیکن کسی کو گولی لگ سکتی تھی۔''

ملکہ نے پوچھا۔ ''کتنے مسافر زخمی ہوئے؟''

اس نے کہا۔ ''زخمی تو نہیں ہوئے ہیں لیکن ہو سکتے تھے۔''

ملکہ نے پوچھا۔ ''کیا اس خوف سے جنگ نہ لڑی جائے کہ دشمن کے جہاز ہمارے گھروں پر بمباری کریں گے اور ہمارے بیوی بچے اور ہمارے شہری مارے جائیں گے؟''

یہ ایسی ٹھوس حقیقت تھی جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہ کوئی جواب دے سکتے تھے، نہ اپنی ملکہ سے بحث کر سکتے تھے۔ ان سب کے سر جھک گئے۔

وہ مراد سے بولی۔ ''میں سننا چاہوں گی کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا اور تم نے تنہا کیسے جنگ لڑی ہے اور کس طرح انہیں زیر کیا ہوا تھا۔ پلیز! بیٹھ جاؤ۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملکہ نے کہا۔ ''یہ جو بول رہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کیا جائے۔ اس کے بارے میں فیصلہ ابھی اسی جگہ ہوگا۔ سپریم کورٹ کے جج کو، آرمی کے تین اعلیٰ افسران کو یہاں ہونا چاہیے۔''

وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ فوراً ہی آڈیو ریکارڈنگ کے انتظامات کیے جانے لگے۔ ملکہ خانم اسے نظر بھر کے دیکھنا چاہتی تھی لیکن شاہانہ رعب اور دبدبہ بھی قائم رکھنا لازمی تھا۔ لہٰذا اس سے بولنے کے بہانے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''انڈین ہو؟''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''جی ہاں۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''خاندانی رئیس ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں کیا کرنا چاہیے۔''

ملکہ نے سب سے اہم سوال کیا۔ ''شادی ہو چکی ہے؟''

''جی ہاں۔ ایک شریکِ حیات ہے لیکن افسوس... وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔''

اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ ''کیا وہ ازدواجی وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہے؟''

''جی ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ بے چاری... ایک حادثے میں اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ آئندہ شیر

کو پہلے جیسی شیرینی نصیب نہیں ہوگی۔''

اس نے پوچھا۔ ''کوئی دوسری نظر میں ہے؟''

ماروی اس کے سامنے آگئی۔ وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''میں نے پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کی تھی۔ اب نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ نہ یہ رہی، نہ وہ رہی۔''

پھر وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''میں اسے واپس بلا رہا ہوں۔ پچھتا رہا ہوں۔ میں نے اسے خط لکھا ہے کہ مجھے معاف کر دے۔ میری زندگی میں واپس آجائے۔''

ملکہ نگارا نے کہا۔ ''تعجب ہے۔ ایسا تو مراد علی منگی کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی ماروی کو طلاق دینے کے بعد پچھتا رہا ہے۔ اسے واپس بلا رہا ہے۔''

مراد نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ مراد علی منگی کو جانتی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''اسے ایک دنیا جانتی ہے۔ کیا تم ٹی وی نہیں دیکھتے؟ نیوز نہیں سنتے؟''

''جی ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ اس دیوانے نے اپنی ماروی کے نام کوئی خط لکھا ہے اور اس خط کو اس نے غباروں کے ذریعے ہوا میں اڑایا ہے۔ خبروں میں کہا گیا ہے کہ وہ ماروی کا موجودہ پتا ٹھکانا نہیں جانتا ہے۔ اس لیے غباروں کے ذریعے بچوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔''

نگارا خانم مسکرا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تعجب ہے کہ اس بچکانا کھیل میں آرمی اور انٹیلی جنس والے بھی شریک ہوگئے ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کچھ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی ہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اس بے چارے عاشق کے اڑائے ہوئے غبارے میرے پاس آگئے ہیں۔''

''کیا......؟'' مراد چونک کر کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی نگارا خانم سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

وہ بولا۔ ''وہ...... وہ غبارے تو بلندی پر اڑتے جا رہے تھے۔ آپ کے پاس کیسے پہنچ گئے؟''

وہ بولی۔ ''ہم تدبیر کے ذریعے تقدیر سے کھیلتے ہیں اور تقدیر ہم سے کھیلتی ہے۔ مراد اپنا خط ماروی تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ محبت نامہ میرے پاس آگیا ہے۔ تقدیر اور مہربان ہوگی تو مراد بھی میرے پاس پہنچ جائے گا۔''

''آپ کیوں چاہتی ہیں کہ مراد آپ کے پاس آجائے؟''

وہ اس پر قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہارے ہی جیسا ہوگا۔ میں نے اسے دیکھا نہیں ہے لیکن وہ میرے حواس پر چھا گیا ہے۔'' وہ ایک ذرا معنی خیز انداز میں بولی۔ ''میں تمہارے جیسے جان کی بازی لگانے والوں کی قدر کرتی ہوں۔''

وہ سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ 'واقعی تقدیر ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ یہ مجھ پر مرمٹی ہے۔ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میرا خط اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔ یہ کہہ رہی ہے کہ میں بھی کسی دن اس کے پاس پہنچ جاؤں گا اور انجانے میں اس کی آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ میری حقیقت معلوم ہو جائے تو شاید گلے کا پھندا بن جائے گی۔ لیکن ماروی کو جو لکھا ہے، وہ یہاں آکر رک گیا ہے۔ میرا وہ خط اس کے پاس محفوظ ہے یا اس نے ضائع کر دیا ہے؟ اسے یہاں سے آگے میری ماروی کے پاس جانا چاہیے۔'

اس نے پوچھا۔ ''مراد کا وہ خط آپ کو کب ملا ہے؟''

''آج سے کوئی چھ دن پہلے ملا تھا۔''

مراد نے مایوس ہو کر پوچھا۔ ''تھا کا مطلب یہ ہے کہ اب نہیں ہے۔ آپ نے اسے کہیں پھینک دیا ہے؟''

''میں اور اسے پھینک دوں؟ ہرگز نہیں۔ میں نے اسے اپنی جان کی طرح سنبھال کر رکھا ہے۔''

وہ اپنے دل میں بولا۔ ''تم اسے اپنی جان کی طرح سنبھال کر رکھو گی تو میرا نقصان ہوگا۔ اسے تمہارے پاس نہیں رہنا چاہیے۔ میری ماروی کے پاس جانا چاہیے۔ لیکن اب وہ کیسے جائے گا؟''

ایسے وقت ایک افسر نے کہا۔ ''ہر ہائی نس! آڈیو ریکارڈنگ کا انتظام ہو گیا ہے۔ آپ مسٹر جان محمد سے بیان لے سکتی ہیں۔''

سپریم کورٹ کی جج ایک خاتون تھی۔ آرمی کی کمانڈر ان چیف بھی خاتون ہی تھی۔ باقی فوج کے کرنل اور جنرل اور اس کے سیاسی مشیر مرد تھے۔ وہ سب کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

مراد نے بیان دینے کی ابتدا کی۔ اس نے کہا۔ ''میں اس وقت ٹوائلٹ میں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ ہائی جیکرز طیارے کو اپنے کنٹرول میں لے چکے ہیں۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تو میں نے اسے کھولتے ہی اس کے ہاتھ میں گن دیکھی۔ جہاز میں کوئی اسلحہ لا ہی نہیں سکتا۔ بڑی سخت چیکنگ ہوتی ہے۔ میں چشم زدن میں سمجھ گیا کہ خطرناک مجرم وہاں ہیں اور کوئی مجرمانہ گیم کھیل رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے

اس گن مین کو ٹوائلٹ کے اندر کھینچ کر اسے ختم کر دیا۔ اس کا اسلحہ حاصل کر لیا۔ مجھے فاضل آٹھ ہلٹس بھی مل گئے۔''

آرمی کے کرنل نے پوچھا۔ ''تم نہتے تھے۔ تم نے کیسے فائٹ کی؟ ا کیسے زیر کیا؟''

مراد نے کہا۔ ''میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکوں گا۔ آپ میرے سامنے گن لے کر آئیں اور آدھے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ آپ کو زیر کر کے دکھاؤں گا۔''

کرنل نے وہاں آنے سے پہلے یہ سنا تھا کہ مراد نے آرمی کے ایک تگڑے افسر کی ایک کلائی پکڑ کر اسے کیسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ آگے بولو۔''

خاتون کمانڈر ان چیف نے مراد سے کہا۔ ''جسٹ اے منٹ۔ یہ بتاؤ اس پر حملہ کرنا کیوں ضروری تھا؟ تم دوسرے مسافروں کی طرح اس کے نشانے پر رہ کر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ جاتے تو جہاز کے اندر گولیاں نہ چلتیں۔''

مراد نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ میری مردانگی نے گوارا نہیں کیا کہ میں ایک مردِ میدان سے چوہا بن جاؤں۔ دوسری بات یہ کہ وہ ہائی جیکرز ہم سے محبت کرنے اور نیکیاں کرنے نہیں آئے تھے۔ میں جانتا تھا' وہ جس ملک میں جہاز اتاریں گے، وہاں اپنے ایسے مطالبات منوائیں گے جو ناقابلِ قبول ہوں گے۔ مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو وہ ایک ایک مسافر کو گولیاں مارتے ہوئے اپنی بات منوائیں گے۔''

سپریم کورٹ کی جج صاحبہ نے کہا۔ ''یہ تمہارا اپنا خیال ہے۔ ورنہ ان کے مطالبات کو بڑے ممالک نے قبول کر لیا تھا۔ ان کے بیس ساتھی قید میں ہیں۔ انہیں رہائی کا حکم دے چکے تھے۔ پھر ہائی جیکرز کے لیے ایک چھوٹا طیارہ مہیا کیا جاتا تو وہ کسی خون خرابے کے بغیر یہاں سے چلے جاتے۔''

مراد نے کہا۔ ''یونہی نہیں جاتے۔ یہاں سے چار اہم سیاست دانوں کو' دو معزز تاجروں کو ان کی بیویوں اور بچوں سمیت اپنی سیکیورٹی کے لیے لے جاتے اور اپنے ملک میں جا کر ان سب کو رہا کر دیتے۔ کیا اس بات کی کوئی ضمانت تھی کہ جنہیں یرغمالی بنا کر وہ لے جا رہے ہیں' ان کے ساتھ وہ اچھا سلوک کریں گے اور انہیں عزت آبرو سے رہا کر دیں گے؟ میں نے مجرموں پر بھروسا نہ کرتے ہوئے ان یرغمالیوں کو عزت اور سلامتی دی ہے تو آپ جیسی انصاف کرنے والی خواتین کو اور معزز حضرات کو تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ آپ میرا کوئی جرم بتائیں؟ میں نے جہاز کے اندر گولیاں چلائیں۔ فائرنگ جرم ہے، اگر کسی کی جان کو نقصان پہنچے لیکن بے رحم مجرموں پر گولیاں چلانا جرم نہیں ہے۔ آپ کوئی ایک ایسا مسافر دکھا دیں جسے میری فائرنگ سے نقصان پہنچا ہو۔''

وہ سب ایک دوسرے سے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ نگارا خانم نے کہا۔ ''مسٹر جان محمد نے جان پر کھیل کر جو کارنامہ انجام دیا ہے' اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اس کے برعکس جان محمد پر بے تکے الزامات کیوں لگائے جا رہے ہیں؟''

خاتون کمانڈر ان چیف نے کہا۔ ''دو بڑے ممالک نے ہم سے کہا تھا کہ وہ قیدیوں کو اس شرط پر رہا کریں گے، جب ہم اس سورما جان محمد کو اس طیارے میں آگے نہیں جانے دیں گے۔ اس پر الزامات عائد کر کے گرفتار کریں گے اور بعد میں اس قیدی جان محمد کو ان بڑے ممالک کے حوالے کر دیں گے۔''

کرنل نے کہا۔ ''ہر ہائی نس! دو سو دس مسافروں کو بخیریت ان کے گھروں تک پہنچانے کے لیے اور ہماری ریاست کو ہائی جیکنگ کی سیاست سے پاک رکھنے کے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ ہم صرف ایک جان محمد کی قربانی دیں۔''

مشیرِ اعلیٰ نے کہا۔ ''ہر ہائی نس! آپ کا حکم ہے کہ ہم بین الاقوامی سیاسی توڑ جوڑ کا اہم حصہ بھی نہ بنیں۔ بڑے ممالک یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جہاد کے نام پر انسانی آبادیوں میں گولیاں چلاتے ہیں۔ بم دھماکے کرتے ہیں اور طیارے اغوا کرتے رہتے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ اس بار میں نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ آئندہ میڈیا کے ذریعے یہ بات پھیلے گی کہ طیارے کو اغوا کرنے والے مجاہدین نہیں تھے۔ بڑے ممالک کی سی آئی اے والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہاں مجھے جہاز میں گولیاں چلانے کا مجرم ثابت نہیں کر سکیں گے۔ لیکن آئندہ میری جان کے دشمن بنتے رہیں گے۔''

ملکہ نگارا خانم نے کہا۔ ''میں حکم دیتی ہوں، ایک بڑے ملک کی شرط مان کر جان محمد پر الزامات عائد نہ کیے جائیں۔ ہم اپنے مسلمان سورما کو ان کے حوالے نہیں کریں گے۔''

کرنل نے کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر...... لیکن ہماری ریاست کا امن و سکون برباد ہو جائے گا۔ بڑے ممالک کی انٹیلی جنس والے یہاں جرائم کو ہوا دیں گے۔ تخریبی کارروائیاں کرائیں گے۔ جب تک جان محمد کو یہاں سے اغوا

نہیں کریں گے یا ناکام ہونے کی صورت میں اسے گولی نہیں ماریں گے، تب تک یہاں سازشیں کرتے رہیں گے اور آئے دن ہماری انتظامیہ کے لیے مسئلے بنتے رہیں گے۔''

نگارا خانم نے کہا۔ ''میری ریاست کی انتظامیہ مسائل سے نمٹنے کے لیے ہی ہے۔ اگر جان محمد مسئلہ بن رہا ہے اور اس مسئلے سے نمٹنے کا حل آپ کے پاس نہیں ہے تو آپ استعفا دے دیں۔ جو اس نئے چیلنج کو قبول کرے گا میں اسے منتظم اعلیٰ بناؤں گی۔''

پھر اس نے سپریم کورٹ کی جج سے کہا۔ ''آپ نے سن لیا کہ مسٹر جان محمد کی دلیری کے نتیجے میں کسی ایک مسافر کو بھی نقصان نہیں پہنچا۔ تمام مسافر یہاں سے صحیح سلامت جانے والے ہیں۔ بڑے ممالک کو اس بات کا غصہ ہے کہ ہائی جیکرز کچھ مارے گئے ہیں، کچھ گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ یہ بھید کھل گیا ہے کہ وہ تمام مجرم مسلمان مجاہدین نہیں ہیں۔ آپ مسٹر جان محمد کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گی۔''

وہ بولی۔ ''مسٹر جان محمد از ناٹ گلٹی۔ کچھ دشمن تنظیمیں اسے گرفتار کرانا اور اپنا قیدی بنا کر انتقام لینا چاہتی ہیں۔ ہماری ریاست کے قوانین کے مطابق نہ یہ مجرم ہے، نہ اسے گرفتار کیا جائے گا۔ میں انتظامیہ کو حکم دیتی ہوں کہ جان محمد کے لیے سخت سیکیورٹی کے انتظامات کیے جائیں۔ موصوف کو کسی دوسرے طیارے میں یہاں سے روانہ کیا جائے۔ موجودہ سفر کو جاری رکھنا ان کے لیے خطرناک ہوگا۔''

ملکہ نگارا خانم نے کہا۔ ''شکریہ۔ مسٹر جان محمد میرے مہمانِ خاص بن کر محل کے مہمان خانے میں رہیں گے۔ میں آرمی کے اعلیٰ افسران سے کہتی ہوں کہ اس لمحے سے چوکنا رہیں۔ دشمن تنظیموں کی سازش ہمارے لیے چیلنج بننے والی ہے۔ ہم ان کے دباؤ میں نہیں آئیں گے۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سپریم کورٹ کی جج اور دوسرے تمام اعلیٰ افسران فوراً ہی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

اس نے کہا۔ ''مسٹر جان محمد! میرے ساتھ آئیں۔''

وہ اس کے ساتھ باہر آیا۔ باہر اس کی کار جہاں کھڑی ہوئی تھی، وہاں تک فوج کے سپاہی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ اسے سلامی مل رہی تھی۔ وہ ملکہ عالیہ کے ساتھ ابھی فوج اور اسلحے کے سائے میں محفوظ تھا۔ ویسے یہ اندازہ تھا کہ آئندہ سکون اور اطمینان غارت ہونے والا تھا۔ وہ جان محمد کے روپ میں ایک عام شہری کی حیثیت سے اب تک محفوظ تھا۔ اس نے دہلی میں رہ کر نہ کسی کو چھیڑا تھا نہ کوئی اس کی جان کو آیا تھا۔ اب اس نے ہائی جیکرز کو ان کے برے انجام تک پہنچا کر صحیح کیا تھا یا غلطی کی تھی؟ اس کا صحیح جواب آگے چل کر جلد ہی ملنے والا تھا۔ اب نئے سرے سے نئے دشمن اسے گھیرنے والے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ بیرونی ممالک کے سیکریٹ ایجنٹس اس کے خلاف کیسی کیسی چالیں چلنے والے ہیں؟ بس ایک اندازہ تھا کہ وہ دشمن مقامی بھی ہوں گے اور بیرونی ممالک سے آکر وہاں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے افراد بھی ہوں گے۔

ملکہ نگارا خانم نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ اگلی سیٹ پر ایک ڈرائیور اور ایک گن مین بیٹھ گیا۔ آگے پیچھے کئی مسلح خواتین کی گاڑیاں تھیں۔ پھر وہ قافلہ آگے چل پڑا۔ وہ شاہانہ طرز کی کار بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ وہ ایک طویل جدوجہد کے بعد تھک گیا تھا۔ اندر ہلکی سی ٹھنڈک اور رات کی رانی کی مہک اسے سحرزدہ سی کر رہی تھی۔ اگر وہ آنکھیں بند کرتا تو اسے نیند آ جاتی۔

نگارا خانم نے کہا۔ ''تم بہت تھک گئے ہو گے؟''

اس نے دل میں سوچا۔ 'ایک ملکہ مجھے اندر تک دیکھ رہی ہے اور سمجھ رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔'

پھر وہ بولا۔ ''جی ہاں، نیند بھی آ رہی ہے۔ بھوک بھی لگ رہی ہے۔ جہاز میں تو پانی پینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔''

نگارا نے اسی وقت فون پر حکم دیا۔ ''ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ کھانا تیار رکھو۔''

پھر وہ فون بند کر کے بولی۔ ''حالات کا تقاضا ہے کہ تم فی الحال یہاں سے نہ جاؤ۔ کچھ روز رہ کر دشمنوں کو تاڑتے رہو۔ فی الحال فضائی اور خشکی کے راستے تمہارے لیے... خطرناک ہیں۔ تمام جانے انجانے دشمن انتظار میں رہیں گے کہ تم آج نہیں تو کل کسی فلائٹ سے جانے والے ہو۔''

اس کے ذہن میں وہ محبت نامہ تھا جو ماروی تک پہنچ نہیں پایا تھا اور ملکہ عالیہ کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اسے ملکہ کی گرفت سے آزاد کرائے یا ماروی کے نام پھر ایک پیغام لکھ کر غباروں کے ذریعے اسے ہوا کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ لیکن وہ ابھی جان محمد تھا۔ ملکہ کی ریاست میں غباروں کا کھیل نہیں کھیل سکتا تھا۔ کسی دوسرے ملک میں بھی جا کر یہ تماشا نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں آکر ایک سوالیہ نشان بن جاتا یا پھر اسے جلد سے جلد لندن پہنچنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ماروی کو وہاں ڈھونڈ لے گا۔ پتا نہیں تقدیر کیا تماشے کر رہی تھی۔ نہ وہ خط پہنچ رہا تھا اور نہ وہ لندن پہنچ رہا تھا۔ حالات اسے ملکہ نگارا کے پاس لے آئے تھے۔

نگارا خانم نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بول رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے چپ ہوگیا تھا۔ اس کا جھکا ہوا سر اور سوچ سے بھری ہوئی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ کہیں دور کسی کے پاس پہنچا ہوا ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے نگارا سے کہہ چکا تھا کہ پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد پچھتا رہا ہے۔ اسے واپس بلانے کے لیے اس نے خط لکھا ہے۔ ملکہ سوچ رہی تھی' کیا یہ خیالوں میں اپنی مطلقہ بیوی کے پاس پہنچا ہوا ہے؟

وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ 'میں حسین بھی ہوں اور پُرکشش بھی۔ دیکھنے والی آنکھوں کو میری صحت مندی للچاتی ہے۔ لیکن یہ کشش محسوس نہیں کر رہا ہے۔ میری طرف چور نظروں سے بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ کسی دوسری کے پاس پہنچا ہوا ہے۔'

اس نے پوچھا۔ ''کیا بہت یاد آرہی ہے؟''

مراد نے خیالات سے چونک کر پوچھا۔ ''کون؟''

''وہی جسے طلاق دے کر پچھتا رہے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ اسے خط بھی لکھا ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہاں، بہت یاد آتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''دنیا میں اور بھی جیتے جاگتے حسین مجسمے ہیں۔ جسے چھوڑ دیا اسے کیوں یاد کر رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''اس کی یاد پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔''

''وہ ایسی زبردست ہے تو اسے چھوڑ کیوں دیا؟''

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ مجھ سرپھرے سے بھی ایک غلطی ہوگئی۔''

''تم نے اسے خط لکھا تھا۔ اس نے کیا جواب دیا؟''

''وہ خط ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ میں نے ایک بہت ہی قابلِ اعتماد دوست کو وہ محبت نامہ دیا تھا۔ دوست نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خط بھی پہنچائے گا اور اسے سمجھائے گا بھی۔ اسے میری زندگی میں واپس آنے کے لیے راضی بھی کرے گا لیکن خط کے ساتھ وہ بھی کہیں گم ہوگیا ہے۔ فون پر بھی اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

''تم خود ہی اس کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''اسی کے پاس جا رہا تھا لیکن تقدیر نے راستہ بدل دیا ہے۔ سفر ملتوی ہوگیا ہے۔ پتا نہیں کب یہاں سے آگے جاسکوں گا۔''

وہ دل میں بولی۔ ''نہیں جاسکو گے۔ خدا کی قدرت نے تمہیں میرے پاس پہنچایا ہے۔ ہمارے دین میں حکم ہے کہ کسی بیوہ یا مطلقہ عورت کو مرد کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔ جلد سے جلد شادی کرلینا چاہیے۔ میں ایک ریاست کی ملکہ ہوکر تقدیر کے آگے جھک رہی ہوں۔ تمہیں بھی جھکنا پڑے گا۔''

پھر اس نے سوچا۔ 'آہ مراد...! میں ایک خودمختار ملکہ ہوں۔ یہاں میرے ایک حکم پر سیاہ سے سفید ہوجاتا ہے۔ یورپ' امریکا اور روس کے مہنگے بازاروں میں جو چاہتی ہوں' وہ خرید لیتی ہوں۔ لیکن تم دولت سے حاصل نہیں ہوسکو گے۔ کبھی تمہارا سراغ مل جائے تو میری پوری فوج بھی تمہیں گھیر کر نہیں لاسکے گی۔ پھر بھی ایک امید ہے' سامنا ہوگا تو کسی بھی طرح تمہارا دل جیت لوں گی۔ ایک بار ہاتھ تو آجاؤ پھر جانے نہیں دوں گی۔'

پھر اس نے چور نظروں سے مراد کو دیکھا اور سوچا۔ 'یہ جانِ محمد بالکل تمہارے جیسا ہے۔ میں نے تمہاری ویڈیو فلم دیکھی ہے۔ یہ ویسا ہی پہاڑ ہے۔ تمہارے جیسا چٹان ہے۔ پھر تمہارے جیسا جنگجو اور غضب کا فائٹر بھی ہے۔ مجھے جلد ہی اس سے نکاح پڑھوانا ہوگا۔'

وہ بڑی حسرتوں سے اس کی تمنا کر رہی تھی' جو ایک ہاتھ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور حسرتیں ایسی تھیں کہ اسے پالینے کے بعد بھی مراد علی منگی اس کے دل میں پھانس کی طرح گزرا رہتا۔ حسرتِ ناکام بنا رہتا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دونوں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ کاش اسے الہام ہوجاتا کہ وہ مراد علی منگی کے ہی قریب ہے۔

وہ اس کے ساتھ شاہی محل میں آگئی۔ میز پر کھانے کی ڈشیں رکھی جارہی تھیں۔ وہ دونوں واش روم میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد میز کے اطراف ایک دوسرے کے روبرو ہوکر بیٹھ گئے۔ مراد نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''مراد علی منگی......''

نگارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میرا دل کہتا ہے جو ناکامی مجھے ہو رہی ہے' وہ مراد علی منگی کو نہ ہو۔ میرا خط میری مطلقہ بیوی تک پہنچ نہیں پا رہا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ مراد کا خط ماروی کے پاس پہنچ جائے۔ اگر میری گزارش پر آپ یہ نیکی کریں گی' اس خط کو غباروں کے ذریعے آگے بڑھادیں گی تو مجھے دلی اطمینان حاصل ہوگا۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں سمجھ رہی ہوں۔ تمہارے دل میں یہ بات ہے کہ مراد کو اس کی ماروی ملے گی تو نیکی کے صلے میں تمہیں بھی تمہاری بیوی مل جائے گی۔''

''ہاں' نیکی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ میں آپ سے بار بار گزارش کروں گا کہ اس خط کو آگے بڑھادیں۔''

''میں نے اسے آگے بڑھانے کے لیے سنبھال کر رکھا

ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مراد علی منگی میرا آئیڈیل ہے۔ میرے کئی جاسوس اسے ان ممالک میں جا کر تلاش کرتے ہیں، جہاں اس کی موجودگی کی اطلاع ملتی ہے لیکن وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی نابود رہتا ہے۔ اب میں نے سوچا ہے۔''

وہ چپ ہو گئی۔ لقمہ چبانے لگی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''یہی کہ جیسے آرمی اور انٹیلی جنس والے سوچ رہے ہیں، میں بھی ان غباروں کے ذریعے ہی اس کے پاس پہنچ سکتی ہوں۔''

''آپ غباروں کے ذریعے کیسے پہنچیں گی؟''

''وہ غبارے پہلے مجھے ماروی تک پہنچائیں گے پھر ماروی مراد سے رابطہ کرے گی تو میرا رابطہ بھی مراد سے ہو جائے گا۔''

''آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ غبارے کب ماروی کے پاس پہنچیں گے اور کہاں پہنچیں گے؟''

''میں نے انتظامات کیے ہیں۔ میں ہیلی کاپٹر میں رہ کر ان غباروں کا تعاقب کرتی رہوں گی۔''

مراد نے حیرانی سے کہا۔ ''یا خدا...! پتا نہیں وہ غبارے کتنے دنوں میں ماروی تک پہنچیں گے اور پہنچیں گے بھی یا نہیں؟ آپ کب تک ہیلی کاپٹر میں سفر کرتی رہیں گی؟''

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''کتنے ہی دن اور مہینے لگ جائیں۔ اگر وہ غبارے مراد کو ماروی تک پہنچا سکتے ہیں تو اسے میرے پاس بھی پہنچائیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''آپ بہت حسین ہیں۔ آپ میں بلا کی کشش ہے لیکن مائنڈ نہ کیجیے گا۔ ماروی اس سے راضی ہو جائے گی تو وہ آپ کی طرف مائل نہیں ہوگا۔''

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر میری طرف نہیں آئے گا؟ کیا میں ایسی نہیں ہوں کہ تم اپنی مطلقہ بیوی کو بھول کر میری طرف آ جاؤ؟''

نگارا نے بات سے بات نکال کر اپنے دل کی بات کہہ دی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میری بات چھوڑیں۔ مراد اور ماروی کے معاملے میں بولیں۔''

''میری بات کا جواب دو گے تو مان لوں گی کہ تم میری طرف مائل ہو سکتے ہو تو مراد بھی مائل ہوگا۔''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ آپ بہت ہی حسین اور دل نشین ہیں۔ آپ ملکہ عالیہ ہیں۔ میری کیا مجال کہ پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کروں۔ ویسے بھی یہاں پہنچ کر اپنے بے شمار انجانے دشمن پیدا کر چکا ہوں۔ آپ کی ناراضگی مول لے کر یہاں بالکل ہی بے دست و پا ہو جاؤں گا۔''

''پلیز! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہیں جبراً اپنی طرف مائل نہیں کروں گی۔ میں اپنا شوہر چاہوں گی، غلام نہیں چاہوں گی۔ بہرحال تم مراد اور ماروی سے نیکی کرنا چاہتے ہو۔ میں اس خط کو ضرور آگے بڑھاؤں گی۔''

وہ ایک گھونٹ پانی پی کر بولی۔ ''میں یہاں سے غباروں کو اڑانے اور خود ہیلی کاپٹر میں جانے کے انتظامات کر چکی ہوں۔ وہ تمام ممالک مجھ سے تعاون کریں گے، جہاں سے غبارے گزرتے رہیں گے۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک لقمہ چباتی رہی۔ سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تمہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکوں گی۔ میری غیر موجودگی میں یہاں تمہیں بھرپور سیکیورٹی نہیں ملے گی۔ میں موجود رہوں گی تو سیکیورٹی سے تعلق رکھنے والے سب ہی افسران پوری توجہ سے اپنی ذمے داریاں نبھاتے رہیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''ایک آئیڈیا ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں سے نکل سکوں گا۔''

وہ بولی۔ ''دشمن اندھے نہیں ہیں۔ وہ تمہیں ہیلی کاپٹر تک پہنچنے سے پہلے ہی اوپر پہنچا دیں گے۔''

''مجھے بھیس بدلنے میں مہارت حاصل ہے۔ کسی کا باپ بھی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔''

اس نے چونک کر مراد کو دیکھا۔ اور سوچا۔ 'تمام دشمن مراد کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ وہ حیرت انگیز بہروپیا ہے۔ کوئی اس کے قریب سے گزر کر بھی پہچان نہیں پاتا ہے۔'

مراد نے پوچھا۔ ''آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں؟ کیا سوچ رہی ہیں؟''

نگارا خانم نے بات بنائی۔ ''سوچ رہی ہوں، میں ہیلی کاپٹر میں نہ جاؤں۔ کوئی ضروری نہیں ہے۔ وہ خط جس طرح غباروں کے ساتھ یہاں تک آیا ہے، یہاں سے آگے اسی طرح ماروی کے پاس جائے گا۔''

اس نے ایک ڈش مراد کی طرف بڑھائی۔ اس کے بعد چپ رہی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھاتے رہے۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں تمہارا زائچہ بنواؤں گی۔''

''کیا یہ ضروری ہے؟''

''ہاں، میں ضروری سمجھتی ہوں۔ تمہاری والدہ کا نام کیا ہے؟''

کسی کا بھی زائچہ بنانے کے لیے اس کی ماں کا نام لازمی ہوتا ہے۔ اس نے کہا۔ ''میری امی کا نام آمنہ خاتون تھا۔''

نگارا خانم کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا نام تھا؟''

اس نے دہرایا۔ ''آمنہ خاتون۔۔۔ کیا بات ہے آپ یہ نام سن کر چونک گئی ہیں؟''

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''چونکنے کی بات ہی ہے۔ مراد علی منگی کی ماں کا بھی یہی نام ہے۔''

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ نہ اس کی ماں کو کوئی جانتا ہے، نہ بھید کھلے گا لیکن وہ تو اس کی ماں کا نام پہلے سے جانتی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''آپ کیسے جانتی ہیں کہ مراد کی ماں کا یہی نام ہے؟''

وہ بولی۔ ''جرائم کی دنیا کے سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ریکارڈ روم میں اس کی پوری ہسٹری ہے۔ کھوج لگانے والے اس جگہ تک گئے ہوں گے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ وہاں سے سراغ رسانوں نے بہت سی معلومات حاصل کی ہیں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ڈائریکٹر نے میری فرمائش پر اس کی ہسٹری شیٹ کی ایک نقل مجھے دی تھی۔''

وہ ہچکچا کر جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ عجیب اتفاق ہے۔ ہم دونوں کی ماؤں کے ایک ہی نام ہیں۔''

وہ بولی۔ ''اتفاق یہ بھی ہے کہ تم دونوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دی۔ اتفاق یہ بھی ہے کہ تم دونوں اسے طلاق دینے کے بعد اس کی واپسی چاہتے ہو۔ اتفاق یہ بھی ہے کہ تم دونوں نے اسے خط لکھا ہے اور دونوں کے خط ان بیویوں تک پہنچ نہیں پا رہے ہیں اور سب سے حیرت انگیز اتفاق یہ ہے کہ دونوں ہی غیر معمولی اور غضب ناک فائٹر ہیں۔ دو سو دس مسافروں میں سے کسی ایک کو بھی گولی نہیں لگی اور چھ مسلح ہائی جیکرز ایک نہتے کے سامنے میدان ہار گئے۔''

نگارا نے کھانا چھوڑ دیا۔ اپنے سامنے سے پلیٹ ہٹا دی۔ وہ پھر کوئی بات کہنا چاہتا تھا لیکن وہ ایسے جذبے سے ایسی لگن سے اور ایسی گہری سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر وہ بڑی خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے صدمات ظاہر ہو رہے تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے دھوکا کھانے کا صدمہ ہو رہا ہے۔ وہ ایک ریاست کی ملکہ تھی۔ اس سے سچ اگلوانے کے لیے زور زبردستی پر اتر آتی لیکن وہ ایک ہاری ہوئی عام سی عورت کی طرح سر جھکا کر جانے لگی۔ مراد تذبذب میں رہ گیا کہ کیا بولے اور کیا کرے؟

وہ دروازے کے پاس رک کر اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میں اتنا کہوں گی کہ صرف ایک بار مجھ پر بھروسا کریں۔ پھر دیکھیں، کوئی میری جان بھی لیتا رہے گا تو میں آپ کا بھید نہیں کھولوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے کے باہر چلی گئی۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ بڑی بات تھی کہ اس ملکہ نے شاہی رعب اور دبدبے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مغرور نہیں تھی۔ جسے اپنا مرد مان لیا تھا، اس کے آگے جھک کر رہنا چاہتی تھی۔ وہ خالی دروازے کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ زندگی کے اس موڑ پر اسے اہم فیصلہ کرنا تھا۔

☆☆☆

مرینہ کا موجودہ چہرہ ایمان علی کے حواس پر چھا گیا تھا۔ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ حالانکہ باپ سے یہ معاملہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی لڑکی تلاش کی جائے گی جو جوان، صحت مند ہو اور ان کی رازدار۔۔۔ بن کر رہنا چاہے تو اس کے چہرے پر سرجری کر کے اسے ہیلن بنا دیا جائے گا۔ وہ ہیلن جو اٹھائیس برس پہلے اٹھارہ برس کی تھی اور ڈاکٹر ممی ہن کی شریک حیات تھی۔ اب مرینہ کے وجود میں زندہ ہو گئی تھی۔ باپ نے بیٹے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مرینہ ہے۔ ایمان علی کو معلوم ہوتا تو اس سے دور بھاگ جاتا۔ لیکن وہ اسے جان محمد کی بیوی عمارہ سمجھ رہا تھا۔ موجودہ حالات میں مرینہ کے تین نام تھے۔ ایک تو وہ مرینہ تھی۔ دوسری جان محمد کی بیوی عمارہ تھی اور تیسری نئے چہرے کے پیش نظر ہیلن نظر آتی تھی اور وہ ہیلن کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ جب مرینہ (ہیلن)۔۔۔ مراد کے ساتھ تاج محل ہوٹل سے نکل کر کار میں بیٹھ کر گئی تو ایمان علی نے حویلی تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ مرینہ کو سرجری کے ذریعے ہیلن نہیں بنایا گیا ہے۔ وہ سچ مچ ہیلن کا چہرہ لے کر پیدا ہوئی ہے۔ پھر اس کا روز کا معمول ہو گیا۔ وہ دور ہی دور سے اپنی ہیلن کو مراد کے ساتھ کہیں نہ کہیں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ دیوانہ بن کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ زخمی ہو گئی ہے۔ اسپتال میں اس کا علاج ہوا تھا۔ اس کے بعد مراد اسے حویلی میں لے آیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا کہ مراد تنہا ائرپورٹ گیا تھا۔ اسے چھوڑ کر لندن جا رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ مرینہ صدمے سے آدھی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہنی مون منانے کے قابل نہیں رہی ہے۔ شوہر اس ناکارہ بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسے تنہائی میں پہلی بار یقین ہوا کہ وہ ہیرے سے پتھر ہو گئی ہے۔ ایک بھاری پتھر کی طرح نامعلوم مدت تک ایک ہی جگہ پڑی رہے گی۔

اس نے پہلی بار تسلیم کیا کہ وہ کسی کمزور دشمن سے بھی

مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی اور بشریٰ بھی مقابلے پر آجائے گی تو اس سے مقابلہ کرنا تو دور کی بات ہے، اس سے بچنے کے لیے بھاگ بھی نہیں سکے گی۔ وہ اب تک بڑے بڑے شہ زوروں کو میدان چھوڑ کر بھاگتے رہنے پر مجبور کرتی رہی تھی۔ اب بشریٰ کے مقابلے میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی ذلت برداشت کرنے سے پہلے مرجانا چاہتی تھی۔

اس نے سرہانے کی میز پر رکھی ہوئی دواؤں کو دیکھا۔ وہاں ایک شیشی میں خواب آور دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے پہلے دو گولیاں نکال کر انہیں پانی کے ساتھ حلق سے اُتارا۔ وہ اپنے اندر چیخ رہی تھی۔ ''میں زیرو ہوگئی ہوں۔ میں نے جسے کبھی گولیاں مار کر، کبھی پھول مار کر حاصل کیا تھا، وہ مجھے ناکارہ اور غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ گیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

اس نے اور چار گولیاں نکال کر انہیں حلق سے اتار لیا۔ پھر پانی پی کر یوں ہانپنے لگی جیسے ساری زندگی دوڑتی آئی ہو۔ اب تو چلنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے اور چار گولیاں نکالیں۔ انہیں ایک ایک کر کے پانی کے ساتھ نگلنے لگی۔ کہنے لگی۔ ''میں بشریٰ جیسی چھپکلی سے کمتر نہیں رہوں گی۔ مراد پر گن چلا کر اسے واپس نہیں لاسکوں گی۔ مجھے ذلتیں اٹھانے سے پہلے ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا چاہیے۔''

ذلت کے باعث سر چکرا رہا تھا۔ شیشی ہاتھ سے چھوٹ کر بستر سے لڑھکتی ہوئی فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ کتنی ہی گولیاں دور تک بکھر گئیں۔ ایسے وقت جان محمد کی ایک کزن نے دیکھا تو شور مچایا۔ دوسرے رشتے دار دوڑے چلے آئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ گھر کی بہو خودکشی کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ وہ فوراً ہی اسے اسپتال لے جانے کے لیے باہر ایک گاڑی میں لے آئے۔

وہ عاشق ایمان علی دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک ملازم سے پوچھا۔ ''کون بیمار ہوگیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''گھر کی بہو نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اسے بچانے کے لیے اسپتال لے گئے ہیں۔''

وہ اپنی کار میں تیز رفتاری سے اُدھر جانے لگا جدھر وہ گاڑی گئی تھی۔ اگرچہ وہ دور نکل گئی تھی لیکن ایک سگنل پر رکنے کے باعث اس کی نظروں میں آگئی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ ''میری معلومات کے مطابق گھر کی بہو وہی مام کی شکل والی عمارہ ہے۔ تعجب ہے اس نے خودکشی کیوں کی ہے۔''

پھر اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ سمجھ میں آگیا ہے۔ اس نے تاج محل ہوٹل میں خوش ہو کر کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر جان محمد کے ساتھ ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جانے والی ہے۔ لیکن وہ شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ان کے درمیان سنگین اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی لیے اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔''

وہ اسپتال پہنچ گیا۔ دور ہی سے اس کے رشتے داروں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ کسی سے کیا پوچھتا کہ عمارہ کیسی ہے؟ زندگی کی طرف لوٹ کر آرہی ہے یا نہیں؟ وہ کس رشتے سے ایسے سوالات کرتا؟ ہائے عمارہ! تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ جان محمد بدذوق ہے تمہاری قدر نہ کر سکا۔ میں تمہیں کلیجے سے لگا کر رکھوں گا۔ تمہیں مرنا نہیں چاہیے۔ تم زندہ رہو گی۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ 'میں تمہارے قریب کیسے آؤں؟ کوئی تمہارے پاس آنے نہیں دے گا۔'

وہ پریشان ہو کر اسپتال کے کوریڈور میں بھٹک رہا تھا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ایسے وقت عبداللہ کبڈی بھی وہاں آگیا اور عمارہ کے رشتے داروں سے باتیں کرنے لگا۔ اسے ایک سہارا مل رہا تھا۔ وہ کبڈی کے ذریعے مشکل آسان کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی نظر ایمان علی پر گئی۔ وہ دور کھڑا اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ اس نے قریب آکر پوچھا۔ ''ایمان...! تم یہاں؟ کیا کسی دوست کی عیادت کے لیے آئے ہو؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سب ہی کسی کی عیادت کے لیے یا تیمارداری کے لیے آتے ہیں۔ تم ان حویلی والوں کو کیسے جانتے ہو؟''

''وہ...'' کبڈی نے مرینہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر اسے ٹریٹمنٹ دے رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اسے بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ وہ مراد کے جانے سے بہت ہی دل برداشتہ...''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے سوچتے ہوئے اسے دیکھا پھر پوچھا ''کیا ڈاکٹر ڈیڈی نے تمہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ عمارہ کون ہے؟''

''کون ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ مرینہ ہے اور جو لندن گیا ہے، وہ مراد ہے۔'' ایمان علی شکست خوردہ سا ہو کر ایک قریبی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس

کی نگاہوں کے سامنے مرینہ کا چہرہ آگیا۔ اس نے پہلی بار تل ابیب کے ائرپورٹ پر مرینہ کو دور سے چھپ کر دیکھا تھا اور اس کے حُسن و جمال پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ مراد سے معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔ لہٰذا وہ اس سے دل لگانے سے باز آگیا تھا۔ پھر وہ مرینہ سے ملاقات کے لیے ایک سفارت خانے میں گیا تو دشمنوں کی ایک گولی آکر اسے لگی تھی۔ مرینہ سے ملاقات مہنگی پڑی تھی۔ یہ عقل آگئی تھی کہ دن رات گولیاں چلانے والی سے فلرٹ نہیں کر سکے گا۔ لیکن اب وہ اس کی مام ہیلن کے روپ میں سامنے آئی تھی اور وہ ماں کی صورت والی بھی اس کی آئیڈیل تھی۔

اس وقت اسپتال میں جو زندگی اور موت کے درمیان تھی، وہ ٹو اِن وَن تھی۔ مرینہ بھی تھی، ہیلن بھی تھی اور اس کا دل اسے شدت سے مانگ رہا تھا۔

کبڈی نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ڈیڈی نے اور مرینہ نے میرے ساتھ یہ خوب مذاق کیا ہے۔ مجھے اپنی مام کی صورت سے گھرا لگاؤ ہے۔ میں آگے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تمہاری نیچر کو خوب سمجھتا ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا مراد نے مرینہ کو چھوڑ دیا ہے؟''

''نہیں، وہ ایسا ظلم نہیں کرے گا۔ یہ خود ہی .... دل برداشتہ ہوگئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ سمجھ رہی ہے کہ مراد اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ اب وہ فائٹر نہیں رہی ہے۔ آئندہ اس پر گولیاں چلا کر اسے حاصل نہیں کر سکے گی۔ وہ ایک عام سی کمزور سی عورت بن گئی ہے۔''

یہی حقیقت تھی۔ وہ مراد کو لڑتے لڑتے حاصل کرتی رہی تھی۔ اب لڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر جانے والے کو واپس لانے کی تمام قوتیں جواب دے گئی تھیں۔ اب وہ ہاری ہوئی عورت کی طرح زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

جان محمد کے ایک عزیز نے آکر کبڈی سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں وہ خطرے سے باہر ہے۔''

وہاں چار رشتے دار تھے۔ وہ چاروں مرینہ کے کمرے میں گئے تھے۔ ایمان علی نے کہا۔ ''کبڈی! کچھ ایسا کرو کہ میں اس سے مل سکوں اور اس کے رشتے دار اعتراض نہ کریں۔''

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر بولا۔ ''تم یہاں بیٹھو میں کوشش کرتا ہوں۔'' وہ بھی مرینہ کے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے رشتے دار باہر آرہے تھے۔ ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ مریضہ کے پاس بھیڑ نہ لگائی جائے۔ اسے آرام کرنے دیا جائے۔

کبڈی نے تمام رشتے داروں سے کہا۔ ''آپ لوگ گھر جائیں، میں اپنی بہن کے پاس رہوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد وہ سب چلے گئے۔ تب اس نے ایمان علی کو اندر بلایا۔ بند کمرے میں اے سی آن تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ساکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر سفید اُجلا لباس کفن کی طرح لگ رہا تھا۔ ایمان علی اسے بڑی محبت سے بڑی اپنائیت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت دور سے دوڑتا ہوا اس کے قریب آگیا تھا۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ اور بھی قریب ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نے پاس آکر اس کی طرف جھک کر دھیمی سی آواز میں پکارا۔ ''ہیلن... مرینہ...!''

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر اس کی طرف ذرا سا ہاتھ اٹھا کر کمزور سی آواز میں کہا۔ ''مراد...! تم آگئے؟''

وہ لرزتے ہوئے ہاتھ کو تھام کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مراد میرے اس چہرے کے ساتھ بھی رہتا تھا۔ اب وہ جان محمد ہے۔ میں ایمان علی ہوں۔''

وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''نہیں تم میرے مراد ہو۔ مجھے بہلنے دو، دھوکا کھانے دو، میرا ہاتھ نہ چھوڑو۔''

وہ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر بولا۔ ''کب تک دھوکا کھاؤ گی؟ کب تک اس کے پیچھے بھاگتی رہو گی؟ آخری بار تم نے اس سے نکاح بھی پڑھوا لیا پھر بھی وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ مان لو کہ وہ صرف ماروی کے لیے پیدا ہوا ہے۔''

''ہاں، اب میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس کے پیچھے جا سکوں۔ مجھ میں کوئی کشش نہیں رہی ہے۔ وہ واپس نہیں آئے گا۔''

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''تمہارے اندر بلا کی کشش ہے۔ یہ میرے دل سے پوچھو۔ تم ہیلن کے روپ میں میرے حواس پر چھا گئی ہو۔ اسے بھول جاؤ۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ راستہ بدل دو۔ میری محبت اور میرے جذبات کی قدر کرو۔''

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ ''میں یہ سوچ کر دنیا سے جا رہی تھی کہ میری موت کے بعد وہ مجھے یاد کرے گا۔ یہ میں نے نادانی کی تھی۔ اب زندہ رہ کر چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی اس سے ناراض ہو کر کہیں گم ہو جاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ وہ میرے پیچھے آئے گا یا نہیں؟ ماروی پہلے بھی اسے چھوڑ

کر گئی تھی۔ اب بھی اسے چھوڑ کر گئی ہے تو وہ پاگل ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے غبارے اُڑا رہا ہے۔ کیا ایسی دیوانگی سے میرے پیچھے نہیں آئے گا؟''

''نہیں مرینہ... ! وہ ماروی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرلو۔ دنیا کی کوئی حسینہ اس کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ میری صاف اور سیدھی سی بات کا برا نہ مانو۔ سچائی کو مان لو۔''

''ایک بار اسے آزماؤں گی پھر مان لوں گی۔ کیا میرا ساتھ دو گے؟ مجھے کہیں چھپا کر رکھو گے؟''

کبڈی نے پریشانی سے کہا۔ ''مرینہ! ایسی حالت میں کہاں جاؤ گی۔ اُٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی ہو۔ یہ میں بھی کہتا ہوں' مراد کو نہ آزماؤ۔ وہ تمام عمر ماروی کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ کہیں چھپ کر اسے آزماؤ گی تو پھر تمہارا دل ٹوٹے گا۔ پھر خودکشی کرنا چاہو گی۔ ایسا کب تک ہوگا مرینہ؟''

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ''میرا دل نہیں مانے گا۔ اس ہرجائی کو آخری بار آزمانے دو۔''

''آخری بار...'' ایمان علی نے کہا۔ ''وعدہ کرو۔ آخری بار ناکام ہونے کے بعد میرے ساتھ زندگی گزارو گی؟''

''گزاروں گی۔ تم وعدہ کرو، کیا مجھے پھر سے دوڑنے بھاگنے کے قابل بنا سکو گے؟''

وہ پھر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ ''سری لنکا کے قریب کنیا کماری میں ایک سنیاسی بابا ہیں۔ وہ روحانی علاج کرتے ہیں۔ تمہیں چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل بنا دیں گے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ پہلے سچے دل سے وعدہ کرو۔ مراد سے مایوس ہونے کے بعد مجھے اپنا لائف پارٹنر بناؤ گی۔''

''اب میں جان دینے کی اور زندگی کو ہارنے کی غلطی نہیں کروں گی۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ گے۔ وہ سنیاسی بابا مجھے پہلے جیسی مرینہ بنا دیں گے اور مراد مجھے مایوس کرے گا تو میں تمہاری قدر کروں گی۔ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔''

اس کا ہاتھ ایمان علی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس ہاتھ کو سینے سے لگا کر بولا۔ ''صبح ہونے والی ہے۔ میں آج رات ہی تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

پھر اس نے کبڈی سے پوچھا۔ ''میرا ساتھ دو گے؟''

وہ بولا۔ ''میں تو دل و جان سے چاہتا ہوں کہ مرینہ اب مراد پر تکیہ نہ کرے۔''

پھر وہ مرینہ سے بولا۔ ''تم اس کی منکوحہ بن کر اپنی ضد پوری کر چکی ہو۔ مراد کے دماغ سے کبھی ماروی کو نکال نہیں سکو گی۔ اس دیوانے کے پیروں میں چکر ہے۔ وہ اُسی سمت چکراتا رہے گا۔ تم آخری بار اسے آزمانا چاہتی ہو' آزما لو۔ میں اور ایمان علی تمہیں مراد سے اور یہاں کے تمام رشتے داروں سے دور کہیں چھپا کر رکھیں گے۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''تم آخری بار مراد سے فون پر باتیں کرنے کے بعد پھر اسے اپنی آواز بھی نہیں سناؤ گی۔ اسے کہو گی کہ وہ تمہیں تلاش کرنے ہندوستان آئے۔ جب وہ آئے تب اس سے ملو گی۔ ورنہ یہ دیکھو گی کہ وہ ماروی کی طرح تمہارے لیے بھی سرگرداں رہے گا یا نہیں؟''

''ہاں، میں ایسا ہی کروں گی اور دعا مانگتی رہوں گی کہ وہ میرا بھی دیوانہ ہو جائے اور مجھے تلاش کرنے یہاں آئے۔''

کبڈی نے اطمینان کی سانس لے کر ایمان علی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کو پورا یقین تھا کہ مراد اب مرینہ کو گھاس بھی نہیں ڈالے گا۔ وہ گولیاں چلانے کا دور گزر چکا تھا۔

☆☆☆

اتنے ہنگاموں میں ماروی کی ابھی خیر تھی۔ خیر خیریت اس لیے تھی کہ اب وہ کسی کے لینے میں تھی، نہ دینے میں۔ نہ کوئی رشتے دار تھا۔

اس کا کوئی اپنا کیسے ہوتا جبکہ اس کا چہرہ اپنا نہیں رہا تھا۔ چہرہ بدلتے ہی بچپن والی ماروی اور جوانی والی معشوقہ مر چکی تھی۔ مراد ساری دنیا چھان مارتا' تب بھی وہ اسے نظر نہ آتی۔

صرف محبوب علی چانڈیو اس کا ہم راز تھا۔ اب اس کا موجودہ نام امیر دانش علی تھا۔ وہ اپنے اوور سیز تک پھیلے ہوئے کاروبار کی ایک ایک رگ سے واقف تھا۔ اس نے لندن پہنچ کر ایک سول ڈسٹری بیوٹر کی حیثیت سے درخواست دی تھی اور سیکیورٹی اماؤنٹ کے طور پر دس لاکھ ڈالرز پیش کیے تھے۔ پھر اس نے پہلے ہی مہینے میں مال کی سیلنگ میں اضافہ دکھایا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کاروبار میں کس طرح ہیرا پھیری سے اپنی پروڈکشن کو مارکیٹ میں پھیلایا جاتا ہے اور وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔ معروف تجلی اور سمیرا اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو گئے تھے۔ یوں محبوب اپنے ہی کاروبار سے اپنی ذرائع آمدنی کو مستحکم کر چکا تھا۔ ماروی کا موجودہ نام نمرہ عالم تھا۔ اسے ایک شریف گھرانے میں جگہ مل گئی تھی۔ ایک بزرگ انیس عالم اپنی زوجہ بتول کے ساتھ کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیٹا، بہو اور ایک جوان

پوتی نمرہ وفات پا چکی تھی۔ صرف ایک آٹھ برس کا پوتا سرفراز رہ گیا تھا۔

میڈیکل رپورٹ کے مطابق سرفراز کے دل میں ایک ننھا سا سوراخ ہوگیا تھا۔ علاج اتنا مہنگا تھا کہ وہ بھی علاج کے بغیر اپنے ماں باپ اور بہن کی طرح اس دنیا سے جانے والا تھا۔ ایسے وقت محبوب اس کا علاج کرانے لگا۔ اس پر لاکھوں ڈالرز خرچ کرنے لگا۔ اس طرح وہ بوڑھے میاں بیوی اس کے احسانات کے آگے جھک گئے۔ ماروی کے لیے وہاں ان کی پوتی نمرہ بن کر رہنے کی گنجائش نکل آئی۔

اب وہ سکون سے تعلیم حاصل کررہی تھی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گورنس اس کے ساتھ روز چھ گھنٹے گزارتی تھی۔ اسے اونچی کلاس میں داخل کرانے کے لیے تعلیم دے رہی تھی۔ وہاں کے ماحول میں رہنے سہنے اور بولنے کے آداب سکھاتی رہتی تھی۔ اس کے اور محبوب کے درمیان فاصلہ رہتا تھا۔ ان کے درمیان یہ طے ہوگیا تھا کہ عدت کے دن پورے ہوتے ہی وہ عمرے کے لیے سعودی عرب جائیں گے اور وہیں اپنا نکاح پڑھوالیں گے۔ نکاح سے پہلے وہ نامحرم تھی۔ محبوب کے ساتھ نہ وہاں جاسکتی تھی نہ اس کے ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف کرسکتی تھی۔ انہوں نے انیس عالم اور بتول بی بی سے کہا تھا کہ وہ سرفراز کو بھی ساتھ لے کر ماروی کے سرپرست بن کر وہاں جائیں گے پھر وہاں نکاح کے بعد محبوب کے ساتھ عبادت کرسکیں گے۔ انیس عالم اور بتول بی بی کو بھی خانۂ کعبہ میں جانے اور عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہونے والی تھی۔ وہ ہر نماز کے وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے اور محبوب کو دعائیں دیتے رہتے تھے۔

محبوب پیار کے پہلے دن سے ماروی کو حاصل کرنے کے لیے بے مثال نیکیاں کرتا اور قربانیاں دیتا آرہا تھا۔ اسے پالینے کے لیے ہی ان بزرگوں کو عمرہ کرانے لے جارہا تھا۔ پتا نہیں خدا کو کیا منظور تھا کہ وہ اب تک اسے حاصل کرنے میں ناکام ہوتا رہا تھا۔ اب اس کا دل اس کا ایمان کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی ماروی کو ضرور حاصل کرلے گا۔ سمیرا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ اس نے تمام کاروبار اور تمام جائداد اس کے حوالے کرکے ایک بیوی کے تمام حقوق ادا کیے تھے۔ اس کے بعد بھی ازدواجی تعلقات قائم رکھنا لازمی تھا۔ بیوی کے سب سے اہم حقوق یہی ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس سے دور رہ کر یہ حقوق ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے سمیرا سے فون پر وعدہ کیا تھا کہ ماروی کو دلہن بنانے کے بعد اور ہنی مون منانے کے بعد کسی دن اس سے ملاقات کرے گا اور اس کے ساتھ کچھ روز گزارے گا۔ کوئی ایسا معمول بنائے گا جس کے مطابق وہ بھی کبھی اس کے ساتھ دن رات رہ سکے گا۔ پھر بھی اس کی حق تلفی ہوتی۔ اسے ماروی کے برابر حقوق نہ ملتے۔ اُدھر معروف تجلی نے سمیرا کو یہی بات سمجھائی تھی۔ ایسا طریقہ کار بتایا تھا جس پر سمیرا عمل کرکے محبوب کو واپس کراچی آکر اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کرسکتی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق محبوب کے پاس ایک محدود رقم ہوگی وہ ماروی کے ساتھ تاحیات عیش وعشرت سے رہنے کے لیے اپنے کاروبار کے منافع سے رقم حاصل کرنا چاہے گا۔

انہوں نے پلاننگ کی تھی کہ اگر یہ رپورٹ درج کرائی جائے کہ محبوب ایک عرصے سے لاپتا ہے۔ شاید کسی نے اسے اغوا کیا ہے۔ وہ اغوا کرنے والوں کے دباؤ میں آکر اپنے مقامی اور بیرونی بینک اکاؤنٹس سے رقوم نکالے گا۔ اس طرح قلاش ہوجائے گا۔ لہٰذا تمام بینکوں کے اکاؤنٹس کو فریز کردیا جائے۔ اس طرح محبوب کسی بینک سے رقم نہیں نکال سکے گا۔ رقم حاصل کرنے کے لیے سمیرا کا محتاج رہا کرے گا۔ سمیرا اس تدبیر پر عمل کرنے کے لیے راضی ہوگئی تھی۔ پھر اس نے سوچا۔ 'یہ مناسب نہیں ہے۔ میں محبوب کے تمام اکاؤنٹس کو فریز کراؤں گی تو وہ مجھ سے بدظن ہوجائیں گے۔ مجھ پر سے ان کا اعتماد اٹھ جائے گا۔'

اس نے معروف تجلی سے دوسری ملاقات میں کہا۔ ''مجھے کامیابی تو ہوگی۔ وہ بڑی بڑی رقوم کے لیے میرے محتاج رہیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا مزاج ایک عورت کی محتاجی گوارا نہ کرے اور ہماری تدبیر ناکام ہوجائے۔ میں ان کا اعتماد کھودینے والا کوئی کام نہیں کروں گی۔''

معروف تجلی نے پوچھا۔ ''کیا تم ازدواجی زندگی کے تمام حقوق ماروی کو دے کر اپنے شوہر سے محروم رہنا چاہتی ہو؟''

''میں ایسا بھی نہیں چاہتی۔''

''تو پھر جو کہتا ہوں وہ کرو۔ جب وہ ماروی کو بیوی بنانے کے بعد کسی دن تمہیں بلائے گا تو میں بھی اُدھر چھپ کر جاؤں گا۔ اس کی موجودہ صورت دیکھوں گا اور اس کا پتا ٹھکانا معلوم کروں گا۔''

''میں نے محبوب سے وعدہ کیا ہے کہ تنہا ان کے پاس جاؤں گی آپ کو بھی خبر نہیں ہوگی۔''

''اپنی بہتری کے لیے وعدہ خلافی کرو۔ میں اس کا

دشمن نہیں ہوں۔ اس کے باپ کی جگہ ہوں۔ آج تک اس کی بہتری کے لیے ہی سوچتا اور کرتا آیا ہوں۔ یاد رکھو، میری یہ بات نہیں مانو گی تو تمام عمر پچھتاتی رہو گی۔ مجھ پر بھروسا کرو اور پھر دیکھو کہ میں اسے کس طرح تمہارے پاس آکر رہنے پر مجبور کردوں گا۔''

سمیرا نے راضی ہو کر کہا۔ ''اللہ کرے وہ دن آئے۔ وہ مجھے جلدی اپنے پاس بلائیں۔ آپ چھپ کر وہاں جائیں گے لیکن اچھی طرح سوچ لیں۔ انہیں کسی طرح کا شبہ تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔''

ان کے درمیان یہ طے ہوگیا کہ محبوب کو نئے بہروپ میں فی الحال چھپ کر رہنے دیں گے پھر رفتہ رفتہ اسے خود ہی ظاہر ہونے پر مجبور کردیں گے۔

ادھر ماروی نے محبوب سے کہا۔ ''آپ مجھے شریکِ حیات بنانے کے بعد سمیرا سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گی۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے پیدائشی چہرے کو مٹایا ہے۔ آئندہ اس نئے روپ میں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں آپ کے سوا کسی کو پہچاننے کا موقع نہیں دوں گی۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں سمیرا کے معاملے میں الجھ گیا ہوں۔ یہاں امیر دانش علی کی حیثیت سے کاروبار کررہا ہوں۔ ہمارے ہیڈ کوارٹر کراچی کا مارکیٹنگ منیجر اور دوسرے کئی افراد آکر میرا موجودہ چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ کبھی معروف صاحب لندن کا دورہ کریں گے تو مجھ سے ضرور ملاقات کریں گے۔ یہ بھی الجھن ہے کہ سمیرا میرا جو چہرہ تنہائی میں دیکھ کر جائے گی، وہی چہرہ معروف صاحب بزنس فیلڈ میں دیکھیں گے۔ میں زیادہ عرصے تک موجودہ چہرے کے پیچھے چھپا نہیں رہوں گا۔ عقل کہہ رہی ہے کہ میں سمیرا سے تنہائی میں نہ ملوں۔ اپنا یہ چہرہ اسے کبھی نہ دکھاؤں۔ اس طرح بھی ہماری حقیقت ظاہر ہونے کا اندیشہ نہیں رہے گا۔''

ماروی نے کہا۔ ''حقیقتاً ہم نے یہی فیصلہ کرنے کے بعد اپنے چہرے تبدیل کیے ہیں کہ کسی تیسرے کو ہمارا راز کبھی معلوم نہ ہو۔''

''میں اس فیصلے پر قائم رہوں گا۔ تیسری اہم ہستی سمیرا کو بھی معلوم نہیں ہونے دوں گا لیکن...''

ماروی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا' وہ بولا۔ ''میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔ مجھے سمیرا کے ازدواجی حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا رہے گا۔''

''یہ اچھا ہی ہے کہ ابھی آپ نے مجھ سے نکاح نہیں پڑھوایا ہے۔ ابھی فیصلہ کرلیں کہ اس کے حقوق کیسے ادا کریں گے؟ سوچ لیں اپنا موجودہ چہرہ اس پر ظاہر کریں گے تو میں آپ سے بہت دور ہوجاؤں گی۔ کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ کی وجہ سے میں بھی پہچانی جاؤں۔ اگر آپ دوستوں اور دشمنوں سے دور صرف میرے ساتھ امن و سکون سے رہنا چاہتے ہیں تو پھر سمیرا کو بھول جانا ہوگا۔ آپ اسے طلاق دے دیں گے تو پھر آپ کے ضمیر پر بوجھ نہیں رہے گا۔ میں سمیرا کا برا نہیں چاہوں گی۔ صرف آپ کو پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے طلاق کا خیال ذہن میں آیا ہے۔ آپ نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ اور سوچیں۔''

وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ ماروی نے کہا۔ ''آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ دو بیویاں مسئلہ بنتی رہیں گی، ابھی آپ نے نکاح نہیں پڑھوایا ہے۔ ابھی ایک ہی ہے۔ اچھی طرح سوچ لیں۔''

وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

محبوب انیس عالم کے اپارٹمنٹ میں ماروی سے ملنے آیا کرتا تھا۔ وہاں وہ مستقبل کی پلاننگ کرتے رہتے تھے اور مستقبل پھر ایک چیلنج بن گیا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ آکر نکل جانے والی اپنا آخری فیصلہ سنانے کے طور پر کہہ گئی تھی کہ اسے اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد نکاح پڑھانے کے لیے آنا چاہیے۔

☆☆☆

ملکہ نگارا خانم' مراد کو اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ یہ چاہتی تھی کہ وہ اپنی زبان سے اُگل دے۔ ''جی ہاں ملکہ عالیہ! میں ہی مراد علی منگی ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر گئی تھی کہ مراد ایک بار اس پر بھروسا کرے۔ پھر وہ آخری سانسوں تک اس کی رازدار بن کر رہے گی۔ وہ اپنی ائرکنڈیشنڈ خواب گاہ میں آکر شاہانہ طرز کے ایک صوفے پر نیم دراز ہوگئی تھی۔ دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ''کیا مراد علی منگی میرے محل میں میرے قریب آگیا ہے؟ کیا میرے سامنے خود کو ظاہر کر کے مجھے اپنا رازدار بنائے گا؟''

وہ سوچنے لگی۔ مجھے اپنا رازدار بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھے قربت ملے گی۔

پھر وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ ''مائی گاڈ! چھ ماہ سے ایک پارٹنر کے بغیر خلافِ فطرت زندگی گزار رہی ہوں۔ یہ آیا ہے تو اسے پکڑ کر رکھوں گی۔ جانے نہیں دوں گی۔ یہ میرے سامنے خود کو ظاہر نہیں کرے گا۔ خود کو مراد نہیں کہے گا۔ مجھ پر

اعتماد نہیں کرے گا تو نہ کرے۔ میں بھی کسی مرد پر بھروسا نہیں کرتی ہوں۔ ایسے تو میری ریاست کی تمام عورتیں اپنے مردوں پر بھروسا نہیں کرتی ہیں۔ جس طرح مرد پوری دنیا میں عورتوں پر حاوی رہتے ہیں، اسی طرح عورتیں یہاں مردوں پر حاوی رہتی ہیں۔ ان پر نگاہوں کا پہرا لگائے رکھتی ہیں۔ مرد کی بدچلنی ثابت ہوجائے تو بہ آسانی طلاق لے کر دوسرا مرد حاصل کرلیتی ہیں۔ میری ریاست میں مجھ کو اور تمام عورتوں کو آزادی اور سہولتیں حاصل ہیں۔ لیکن مراد مجھ سے راضی ہوجائے گا اور میں اس کی منکوحہ بن جاؤں گی تو کیا وہ ریاست کے قوانین کے مطابق میری برتری کو تسلیم کرے گا؟ نہیں... جہاں تک میری اسٹڈی ہے۔ اس کی ہسٹری کے مطابق اس کی وِل پاور (قوتِ ارادی) بہت مضبوط ہے۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں مانتا ہے۔ ہاں، یہ بڑی مشکل ہے۔ وہ مجھ سے کم تر ہو کر نہیں رہے گا۔ مجھے ہی حالات سے سمجھوتا کرنا ہوگا۔ میں بڑی حکمتِ عملی سے اس کی منکوحہ بن کر رہوں گی۔ کسی حد تک ایک شوہر کی برتری کو برداشت کرتی رہوں گی۔ اس کے بعد...؟ جب تک اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہے گا، تب تک اس کے زیرِ اثر رہوں گی۔ جب دل بھر جائے گا تو ہم عورتوں کو طلاق لینے اور شوہر کو چھوڑ دینے کی آزادی ہے۔

''مگر وہ آتو جائے۔ اس کی طلب مجھے پاگل کر رہی ہے۔ ایک مدت سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب اس قدر قریب آکر بھی دور کیوں ہے؟ کیا سوچ رہا ہے؟''

پھر اس نے گہری سانس لے کر بڑے اعتماد سے زیرِ لب کہا۔ ''وہ آئے گا...... ابھی آئے گا۔''

اُدھر مراد تنہا ڈائننگ ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ملکہ اسے کہہ گئی تھی کہ وہ اس پر اعتماد کرے اور یہ تسلیم کرے کہ وہ مراد علی منگی ہے اور وہ سوچ رہا تھا، اس پر اعتماد کرنا ہی ہوگا۔ تقدیر نے اسے نگارا خانم کی ریاست میں لاکر ہر طرف سے جکڑ دیا تھا۔ وہ سیکیورٹی کے بغیر شاہی محل کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ غیر ملکی جاسوس اور سیکریٹ ایجنٹس نہ جانے کہاں کہاں چھپے ہوئے اس کی تاک میں ہوں گے۔ وہ کسی فلائٹ سے جانا چاہتا تو دشمن اسے ائرپورٹ پر ہی ختم کردیتے یا پھر اس کے تعاقب میں رہ کر یہ معلوم کرنا چاہتے کہ وہ خطرناک جنگجو شخص کون ہے اور کہاں جارہا ہے؟ فی الحال اسے ملکہ خانم کی طرف سے مکمل تحفظ حاصل ہورہا تھا اور ملکہ عالیہ کی مہربانیاں سمجھا رہی تھیں کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں جکڑ کر رکھنا چاہتی ہے۔ نگارا خانم کا اعتماد حاصل

کرنے کے لیے لازم تھا کہ وہ حالات سے سمجھوتا کرے۔ جو ہونے والا ہے ہو جائے۔ بعد میں جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ وہ سونے کے پنجرے میں وفادار رہے گی تو اچھی بات ہے۔ ورنہ اسے پنجرہ توڑ کر نکلنے کا خاصا تجربہ تھا۔

اس کے فون کو ایک آرمی کے افسر نے چھین لیا تھا۔ پھر اسے شاہی مہمان بنتے دیکھ کر فون واپس کر دیا تھا۔ اس دوران اس کا سوئچ آف رہا تھا۔ اس نے مرینہ کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی جان محمد کے ایک چاچا کی آواز سنائی دی۔ ''جان محمد! کہاں ہو تم؟ اپنے فون کو بند کیوں رکھا تھا؟''

وہ بولا۔ ''مجبوری تھی چچا جان! آپ عمارہ سے بات کرائیں۔ یہ اس کا فون ہے۔ وہ اٹینڈ کیوں نہیں کر رہی ہے؟''

دوسری طرف کی بات سنتے ہی اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ وہاں وہ سانحہ ہو چکا تھا جس کی وہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں مرینہ' ماروی کی طرح روپوش رہ کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مراد اس کے لیے بھی پاگل ہو کر اسے تلاش کرے گا یا نہیں؟ وہ جذبات میں آ کر سوچتی رہی تھی اور ایمان علی اور کبڈی کے سامنے بولتی رہی تھی۔ لیکن دل کہہ رہا تھا' پھر مایوسی ہوگی۔ مراد اس کے پیچھے دیوانہ بن کر نہیں آئے گا۔ اس نے ایمان علی اور کبڈی کے جانے کے بعد کچھ زیادہ ہی کمزوری محسوس کی۔ علاج اور دواؤں کے باوجود ٹوٹی ہوئی کمر کا صدمہ اور خواب آور گولیاں اس کے اندر ریک رہی تھیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہو گئی تھی۔ اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ وہ سرہانے رکھی ہوئی بیل بجاتی تو کوئی نرس یا وارڈ بوائے دوڑا چلا آتا۔ پھر ڈاکٹر آ کر اسے سنبھلنے کی دوائیں دیتے لیکن وہ سنبھلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی کو کال نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نرس آئی تو وہ آنکھیں بند کیے ساکت پڑی تھی۔ اس نے سمجھا گہری نیند میں ہے۔ اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ چلی گئی اور وہ ساری دنیا سے غافل ہو کر آخری نیند میں غرق ہو گئی تھی۔

مراد کے کان سے فون لگا ہوا تھا۔ وہ شدید حیرانی اور بے یقینی سے چیخ کر بولا۔ ''انکل! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا اور کمر کی چوٹ جان لیوا نہیں تھی۔ پھر یہ کیسے ہو گیا؟''

''بیٹے! تمہارے جانے کے بعد اس نے ڈھیر ساری خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا تھا۔ سب ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ اب اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

''جب اسے بچا لیا گیا تھا تو پھر وہ جان سے کیسے گئی؟''

''ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ تمہاری جدائی برداشت نہ کر سکی۔''

مراد سے جدائی کے پیچھے اور کتنے صدمات تھے۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ وہ آئندہ ایک ناکارہ فائٹر اور ایک ناکارہ بوجھ بن کر رہنے والی بیوی کی حیثیت سے زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔

انکل نے فون پر کہا۔ ''تمہاری چچی جان رات آٹھ بجے اس کے لیے کھانا لے کر کمرے میں گئیں تو وہ آواز دینے سے بھی بیدار نہیں ہوئی۔ پھر پتا چلا کہ وہ نیند کی حالت میں ہی وفات پا چکی ہے۔''

وہ جنگ باز عورت بڑے آرام سے سوتے سوتے ابدی نیند میں ڈوب گئی تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آرام سے نہیں گئی تھی۔ بشریٰ نے اسے تھوڑ پھوڑ کر اوپر پہنچا دیا تھا۔ لیکن بشریٰ کے دیے ہوئے زخم اور کمر کی ٹوٹی ہوئی ہڈی نے جان نہیں لی تھی۔ اسے نیند کی حالت میں طبعی موت ملی تھی۔

چاچا نے کہا۔ ''بیٹے! جتنی جلدی ہو سکے چلے آؤ۔ تمہارے یہاں آنے کے بعد ہی تدفین ہوگی۔''

وہ تڑپ گیا۔ اس کی طرف دل کھنچا جا رہا تھا۔ وہ دنیا سے نرالی شریک حیات تھی۔ اس کے لیے موت بھی بنتی رہی تھی اور اس کی سلامتی کی خاطر دشمنوں کے لیے بھی عذاب جان بن جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے پاس کیسے جائے؟ کیسے آخری دیدار کرے؟ محل سے باہر قدم قدم پر موت تھی۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''چچا جان! میں بہت بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں۔ پتا نہیں کتنے دنوں بعد یہاں سے نکل سکوں گا۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اس کی آخری رسومات ادا کر دیں۔''

اس نے دو چار باتیں کرنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔ جس سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ ایسی زبردست، باکمال عورت یوں اچانک ہی مر گئی ہے۔ وہ بڑی دیر تک وہاں سر جھکائے بیٹھا اسے یاد کرتا رہا۔ وہ ضدی عورت اسے حاصل کرنا چاہتی تھی یا مار ڈالنا چاہتی تھی۔ آخر ضد پوری کر لی تھی۔ اسے حاصل کر کے خود فنا ہو گئی۔

وہ وہاں سے اٹھ کر محل کے ایک حصے میں آیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ لیڈیز سیکیورٹی گارڈز ہاتھوں میں گن لیے جاگ رہی تھیں۔ ایک خاتون گارڈ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ مہمان خانے میں تشریف لے جانا چاہیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''میں ملکہ عالیہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''
وہ بولی۔ ''سوری، وہ سو رہی ہیں۔''
اس نے کہا۔ ''وہ جاگ رہی ہیں۔''
''میں جو کہہ رہی ہوں کہ وہ گہری نیند میں ہیں۔''
''اور میں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہیں۔''
خاتون گارڈ نے پوچھا۔ ''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں؟''
مراد نے کہا۔ ''تم خود جا کر دیکھ لو۔''
وہ وہاں سے چلی گئی پھر جلد ہی واپس آ کر بولی۔
''میں شرمندہ ہوں۔ آپ نے درست فرمایا تھا۔ میرے ساتھ آئیں۔''
وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ایک بہت ہی عالی شان پُرتکلف خواب گاہ میں پہنچا۔ وہاں ایسی ٹھنڈک اور بھینی بھینی سی خوشبو تھی جو ذہن کو متاثر کر رہی تھی۔ اس وسیع و عریض خواب گاہ میں ایک فوارہ تھا جس کا پانی بلندی کی سمت اچھلتا ہوا تھرکتا ہوا ناچتا ہوا دائرے کی صورت میں نیچے آ رہا تھا۔ بہت ہی دھیمی دھیمی سی موسیقی کی دھن سنائی دے رہی تھی۔
وہ شاہانہ طرز کے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے روبرو ہو کر بولی۔ ''مجھ پر بھروسا کرنے آئے ہو؟''
وہ بولا۔ ''تم میری زبان سے جو سننا چاہتی ہو میں وہی ہوں۔''
''کھل کر اعتراف کرو۔''
اس نے کہا۔ ''صرف مراد علی منگی ہی ملکہ عالیہ کو تم کہنے کی جرأت کر سکتا ہے اور رات کے دو بجے تک ملکہ کی نیندیں اڑا سکتا ہے۔''
وہ خوشی سے کھل گئی۔ یکبارگی دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک شعلہ سا آ کر لپٹ گیا ہے۔ وہ مچل مچل کر لپٹ رہی تھی۔ جیسے اندیشہ ہو کہ مدتوں انتظار کرنے کے بعد جو ملا ہے، وہ کہیں چلا نہ جائے۔ وہ بڑے دل سے، بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔ ''ہائے مراد پتا نہیں کتنے برسوں سے تمہاری آرزو میں جی رہی تھی۔ میرے کئی جاسوس نگر نگر تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور تم گھر بیٹھے مل گئے ہو۔ میں بہت خوش نصیب ہوں اور اب بدنصیب بننا نہیں چاہوں گی۔ تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔ اتنی محبتیں دوں گی کہ تم کبھی مجھ سے دور نہیں جاؤ گے۔''
وہ اسے ایسے جکڑ رہی تھی جیسے اس کے وجود کے اندر گھس جانا چاہتی ہو۔ بار بار گردن اٹھا کر اپنا چہرہ اس کی طرف کر رہی تھی تاکہ وہ پیار کرے۔
وہ بولا۔ ''اپنے جوش اور جذبوں کو لگام دو۔ میں کسی نامحرم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ ابھی تمہاری دیوانگی کے آگے مجبور ہوں اور سمجھا رہا ہوں۔ پلیز! خدا سے ڈرو اور مجھ سے فاصلہ رکھو۔''
وہ فوراً ہی الگ ہو گئی۔ اپنے ننگے سر کو اسکارف سے ڈھانپنے لگی۔ وہ بولا۔ ''تم بہت حسین ہو۔ میرے دل میں سما گئی ہو۔ میں تم سے نکاح پڑھاؤں گا لیکن کچھ دنوں کے بعد۔''
نگارا خانم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے کہ میری وائف کا انتقال ہو گیا ہے۔''
وہ بولی۔ ''خدا مغفرت کرے۔ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ میں تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں۔''
مراد نے پوچھا۔ ''کیا تم نے مرینہ کا نام سنا ہے؟''
وہ بولی۔ ''جرائم کی دنیا کے متعلق معلومات رکھنے والے سب ہی مرینہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مراد علی منگی کی پشت پر رہتی ہے۔ جس دن وہ پکڑی جائے گی، اس دن مراد بھی گرفتار ہو گا۔ دونوں ہی بندوق اور بلٹس کی طرح ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔''
''وہ میری ضروری لائف پارٹنر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہی بھیس بدل کر میری شریک حیات بن کر میرے ساتھ رہتی تھی۔ اسی کا انتقال ہوا ہے۔''
''اوگاڈ! مرینہ مر چکی ہے؟''
وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ میں تین دنوں تک بالکل تنہائی چاہوں گا۔ کسی بھی خاتون خدمت گزار کو میرے مہمان خانے میں نہ بھیجو۔ میں تین دنوں کے بعد یہاں آ کر تم سے ملوں گا۔''
''تم جو چاہو گے' وہی ہو گا۔''
''یہ میری شدید خواہش ہے کہ میرا پیغام ماروی کی طرف جائے۔ میں چاہوں گا کہ تم کل ہی غباروں کے ذریعے اس پیغام کو یہاں سے روانہ کر دو۔''
''تمہاری یہ خواہش کل ہی پوری ہو جائے گی۔''
وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی محل کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی صدر دروازے تک آئی۔ یہ حکم صادر کیا کہ تین دنوں تک کوئی کنیز اور لیڈی سیکیورٹی گارڈ مہمان خانے میں نہ جائے۔ وہاں مہمان کی خدمت' خدام کیا کریں گے۔
وہ مرد سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ سامنے ہی ایک

مہمان خانے کی طرف جانے لگا۔ ملکہ خانم بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ملتے ہی بچھڑ گیا تھا۔ اس سے آئندہ تین دنوں تک سامنا ہونے والا نہیں تھا۔ بہرحال یقین تھا کہ تین دنوں کے بعد اس کی دھڑکنوں سے لگ سکے گی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ سر جھکائے سوچتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آگئی۔ وہ جنت جیسی خواب گاہ مراد کے بغیر ویران سی لگ رہی تھی۔ اسے پالینے کا خیال ایسا تھا کہ وہ سوچ سوچ کر مسرتوں سے مالا مال ہو رہی تھی۔ ویسے آنے والے دنوں میں اسے یہ تجربہ حاصل ہونے والا تھا کہ مراد علی منگی جہاں رہتا ہے، وہاں دنیا جہان کے ہنگامے پرورش پاتے رہتے ہیں۔

وہ ہائی جیکرز تعداد میں چھ تھے۔ تین مارے گئے تھے اور تین زخمی ہوئے تھے۔ انہیں اسپتال پہنچانے تک چوتھا بھی مر گیا تھا۔ ان کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ پانچواں جو زخمی تھا، وہی ایک مسلمان تھا۔ ان کے سرغنہ ڈمم برگ کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک پیشہ ور مجرم ہے۔ اب سے دو برس پہلے بھی ایک طیارے کو ہائی جیک کیا تھا۔ اسلام دشمن تنظیموں کے کارندے مسلمان مجاہدین بن کر ہائی جیکنگ کا جو ڈراما پلے کر رہے تھے، اس کا پول کھل گیا تھا۔ وہ سب ہی اس جان محمد کو گالیاں دے رہے تھے۔ یہ دعوے سے کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ نہتا ہو کر چھ مسلح ہائی جیکرز کو برے انجام تک پہنچانے والا جرائم کی دنیا کا کوئی بہت ہی خطرناک کھلاڑی ہوگا۔ اسے فوراً گرفتار کر کے اس کی اصلیت معلوم کی جائے۔

کئی ممالک ملکہ نگارا خانم سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ جان محمد کو منظرِ عام پر لائے۔ پریس اور الیکٹرونک میڈیا والے اسے اپنے اخبارات اور چینلز کے ذریعے پیش کرنا چاہتے تھے اور وہ جواب دے رہی تھی کہ جان محمد کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ اسے منظرِ عام پر نہیں لائے گی۔ پریس اور الیکٹرونک میڈیا سے کہہ دیا کہ وہ شاہی محل کا رخ نہ کریں۔ انٹرپول اور انٹرنیشنل سی آئی اے کے اعلیٰ عہدیداروں نے ملکہ سے کہا کہ وہ اپنے طور پر سخت سیکیورٹی کے انتظامات کر کے محل کے کسی حصے میں جان محمد سے ان کی ملاقات کرائے۔ ملکہ پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ اس نے ایک طیارے کو ہائی جیک ہونے نہیں دیا ہے۔ دو سو دس مسافروں کی جانیں بچانے کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ لوگ مراد کی تعریفیں کر رہے تھے۔ میٹھے بول بول رہے تھے۔ کسی طرح اسے قریب سے دیکھنا اور اپنے سوالات کے ذریعے اسے خریدنا چاہتے تھے۔ سب ہی کو یہ شبہ تھا کہ جان محمد کے پیچھے مراد علی منگی چھپا ہوا ہے۔

ملکہ نگارا خانم نے ان کی یہ تجویز مان لی کہ سخت سیکیورٹی میں مراد کو تحفظ دیتے ہوئے ان سے ملاقات کرائی جائے گی۔ اس نے کہا۔ ”جان محمد کی وائف کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ تین دنوں تک سوگ منائے گا۔ کسی سے ملاقات نہیں کرے گا۔ اب سے پانچ دنوں کے بعد آری کے آڈیٹوریم میں اجلاس منعقد کیا جائے گا۔ جہاں دو بڑے ممالک کے چار نمائندے اور انٹرپول اور سی آئی اے کے چھ عہدیداران حاضر ہو کر جان محمد سے ملاقات کر سکیں گے۔ دس افراد سے زیادہ کسی کو آڈیٹوریم میں آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

پچھلی رات سے دنیا کے تمام چینلز ہائی جیک ہونے والے طیارے کی اور جان محمد کی دلیری کی خبریں نشر کر رہے تھے۔ بھارتی انٹیلی جنس کے سراغ رساں دہلی میں رہنے والے جان محمد کے بارے میں دور تک معلومات حاصل کر رہے تھے۔ انٹرپول اور سی آئی اے کے چھٹے ہوئے جاسوس انڈیا کی راجدھانی میں موجود تھے۔ اس کے متعلق کھوج لگانے سے معلوم ہوا کہ اب سے پندرہ ماہ پہلے چانپا پل پر سے دریا میں گرنے والی ٹرین میں جان محمد تھا اور دریا میں غرق ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے اور تمام رشتے داروں نے اس پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔ پھر اچانک ہی پانچ ماہ پہلے اس نے واپس آکر بیان دیا تھا کہ وہ ڈوبنے کے بعد کنارے لگ گیا تھا۔ واپس اس لیے نہیں آیا تھا کہ باپ سے اور گھر والوں سے ناراض ہو کر گیا تھا۔

دوسری صبح سراغ رسانوں کی ایک فوج اس حویلی میں پہنچ گئی۔ مرینہ کی تدفین روکنے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے اس خاندان کے بزرگوں سے پوچھا۔ ”جان محمد پندرہ ماہ پہلے ٹرین کے حادثے میں دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ وہ پانچ ماہ پہلے کہاں سے آگیا تھا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے تو اسے خدا کی قدرت سمجھ کر مرنے والے کو زندہ دیکھ کر کلیجے سے لگا لیا تھا۔“

ایک جاسوس نے پوچھا۔ ”کیا آپ لوگوں نے محسوس کیا تھا کہ دوبارہ زندہ ہو کر آنے والا جان محمد کچھ بدل سا گیا ہے؟“

”ہاں۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ ہم رشتے داروں کو نہیں پہچانتا تھا۔ کہتا تھا کہ حادثے میں دماغی چوٹ کے باعث

اس کی یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔''
تمام سراغ رسانوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ایک نے کہا۔''یادداشت گم نہیں ہوئی تھی۔ اس بہانے وہ بہروپیا خود کو چھپا رہا تھا۔''
انٹرپول کے ایک افسر نے حویلی کے بزرگ سے پوچھا۔''آپ یاد کریں۔ سوچیں کہ دوبارہ آنے والا جان محمد اور کس طرح بدل گیا تھا؟ اس کی کون سی عادت یا فطرت مختلف ہوگئی تھی؟''
بزرگ نے کہا۔''ہم اس کی شادی جبراً کرا رہے تھے۔ وہ راضی نہیں تھا۔ ٹھیک شادی کے دن وہ ایک رقعہ لکھ کر گھر سے بھاگ گیا تھا کہ وہ کسی عورت کے قابل نہیں ہے۔''
دوسرے بزرگ نے کہا۔''لیکن جب واپس آیا تو اس نے اپنی پسند کی عورت سے شادی کی۔ اس عورت کی میت ابھی ہماری حویلی میں رکھی ہے۔ آپ خوامخواہ ہمیں اس کی تدفین سے روک رہے ہیں۔''
سی آئی اے کے ایک افسر نے پوچھا۔''یہ عورت کون تھی؟ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟''
بزرگ نے کہا۔''ہم نہیں جانتے۔ جان محمد نے کہا تھا کہ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔''
ایک افسر نے صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔''صاف سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ مراد علی منگی ہے اور یہ مرنے والی مرینہ تھی۔ بھارتی پولیس اور سراغ رساں پچھلے کئی مہینوں سے ان دونوں کو تلاش کررہے ہیں۔ یہ یقین تھا کہ وہ اسی شہر میں ہیں لیکن پہچانے نہیں جارہے تھے۔''
دوسرے افسر نے کہا۔''موٹی عقل سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو جان محمد کسی عورت کے قابل نہیں تھا، وہ اچانک ایسا سورما کیسے بن جائے گا کہ نہتا ہوکر چھ مسلح ہائی جیکرز کو طیارے کی محدود چاردیواری میں گھیر کر مار ڈالے گا اور کسی ایک مسافر کے بدن پر خراش بھی لگنے نہیں دے گا۔ وہ......وہ......''
وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔''وہ مراد علی منگی ہے۔ میں ابھی اس ریاست کی ملکہ کو کال کرتا ہوں۔ وہ اسے ہمارے حوالے کرے گی۔ اب تو اس کا باپ بھی ہمارے شکنجے میں آئے گا۔''
پھر کئی افسران، انٹرپول اور انٹرنیشنل سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کرنے لگے۔ بڑے ممالک کے حکمرانوں کو اطلاع دی جانے لگی کہ جان محمد کے پیچھے مراد علی منگی چھپا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں واضح ثبوت مل رہے ہیں۔
کسی مطلوب و مفرور مجرم کو کوئی ملک پناہ دے تو بین الاقوامی قوانین کے مطابق اور سفارتی تعلقات کو بحال رکھنے کی خاطر کوئی اس مجرم کو اپنے ملک میں واپس نہیں لاسکتا۔ ملکہ نگارا خانم نے صاف انکار کردیا اور کہہ دیا کہ مراد علی منگی اس کی پناہ میں رہے گا۔ وہ اسے کسی ملک کے حوالے نہیں کرے گی اور نہ ہی اب کسی کو مراد سے ملنے کے لیے اپنے ملک میں آنے دے گی۔
سپر پاور کہلانے والے ممالک بھی اسے مجبور نہیں کرسکتے تھے۔ اسے اندیشہ تھا کہ ملکہ کو مجبور کیا جائے گا تو وہ دوسری سپر پاور لابی میں چلی جائے گی۔ اس کی ریاست ایک بڑے ملک کے سرحدی علاقے میں تھی۔ دوسرے بڑے ممالک بھی ملکہ نگارا خانم کے ساتھ سیاسی سمجھوتا کرتے رہتے تھے۔ اس نے فون پر کہا۔''آج سے تین دنوں کے بعد میں ساری دنیا کو ایک سرپرائز نیوز سنانے والی ہوں۔''
یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کردیا۔ دوسرے دن مراد سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اس کے پیغام کو غباروں کے ذریعے فضا میں اڑا دیا۔ بے شمار چینلز ان غباروں کو دکھانے لگے۔ کہنے لگے۔''وہ مراد علی منگی جو عرصہ دراز سے روپوش تھا، اب وہ ظاہر ہوگیا ہے۔ اس نے پہلی بار دہلی سے غبارے اڑائے تھے۔ اس بار اس نے ملکہ نگارا خانم کے محل سے انہیں اڑایا ہے۔ بہت جلد ماروی بھی منظرِ عام پر آنے والی ہے۔''
دہلی میں مرینہ کی تدفین رکی ہوئی تھی۔ سراغ رساں سر سے پاؤں تک اسے اچھی طرح دیکھ رہے تھے۔ وہ بارہ برس کی عمر سے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تعلیم و تربیت کے لیے داخل ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا زیادہ حصہ اس عالمی شہرت یافتہ ادارے میں گزرا تھا۔ اس کے ریکارڈ کے مطابق اس مرنے والی عمارہ کا بلڈ گروپ وہی تھا جو مرینہ کا تھا اور انگلیوں کے نشانات بھی مرینہ ہی کے تھے۔
اب شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ نے تصدیق کردی کہ وہ مرینہ ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ افسران سے اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ صرف مراد علی منگی کے ساتھ رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ یقین سے کہا جارہا تھا کہ وہ مرنے والی جس کے ساتھ رہتی رہی تھی، وہ مراد علی منگی ہی ہے۔
مراد تین دنوں کے بعد مہمان خانے سے باہر آگیا۔ ملکہ نگارا نے محل کی دہلیز پر اپنا دل بچھا کر اس کا استقبال کیا۔

اگر وہ نمازی پرہیز گار نہ ہوتا تو تمام خدام اور کنیزوں کے سامنے ہی اس کے سینے سے لگ کر اسے اپنی دھڑکنیں سناتی۔ وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود اس کی منکوحہ بننے کے لیے تڑپ رہی تھی۔

مراد نے خواب گاہ کی تنہائی میں آ کر کہا۔ ''انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ ہم جب چاہیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ آئندہ ازدواجی زندگی کیسے گزاریں گے؟''

ملکہ نے کہا۔ ''جیسے دوسرے میاں بیوی گزارتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''دوسروں میں اور ہم میں بڑا فرق ہے۔''

''کیا فرق ہے؟''

''میں زمین ہوں تم آسمان ہو۔ میں ایک عام سا شہری ہوں اور تم ملکہ معظمہ ہو۔''

''تم نے مجھے تم کہہ کر اس بڑے فرق کو مٹا دیا ہے۔''

''یہ فرق تنہائی میں مٹا ہے۔ خواب گاہ کے باہر... بےشمار کنیزیں، خدام اور سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ محل کے باہر تمام سرکاری شعبوں کے عہدیدار ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں رعایا ہے۔ میں ان سب کے سامنے تم کہوں گا تو ملکہ کی توہین ہوگی۔''

''اگر تم چاہو تو باہر ایک ملکہ کے وقار کو اور اس کی قدر و منزلت کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے آپ کہہ سکتے ہو۔''

''کوئی بات نہیں، بیوی کو آپ کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے بھی آگے مسائل ہیں۔''

''وہ کیا ہیں؟''

''ملکہ کے آتے ہی آرمی کے اعلیٰ افسران، سپریم کورٹ کی جج صاحبہ اور دیگر معززین بھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر سیلوٹ کرتے ہیں۔ کیا تمہارا سابقہ شوہر تعظیماً اٹھ کر تمہیں سیلوٹ نہیں کرتا تھا؟''

''ہاں یہ سرکاری آداب ہیں۔ میرا سابقہ شوہر بلکہ میری والدہ اور دادی جان کے شوہر بھی انہیں سیلوٹ کرتے تھے۔''

''اور یہی مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں بیوی کو اپنی ملکہ سمجھ کر سلام نہیں کروں گا۔ ہمارے دین میں میاں بیوی ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں لیکن بیوی پیچھے ہو جائے اور ملکہ سامنے آ جائے تو میری مردانگی اسے سلام نہیں کرے گی۔''

''واقعی یہ مسئلہ ہے۔ تم اعلیٰ عہدیداروں کے سامنے مجھے سیلوٹ نہیں کرو گے تو میری سبکی ہوگی۔''

پھر اس نے دل میں کہا۔ ''لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ تم خوددار ہو تو میں بھی تم سے کم نہیں ہوں۔''

وہ بولی۔ ''اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم بھی ایک ساتھ اس محل سے باہر نہیں جائیں گے۔ باہر نہ ایک دوسرے سے سامنا کریں گے، نہ تمہیں ملکہ کو سیلوٹ کرنا پڑے گا۔''

اس نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے یہی ہوگا۔ باہر کوئی ملکہ عالیہ کے شوہر کو اس کے ساتھ نہیں دیکھے گا۔ اب آگے سنو کہ کیا ہونے والا ہے؟ یہ کہ مجرموں کی دنیا کی وہ تمام تنظیمیں جو بڑے ممالک کے لیے درپردہ... کام کرتی ہیں، وہ تمام ممالک مجھے منظرِ عام پر لائے بغیر اور مجھے گرفتار کیے بغیر سکون سے نہیں رہیں گے۔ مجھے ان سے سرکاری طور پر نمٹنے کے لیے اس ریاست کی آرمی، پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے بھرپور تعاون حاصل کرنا ہوگا اور اس کے لیے ہمیشہ ان سے رابطہ رکھنا ہوگا اور ایسے وقت تمہاری موجودگی بھی لازمی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ ''تم میرے مجازی خدا بننے کے بعد ایک طرح سے یہاں کے حکمران کہلاؤ گے۔ میں آرمی، پولیس، انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے تمام اہم شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو حکم دوں گی کہ وہ تمہارے ضروری احکامات کی تعمیل کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ جن سنگین معاملات میں تمہارے ساتھ میری موجودگی لازمی ہوگی تو ہم اعلیٰ عہدیداروں کی موجودگی میں اسکائپ کے ذریعے بڑی سی اسکرین پر ایک دوسرے سے بولتے رہیں گے۔ اس طرح میرے یا تمہارے قریب بیٹھے ہوئے اعلیٰ عہدیدار ہمیں دیکھتے اور سنتے رہیں گے۔''

یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ان دونوں نے اسی دن فیصلہ کیا کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ ملکہ نے اپنے ملکی چینل اور اخبارات کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ شام چھ بجے اپنے چینل سے عوام کو مخاطب کرے گی اور دنیا کے تمام حکمرانوں کو بھی ایک سرپرائز دے گی۔ ویسے یہ بات تمام ریاست میں آپ ہی آپ پھیل رہی تھی کہ ان کی ملکہ معظمہ اپنی شادی خانہ آبادی کی خبر سنانے والی ہیں۔ ریاست کے اندر اور باہر تمام دشمن بھی سمجھ رہے تھے کہ مراد علی منگی نے اپنے تحفظ اور سلامتی کے لیے ملکہ نگارا کے دل و دماغ پر مضبوطی سے پنجے گاڑ دیے ہیں۔

شام چھ بجے دنیا کے تمام ممالک کے حکمرانوں اور تمام انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے عہدیداران اپنے اپنے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دنیا کے تمام ملکوں میں اور تمام

علاقوں میں چھوٹی بڑی اسکرین پر ملکہ اور مراد ایک ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ وہ تمام دشمن جو مراد کو پہچانتے تھے، وہ جان محمد کی صورت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

نگارا خانم نے کہا۔ ''السلام علیکم! میں ریاست باب النساء کی ملکہ نگارا خانم آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ سے کچھ بولنے کے لیے آج میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔'' وہ مراد کو دیکھ کر بولی۔ ''یہ میرے ساتھ ہیں۔ یہ کون ہیں؟ آپ کو اندازہ ہے۔ میں تصدیق کردوں کہ یہ مراد علی منگی ہیں۔''

یہ تو سب ہی کسی حد تک جان چکے تھے۔ پھر بھی ایک ملکہ کی طرف سے یہ اہم انکشاف تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''کہا جاتا ہے کہ یہ بدنام زمانہ مجرم ہیں۔ اگر مجرم ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی جان پر کھیل کر دو سو دس مسافروں کی جانیں بچاتے ہیں تو میں مشورہ دوں گی کہ ہم سب کو مجرم کہلانا چاہیے۔ بائی داوے میں چیلنج کرتی ہوں کہ کوئی مسٹر مراد علی منگی کے خلاف ایک ثبوت یا ایک گواہ پیش کرے۔ آج سے یہ اس ریاست کے حکمرانِ ثانی ہیں۔ کوئی انہیں مجرم کہنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ میرے لیے قابلِ قدر ہیں۔ میں ان کی اتنی قدر کرتی ہوں کہ آج بعد نمازِ مغرب ان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والی ہوں۔ یہ میرے آئیڈیل تھے اور ہیں۔ میں ان کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے والی ہوں۔''

ماروی اور محبوب بھی ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ماروی بڑے دکھ سے اپنے بچپن کے پیار کو دیکھ رہی تھی۔ اگر چہ وہ صورت نہیں تھی لیکن یار وہی تھا۔

محبوب نے ماروی کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ یہ کنارے لگ رہا ہے۔ اب تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔ ویسے یہ بہت اونچی جگہ پہنچ گیا ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''کیا ہوتے ہیں یہ مرد؟ ہم نے کل ہی مرینہ کی وفات کی نیوز سنی تھی۔ آج یہ ملکہ سے شادی کر رہا ہے۔ کچھ روز تو سوگ مناتا۔ آپ مردوں کی نظروں میں عورت کی ویلیو کیا ہے؟''

وہ ذرا پیچھے ہو کر بولا۔ ''مجھے غصہ کیوں دکھا رہی ہو؟ سب ہی عورتیں اور سب ہی مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔''

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''واقعی مراد کی طرف سے اندیشہ کم ہو گیا ہے اور آج سے چار دنوں کے بعد عدت کے ایام پورے ہو جائیں گے۔''

''ہم پانچویں دن یہاں سے سعودی عرب کے لیے فلائی کریں گے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

ادھر ملکہ خانم کہہ رہی تھی۔ ''میں مراد علی منگی کے بارے میں بہت کچھ بولنا چاہتی ہوں لیکن یہ بہتر ہوگا کہ یہ اپنی زبان سے بولیں۔ میں بھی سنوں گی، آپ بھی سنیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اسکرین سے آؤٹ ہو گئی۔ صرف مراد رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ ایسے لمحات ہیں کہ اس وقت مجھے دوست بھی دیکھ رہے ہیں اور دشمن بھی... میرے دوستو! میری نئی زندگی کا نیا سلام! میرے دشمنو! مجھے دیکھو اور ماتم کرو کہ میں کس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ آج میں ایک ملکہ معظمہ کا مجازی خدا بن رہا ہوں۔ پہلے میرے دو ہاتھوں میں دو گنیں ہوتی تھیں، آج کے بعد میرے آگے پیچھے دائیں بائیں ایک ریاست کی پوری فوج ہوگی۔ میرا کوئی دشمن یہاں کھلونے والی گن لے کر بھی نہیں آسکے گا۔ جو آئے گا' اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا، کسی عدالت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ اسے دیکھتے ہی گولی ماردی جائے گی۔ آج سے اس ریاست کی خارجہ پالیسی میری سلامتی کے لیے ہوگی۔ جو ملک میرا دوست ہوگا، اس سے دوستی اور سیاسی معاہدے ہوں گے۔ ورنہ میری دشمنی کتنی مہنگی پڑتی ہے، یہ میرے دشمن بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ آج سے اس مراد علی منگی کے لیے ایک نیا سیاسی محاذ کھل رہا ہے۔ مجھے آج کے بعد سیاسی جنگ بھی لڑنی ہوگی اور سیاست کیا ہے؟ ذہانت بھری مکاری ہے۔ آج سے دشمنوں کے خلاف یہی مجرمانہ چالبازی جاری رہے گی۔ قانون کے سائے میں جرم کرتے رہنے کو ہی سیاست کہتے ہیں۔ سیاستدانوں سے بڑا مجرم کوئی نہیں ہوتا۔''

بل چرخی جیل سے فرار ہونے والا قلندر شاہ دو کمروں کے ایک سرکاری کوارٹر میں تھا۔ ملکہ نگارا کے حکم کے مطابق اس کے علاج پر خاص توجہ دی جارہی تھی۔ اسے جیل میں بری طرح ٹارچر کیا گیا تھا۔ اب علاج کے باعث رفتہ رفتہ تکلیف ختم ہو گئی تھی۔ بدن کی اجلی رنگت پہلے جیسی نہیں ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ جلے ہوئے داغ دھبے رفتہ رفتہ مٹ جائیں گے۔ وہ پہلے کی طرح خطرات سے کھیلنے اور واردات کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملکہ نگارا جلد ہی اسے طلب کریں گی اور اسے جیل سے اغوا کرانے کا مقصد بیان کریں گی۔ لیکن ایک ہفتہ گزر گیا تھا اور ملکہ نے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ پھر اس نے طیارے کے اغوا ہونے کی خبر سنی تھی اور جان محمد کی جواں مردی کے چرچے سن رہا تھا۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر اسے آنکھوں

سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ چونکا دینے والی بات اس کے کانوں میں پڑی کہ وہ جان محمد نہیں ہے۔ مراد علی منگی ہے۔ وہ مراد ہے جس پر وہ چھپ کر دوبار گولیاں چلا چکا تھا۔

میکی براؤن اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اتحادی تنظیموں کے سربراہوں نے اس سے کہا تھا۔ ''تمہارا معاوضہ بڑھا دیا جائے گا۔ کسی طرح اس درندے کو ڈھونڈ کر ختم کردو۔''

ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ درندہ اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ''ارے او بدنصیب! ابھی اپنی خوش نصیبی کا جشن منالے۔ میں اس بار جلد بازی نہیں کروں گا۔ بہت اطمینان سے گولی ماروں گا۔ تو آخری وقت میں بہت لمبا ہاتھ مار رہا ہے۔''

اس نے مقتول کے بیٹے جیکی براؤن سے فون پر رابطہ کیا۔ پھر پوچھا۔ ''مراد کو اسکرین پر دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں۔ تم اس کے صورت آشنا ہو رہے ہو۔ اس کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑے گا لیکن......''

''لیکن کیا؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہوگیا ہے۔ ایک ریاست کی پوری فوج اس کی محافظ رہے گی؟''

''ہاں، اب وہ جہاں بھی جائے گا، اس کے آگے پیچھے مسلح فوج رہا کرے گی۔''

''جہاں لشکر لاکھوں کی تعداد میں ہو، وہاں بھی موت آتی ہے۔ اب تک میری دو گولیاں اس پر ضائع ہوگئیں۔ تیسری انعام دے گی۔ بولو کیا دے رہے ہو؟''

''میرے مقتول باپ نے پچاس لاکھ ڈالرز دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہی تمہیں ملے گا۔''

''خطرات بڑھ گئے ہیں۔ معاوضہ بھی بڑھاؤ۔ مراد کے تمام باڈی گارڈز کا تعلق آرمی سے ہوگا۔ ان کے درمیان گولی چلانے کا مطلب ہے، میں بھی مارا جاؤں گا۔ دس لاکھ ڈالرز کا اضافہ کرو۔ میں جان پر کھیلنے جاؤں گا۔''

''دس نہیں، پانچ کا اضافہ کرتا ہوں۔ کل یہ پانچ لاکھ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائیں گے۔ کیا تم اس ریاست میں جارہے ہو؟''

''میں اسی ریاست میں ملکہ نگارا خانم کا ایک اہم مہمان ہوں جب چاہوں ملکہ سے مل سکتا ہوں۔ ملکہ سے ملنے کا مطلب ہے مراد کے قریب جانا۔ میں بہت سوچ سمجھ کر ٹھہر ٹھہر کر اس کی موت بنوں گا۔ پہلے ان میاں بیوی کا اعتماد حاصل کروں گا۔''

''تم واقعی آندھی طوفان کی طرح ٹارگٹ تک پہنچتے ہو۔ اس سے بڑی بات کیا ہے کہ تم مراد کے قریب پہنچے ہوئے ہو۔ اوکے میں تمہاری اگلی کال کا انتظار کروں گا۔''

انٹرپول اور انٹرنیشنل سی آئی اے کے اعلیٰ عہدیدار اور کئی ممالک کے حکمران ٹی وی اسکرین پر ملکہ اور مراد کی باتیں سن چکے تھے۔ اب وہ آپس میں بول رہے تھے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے سراغ رسانوں سے پوچھ رہے تھے کہ مراد علی منگی سے موجودہ حالات میں کیسے نمٹا جائے گا؟ یہ کام بہت ہی پیچیدہ ہوگیا تھا کہ اسے ملکہ معظمہ کے تختِ طاؤس سے کس طرح اتار کر پھر سے ایک عام مجرم بنا کر گرفتار کیا جاسکے گا اور اسے موت کے گھاٹ اتارا جاسکے گا؟ آئندہ حکومتی اور سفارتی سطح پر سیاسی چالیں چلی جانے والی تھیں۔ اس نے دوستوں اور دشمنوں سے بے نیاز ہوکر نگارا خانم کو اپنی دلہن بنالیا۔ دلہن کی شاہی خواب گاہ میں اس کے ساتھ پہلی رات... گزارنے لگا۔

وہ اتنی جلدی سہاگ رات کی مسرتیں حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مرینہ جیسی لائف پارٹنر اتنی جلدی دل سے جانے والی نہیں تھی۔ اس کی عداوتیں اور بے انتہا محبتیں رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ پھر یہ مناسب نہیں تھا کہ ایک بیوی کی وفات کے پانچویں دن ہی دوسری کو بیج پر لے آتا۔ لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے، ملکہ نگارا کے ذریعے لشکری قوت حاصل کرلے اور دشمن ممالک کے حکمرانوں کو سیاسی دباؤ میں لے آئے۔

وہ یہی کررہا تھا۔ بڑے ممالک یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملکہ ان سے بدظن ہوکر دوسرے سپر پاور کی جھولی میں چلی جائے۔ اس لیے وہ مراد کے خلاف سازشیں کرنے کی جرأت کرنے والے نہیں تھے اور درِ پردہ سازشیں کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے اب مراد کے پاس طاقت تھی، ذرائع تھے اور وسیع اختیارات تھے۔

سہاگ رات بڑی رنگین تھی۔ روشن تھی۔ باہر رات کی تاریکی میں دور بہت دور آسمان کی بلندیوں میں وہ غبارے محوِ سفر تھے۔ ایک ابدی نیند سوچکی تھی۔ دوسری مطلقہ بھی اور وہ اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ کئی ممالک کے انٹیلی جنس والوں کی نظریں اب بھی ان غباروں پر تھیں۔ مراد تو نظروں میں آگیا تھا۔ وہ ماروی کو بھی دیکھنا اور اسے اپنی حراست میں رکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ آج بھی مراد کی کمزوری بن سکتی ہے یا نہیں؟

دوسری صبح ماسٹر کوبو بو نے فون پر کہا۔ ''ملکہ نگارا خانم

سے شادی مبارک ہو۔''

مراد نے کہا۔ ''شکریہ۔ میں روپوش ہونے کے بعد یہ سم استعمال نہیں کررہا تھا۔ اب تو ڈنکے کی چوٹ پر ظاہر ہوگیا ہوں۔ اس لیے یہ سم استعمال کررہا ہوں۔''

''بیٹے! سب سے زیادہ خوشی مجھے ہے۔ تم نے ایسی سیاسی قوت حاصل کرلی ہے کہ عالمی عدالت بھی اب تمہیں مجرم نہیں، ریاست باب النساء کا حکمران کہے گی۔''

اس نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو آئندہ سیاسی سطح پر بدمعاشوں کو نچاتا رہوں گا۔''

''مجھے اندازہ ہے' آئندہ تم وہ کرو گے جس کی ابھی کوئی توقع نہیں کررہا ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں کل بھی تمہارا تھا اور آئندہ بھی تمہارا رہوں گا۔''

''بلاّ آج کل کہاں ہے؟ اسے بولیں کہ مجھ سے بات کرے۔''

''میں ابھی کہتا ہوں۔''

ماسٹر سے رابطہ ختم ہوگیا۔ بشریٰ اور بلاّ پہلے دہلی میں تھے پھر چپت راؤ کے ساتھ آگرہ' ممبئی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے جے پور آگئے تھے۔ وہاں انہوں نے ٹی وی اسکرین پر مراد اور ملکہ نگارا خانم کو دیکھا۔ اس سے پہلے چپت راؤ نے مرینہ کے وفات پانے کی خبر سنائی تھی۔ اس کی موت پر کسی کو افسوس نہیں ہوا۔ خوشی بھی نہیں ہوئی کیونکہ ایک دن انہیں بھی مرنا تھا۔ بشریٰ نے کہا۔ ''چلو مراد بھائی کی جان چھوٹی۔ کمبخت کو مرنا تھا تو ماروی کو طلاق ہونے سے پہلے مر جاتی۔ ان کی ازدواجی زندگی تو نہ ٹوٹتی۔''

بلےّ نے کہا۔ ''مرینہ تیرے ہاتھوں سے مری ہے۔''

چپت راؤ نے کہا۔ ''نہیں۔ اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے اس کی موت ہوئی ہے۔ وہاں سب کہہ رہے ہیں کہ وہ سوتے سوتے چل بسی ہے۔''

بلےّ نے کہا۔ ''اسی بلی نے اسے بیڈ پر پہنچایا اور سلایا تھا۔ وہ بڑی قوت برداشت رکھتی تھی۔ لیکن اس کی پہنچائی ہوئی چوٹوں نے اسے کمزور کردیا تھا۔ بے حد کمزوری کے باعث ہی حرکت قلب بند ہوگئی تھی۔''

وہ بولی۔ ''اس کی موت کا فائدہ کیا ہوا؟ مراد بھائی تو اس سے چھوٹتے ہی ملکہ عالیہ کی زلفوں میں جاکر اٹک گئے ہیں۔ کیا اب غباروں کے ذریعے ماروی کو واپس نہیں بلائیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''یہ اچھا ہی ہے بشریٰ کہ وہ اب ملکہ کے ساتھ رہے اور ماروی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اللہ نے چاہا تو ماروی کو محبوب کی صورت میں ایک بہترین اور بے مثال لائف پارٹنر ملے گا۔ مراد نے اس بے چاری کو بڑے صدمات دیے ہیں۔''

''درست کہتے ہو۔ میں ماروی اور محبوب کے حق میں دعائیں مانگتی رہوں گی۔''

ایسے وقت ماسٹر نے بلےّ سے فون پر کہا کہ مراد اس سے باتیں کرنا چاہتا ہے اور اس نے پرانی سم آن رکھی ہے۔

اس نے کہا۔ ''میں ابھی اس سے باتیں کروں گا۔''

وہ فون بند کرکے بشریٰ سے بولا۔ ''یہ بڑی بات ہے کہ وہ بہت اونچی جگہ پہنچ کر بہت طاقتور ہونے کے بعد بھی مغرور نہیں ہے، مجھے یاد کررہا ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''مجھے مراد بھائی اسی لیے اچھے لگتے ہیں۔''

وہ اس کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ بشریٰ نے اس سے فون لے کر آواز بڑھادی۔ رابطہ ہوتے ہی مراد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو بلےّ! کہاں ہو؟ کیسے ہو؟''

''میں تو جیسا تھا' ویسا ہی ہوں۔ تم کیا سے کیا ہوگئے ہو۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیسے کیسے، ایسے ویسے ہوگئے اور ایسے ویسے، کیسے کیسے ہوگئے۔''

''یار! تم تو لاجواب ہوگئے۔ اب تو ہزاروں مسلح سپاہیوں کا لشکر تمہارے پیچھے رہے گا۔ دنیا کا کوئی ملک، کوئی حکمران تمہیں مجرم کہنے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ تم نے بڑی دانائی سے تحفظ حاصل کیا ہے۔''

''بلےّ! پھر بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں اپنی ایک خفیہ سیکیورٹی فورس بنانا چاہتا ہوں۔''

''بے شک تمہیں اس احتیاطی تدبیر پر عمل کرنا چاہیے۔''

''مجھے اس مقصد کے لیے تمہاری اور بشریٰ کی ضرورت ہے۔''

بلےّ نے بشریٰ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''مراد بھائی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم وہاں مستقل رہائش اختیار کریں؟''

مراد نے کہا۔ ''ہاں بشریٰ! جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہوگا' اس ریاست میں ہمیشہ خواتین کی حکمرانی رہی ہے۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملتے ہیں بلکہ مردوں سے زیادہ عورتیں یہاں کے تمام شعبوں پر حاوی نظر آتی ہیں۔ یہ جگہ تمہارے مزاج کے مطابق ہے۔ جب تک حالات اجازت دیں گے، تب تک تم دونوں میرے ساتھ یہاں رہو گے۔ لیکن ہم یہاں ایک دوسرے کے شناسا نہیں رہیں

گے۔تم دونوں میری خفیہ سیکیورٹی فورس کے کمانڈر اور منتظم رہو گے۔ مجھ سے رشتہ ظاہر نہیں کرو گے۔''

بلّے نے کہا۔''ہم سب نے یہ ارادہ کیا تھا کہ روپوش رہ کر امن و امان سے عام شہری کی طرح زندگی گزاریں گے۔ کبھی ہتھیار نہیں اٹھائیں گے لیکن تقدیر کو منظور نہیں ہے۔ گن چلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جاتا ہے.... بہرحال ہم آئیں گے۔''

بشریٰ نے جلدی سے کہا۔''لیکن ایک شرط پر۔ آپ ہماری ایک شرط مان لیں گے تو ہمیشہ آپ کے کام آتے رہیں گے۔''

''تمہاری ایک نہیں ہزار شرطیں منظور ہیں۔''

''آپ ایک ہی نہیں مان سکیں گے۔انکار کردیں گے۔''

''ایسی کیا بات ہے بشریٰ؟''

''ایسی ہی بات ہے۔شرط بہت کڑی ہے۔''

''فارگاڈ سیک، بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''آج کے بعد آپ میری بہن ماروی کو بھول جائیں گے۔اس کا نام بھی زبان پر نہ لائیں گے۔''

دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ بشریٰ نے جواب کا انتظار کیا پھر کہا۔''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، آپ انکار کریں گے۔''

وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔''بشریٰ! کیوں میری جان لے رہی ہو؟''

''طلاق کے بعد میری بہن کی جان آدھی ہوگئی ہے۔ اب وہ کہیں بھی ہے، محبوب کے ساتھ ایک پُرسکون ازدواجی زندگی گزار رہی ہوگی۔ خدا کے لیے اُسے معاف کردیں۔ آپ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ آپ کے دل میں خوفِ خدا ہے۔ کیا یہ خوف نہیں ہے کہ ماروی کی ہنستی بستی زندگی میں زہر گھولیں گے تو خدا آپ سے ناراض ہوگا؟ آپ کی نمازیں قبول نہیں کرے گا؟''

وہ گھبرا کر بولا۔''بس کرو بشریٰ اور کچھ نہ بولو۔ میں تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔''

اس نے فون بند کرکے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔ یہ خیال کئی بار ذہن میں آیا تھا کہ ماروی کو اپنے طور پر زندگی گزارنے دے۔ وہ محبوب کے ساتھ خوش ہے تو اسے خوش رہنے دے۔ لیکن رقابت کی آگ جلاتی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی پھانس گڑی ہوئی تھی کہ وہ بچپن سے اس کی ہے۔ اسی کی رہے گی۔ وہ اسے چھوڑ بھی دے تو وہ کسی اور کے پاس نہیں جائے گی اور یہ غلط تھا۔ پھر صحیح کیا ہے؟ نماز کا وقت نہیں تھا۔ وہ مصلیٰ بچھا کر دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلا گیا۔ صحیح یہ ہے۔ یہ جو میں نے سجدہ کیا ہے۔ اگر یہ سجدہ خوف خدا سے خالی ہے تو پھر میری نمازیں محض دکھاوے کی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ سجدہ ایک عدالت ہے۔ وہ اس عدالت میں خود مجرم ہے اور خود منصف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیکھتا رہتا ہے کہ بندہ سجدے میں بھی اپنا محاسبہ کرتا ہے یا نہیں؟ اپنے رب کی نادیدہ موجودگی سے خوفزدہ ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو جا بندے بھٹکتا رہ۔ تیرے مقدر میں گمراہی ہے۔ ماروی کے مقدر میں نہیں ہے۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی عدالت خانہ کعبہ میں جارہی ہے۔

وہ بڑی دیر تک مراقبے میں رہا۔ پھر اس نے دونوں کانوں کو پکڑ کر کہا۔''اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ اپنی غلطیوں کو مانتا ہوں۔ آئندہ ماروی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھوں گا۔ وہ نامحرم ہے۔ شاید پرائی ہوچکی ہے۔ اگر اس کی آرزو پیدا ہوتی ہے تو یہ سراسر شیطانیت ہے۔ مجھے شیطانی عشق سے بچنا چاہیے اور میں بچتا رہوں گا۔''

وہ اللہ اکبر کہتا ہوا سجدے میں چلا گیا۔ غلطیاں سجدے ہی میں درست ہوتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تخریب پسندوں کا برین واش ہوتا ہے۔ پھر وہ سجدے سے اُٹھا تو یوں لگا' کوئی اس کے دائیں طرف دوزانو بیٹھا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھنا چاہا تو نہ دیکھ سکا۔ اس کا سر اس طرف نہیں گھوم رہا تھا۔ کسی نادیدہ قوت نے اسے جکڑ لیا تھا۔ پھر اسے حضرت صلاح الدین اجمیری کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔''اے نمازی! تیرے اندر چند خامیاں ہیں۔ آج تُو نے اپنی ایک بڑی خامی دور کی ہے۔ آج تو نے اس مظلوم لڑکی کا حق ادا کیا ہے۔ تو ایک مطلقہ اور نامحرم کی طلب سے باز آچکا ہے۔

''تو اپنے فیصلے پر قائم رہے گا تو تیری نمازوں میں اور پختگی پیدا ہوتی رہے گی۔ نمازیوں کو اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے۔ جو اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو اپنے اندر سے ڈھونڈ نکالتے ہیں اور انہیں دور کردیتے ہیں۔ وہی اللہ تعالیٰ سے انعام پاتے ہیں۔ اپنا محاسبہ کرتا جا۔ تجھے ایک انعام ملنے والا ہے۔''

اچانک ایسا لگا کہ وہ نہیں ہیں۔ اس بار جکڑ بندی نہیں تھی۔ وہ آزاد ہوگیا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا مصلے پر تھا۔

☆☆☆

اس کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ اچانک حالات بدل گئے تھے۔ ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں۔ پھر ایسی صورت میں کہ بیوی نئی تھی اور جگہ بھی نئی تھی اور بیوی کوئی عام سی عورت نہیں، ملکہ عالیہ تھی۔ جگہ کوئی چھوٹی سی نہیں تھی، ایک پوری سلطنت تھی۔ ایک ملکہ کو اپنے مزاج میں ڈھالنا تھا اور کچھ تھوڑا بہت اس کے مزاج کے مطابق گزارہ کرنا تھا۔

وہ پوری سلطنت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔ سب سے پہلے آرمی، پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے مل کر انہیں اندر سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نگارا خانم سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک خفیہ سیکیورٹی فورس بنائے گا۔ اس فورس کی کمانڈر ایک خاتون رمشا (بشریٰ) اور منتظمِ اعلیٰ سلمان (بلا) ہوگا۔"

بشریٰ اور بلے کے نئے چہرے کے مطابق ان کے یہی نام تھے۔ وہ تیسرے دن تلاشِ روزگار کے سلسلے میں وہاں آئے تو ان دونوں کو دو مختلف شعبوں میں ملازمت مل گئی۔ ملکہ نگارا اور مراد ان سے دور ہی رہے۔ ملکہ کی سفارش پسِ پردہ رہی۔ وہ ان شعبوں میں رہ کر درِ پردہ جاسوسی کرنے والے تھے اور آستین میں چھپے ہوئے سانپوں کو نکالنے والے تھے۔ وہ اپنی پلاننگ کے مطابق بہت ہی ذہین اور قابلِ اعتماد خواتین اور حضرات کو اپنے اعتماد میں لے کر اپنی خفیہ سیکیورٹی فورس بنانے والے تھے۔

مراد نے نگارا سے کہا۔ "تمہارے ذہن میں یہ خلش ہوگی کہ میں کسی دن ماروی کو تمہاری سوتن بناؤں گا۔"

وہ بولی۔ "دنیا کی کوئی سہاگن کسی سوتن کو برداشت نہیں کرتی لیکن تمہیں پا کر میں اپنی انا اور خودداری کو بھول گئی ہوں۔ میرا مزاج بدل گیا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں تمہیں ناراض کروں گی اور تم مجھ سے بدظن ہو کر یہاں سے جانا چاہو گے تو میری پوری آرمی بھی تمہیں نہیں روک سکے گی۔"

"نہ تم میرے مزاج کے خلاف کبھی کچھ بولو گی اور نہ میں تمہارے مزاج کے خلاف کبھی کوئی سوتن لاؤں گا۔ میں نے اپنے ربّ سے وعدہ کیا ہے کہ ماروی کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ یہ آخری بار اس کا نام زبان پر آیا ہے۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کے سینے سے لگ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی اور کہنے لگی۔ "میں نے دل میں عہد کیا تھا کہ ماروی کے معاملے میں کبھی غصہ نہیں دکھاؤں گی۔ ایک ریاست کی ملکہ ہوں لیکن کبھی مغرور بن کر نہیں رہوں گی۔ ایک محبت کرنے والی شریکِ حیات کی طرح تم سے رشتہ نباہتی رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کو میری یہ انکساری پسند آئی ہے۔ آپ بلا شرکت غیرے میرے اور صرف میرے ہی رہیں گے۔"

وہ بڑے جذبوں سے محبتیں دیتی رہی پھر بولی۔ "وہ..... ان غباروں کا کیا کرو گے؟ وہ ماروی کی سمت جا رہے ہوں گے۔"

"میں نے اسے دل سے نکال دیا ہے۔ اب وہ غبارے بچکانا کھیل لگ رہے ہیں۔"

"تم کامل یقین سے کہتے تھے کہ وہ خط ماروی کے ہاتھوں میں ضرور پہنچے گا۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں، اس وقت دل کا معاملہ تھا۔ میں دل سے کہتا تھا۔ اب کہتا ہوں، وہ غبارے وہاں تک نہ پہنچیں۔ کسی دریا میں یا سمندر میں جا کر غرق ہو جائیں۔" وہ اسے بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ "آئندہ اس کا ذکر نہ کرنا۔ صرف اپنی باتیں کرو۔"

انہوں نے ان غباروں کو نظرانداز کر دیا۔ کسی کا ذکر نہ کرنے سے، کسی کو بھول جانے سے اس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ وہ غبارے بھی ختم ہونے والے نہیں تھے۔ ابھی ان میں گیس بھری ہوئی تھی۔ اس لیے وہ زندہ تھے اور اپنی مخصوص رفتار سے ایک سمت اُڑتے جا رہے تھے۔ آسمان پر پرندے بھی اڑتے ہیں۔ جہاز بھی اُڑتے ہیں اور دعائیں بھی فلک کو چھونے جاتی ہیں۔ ماروی بھی فضا میں پرواز کر رہی تھی۔ محبوب، انیس عالم، بتول بی بی اور سرفراز کے ساتھ لندن سے اس مقام تک جا رہی تھی جدھر اب تک سجدے کرتی رہی تھی۔ دور بہت دور غباروں کا رخ بھی اسی سمت تھا۔ وہ بھی جیسے خانۂ کعبہ کا طواف کرنے اور بلندی سے اتر کر اسی زمین پر سجدہ کرنے آ رہے تھے۔ وہ محبت نامہ تھم تھم کے آ رہا تھا۔ اب وہ محبت نامہ ناپسندیدہ تھا اور خلافِ تہذیب تھا۔ ماروی ایک نئی زندگی شروع کرنے آئی تھی اور وہ پیغامِ محبت اسے پتھر کی طرح لگنے والا تھا۔ گیس کچھ کم ہو گئی تھی۔ وہ بلندی سے کچھ نیچے آ گیا تھا لیکن کسی حد تک ماروی کے قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ جدہ کے ائرپورٹ پر پہنچ گئی تھی اور غبارے مکہ معظمہ کی سمت جا رہے تھے۔ وہ بھی محبوب کے ساتھ بائی روڈ اُدھر جانے والی تھی۔

شہر مکہ کے قریب وسیع و عریض میدان میں حدِ نظر تک لاکھوں کی تعداد میں حاجیوں کے خیمے نصب تھے۔ حاجیوں کی کثیر تعداد دیکھ کر ایمانی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کے مسلمان وہاں رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر یکجا

ہوجاتے ہیں۔ انہوں نے خانۂ کعبہ کے قریب ایک ہوٹل میں دو کمرے کرائے پر لیے۔ ایک کمرے میں وہ انیس عالم، بتول بی بی اور سرفراز کے ساتھ تھی۔ محبوب ابھی نامحرم تھا۔ لہٰذا وہ دوسرے کمرے میں گزارہ کرنے والا تھا۔ وہ ظہر کی نماز کے وقت خانۂ کعبہ میں آئے تو پہلی بار وہاں قدم رکھتے ہی ماروی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ ایک دیوار سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔ سب ہی کہتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر صرف گناہ گاروں کو ہی نہیں بے گناہوں کو بھی یہ سوچ سوچ کر رونا آتا ہے کہ خدا جانے، جانے انجانے میں ہم سے کب اور کیسی غلطیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔ وہ غفورالرحیم معاف فرماتا ہے لیکن سزائیں بھی ضرور دیتا ہے۔ محبوب اس سے دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس کے قریب جاکر آنسو پونچھنے والا رشتہ نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

''یا اللہ! یہ برسوں سے دو چاہنے والوں کے درمیان عذاب میں مبتلا رہتی آئی ہے۔ صدمات سے ٹوٹ چکی ہے۔ ماروی پر رحم فرما میرے معبود! اسے میری شریکِ حیات بنادے۔ اس بار کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ ہم تیری عدالت میں انصاف مانگنے آئے ہیں۔''

اسی وقت کہیں دور سے آواز آئی۔ ''غبارے۔۔۔!''

ماروی اور محبوب دونوں ہی چونک گئے۔ وہ خبروں میں سنتے آرہے تھے۔ ایک بار ایک ٹی وی چینل میں ان غباروں کو درجنوں کی تعداد میں یکجا ہوکر اڑتے دیکھا تھا۔ اخباروں میں لکھا تھا کہ وہ غبارے کسی ماروی کی طرف جارہے ہیں۔ اس ماروی کے ذریعے مراد کو گرفتار کیا جاسکے گا۔ ماروی اور محبوب نے یہ بھی پڑھا تھا کہ مراد نے ماروی کے نام ایک خط لکھا ہے۔ وہ اسے اپنی زندگی میں واپس بلا رہا ہے۔ یہ سب دل توڑنے اور بنتے ہوئے رشتے کو پھر سے بگاڑنے والی باتیں تھیں۔ ماروی رونا بھول گئی۔ اس نے اور محبوب نے آسمان کی طرف دیکھا لیکن دور تک کوئی غبارہ نظر نہیں آیا۔

کسی نے دوربین کے ذریعے درجنوں غباروں کو دیکھ کر حیرانی سے چیخ کر کہا تھا۔ ماروی نے فون پر محبوب سے کہا۔ ''میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''ہم اللہ کے دربار میں ہیں۔ حوصلہ رکھو، میں ابھی دیکھتا ہوں۔''

وہ دوڑتا ہوا ایک دکان میں آیا۔ وہاں سے اس نے ایک دوربین خریدی پھر اسے آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔

دور...... حدِنظر سے دور وہ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے ہی نظر آرہے تھے۔ گویا ماروی کے پاس آنے والے تھے۔

محبوب نے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ادھر جاتے ہوئے فون پر کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، میں اس خط کو کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔ میں ادھر جارہا ہوں۔ دیکھوں گا کہ وہ غبارے کہاں جاکر زمین پر گرنے والے ہیں۔''

ماروی کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔ ''وہ یہاں تک آگئے ہیں تو میرے ہی پاس آئیں گے۔ یا اللہ! انٹیلی جنس والے مجھے حراست میں لے کر محاسبہ کریں گے۔ یا اللہ! وہ خط میرے پاس نہ آئے۔''

وہ پھر رونے لگی۔ محبوب بھی مجبور ہونے والا تھا۔ وہ انٹیلی جنس والوں کا سامنا کرکے ان سے وہ خط مانگ کر ان کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہے گا۔ پھر بھی اُدھر جارہا تھا۔

اب وہ غبارے دوربین کے بغیر بھی نظر آرہے تھے۔ وہ قریب آرہے تھے۔ ان کی بلند پروازی ختم ہوچکی تھی۔ ان کی پرواز نیچی ہوتی جارہی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ ہوا جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ پتا نہیں کیسے حاجیوں کے خیموں میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی۔ وہ غبارے اپنی پرواز سے محروم ہوتے ہوئے پستی کی سمت اسی آگ میں غروب ہونے آرہے تھے۔ محبوب ان کی طرف دیکھنا بھول گیا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ حاجیوں کو آگ سے نکالنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں تک وہاں مصروف رہا۔ وہاں کی انتظامیہ بڑے ہی منظم طریقے سے بڑی مستعدی سے آگ پر قابو پارہی تھی۔ محبوب اس المناک سانحے سے دہل گیا تھا۔ متاثرہ حاجیوں کو طبی امداد پہنچانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ ایسے وقت ماروی کو اور ان غباروں کو بھی بھول گیا تھا۔

جس ہوٹل میں انہوں نے قیام کیا تھا، ماروی نے اس ہوٹل کی چھت پر آکر دوربین سے دیکھا تھا۔ وہ غبارے پرواز سے محروم ہوکر آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان جاکر نظروں سے گم ہوگئے تھے۔

مراد اور نگارا خانم نے پہلے تو حاجیوں کے خیمے میں آگ لگنے کی المناک خبر سنی۔ پھر انٹرپول والوں نے اطلاع دی کہ ہر ہائی نس نے جن غباروں کو اُڑایا تھا، وہ خط سمیت آگ میں گر کر نابود ہوگئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مراد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ سے اُتر کر وہ واش روم میں جاکر زیرِلب شکر ادا کرتا ہوا وضو کرتا رہا۔ پھر خواب گاہ میں آکر دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کرنے لگا۔ اس نے پچھلی بار سجدے میں رہ کر

اپنے ربّ سے وعدہ کیا تھا کہ ماری کی ہوس نہیں کرے گا۔ طلاق کے بعد اس کی طلب کرنا سراسر شیطانی عشق ہے اور اس نے ایسی شیطانی چاہت سے توبہ کی تھی۔

سچے دل سے توبہ کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ ربّ کریم نے قبول کی تھی اور یہ تو وہی معبود وہی قادر مطلق جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس معبود نے یہ کیا تھا کہ جو محبت نامہ غلط تھا' اسے آگ میں جھونک دیا تھا۔ اب سے پہلے بھی اس نمازی کو کئی بار اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی رہی تھی۔

ان لمحات میں وہ دل کی گہرائیوں سے عبادت میں گم ہوگیا تھا۔ اس کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔ کتابِ زندگی سے ماروی کا باب ہمیشہ کے لیے خارج ہوگیا تھا۔ اس نے عبادت کے بعد سوچا کہ ماروی کو اطمینان حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس کی طلب سے باز آگیا ہے اور آئندہ بھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

اس نے فون پر سمیرا کو مخاطب کیا۔ وہ بولی۔ ''مراد! تمہیں ایک نئی دلہن اور بہت بڑی کامیابی مبارک ہو۔ اب ایک ریاست کے فرماں روا کو کوئی مجرم نہیں کہے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''شکریہ۔ تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ماروی کی طلب سے بھی باز آگیا ہوں۔ کیا تم محبوب کے ذریعے اسے یہ اطمینان دلاسکتی ہو کہ میں آئندہ اس کے راستے میں کبھی رکاوٹ نہیں بنوں گا۔''

''تمہارا پیغام کیسے پہنچاؤں؟ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''سمیرا...! تم ہی ایک ذریعہ ہو۔ کبھی تو محبوب تم سے رابطہ کرے گا۔ آخر تم اس کی شریکِ حیات ہو۔''

''ہاں، یہ امید ہے کہ ماروی سے نکاح پڑھانے کے بعد وہ مجھے کال کریں گے۔ میرے اندازے کے مطابق ماروی عدت کے ایام گزار چکی ہے اور وہ محبوب کے نکاح میں آگئی ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''خدا کرے' اس کی شادی خانہ آبادی ہو۔ وہ مسرتوں بھری زندگی گزارتی رہے۔ میں چاہتا ہوں' کسی طرح اسے میری طرف سے اطمینان ہوجائے۔ پھر وہ چھپ کر زندگی نہیں گزارے گی۔ میرا ضمیر مطمئن رہے گا۔''

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، جب بھی محبوب سے رابطہ ہوگا تو ماروی تک تمہاری نیک خواہشات ضرور پہنچاؤں گی۔''

سمیرا نے وعدہ کر کے فون بند کردیا۔ پھر خلا میں تکتے ہوئے زیرِلب بولی۔ ''ہائے محبوب! کہاں ہو تم؟''

وہ خانۂ کعبہ میں تھا۔ اس وقت ماروی سے اس کا نکاح پڑھایا جارہا تھا۔ نکاح کے فوراً بعد ہی اس نے دوزانو ہوکر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے ماروی کو پالینے کے لیے ایک بہت ہی طویل اور تھکا دینے والا سفر کیا تھا اور سفر کے دوران میں ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہا تھا۔ بار بار ناکام ہوتا رہا تھا۔ خانۂ کعبہ میں آکر اس کی ناکامیاں دور ہوئی تھیں اور دل کی مراد بھی پوری ہورہی تھی۔

اس نے ہوٹل کے کمرے میں رات گزاری۔ تمام رات اس کی قربت سے سحرزدہ سا رہا۔ اسے پاکر بھی سوچ رہا تھا، کیا میں نے پالیا ہے؟ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے؟ اب سے پہلے وہ اس سے محروم رہ کر اسے خوابوں اور خیالوں میں حاصل کرتا رہا تھا۔ دل توڑنے والی ناکامیوں کے بعد مشکل سے کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔ بہرحال اس کے حسین وجود کی حرارت صبح تک یقین دلاتی رہی کہ وہ جانِ جاں واقعی حاصل ہوچکی ہے۔ آئندہ اس کی رگِ جاں کے قریب رہنے والی ہے۔

دوسرے دن ماروی نے کہا۔ ''میں خانۂ کعبہ میں عبادت کے دوران سوچتی رہی کہ مجھے سمیرا کو سوتن کی حیثیت سے برداشت کرنا چاہیے۔ میں اس کے جائز حقوق چھین کر اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کروں گی۔''

وہ بولا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ تم مثبت انداز میں سوچ رہی ہو۔ یہ وہ مقدس مقام ہے' جہاں کسی کو نقصان پہنچانے والی غلط باتیں ذہن میں نہیں آتی ہیں۔ اگر آتی ہیں تو فوراً ہی اللہ کا خوف طاری ہوجاتا ہے۔ خانۂ کعبہ میں ربِّ کریم ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے۔''

''آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ ہم دونوں کے برابر حقوق کیسے ادا کریں گے؟ دونوں کے ساتھ کیسے زندگی گزاریں گے؟ میں کراچی نہیں جاؤں گی۔ آئندہ سمیرا کی طرح بزنس فیلڈ میں رہنے کے لیے لندن میں تعلیم و تربیت حاصل کرتی رہوں گی۔''

''یہ اچھی بات ہے۔ بزنس کو قائم و دائم رکھنے کے لیے تم سمیرا کی طرح میرا دوسرا بازو بن جاؤ گی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دلہن بنانے کے بعد اس سے ملاقات کروں گا۔''

''میں اس سے نہیں ملوں گی۔ پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی پھر آپ کے ساتھ کراچی جاکر رہوں گی۔ فی الحال آپ اس سے کسی دوسرے ملک میں ملاقات کریں۔''

''میں اتنی جلدی تم سے جدا نہیں ہونا چاہوں گا۔ کیا تم مجھ سے دور ہونا چاہو گی؟''

''کبھی نہیں لیکن آپ اس کے پاس جا کر کچھ روز رہ کر آ سکتے ہیں۔ اس دوران سوچتے رہیں۔ فیصلہ کرتے رہیں کہ دونوں کو برابر وقت کیسے دے سکیں گے؟''

اس نے فون اٹھا کر سمیرا سے رابطہ کیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''خدا کا شکر ہے میں آپ کو یاد آ رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''تمہارے لہجے میں طنز ہے جبکہ میں نے کہہ دیا تھا کہ ماروی سے نکاح پڑھانے کے بعد ہی تمہیں کال کروں گا۔''

وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ''انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ ابھی کال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے منکوحہ بنا چکے ہیں؟''

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ یہ میری شریکِ حیات بن چکی ہے۔ آخر میں نے اپنی منزل پالی ہے۔''

''آپ بہت ہی مستقل مزاج ہیں۔ اپنی دُھن کے پکے ہیں۔ آخر اپنی ضد پوری کرلی۔ کل ریاست باب النساء کے فرماں روا مراد علی منگی نے مجھ سے فون پر باتیں کی تھیں۔''

''تم طنزیہ انداز میں اسے ایک ریاست کا فرماں روا کہہ رہی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''اور کیا کہوں...؟ ایک معمولی گدھا گاڑی والا ایک ملکہ کے کاندھے پر سوار ہو کر ریاست کا حکمران بن گیا ہے۔ دوسری گوٹھ کے کچے مکان میں رہنے والی' ارب پتی سرمایہ دار کی دلہن رانی بن گئی ہے۔''

''پہلے تو تم ایسے طنزیہ انداز میں نہیں بولتی تھیں۔ تمہارا مزاج بدل گیا ہے۔''

''عورت کا مزاج کیسے بدلتا ہے' یہ ماروی سے پوچھیں۔ جب مرینہ اس کی سوتن بننے والی تھی، تب وہ کیسے آگ بگولا ہو کر مراد کو چھوڑ کر سمندر پار سے چلی آئی تھی۔ اِس وقت میرے اندر ایسی ہی آگ لگی ہے۔ پلیز ایک گھنٹے بعد مجھ سے بات کریں۔ میں ابھی کچھ بولنے کے قابل نہیں ہوں۔''

فون پر اس کے رونے سسکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی وہاں قریب ہی بیٹھی تھی، اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نہیں ہوتی... کیا کیا جائے؟ کسی عورت سے بھی سوتن برداشت نہیں ہوتی۔ میں اس کی حالت کو اس کے مزاج کو اور میرے خلاف اس کے غصے کو سمجھ رہی ہوں۔ آپ ہمیں ایک کشتی پر سوار کرانا چاہیں گے۔ ہم دو الگ کشتیوں پر رہا کریں گے۔ آپ ایک پاؤں ایک کشتی پر اور دوسرا پاؤں دوسری کشتی پر رکھ کر سفر کریں گے تو ڈوب جائیں گے۔ میں ہر ایک سے نباہ کر لیتی ہوں لیکن سمیرا کی سوتن بننے سے پہلے ہی اس کی فطرت کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ میں نے بارہا اس کے ساتھ نیکیاں کیں۔ اس نے تسلیم بھی کیا لیکن کسی وقت بھی خود کو کمتر ہوتے دیکھ کر میری نیکیوں کو بھول کر دشمن بن جاتی ہے۔ ایسی سوتن بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ میں اس سے دور رہا کروں گی۔''

''میں تو تمہارے ایک اشارے پر اسے طلاق دے سکتا ہوں۔ لیکن تم کہتی ہو، یہ ایک سہاگن کے ساتھ ظلم ہوگا۔ پھر بولو میں کیا کروں؟''

''دو چار برس انتظار کریں۔ صبر کریں، تب تک میں آپ کے بزنس کو اچھی طرح سمجھتی رہوں گی۔ آپ مجھے سمجھاتے رہیں گے۔ میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈپلوما حاصل کرلوں گی۔ پھر میں کسی پہلو سے بھی سمیرا سے کمتر نہیں رہوں گی۔ کبھی دو سوتنوں کے جھگڑوں میں آپ کے بزنس کو ڈوبنے نہیں دوں گی۔ کوشش کروں گی کہ ہم تینوں کی ازدواجی زندگی نارمل رہے۔''

''ویری نائس آف یو۔ اس طرح میں دو سوتنوں کے درمیان الجھتا نہیں رہوں گا۔ تمہیں کاروباری معاملات میں ٹریننگ بھی دیتا رہوں گا۔ میں اپنی ہی پروڈکشنز کا لندن میں سول ڈسٹری بیوٹر ہوں۔ میری وہ سول ایجنسی تم سنبھالتی رہو گی۔''

سمیرا نے ایک گھنٹے سے پہلے ہی کال کی اور کہا۔ ''میں بہت الجھی ہوئی ہوں۔ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ آپ ماروی کے معاملے میں ہمیشہ کی طرح ناکام رہیں گے لیکن اس اچانک کامیابی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اب یہ امید بھی نہیں رہی کہ مراد ہمیشہ کی طرح آپ کے راستے کا پتھر بن جائے گا۔''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اس نے کل ہی مجھ سے فون پر کہا ہے کہ وہ آئندہ کبھی آپ کے اور ماروی کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔ کبھی ماروی کی طلب نہیں کرے گا۔''

محبوب نے کہا۔ ''مجھے مراد کا نمبر دو۔ میں اس سے بات کروں گا۔''

''ابھی اس کا نمبر send کروں گی۔ پہلے آپ

سے اپنی ازدواجی زندگی کے حقوق چاہتی ہوں۔ میرا جائز مطالبہ یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہا کریں۔"

"ایک سوتن کی موجودگی میں یہ مطالبہ جائز نہیں ہے۔ میں دونوں سے انصاف کروں گا۔ دونوں کے ساتھ رہوں گا۔ اس سلسلے میں میرا طریقہ کار کیا ہوگا' یہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر تمہیں بتاؤں گا۔"

"آپ میرے پاس کب آرہے ہیں؟"

"ایک ماہ تک ہنی مون منانے کے بعد تم سے کہیں ملوں گا۔ ابھی مراد کا نمبر send کرو۔"

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ سمیرا نے اچانک خاموش ہوجانے والے فون کو دیکھا۔ معروف تجلی سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہا ہے؟"

وہ جھنجلا کر بولی۔ "میری تو کوئی ویلیو ہی نہیں رہی۔ وہ ایک ماہ بعد آنے کو کہہ رہے ہیں۔"

"خود کو سنبھالو۔ وہ نئی دلہن ہے۔ تمہارا غصہ اور جھنجلاہٹ بے جا ہوگی۔ اسے ایک ماہ اس کے ساتھ گزارنے دو۔ ذرا صبر کرو۔"

"کیسے صبر کروں؟ میری میڈیکل رپورٹ آگئی ہے۔ میں ماں بن سکتی ہوں۔ اب میں سوتن کو محبوب پر حاوی نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے اپنی اولاد کے لیے ابھی سے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"تم کروگی۔ اپنی اولاد کے لیے بہت کچھ کروگی لیکن جلد بازی سے نقصان اٹھاؤ گی۔ آج فون پر اس کے ساتھ تمہارا رویہ بدل گیا تھا۔ لہجہ بدل گیا تھا۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ تمہاری طرف سے محتاط ہوگیا ہوگا۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔ "میں اپنی ہونے والی اولاد کی خاطر تھوڑی سی بے ایمانی کروں گی۔"

"کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"اگر آپ میرا ساتھ دیں گے تو پھر کروڑوں روپے کی ہیرا پھیری کروں گی اور چوری چھپے اپنے نام سے جائداد بناؤں گی۔"

"نہیں سمیرا......! دل میں بے ایمانی نہ لاؤ۔"

"یہ بے ایمانی نہیں ہوگی۔ میں تو محبوب کی اولاد کے لیے ہی خفیہ جائداد بناؤں گی۔"

"تم محبوب کو دھوکے میں رکھ کر جو کروگی، وہ سراسر بے ایمانی ہوگی۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"آپ نے پہلے کئی بار محبوب کو دھوکا دینے کی بات کی ہے۔"

"کوئی مثال دو کہ میں نے ایسا کیا ہے؟"

"آپ نے کہا تھا کہ ہم محبوب کے تمام بینکس اکاؤنٹ کو فریز کرادیں گے۔ وہ کسی بھی بینک اکاؤنٹ سے ایک روپیا بھی نہیں نکال سکے گا۔ کیا محبوب کو اس کے کروڑوں ڈالرز سے محروم کردینا بے ایمانی نہیں ہے؟"

"بے ایمانی تب ہوتی، جب ہم اس کے کسی اکاؤنٹ سے ایک ڈالر بھی اپنے لیے نکالتے۔ وہ تو محبوب کو یہاں واپس لانے کی ایک چال تھی۔ میں نے ہمیشہ کسی نہ کسی چالبازی سے اسے بزنس میں واپس لانا چاہا ہے۔ میں نے ماروی کی ہلاکت کا منصوبہ بنایا تھا۔ محبوب کی لاعلمی میں اسے ختم کردینا چاہتا تھا۔ میری نمک حلالی کا تقاضا ہے کہ کسی بھی قیمت پر بزنس کو تباہی سے بچاؤں اور محبوب کو اس فیلڈ میں واپس لاؤں۔ ماروی سے میری نہ دشمنی ہے نہ دوستی ہے۔ تم سے دوستی اور محبت ہے۔ تمہیں اس لیے بیٹی کہتا ہوں کہ نہایت دیانت داری سے اور مکمل ذمے داریوں سے کاروبار کو سنبھال رہی ہو۔ آئندہ کسی بھی وجہ سے محبوب کے کاروبار میں ہیرا پھیری کروگی، چوری چوری اپنے نام جائداد بناؤ گی تو مجھے دشمن بننے میں ایک ذرا دیر نہیں لگے گی۔ جب مراد جیل میں تھا، تب میں نے محبوب کی بہتری کے لیے اسے بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہا تھا۔ میرا خیال تھا، وہ مرجائے گا تو ماروی محبوب کی ہوجائے گی۔ وہ پھر بزنس کی طرف دھیان دینے لگے گا۔ میں اسے اپنے کاروبار کی حدود میں رکھنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ میں نے کسی بھی چالبازی اور ہیرا پھیری سے بھی کسی طرح کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر ضرور اسے کسی دن کاروبار میں واپس لے آؤں گا۔ تمہیں بھی یہی بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ اگر اپنی جائداد بنانے کی اور محبوب سے بے ایمانی کی بات کروگی تو میں تمہیں بیٹی نہیں کہوں گا۔ دشمن بن جاؤں گا۔"

سمیرا نے سر جھکا لیا۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ اسے معروف تجلی کی طرح دیانت داری کی حدود میں رہ کر ماروی کے مقابلے میں محبوب کو جیتنا ہوگا۔ اس نے محبوب کو مراد کا نمبر send کیا اور میسیج میں لکھا۔ "یہ ایک ماہ میرے لیے پہاڑ ہے۔ لیکن مجازی خدا کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کال تو کرسکتی ہوں۔"

محبوب نے میسیج کے ذریعے کہا۔ "بے شک کرسکتی ہو۔ میں تمہارے تمام جائز حقوق تسلیم کرتا رہوں گا۔"

پھر اس نے مراد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...... کون؟''

''میں ہوں محبوب۔ کیا مجھ سے بات کرنا چاہو گے؟''

وہ چونک کر خوش ہو کر بولا۔ ''محبوب صاحب...! آپ ہیں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی خوشی حاصل ہو رہی ہے، میں بیان نہیں کر سکتا۔''

محبوب نے کہا۔ ''میں تمہاری خوشی دیکھ کر باغ باغ ہو رہا ہوں۔ حیران ہو رہا ہوں کہ تمہارے دل میں اب میرے خلاف کوئی میل نہیں ہے۔ کیا واقعی تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے؟''

''جب سے رقابت کی آگ میرے اندر ٹھنڈی ہوئی ہے، تب سے مجھے اپنی غلطیاں معلوم ہو رہی ہیں۔ میں ایک معمولی گدھا گاڑی والا تھا۔ آپ نے میرا ہاتھ تھام کر عزت دی تھی۔ مجھے ایک اور محبوب علی چانڈیو بنانے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے تھے۔ میں جیل چلا گیا تو آپ میرا مقدمہ لڑتے رہے۔ میری غیر موجودگی میں ماروی کو تحفظ دیتے رہے۔ آپ نے اس کی عزت آبرو پر آنچ نہیں آنے دی۔ میں اندھی رقابت میں آپ کا دشمن بن گیا۔ تب بھی آپ ماروی کے محافظ بن کر رہے۔ آپ میرے بدترین حالات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میرے خلاف ماروی کے دماغ میں زہر گھول سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اسے حاصل کرنے کے لیے کسی طرح کی جاہلانہ دشمنی نہیں کی۔ اللہ دیر سے انعام دیتا ہے لیکن دیتا ضرور ہے۔ آپ کو انعام مل رہا ہے اور مجھے سبق حاصل ہو رہا ہے کہ میں نے عطائے ربِّ جلیل کی قدر نہیں کی۔ اس لیے وہ مجھ سے چھین لی گئی۔ میں نے بڑی غلطیاں کی ہیں۔ یہ نمازیں ہیں جو مجھے سزاؤں سے بچا رہی ہیں اور صراطِ مستقیم پر چلا رہی ہیں اور سیدھا راستہ یہی ہے کہ میں آپ کی قدر کرتا رہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''اللہ تمہیں اور نیکیاں دے اور تمہاری تعمیری سوچ کو جلا بخشے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر بدل جاؤ گے۔ ایک ریاست کے حکمران ہو کر مجھے برتر اور خود کو کمتر کہہ رہے ہو۔ ایسی عاجزی وانکساری صرف ایمان والوں میں ہی ہوتی ہے۔ اللہ تمہارے ایمان کو اور زیادہ استحکام عطا فرمائے۔''

مراد نے کہا۔ ''آمین......!''

ماروی بند کمرے میں محبوب سے لگی بیٹھی تھی۔ مراد کی باتیں سن کر دل کو اطمینان ہو رہا تھا۔ یہ خوشی مل رہی تھی کہ نمازوں نے اب صحیح معنوں میں اسے دین دار بنا دیا ہے۔

مراد نے کہا۔ ''محبوب صاحب! ہم بہت عرصے تک بھٹکتے رہے بھٹکتے رہے۔ ہمیں اپنے چہرے بدلنے پڑے۔ میں تو مجرم کہلا رہا تھا۔ میں روپوش رہنے کے لیے چہرے بدل رہا تھا لیکن میری وجہ سے آپ نے بھی چہرہ تبدیل کیا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی مجھے مجرم نہیں کہہ سکے گا۔ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے بغیر ہر ہائی نس نگارا خانم کے شوہر کو عدالت بھی مجرم نہیں کہے گی۔ لہٰذا میں پھر سے اپنے پیدائشی چہرے کی طرف واپس آنے والا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''بے شک۔ اب دنیا کی کوئی عدالت تمہیں مجرم نہیں کہے گی۔ تم اپنے اصلی چہرے کے ساتھ جس ملک میں جاؤ گے، وہاں قانون کے محافظ تمہیں سیلوٹ کریں گے اور تمہیں حکومتی سطح پر پروٹوکول دیا جائے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''میرا یہ مشورہ ہے کہ آپ بھی اصلی چہرے کی طرف واپس آ جائیں۔ اب میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے رہوں گا تو کوئی آپ کو ایک مجرم مراد علی منگی نہیں کہے گا۔''

''درست کہتے ہو۔ میں آئندہ اپنے پیدائشی چہرے کے ساتھ رہ سکوں گا۔ ہم دونوں کی پہلی جیسی شخصیت اور پہلے جیسے دن لوٹ کر آ رہے ہیں۔''

ماروی سن رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ جب فون سے رابطہ ختم ہو گیا تو اس نے کہا۔ ''آپ کے اصلی چہرے والی پرسنالٹی بہت ہی رعب اور دبدبے والی ہوتی ہے۔ آپ کی وہ صورت اور شخصیت بہت ہی متاثر کرتی ہے۔''

''اور ماروی کا حسن بھی لوٹ کر آنے والا ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''ابھی نہیں۔ میں ماروی بن جاؤں گی تو نمرہ عالم بن کر اس فیملی میں نہیں رہ سکوں گی۔ مجھے مکمل تعلیم و تربیت حاصل کرنے تک لندن میں اسی فیملی کے ساتھ رہنا ہو گا۔ جب آپ کے بزنس کو پوری مہارت سے ہینڈل کرنے کے قابل ہو جاؤں گی تو ماروی بن کر کراچی جاؤں گی۔''

اب نئے منصوبے بننے والے تھے۔ ایک نئی کہانی شروع ہونے والی تھی۔ جب تک پھول پوری طرح کھلا رہے، تب تک وہ خوشبو لٹاتا رہتا ہے اور خوشبو ہوا کے رحم و کرم پر رہتی ہے۔ جدھر ہوا لے جائے اُدھر جاتی ہے اور ہوا کا رُخ بدلتا رہتا ہے۔ ابھی وہ نہیں جانتے تھے کہ نئے منصوبوں کے نتائج کیا ہوں گے۔

☆☆☆

قلندر شاہ نے ملکہ عالیہ سے ملاقات کرنے کی درخواست لکھ کر بھیجی تھی۔ اسے شاہی محل سے جواب موصول ہوا تھا کہ ہر ہائی نس بہت مصروف ہیں۔ پھر کسی وقت اسے طلب کریں گی۔ وہ بڑے صبر سے انتظار کر رہا تھا۔ اکثر گھومتا پھرتا ہوا سرحدی علاقے کی طرف چلا جاتا تھا۔ مراد کو بھی گولی مارنے کے بعد فرار ہونے کے راستے ذہن نشین کرتا رہتا تھا۔ وہ ہر روز مراد کو محل سے آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے پھر کئی گھنٹوں کے بعد وہاں سے واپس آتے دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی کیونکہ وہ کلرڈ شیشوں والی کار میں ہوتا تھا اور اس کے آگے پیچھے درجنوں مسلح گارڈز کی گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ جرمنی سے پلاسٹک سرجری کے ایک ماہر کو طلب کیا گیا تھا۔ مراد نے محبوب سے فون پر کہا تھا کہ اپنے اصلی چہرے کی کئی تصاویر send کرے۔ اس طرح پیدائشی چہرے کی تصاویر ملنے کے بعد ماہر نے اس کا پہلا چہرہ اسے لوٹا دیا تھا۔

دوسرے دن اس نے ریاستی ٹی وی چینل سے دوستوں اور بے شمار دشمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ دشمنوں نے مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کر کے ایک قابلِ گرفت مجرم کے طور پر مشہور کر دیا تھا۔ مجھے مجبور ہو کر چہرہ بدل کر روپوش رہنا پڑا تھا۔ آج میں مجبور نہیں ہوں۔ مجھ پر الزامات عائد کرنے والوں کو عالمی عدالت میں چیلنج کرتا ہوں۔ وہ آئیں اور میرے کسی چھوٹے سے جرم کا بھی کوئی ثبوت پیش کریں۔ میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سب کے سامنے ہوں۔ ہماری دنیا میں بعض لوگ حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے کے ہم شکل ہوتے ہیں یا ایک دوسرے سے بڑی حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے شہر کراچی میں میرا ایک مہربان اور محسن ہے۔ اس کا نام محبوب علی چانڈیو ہے۔۔۔ وہ ہو بہو میری صورت کا حامل ہے یا میں اس کی صورت لے کر پیدا ہوا ہوں۔ اس نیک اور مہربان ہم شکل نے میری وجہ سے ہمیشہ ہی بڑی پریشانیوں کا سامنا کیا ہے۔ میرے دشمن اسے مراد علی منگی سمجھتے رہے ہیں۔ میں دشمنی کرنے والوں سے کہتا ہوں کہ اس فرشتہ صفت انسان کو مراد سمجھ کر پریشان نہ کریں۔ میں مراد علی منگی ایک طویل عرصے تک اس ریاست میں رہوں گا۔ یہاں سے کسی دوسرے ملک میں جاؤں گا تو اخبارات و ٹی وی چینلز کے ذریعے دنیا کو معلوم ہوتا رہے گا کہ میں کہاں ہوں اور میرا ہم شکل کہاں ہے۔ میرے وہ دشمن جو یہاں پُرامن شہری کی طرح رہتے ہیں اور بڑی رازداری سے میرے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ انہیں آخری بار سمجھاتا ہوں کہ چپ چاپ میری ریاست سے نکل جائیں ورنہ یہاں رہنا اور سازشیں کرنا انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔''

قلندر شاہ اس کی باتیں سن کر زیرِلب بڑبڑا رہا تھا۔

''تجھے شاہی محل میں رہنا مہنگا پڑے گا۔ ہزاروں گارڈز کے درمیان رہ کر سمجھ رہا ہے' موت نہیں آئے گی۔ آج تک خوش قسمتی سے بچتا آیا ہے۔ خوش فہمی میں رہ کر بھول رہا ہے کہ بدقسمتی اچانک شب خون مار سکتی ہے۔'' قلندر شاہ ایسے بول رہا تھا جیسے بادل گرج رہے ہوں اور یہ بادلوں کی خاصیت ہوتی ہے۔ وہ برسیں یا نہ برسیں' گرجتے ضرور ہیں۔

بلے کو وہاں کے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت ملی تھی۔ وہ وہاں ریکارڈ کیپر تھا۔ دوسرے شعبوں کی طرح وہاں بھی خواتین اعلیٰ عہدوں پر تھیں اور معمولی ملازمہ بھی تھیں۔ اچھے مزاج کی حامل بھی تھیں اور تنک چڑھی بھی تھیں۔ بلے نے دو دنوں میں انٹیلی جنس کی چیف لیلیٰ فردوس کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ پہلے تو اس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ''تم کون ہو؟ تم نے انڈیا سے یہاں آتے ہی اتنے اہم ڈیپارٹمنٹ میں ایک اہم عہدہ حاصل کر لیا ہے۔ تمہارے پیچھے کسی نے زبردست سفارش کی ہے۔ کسی ملک کا سفارت خانہ تمہاری پشت پر ہے یا انٹر پول اور انٹرنیشنل سی آئی اے سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میڈم! میرا صرف خدا سے تعلق ہے۔ میں اپنی صلاحیتوں کے بل پر یہاں آیا ہوں۔''

''میں نہیں مانتی۔''

''تو پھر اوپر والوں سے میری شکایت کریں اور مجھے ملازمت سے نکلوا دیں۔''

وہ اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے' تم کوئی خاص آدمی ہو۔ میرا مطلب ہے' بہت گہرے ہو۔''

''میں شاید گہرے سے بھی زیادہ گہرا ہوں۔ میرے بارے میں زیادہ سوچو گی تو تھک جاؤ گی۔''

''مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہارے بارے میں سوچوں۔''

وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ اسی رات اس نے فون پر اسے مخاطب کیا اور حکم دیا۔ ''فائل نمبر سی آئی تھری لے کر ابھی میرے بنگلے میں آؤ۔''

وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک بنگلے میں رہتی تھی۔ دبئی قوانین کے مطابق وہاں کسی جوان عورت کو شادی کے بغیر تنہا

رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیلیٰ فردوس کسی ایک شوہر کی جکڑ بندی میں رہنا نہیں چاہتی تھی لیکن قانون کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ اس ریاست میں عورتوں کو بھرپور آزادی تھی لیکن گناہوں کے تمام راستے بند کردیے گئے۔ کوئی بھی عورت اپنے شوہر یا باپ یا سگے بھائی کے بغیر راستوں اور بازاروں میں دیکھی جاتی تو اسے اس نامحرم کے ساتھ کوڑے مارے جاتے تھے۔ وہ سب اپنے اہم شناختی کاغذات اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

اسی طرح مردوں کی بھی قدر کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ ہزار پابندیوں کے باوجود گناہ کرنے والے چھپ کر منہ کالا کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیلیٰ فردوس نے ایک غیر ملکی سفارت خانے کے ایک سیکریٹری سے دل لگایا تھا۔ وہ عیسائی تھا۔ اس نے سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق اسلام قبول کیا تھا۔ لیلیٰ اس سے شادی کرکے اسے اپنا نمائشی شوہر بنا کر اس کے ساتھ اسی بنگلے میں رہتی تھی اور اس ملک کے لیے اپنی ریاست کے خلاف کام کررہی تھی۔

وہ بنگلے کے سامنے پہنچا تو لیلیٰ کے خاوند نے دروازہ کھول کر اس کا استقبال کیا۔ یہ جتانا ضروری تھا کہ وہ کسی اکیلی عورت سے ملنے نہیں آیا ہے۔ اس کا شوہر بنگلے میں موجود ہے لیکن وہ نام نہاد شوہر اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہاں سے گیا تو پھر اس کی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے حسن و شباب کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ آئی۔ اس نے ایسا مختصر سا چست لباس پہنا تھا کہ بدن کے ظالم نشیب و فراز دور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بے باکی اور بے حیائی نے بتا دیا کہ وہ بلّے سے کیا چاہتی ہے۔

وہ ایک ہی صوفے پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس ریاست میں بڑی پابندیاں ہیں۔ یہ باہر پورا لباس پہن کر نکلنا پڑتا ہے۔ عبا پہنو یا نہ پہنو، بدن کہیں سے نہ جھلکے۔ لباس چست نہ ہو۔ ڈھیلا ہو۔ صرف دو ہاتھ اور پاؤں نظر آئیں۔ چہرہ نقاب میں ہو۔“

وہ ذرا تن کر بولی۔ ”سچ بولو۔ یہ لباس کیسا لگ رہا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”تم دیکھ رہی ہو کہ میں تمہیں نہیں دیکھ رہا ہوں، ڈر لگتا ہے کہ دیکھتے ہی اندھا ہو جاؤں گا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ”کیا مولوی ہو؟“

وہ فائل کو سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری مطلوبہ فائل ہے۔ مجھے اجازت دو۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”رک جاؤ۔ میری اجازت کے بغیر جاؤ گے تو بری طرح پھنسو گے۔“

بلّے نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”یہ ثابت نہیں کرسکو گے کہ تم نے مجھے یہ فائل لاکر دی ہے۔ یہ موسٹ کانفیڈنشل فائل ہے۔ کل ڈیوٹی پر پہنچو گے تو تم پر اس فائل کی چوری کا الزام آئے گا۔“

وہ بولا۔ ”تم ہمارے ادارے کی چیف ہو۔ میں تمہارے حکم پر عمل کرتے ہوئے اسے ریکارڈ روم سے باہر لایا ہوں۔“

”بے شک میں تمہاری حمایت میں بولوں گی لیکن کیسے بولوں گی۔ یہ معلوم کرنے کے لیے میرے بیڈروم میں آؤ۔“

وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ”میں انتظار کروں گی۔ یہاں بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لو۔“

وہ چلی گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ کا خیال تھا کہ وہ اسے مجبور اور بے بس بنا کر آئی ہے جبکہ وہ مجبور نہیں تھا۔ اس کے پاس ایسا فون تھا جس میں بولنے والوں کی باتیں ریکارڈ ہو جاتی ہیں۔ لیلیٰ نے اسے فون پر وہ فائل لانے کو کہا تھا۔ اس کی آواز اور اس کا حکم اس میں ریکارڈ ہو چکا تھا۔

وہ اپنی چیف آفیسر کی ہوس پرستی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسی وقت ہلکی سی میسج ٹون سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ صوفے پر لیلیٰ فردوس کا فون پڑا ہوا تھا۔ وہ اسے وہاں سے اٹھانا بھول گئی تھی۔

بلّے نے ایک بٹن کو دبایا تو ننھی سی اسکرین پر لکھا تھا۔ ”کیا فائل مل گئی؟“

اس میسج نے بلّے کو چونکا دیا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا کیا کرے؟ اس فائل کی ضرورت کسی اور کو تھی۔ اس نے فوراً ہی حاضر دماغی سے کام لیا۔ اس میسج کا جواب لکھا۔ ”مل گئی۔ اب کیا کروں؟“

اس نے میسج کو send کیا پھر بے چینی سے انتظار کرنے کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ لیلیٰ آجائے گی۔ وہ مطمئن ہو کر گئی تھی کہ ایک گبرو جوان پھنس گیا ہے۔ وہ اپنی اور ملازمت کی سلامتی کے لیے بیڈروم میں ضرور آئے گا۔

جواب آ گیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ ”کرنا کیا ہے۔ فوراً پوری فائل کی فوٹو کاپی کراؤ۔ رونالڈ انہیں سفارت خانے میں پہنچا دے گا۔“

اس نے جواباً لکھا۔ ”او کے، ابھی پوری فائل کی فوٹو کاپی ہو جائے گی۔“

اس نے میسج کو send کرنے کے بعد لیلیٰ کے فون

کو جیب میں رکھا۔ پھر اپنے فون پر بولا۔ ''ہیلو مراد! اس ریاست کے خلاف دو سازش کرنے والے ثبوت کے ساتھ میری نظروں میں ہیں۔ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کی چیف لیلیٰ فردوس کے بنگلے پر ابھی اسی وقت خفیہ فورس کو بھیجو۔ میں یہاں موجود ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''سیکریٹ فورس کے بندے پندرہ منٹ میں پہنچیں گے۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے لیلیٰ کے فون کو جیب سے نکال کر اس کے سوئچ کو آف کیا۔ پھر اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ لیلیٰ اپنی خواب گاہ میں آکر بڑے ہی مستی بھرے انداز میں بیڈ پر چاروں شانے چت ہوگئی تھی۔ بڑے انتظار کے بعد ایک آئیڈیل مرد ہاتھ لگا تھا۔ اس ریاست میں کسی سے یاری دوستی کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے ناممکن کو ممکن کر رہی تھی۔ اس پر ہوس اتنی غالب آگئی تھی کہ وہ اپنا فون ہی بھول گئی تھی۔ ان لمحات میں وہ اس کے لیے غیر ضروری تھا۔

پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے بیڈروم سے نکل کر دوسرے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر بولی۔ ''رونالڈ! دیکھو کون آیا ہے۔ میں اس لباس میں کسی کے سامنے نہیں جاسکوں گی۔''

ادھر بلّے نے دروازہ کھول دیا تھا۔ چار مسلح افراد نے کمرے میں آتے ہی اسے سیلوٹ کیا۔ پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے بیڈروم کی طرف آئے۔ وہاں لیلیٰ اپنے بناسپتی شوہر رونالڈ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مختصر سے شرمناک لباس میں تھی۔ چیخ مارتی ہوئی اپنے بیڈروم میں جانا چاہتی تھی۔ بلّے نے راستہ روک کر سیکریٹ فورس کے افسر سے کہا۔ ''اس کی تصویریں لو۔''

وہ شرم سے چھپنا چاہتی تھی۔ افسر نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ فلیش لائٹس بار بار بجلی کی طرح چمک کر بجھ رہی تھیں۔ بلّا بیڈروم کے اندر جاکر وہ اہم فائل لے آیا۔ وہ انٹیلی جنس کی بہت بڑی چیف سمجھ گئی تھی کہ اسے قانونی گرفت میں لیا جارہا ہے اور بلّا ان کا ایک افسر ہے۔

وہ بولی۔ ''کوئی یہ ثابت نہیں کرسکے گا کہ میں نے یہ فائل اپنے بنگلے میں منگوائی تھی۔ یہ سلمان فراڈ ہے۔ میرے خلاف چالیں......''

افسر نے ایک اُلٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ ایک ہاتھ کھاتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ افسر نے پوچھا۔ ''سر! کیا حکم ہے؟''

بلّے نے کہا۔ ''تھرڈ ڈگری......''

ایک گھنٹے بعد لیلیٰ اور رونالڈ ایک ٹارچ سیل کے دو الگ کمروں میں تھے۔ ایک کمرے میں وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر ایک مائیک لٹکا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک بات ریکارڈ کی جانے والی تھی۔ اس کے سامنے اور دائیں بائیں تین مووی کیمرے تھے۔ اس کی متحرک ویڈیو فلم تیار... کی جانے والی تھی۔ وہاں کی دیواریں سیاہ تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت بڑی قبر میں آگئی ہو۔ آس پاس ایذا رسانی کے ایسے ایسے آلات رکھے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر وہ خوف سے لرز رہی تھی۔ وہاں سیکریٹ فورس کا افسر اور چند مسلح سپاہی تھے۔ بلّے نے لیلیٰ کے پاس آکر اس کا فون آن کر کے کہا۔ ''جب میں تمہارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا، تب ایک میسیج آیا تھا۔ اسے پڑھو۔''

اس نے بٹن دبایا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ ''کیا فائل مل گئی؟''

لیلیٰ فردوس کی آنکھیں حیرانی سے اور خوف سے پھیل گئیں۔ بلّے نے فون کو آپریٹ کیا۔ پھر اس سے کہا۔ ''تم نے اس میسیج کا یہ جواب دیا ہے۔ اسے پڑھو۔''

اسکرین پر لکھا تھا۔ ''مل گئی۔ اب کیا کروں؟''

وہ چیخ پڑی۔ ''نہیں، میں نے نہ میسیج پڑھا تھا، نہ یہ جواب لکھا تھا۔''

وہ بولا۔ ''یہ تمہارا فون ہے دنیا کہے گی، عدالت کہے گی کہ تم ہی نے جواب لکھا ہے۔ کم آن آگے پڑھو۔ یہ تمہارے میسیج کا جواب ہے۔''

لیلیٰ نے پڑھا۔ وہاں لکھا تھا۔ ''کرنا کیا ہے۔ فوراً پوری فائل کی فوٹو کاپی کراؤ۔ رونالڈ انہیں سفارت خانے میں پہنچادے گا۔''

وہ رونے لگی۔ آگے پڑھنے لگی۔ ''اس نے لکھا تھا۔ ''او کے ابھی پوری فائل کی فوٹو کاپی ہوجائے گی۔''

بلّے نے فون کا سوئچ آف کر کے کہا۔ ''تمہیں کسی نے ہدایت دی ہے کہ فائل کی فوٹو کاپی سفارت خانے میں پہنچائی جائے۔ فوراً بولو، وہ کون ہے؟ جس کے ہاتھوں میں تم لوگوں کی ڈور ہے اور تم سب اس کے اشارے پر ناچ رہے ہو؟''

وہ ٹھوس ثبوت کے ساتھ پھنس گئی تھی۔ اس ٹارچ سیل میں اذیتیں برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے معاف کردو۔ میں اپنی ریاست کی وفادار بن کر رہوں گی۔''

''ریاست کی وفادار ہو تو بولو، کون ہماری ریاست

کے اہم خفیہ راز معلوم کرنا چاہتا ہے؟''

وہ شکست خوردہ ہو کر بولی۔ ''وہ ایک ملک کا وزیرِ خارجہ ہے۔''

''تمہارے اور رونالڈ کے علاوہ اس کے اور کتنے جاسوس ہیں؟''

''اور کوئی نہیں ہے۔ اگر ہوگا تو میں نہیں جانتی۔''

''ابھی وزیر خارجہ کو اپنے فون سے کال کرو۔ اسے بولو کہ فائل کی فوٹو کاپی ہوگئی ہے اور ایک بات... تم کہو گی کہ اتنی اہم کانفیڈنشل فائل کو ان کے پاس پہنچا کر بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہو۔ وہ اس کے عوض تمہیں کتنی رقم دیں گے؟ اور وہ رقم کہاں ادا کریں گے؟''

''فرینکفرٹ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ کل تک اس اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ ڈالرز جمع کر دیے جائیں گے۔''

''تم ابھی فون پر پیمنٹ کے سلسلے میں باتیں کرو گی۔''

سیکریٹ فورس کے افسر نے فوراً فون کالز کو ٹیپ کرنے کے انتظامات کیے۔ پھر بلّے نے وہ فون لیلیٰ کو دیا۔ اس کے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔ وہ رابطہ کرنے کے بعد انتظار کرنے لگی۔ اس حد تک رابطہ ہوگیا تھا کہ وزیر صاحب تک گھنٹی پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید نیند میں تھا۔ بڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ''او گاڈ لیلیٰ! اتنی رات کو نیند خراب کر رہی ہو۔ ابھی اطلاع دینا کیا ضروری تھا۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم پوری فائل کی فوٹو کاپی کرا چکی ہو۔''

وہ بولی۔ ''جی ہاں۔ میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ میرا کام کب ہوگا؟ رقم کب ملے گی؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ کل ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ ڈالرز جمع ہو جائیں گے۔ تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس لیے نیند خراب کرنے پر ناراض نہیں ہوں۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔''

بلّے نے لیلیٰ سے فون لے کر کہا۔ ''اس نے تو نیند خراب کی ہے، میں تمہاری نیند اڑا رہا ہوں۔ تمہارے سفارت خانے کا سیکریٹری رونالڈ اور تمہاری لیلیٰ اس وقت ٹارچ سیل میں ہیں۔''

دوسری طرف فون خاموش رہا۔ بلّے نے پوچھا۔ ''یو منسٹر آف فارن افیئرز چپ کیوں ہو؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں ہوں تم سب کا باپ مراد علی منگی۔ ابھی تمہارے سفارت خانے پر تالا لگ رہا ہے۔''

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ اسی وقت مراد وہاں آگیا۔ اس نے بلّے کی تمام کارروائیوں کا جائزہ لیا۔ موبائل فون کے ذریعے اور میسیج کے ذریعے حاصل ہونے والے ٹھوس ثبوت کو پڑھا۔ لیلیٰ اور فارن منسٹر کی فون کالز سنیں۔ پھر بلّے کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''شاباش! میں تسلیم کرتا ہوں۔ تم میرا ہتھیار ہو اور تم ہی میری ڈھال ہو۔ میں اس ریاست میں اطمینان سے سیاسی جنگیں لڑتا رہوں گا۔''

پھر اس نے آرمی کے ایک افسر کو فون کے ذریعے حکم دیا۔ ''اس سفارت خانے کو لاک کردو۔ سفیر کو اور اس کے تمام عملے کو چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست سے باہر جانے کا حکم دو۔''

چونکہ سفیر اور اس کے عملے کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا، اس لیے انہیں وہاں سے بھاگنے کا حکم دے دیا گیا۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں آئے۔ وہاں رونالڈ ایک کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس سے کئی طرح کے سوالات کیے گئے اور ان سوال و جواب کی آڈیو ریکارڈنگ ہوتی رہی۔

پھر اس سے آخر میں کہا گیا۔ ''تم اس ریاست کے دشمن ہو۔ تمہارا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔ سچ سچ بولو، کیا تم نے دل سے اسلام قبول کیا ہے؟''

وہ قسم کھانے لگا کہ سچا مسلمان ہے اور نمازیں پڑھتا ہے۔ مراد نے کہا۔ ''قرآن مجید کی کوئی ایک آیت سناؤ۔''

وہ ہچکچانے لگا پھر بولا۔ ''وہ...... میں نماز کے وقت عربی میں نہیں اپنی انگلش لینگویج میں بولتا ہوں۔''

مراد نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ''اس کا لباس اتارو۔''

وہ گڑگڑانے لگا۔ ''نہیں۔ ایسا نہ کرو۔''

مراد نے حکم دیا۔ ''اس کی ویڈیو فلم بناؤ۔''

حکم کی تعمیل کی گئی۔ یہ ثبوت تھا کہ وہ مسلمان بن کر دھوکا دے رہا تھا اور لیلیٰ ایک غیر مسلم اور نامحرم کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔

وہ حکم دے کر بلّے کے ساتھ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ وہ دونوں جب ٹارچ سیل سے باہر آئے تو رونالڈ کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

بشریٰ ایک بہت بڑی کیمیکل کمپنی میں سرکاری انسپکٹر تھی۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ غیر ملکی دواؤں کے کنٹینرز کو چیک کرتی تھی تاکہ اصل دواؤں کے پیچھے نشہ آور

کیمیکل اور شراب کی بوتلیں نہ آئیں۔ اس ریاست میں نشہ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کہیں پان، چھالیا، تمباکو اور سگریٹ فروخت نہیں ہوتا تھا۔ چوری چھپے نشہ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جو سزا پانے کے باوجود دوسری بار پکڑے جاتے تھے، انہیں گولی ماردی جاتی تھی۔۔۔۔ زنا اور حرام کاری پر کسی مقدمے کے بغیر موت کی سزادی جاتی تھی۔ غیر ملکی سفارت کار، ڈاکٹرز، انجینئر اور دیگر ماہرین وہاں زیادہ عرصہ قیام نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ماہ دو چار روز کی چھٹیاں لے کر اپنے ملک میں جاتے تھے۔ شراب پیتے، ناچتے گاتے اور عورتیں بدلتے رہتے تھے پھر ریاست میں آکر پارسائی کی زندگی گزارتے تھے۔

ملکہ نگارا خانم کی والدہ اور دادی کے دور میں غیر ملکیوں نے ایسی پابندیوں پر احتجاج کیا تھا۔ ریاست میں آکر کام نہ کرنے کی اور بڑے بڑے پروجیکٹس کو روک دینے کی دھمکیاں دی تھیں۔ لیکن ان بزرگ حکمران خواتین نے پروجیکٹس کے رکنے اور نقصانات اٹھانے کی پروا نہیں کی۔ کچھ عرصے بعد ہی دوسرے کئی ممالک سے ایسے ڈاکٹر، انجینئرز اور دیگر ماہرین آنے لگے جو نشہ نہیں کرتے تھے اور جنہیں عورتوں کی طلب نہیں تھی۔ یا پھر انہیں اپنی بیویوں کے ساتھ وہاں آکر رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یوں دوسرے ممالک سے تعلقات بحال ہوگئے تھے اور تمام ماہرین آکر کام کرنے لگے تھے۔ بہرحال بشریٰ کیمیکلز سے تعلق رکھنے والے کئی اداروں کی انسپکشن آفیسر تھی۔ ایسے ہی اداروں سے نشے کی لعنت چوری چھپے بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ وہاں کبھی بھولے بھٹکے کوئی نشہ کرنے والا پکڑا جاتا تھا۔ اس پر سختیاں کی جاتی تھیں۔ اس سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ نشے کی پڑیاں یا شراب کی بوتل کہاں سے حاصل کرتا ہے؟ لیکن نشہ کرنے والے نہیں جانتے تھے کہ وہ ڈرگ کا دھندا کرنے والے کون ہیں؟ وہ ماسک پہن کر آتے تھے۔ مال سپلائی کرتے تھے اور رقم لے کر چلے جاتے تھے۔

ملکہ نگارا کی والدہ اور دادی کے دور میں بھی وہ انڈر ورلڈ ڈرگ مافیا کے کارندے پکڑے نہیں گئے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ریاست کی انٹیلی جنس والے ڈرگ مافیا کے مقابلے میں نااہل تھے۔ وہاں تک پہنچ نہیں پاتے تھے یا پھر مافیا تنظیم سے رشوت لیتے تھے اور انہیں چھوٹ دیتے رہتے تھے۔ ڈرگ مافیا کے کارندوں تک پہنچنا بشریٰ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ وہ بڑے صبر سے ان کی کھوج میں لگی ہوئی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے اور شیطان کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ خود ہی ورغلانے کے لیے آپہنچتا ہے۔

ایک رات اچانک ہی قلندر شاہ سے اس کا سامنا ہوگیا۔ بشریٰ نے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں اچانک ہی چھاپا مارا تھا۔ اس ہوٹل کی ایک کھانے کی ڈش بہت مشہور تھی۔ اتنی لذیذ ہوتی تھی کہ اسے کھانے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ پھر وہاں کی فش فنگرز اور جھینگے بھی بڑے شوق سے کھائے جاتے تھے۔ ایسی لذیذ سوئٹ ڈش پوری ریاست کے کسی ہوٹل میں دستیاب نہیں تھی۔ ایک روز پہلے بشریٰ نے وہ سوئٹ ڈش منگوا کر چکھی تھی۔ پھر اسے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس میں افیون کی تھوڑی سی مقدار ملائی جاتی تھی۔ بشریٰ نے دوسری رات اس ہوٹل پر چھاپا مارا۔ ہوٹل کے مالک اور باورچی کو حراست میں لیا اور وہاں کھانے والوں کے پاس جا کر انہیں حکم دیا کہ وہ ڈش جس کے سامنے رکھی ہے، اسے ہاتھ نہ لگائیں۔ یہ آج سے قانوناً ممنوع ہے۔

قلندر شاہ وہاں بیٹھا کھا رہا تھا۔ منع کرنے کے باوجود وہ ڈش کو سامنے رکھ کر چمچ سے کھانے لگا۔ بشریٰ نے ایک ہاتھ مارا تو ڈش اُڑتی ہوئی دور چلی گئی۔ قلندر شاہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اسے مارنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ اس کے منہ کی طرف گھمایا۔ وہ اچھل کر پیچھے گئی۔ وہ ایک خطرناک شوٹر تھا لیکن اچھا فائٹر نہیں تھا۔ بشریٰ کے مقابلے میں بے حد طاقتور اور قوت برداشت کا مالک تھا۔ وار خالی جاتے ہی اس نے بشریٰ پر چھلانگ لگائی۔ وہ بڑے آرام سے ایک کرسی کھینچ کر آگے لے آئی۔ وہ کرسی سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر تیزی سے اٹھا تو منہ پر ایک لات پڑی۔ وہ دوسری طرف گھوم گیا۔ بے چارہ شوٹر حیران تھا کہ وہ عورت ہے یا بجلی؟ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے پلٹ رہا تھا کہ منہ پر ایک فلائنگ کک پڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، سپاہیوں نے آکر اسے پکڑ لیا۔ بشریٰ کے ماتحت افسر نے اسے ہتھکڑیاں پہنادیں۔

بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود وہ سپاہیوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے ان سے ٹکرا رہا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت طاقتور تھا۔ سپاہیوں کو ٹکریں مار کر دور پھینک رہا تھا۔ اسے اور دو چار سپاہیوں نے آکر دبوچ لیا

تھا۔ وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ ''پچھتاؤ گے۔ دیکھ لینا بری طرح پچھتاؤ گے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ میں ہر ہائی نس ... نگارا خانم کا مہمانِ خاص ہوں۔ کل صبح تک تم سب کی نوکریاں کھا جاؤں گا اور یہ عورت... اس چھپکلی کو تو میں جوتے تلے مسل ڈالوں گا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''اچھا تو تم ہر ہائی نس کے مہمان ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ اس کے روبرو آئی۔ وہ سینہ تان کر بولا۔ ''میں ہوں قلندر شاہ... ہماری دنیا میں جتنے گن چلانے والے ہیں وہ سب جانتے ہیں کہ میں کتنا خطرناک شوٹر ہوں۔''

اس کے منہ سے بدبو کا ایک بھبکا آیا تھا۔ وہ ناگواری سے پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''تم نے شراب پی ہے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں شراب پی ہے۔ تمہارا خون تو نہیں پیا ہے۔ تم میرا کیا بگاڑ لوگی؟''

بشریٰ نے سپاہیوں سے کہا۔ ''اسے اس کی رہائش گاہ میں لے چلو۔ اس کے گھر میں بوتل ضرور ہوگی۔''

قلندر شاہ پینے کا عادی تھا۔ وہاں ہر ہائی نس کا مہمان رہ کر یہ جانتا تھا کہ اسے کھانے پینے کے لیے دنیا جہان کی نعمتیں ملیں گی لیکن شراب نہیں ملے گی۔ وہ ایسی گولڈن پری کو چور راستے سے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کے تعلقات کئی مجرمانہ تنظیموں سے تھے۔ اس نے بلیک ڈریگون نامی ایک تنظیم سے کہا تھا کہ اس ریاست میں رہ کر ان کے لیے کام کرتا رہے گا۔ کسی بھی چور راستے سے شراب کی بوتلیں اس کے گھر پہنچائی جائیں۔ اس طرح وہ شراب کے معاملے میں خود کفیل ہوگیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی اسے ایک بوتل دے جاتا تھا۔ اسے کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بوتل شراب کی نہیں دوا کی ہوتی تھی۔ بوتل پر دوا کا لیبل ہوتا تھا لیکن اندر اُم الخبائث ہوتی تھی۔ واڈکا اور جن سفید پانی کی طرح ہوتی ہیں۔ اس لیے شبہ نہیں ہوتا کہ وہ شراب ہے۔

وہ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ بشریٰ نے ایک کمرے میں آکر دوا کی وہ بوتل دیکھی تو اسے یاد آیا کہ کیمیکل کمپنی کی دوائیں ایسی ہی بوتلوں میں آتی ہیں۔ اس نے ایک کنٹینر میں آنے والی دواؤں کو چیک کیا تھا۔ اس میں مختلف ساخت کی بوتلوں میں مختلف دوائیں تھیں۔ قلندر شاہ کے کمرے میں جس ساخت کی بوتل تھی، ایسی ہزاروں بوتلیں اس کنٹینر میں تھیں۔

بشریٰ نے قلندر شاہ کے پاس آکر پوچھا۔ ''شراب کی بوتل کہاں ہے؟''

وہ بولا۔ ''بوتل میرے گھر میں کہاں سے آئے گی۔ میں کبھی نشہ نہیں کرتا۔''

بشریٰ نے اس بوتل کو کھولا تو اس میں سے شراب کی بو محسوس ہوئی۔ اس نے کمرے سے باہر جاکر مراد کو کال کی۔ ''بھائی! کیا قلندر شاہ نامی کوئی شخص ہر ہائی نس کا مہمانِ خاص ہے؟''

مراد نے کہا۔ ''ہاں، وہ ایک زبردست شوٹر ہے۔ وہ پل چرخی جیل سے فرار ہورہا تھا۔ ملکہ کے سپاہی اسے وہاں سے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ اسے آزمایا جائے گا۔ اگر وہ وفادار رہوگا تو ملکہ اسے باڈی گارڈ بنا کر رکھیں گی۔''

''بھائی! میں نے اسے نشے کی حالت میں پکڑا ہے۔ اس وقت وہ میری حراست میں ہے۔ میرا فرض کہتا ہے، اسے ٹارچر سیل میں لے جاکر اس سے اگلواؤں کہ وہ کہاں سے کس چور دروازے سے شراب حاصل کرتا ہے۔''

''تمہیں یہی کرنا چاہیے۔ لیکن وہ ملکہ کا مہمان ہے۔ میں ابھی نگارا خانم سے بات کرکے تمہارے پاس آؤں گا۔ اسے حراست میں رکھو۔''

مراد فون بند کرکے خواب گاہ میں نگارا خانم کے پاس آیا۔ وہ گلے کا ہار بن کر بولی۔ ''تم ریاستی معاملات میں بہت زیادہ معروف رہنے لگے ہو۔ مجھ سے دور ہوتے ہو تو ایسا لگتا ہے، مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں ایسا بھگوڑا ابھی نہیں ہوں کہ تمہاری جیسی پیار کرنے والی کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم دیکھ رہی ہو کہ ریاست میں چوری چھپے گناہ اور جرائم ہورہے ہیں۔ پچھلے دنوں بلے نے ایک ملک کی طرف سے ہونے والی تخریبی کارروائیوں کا انکشاف کیا تھا۔ تمہاری قابلِ اعتماد انٹیلی جنس کی چیف لیلیٰ فردوس کا اصلی چہرہ دکھایا تھا۔''

وہ بولی۔ ''بے شک تمہاری خفیہ فورس زبردست کارنامے انجام دے رہی ہے۔ لیلیٰ فردوس اور رونالڈ کو تو گولی ماردی گئی ہے۔ اب کیا مسئلہ ہے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ابھی تمہارا خاص مہمان قلندر شاہ نشے کی حالت میں پکڑا گیا ہے۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''اوگاڈ! اس کمبخت نے نشہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟''

''اگر تم اجازت دو تو تمہارے مہمان سے ٹارچر سیل میں اگلوایا جائے گا۔ جیسا کہ تم نے بتایا ہے، وہ ایک خطرناک شوٹر ہے۔ اس کا تعلق خطرناک تنظیموں سے رہا

ہے۔ ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ وہ یہاں بیٹھ کر ان تنظیموں سے رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟''

''یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے۔''

''تو پھر مجھے جانے دو۔''

''تمہارا جانا کیا ضروری ہے؟ تمہاری خفیہ فورس اس سے نمٹ لے گی۔''

''جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے بے شمار شوٹرز میرے دشمن رہ چکے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے۔ مجھے وہاں جا کر اس سے نمٹنے دو۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم نے کہا تھا کہ میں تمہارے معاملات میں روک ٹوک نہیں کروں گی تو ہمارے تعلقات بہتر رہا کریں گے تمہاری فطرت میں جنگجوئی ہے تم ضرور جاؤ گے۔ اس لیے جاؤ۔ میں انتظار کروں گی۔ جب تک نہیں آؤ گے جاگتی رہوں گی۔''

وہ بڑے پیار سے رخصت ہوگیا۔ بشریٰ نے مراد کو فون کرنے کے بعد بلّے سے رابطہ کیا۔ اسے بھی وہاں کے حالات بتائے تھے۔ اس نے بھی کہا تھا کہ ابھی آرہا ہے۔ وہ فون بند کر کے کمرے میں آئی۔ اس نے قلندر شاہ کو دیکھا۔ پھر اپنے ماتحت افسر سے کہا۔ ''والیِ ریاست مراد علی منگی آرہے ہیں۔ اس سے اگلوائیں گے کہ یہ شراب کی بوتلیں کہاں سے حاصل کرتا ہے۔''

والیِ ریاست کی آمد کی اطلاع ملتے ہی وہ سب فوجی انداز میں الرٹ ہوگئے تھے۔ قلندر شاہ یہ خبر سن کر چونک گیا۔ جس پر دو بار گولیاں چلا چکا تھا اور اب تیسری بار فیصلہ کن حملہ کرنا تھا' وہ ابھی آرہا تھا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ مراد اسے دشمن کی حیثیت سے نہیں پہچانتا۔ اس نے پچھلے دو حملے چھپ کر کیے تھے۔ پھر بھی وہ قیدی بن کر نہیں' آزاد رہ کر اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

اس نے بشریٰ سے کہا۔ ''میری ہتھکڑی کھولو۔۔۔ میں ہز ہائی نس کا مہمان ہوں۔ مجھے آزادی ملنا چاہیے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''تمہارے میزبان آرہے ہیں۔ تم انہیں سیدھی طرح شراب حاصل کرنے کا چور راستہ بتا دو گے تو یہ ہتھکڑیاں کھل جائیں گی۔''

''میں نہیں جانتا شراب کہاں سے آتی ہے۔ ایک شخص لا کر دیتا ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں۔ جب وہ ادھر آئے گا تو میں اسے تمہارے حوالے کردوں گا۔''

وہ بولی۔ ''تب ہتھکڑیاں کھول دی جائیں گی۔''

وہ غصے سے تلملا کر بولا۔ ''ابھی کھولو۔''

اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ پھنس گیا ہے۔ اس وقت بھی اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ ریاست کے قانون کے مطابق مراد اسے معاف۔۔۔ کرنے والا نہیں تھا۔ پھر اسے شراب سپلائی کرنے والوں کی نشاندہی نہ کرنے کی بھی سزا ملنے والی تھی۔ وہ ایک شاہی مہمان کی حاصل کی ہوئی عزت و تکریم سے محروم ہونے والا تھا۔

بشریٰ دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں اس کے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ادھر قلندر شاہ نے اچانک ہی ماتحت افسر پر چھلانگ لگائی۔ وہ اچانک حملے کے باعث سنبھل نہ سکا۔ اس کے ہاتھوں کی ہتھکڑیوں نے ماتحت کے حلق کو جکڑ لیا۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ تین سپاہی باہر تھے۔ ایک اندر تھا۔ اس نے گن سے نشانہ لیا لیکن افسر آگے تھا اور قلندر شاہ پیچھے، گولی چلتی تو افسر مارا جاتا۔

قلندر شاہ نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ''گن پھینک دو۔ ورنہ یہ مارا جائے گا۔''

ماتحت افسر اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اس کے شکنجے سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اشارے سے سپاہی کو گن پھینکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ سپاہی نے یہی کیا۔ قلندر شاہ نے افسر سے کہا۔ ''اپنا ریوالور مجھے دو۔ اسے نال کی طرف سے پکڑ کر میری طرف کرو۔''

افسر نے یہی کیا۔ اپنے ریوالور کو نال کی طرف سے پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ اسے گرفت میں لے کر ماتحت افسر کی پیشانی کا نشانہ لے کر بولا۔ ''فوراً چابی نکالو اور ہتھکڑیاں کھولو۔''

اس کی گردن ایسی جکڑی ہوئی تھی کہ سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ ایسے ہی وقت بشریٰ دوسرے کمرے سے آئی پھر دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ ہتھکڑیاں کھل چکی تھیں۔ اس نے گولی چلائی۔ بشریٰ اچھل کر دروازے کے پیچھے چلی گئی۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی باہر سے تینوں سپاہی دوڑتے ہوئے آئے لیکن اس پر گولی نہ چلا سکے۔ اس نے ماتحت افسر کی گردن کو ایک بازو کے شکنجے میں لے کر کہا۔ ''مجھ پر گولی چلانے سے پہلے یقین کرلو کہ تمہارا یہ افسر بھی مرے گا۔ دروازے سے دور ہٹو۔ اندر ہی رہو۔ مجھے باہر جانے دو۔'' بشریٰ نے دروازے کے پیچھے سے اسے نشانے پر رکھا تھا لیکن افسر کی سلامتی کے لیے گولی نہیں چلا رہی تھی۔ وہ اسے ڈھال بنا کر الٹے قدموں چلتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔

بشریٰ سپاہیوں کے ساتھ دوڑتی ہوئی دروازے پر آکر رک گئی۔ قلندر شاہ نے اسی وقت گولی چلائی۔ وہ سب جواباً فائر نہ کرسکے۔ ان کی گولیاں پہلے افسر کو لگتیں، بعد میں وہ مارا جاتا۔ وہ اسی طرح اسے ڈھال بناتا ہوا ویگن کار کی پچھلی سیٹ پر افسر کے ساتھ آیا پھر بولا...... ''فوراً آگے جاؤ اور گاڑی چلاؤ۔ ذرا سی بھی چالاکی دکھاؤ گے تو حرام موت مرو گے۔''

یہ کہہ کر اس نے دوسری گاڑی کے پہیے پر گولی چلا کر اسے ناکارہ بنا دیا۔ افسر سہما ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر اسے اسٹارٹ کرکے واپسی کے لیے موڑتا ہوا سڑک پر آگیا۔ پھر اس کے حکم سے رفتار بڑھا کر ایک سمت جانے لگا۔ بشریٰ نے پہلے مراد کو پھر بلے کو فون پر بتایا کہ قلندر شاہ کس طرح ایک گن اور گاڑی لے کر فرار ہوگیا ہے۔ ابھی دور نگی چوراہے کی طرف گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ ہائی وے پر سرحد کی طرف جائے گا۔ دونوں نے کہا کہ وہ اُدھر جارہے ہیں اور فون کے ذریعے رابطہ کرتے ہوئے تمام راستوں کی ناکابندی کرارہے ہیں۔

قلندر شاہ پرانا کھلاڑی تھا۔ یہ جانتا تھا کہ اس گاڑی میں دور تک نہیں جاسکے گا۔ پولیس کی موبائل گاڑیاں اسے گھیر لیں گی۔ اس نے کچھ دور آگے جاکر حکم دیا۔ ''گاڑی روکو۔''

رات کے وقت وہ راستہ ویران تھا۔ گاڑی رک گئی۔ اس نے حکم دیا۔ ''دروازہ کھول کر باہر جاؤ۔''

پھر خود بھی باہر آگیا۔ افسر کی جیبیں ٹٹولیں۔ وہاں سے آٹھ آٹھ بلٹس کے دو میگزین برآمد ہوئے۔ اس نے ان میگزین کو اپنی جیبوں میں رکھ کر اسے گولی ماردی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی نشاندہی کے لیے زندہ رہے۔ پھر وہ گاڑی کو وہیں چھوڑ کر اس سڑک سے دور ایک بستی کی طرف جانے لگا۔ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکابندی کردی گئی تھی۔ پولیس اور آرمی کی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ پڑوسی ملک کی طرف جانے والے راستے پر آرمی کے جوان سرحدی چوکی تک پہنچ رہے تھے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ جس گاڑی میں فرار ہوا تھا، وہ ایک سڑک کے کنارے کھڑی ہے اور اس کے قریب افسر کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ تمام سپاہی آس پاس کی بستیوں میں جاکر اسے تلاش کرنے لگے۔

بلے نے حیرانی سے فون پر مراد کو مخاطب کیا۔ ''کیا اس کا سراغ مل رہا ہے؟ کیا وہ بارڈر کی طرف گیا ہوگا؟''

قلم ایک مخلص دوست

قلم بہت اہمیت کا حامل ہے، ہر اس انسان کے لیے جس کے اندر برائیوں سے لڑنے کی طاقت موجود ہو۔ برائیاں تو ہر انسان میں پائی جاتی ہیں لیکن قلم کے ساتھ لڑنے کی ہمت اگر انسان میں سمندر کی موجوں کی طرح موجزن ہو تو انسان بہت سے ایسے کارنامے سرانجام دیتا ہے جو پھر اس کو دنیا میں ممتاز کردیتا ہے۔ لہٰذا قلم سے محبت کرو، یہ بہت مخلص دوست ہے اور یہ کبھی بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا البتہ اس کے ذریعے ایسی باتوں کو حاصلِ تحریر نہ لائیں جو کسی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہوں۔

انسان ایک ناسمجھ مخلوق

انسان کا ہر لمحہ بے انتہا قیمتی ہوتا ہے مگر انسان کو خود اس لمحے کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ انسان اگر یہ جان لے کہ وہ انسان ہے تو وہ حیوان بننے سے بچ جاتا ہے۔

انسان کے قدموں کی چاپ ہر روز انسان کو پیغام دیتی ہے کہ چل اس کے گھر جس نے تجھے پیدا کیا مگر انسان اس پیغام کو کچھ اور سمجھ کر کسی اور راستے پر چل نکلتا ہے۔

خودی کی تلاش

جو لوگ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، ان کو وہ خوشی کبھی نہیں مل پاتی جس کی ان کو تلاش ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ سے امیدیں رکھتے ہیں وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتے۔ اس کا کوئی سرا یا کونا ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اسی طرح اور لوگوں سے امیدیں باندھنے والوں کو اپنا آپ نہیں ملتا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی کونا ڈھونڈنے کے بجائے اپنے آپ کو ڈھونڈا جائے کہ تم کیا چاہتے ہو اور تمہاری شناخت کیا ہے؟ اپنے آپ سے پیار کرو گے تو کبھی تنہا نہیں رہو گے اور یہی زندگی گزارنے کا اصول ہے کہ پہلے اپنے آپ کو قبول کرو۔ اپنی کمزوریوں کو راست کرو اور اسی ایک ذات پر بھروسا کرکے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کو تسلیم کرو پھر وہ دن دور نہیں جب تمہیں اور نوازا جائے گا۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

مراد ہیلی کاپٹر میں پرواز کر رہا تھا۔ ہائی وولٹیج کی لائٹ نیچے زمین پر پہنچ رہی تھی۔ میلوں دور تک سرحدی تار کانٹے لگے ہوئے تھے۔ ہیلی کاپٹران تار کانٹوں پر روشنی پھینکتا جارہا تھا۔

اس نے بلّے سے کہا۔ ''یہ حیرانی کی بات ہے۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر سے پہلے سرحد تک نہیں پہنچے گا۔ ابھی شہر میں یا جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ میں حکم دے رہا ہوں کہ ہر گھر میں جاکر اسے تلاش کیا جائے۔''

بشریٰ اور بلّا دو مختلف علاقوں میں اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ دونوں موٹر سائیکل پر تھے اور فون کے ذریعے ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ بلّے نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں رومی شاہراہ کے قریب چار منزلہ عمارت کے نچلے حصے میں ہوں۔ یہ عمارت زیرِ تعمیر ہے۔ میرے ماتحت چاروں فلورز میں اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''وہ ایسے ہی ویران مقامات میں کہیں جاکر چھپا ہوگا۔ میں تاریخی کھنڈرات کی طرف جارہا ہوں۔''

اسے جنگل میں بھی ڈھونڈا جارہا تھا۔ جنگل ہرا بھرا تھا۔ گھنے درخت بھی تھے۔ درختوں کے سایہ دار ہونے کے باعث وہ ہیلی کاپٹر سے نظر نہیں آرہا تھا۔ فوجی وہاں دور تک پھیل کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی درخت کی شاخوں اور پتوں میں چھپ کر رہ سکتا تھا۔ اس رات پورا شہر جاگ رہا تھا۔ سپاہی ایک ایک گھر میں گھس کر ایک ایک گوشے میں جھانک رہے تھے۔ وہ تو ایسے غائب ہوگیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

ایک پولیس اسٹیشن کی لیڈی انسپکٹر پامیلا جوزف نے اپنے فون پر اپنے اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''قلندر شاہ میرے تھانے میں آیا تھا۔ اچانک اس طرح آیا کہ میں سنبھل نہ سکی۔ اس نے میز پر سے میری گن اٹھالی تھی۔ سپاہی میری سلامتی کی خاطر اس پر گولی نہ چلاسکے۔ وہ میری گن اور بلٹس سے بھری ہوئی ایک تھیلی لے گیا ہے۔''

پولیس کا ایک اعلیٰ افسر چند سپاہیوں کے ساتھ اس تھانے میں آیا۔ اس نے پامیلا کی روداد تفصیل سے سنی پھر اسے آئندہ محتاط رہنے کی تاکید کرکے چلا گیا۔ اس شہر کے تمام تھانوں کے افسران کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ محتاط اور ہوشیار رہیں۔ جب تک اسے گرفتار نہ کیا جائے، کوئی ایک گھنٹے کی بھی چھٹی نہ کرے۔ تمام پولیس اسٹیشن کے افسران کو تاکید تو کی جارہی تھی لیکن کسی تھانے کے اندر جاکر مفرور کو تلاش نہیں کیا جارہا تھا۔ یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ کسی تھانے کی سرپرستی حاصل کرکے بہ آسانی چھپ سکتا ہے۔ وہ لیڈی انسپکٹر پامیلا جوزف کے تھانے کی حوالات میں تھا۔ جب ایک اعلیٰ افسر وہاں پامیلا کی روداد سننے آیا تھا تب وہ ٹوائلٹ میں جاکر چھپ گیا تھا۔

اس کے ذرائع دور سرحد کے اس پار تک تھے۔ کئی ممالک اسے رازداری سے تحفظ دینے کے لیے مستعد ہوگئے تھے۔ پامیلا ایسے ہی ایک ملک کی ایجنٹ تھی۔ یہ سازش کی جارہی تھی کہ ریاست باب النساء کے عوام کو عورتوں کا اور نشے کا عادی بنایا جائے۔ جو قوم ان دو لعنتوں میں مبتلا ہوجاتی ہے، اسے آسانی سے غلام بنالیا جاتا ہے۔ انسپکٹر جنرل آف پولیس بھی اس ملک کا زرخرید وفادار تھا۔ وہاں سے احکامات صادر ہوئے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ پامیلا نے قلندر شاہ کو پناہ دی ہے۔ رات گزرنے تک اسے اور زیادہ محفوظ پناہ گاہ میں پہنچایا جائے۔

آئی جی ... پولیس نے مراد سے کہا۔ ''سر! اس مفرور کو بے ایمان پولیس والے چھپائیں گے تو ہم کبھی اسے گرفتار نہیں کرسکیں گے۔ آپ حکم صادر کریں کہ تمام چھوٹے بڑے پولیس افسران اور ایک ایک سپاہی کے گھر میں گھس کر اسے تلاش کیا جائے۔ وہ ضرور ہماری گرفت میں آئے گا۔ سب سے پہلے میرے گھر میں انٹیلی جنس والوں کو تلاشی کے لیے آنا چاہیے۔ میں دروازے کھلے رکھوں گا۔''

اس نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ مراد نے حکم دیا کہ تمام پولیس والوں کے گھروں کی تلاشی لی جائے۔ اس حکم کے مطابق آئی جی ... پولیس کے بنگلے میں انٹیلی جنس والے آئے۔ انہوں نے ہر کمرے میں جاکر دیکھا۔ اس بنگلے کے فرش سے لے کر چھت تک دیکھ لیا پھر وہاں سے مطمئن ہوکر چلے گئے۔ پولیس کے اس اعلیٰ افسر کے بنگلے میں اسپیشل برانچ کا کوئی جاسوس دوبارہ نہیں آسکتا تھا۔ ان کے جاتے ہی پامیلا نے بڑی رازداری سے قلندر شاہ کو وہاں پہنچادیا۔ اب مراد، بشریٰ اور بلّا دن رات دوڑتے رہتے تب بھی اس کے سائے تک پہنچ نہ پاتے۔ وہ دُھن کا پکا تھا۔ مراد پر گولی چلائے بغیر اس ریاست سے جانے والا نہیں تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

مصیبتیں

رضیہ محبوب

کچھ لوگ بہت وہمی قسم کے ہوتے ہیں مگر... حیرت اس وقت ہوتی ہے جب وہ وہم سچے بھی ثابت ہو جائیں۔ بہرحال چھوٹی چھوٹی باتوں پر چونکنا اور سوچنا ہر ایک کی فطرت نہیں ہوتی لیکن... جس کی ہوتی ہے وہ اس دائرے سے نکلنا بھی نہیں چاہتا جیسے کہ وہ...

بنگلا دیشی ادب سے ایک خوبصورت انتخاب

"مصیبتیں کیونکر آتی ہیں۔" سرکار صاحب سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ نوکر کے ہاتھوں سے دس چائنا پلیٹیں گر کر چکنا چور ہو گئیں۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا۔ صبح سویرے یہ منحوس لفظ مصیبت آپ کے منہ سے نکلا ہے۔" سرکار صاحب کی بیگم فوراً چلائیں۔ پھر نوکر پر برس پڑیں۔ "الو، بے شرم۔ کام کا نہ کاج کا۔"

سرکار صاحب بدحواس ہو کر اٹھے اور نوکر کے کان اینٹھنے کے لیے بڑھے۔ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر نوکر چلانے لگا۔ "اوماں۔ اوباپ۔ رحم کرو۔"

خوش قسمتی کہ یہ شہر تھا اس لیے مداخلت کرنے کوئی نہیں آیا لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔

نوکر نے اپنا سامان اکٹھا کیا اور اس کو یہاں سے چلے جانے کا بہانہ بنایا۔ کسی نے اسے روکا نہیں۔

سرکار صاحب کی بیگم نے پلیٹوں کے ٹکڑے اکٹھے کیے اور بولیں۔ "اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ کام کوئی نہیں کرتا۔

سب کام بڑھاتے رہتے ہیں۔ پیسے لاکر کوئی دیتا نہیں۔ برباد ہر کوئی کرتا ہے۔ مجھے میری دس پلیٹیں شام تک چاہئیں...... اور سنیں، اس کمینے کو اس کی تنخواہ دے کر چلتا کریں وہ پھر کبھی اس گھر میں نہ آئے۔"

سب سے بڑی بیٹی بیاہی جاچکی تھی۔

چھوٹی بیٹی نے آکر کہا۔ "اتنی ساری پلیٹیں توڑ ڈالیں۔ پھر اسے پیسے کیوں دے رہی ہیں؟"

بیگم نے کہا۔ "نہیں، ایسا نہیں کرنا ہے۔"

"وہ کیوں نہیں؟"

"اور مصیبت کو یاد کرو۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ صبح سویرے کوئی اس لفظ مصیبت کو منہ سے نہ نکالے یا صفائی سے پہلے پیسے خرچ نہ کرے لیکن میری کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ تم سارے کے سارے اپنے باپ کی طرح ہو۔"

قبل اس کے کہ وہ شوہر پر غصہ اتارتیں، دروازے پر دستک ہوئی۔

بیگم نے کہا۔ "دھوبی آیا ہوگا سویرے سویرے۔"

"دھوبی۔" سرکار صاحب نے پوچھا۔ "دھوبی...... اور یہ آج کل۔"

بیگم نے کہا۔ "دھوبی کہاں سے ملے گا۔ جب آپ نے سب کو بھگا دیا۔ آپ کو تو باہر کے کام سے فرصت ہی نہیں ہے۔ گھر کا خیال کون کرے گا۔ نوکر سارے جنٹلمین بن گئے ہیں اور بیٹے سب نواب ہو گئے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی میلے کپڑے لے کر دھوبی کے یہاں چلا جائے۔"

بڑے بیٹے نے نرمی سے کہا۔ "اماں، دھوبی آج کل کہاں۔ میں کپڑے لانڈری لے جاتا ہوں۔"

ماں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "لانڈری یا فونڈری، میں نے دھوبی کا انتظام کرلیا ہے۔ تم لوگ ایسے ہی رہو۔ بڑی مشکلوں سے دُگنے پیسوں پر راضی ہوا ہے۔"

سرکار صاحب نے آہ بھری۔ "پھر تو تمہیں بہت خوشی ہوگی کیونکہ مجھے مشکل سے خرچہ پورا کرنا پڑتا ہے۔"

انہوں نے دروازہ کھولا تو یہ رجب دھوبی نہیں بلکہ ان کا بھتیجا رجب تھا جو ساتھ والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زرد اور ایک سفید کاغذ تھا۔

سرکار صاحب نے پوچھا۔ "کیا بات ہے رجب علی...... کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔"

"یہ ٹیلی فون کرنے آیا ہوگا۔ ایک اور مصیبت۔" بیگم نے کہا۔ "جانتے ہیں۔ بیچ رات میں فون کی گھنٹی بجی، میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ کسی نکھٹو لڑکے کی آواز تھی۔ کہہ رہا تھا...... آپ نے آسمان پر خوب صورت چاند دیکھا؟"

سرکار صاحب نے پوچھا۔ "یہ کب ہوا؟ کون بدمعاش تھا؟ مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں دکھاتا نا اس کو پورا چاند۔"

بیگم نے کہا۔ "فضول بات۔ آپ کچھ نہیں کرپاتے۔ ٹیلی فون کے تار سے اس کے منہ پر پٹی کیسے پھینکتے۔" پھر اس نے رجب کی طرف دیکھا۔ "چلو اب تم آگئے ہو تو فون کرلو۔ کس کو کرنا ہے؟ اپنی گرل فرینڈ کو مت کرنا۔ ورنہ ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"نہیں۔ میں فون کرنے نہیں آیا ہوں۔" رجب علی نے نرم لہجے میں کہا۔ کہتے ہوئے وہ جھینپ گیا۔ کیونکہ گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی آگئی تھی اور رجب علی اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔

"تو پھر کس لیے؟"

رجب علی نے جواب دیا۔ "چاچی! اماں نے آپ کا بجلی کا بل دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔"

"ہمارا بجلی کا بل...... وہ کیوں؟" بیگم غصے میں آگئیں۔

"آپ ناراض نہ ہوں۔ ہمارا بل ایک دم سے 35 سے 45 کا آیا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "بجلی زیادہ استعمال کرو گے تب زیادہ بل تو آئے گا ہی۔"

رجب نے بتایا۔ "لیکن فلیٹ نمبر 9 میں بل صرف دس کا آیا ہے اس لیے اماں غصے میں ہیں۔ کہتی ہیں ضرور کوئی گڑبڑ کی ہے کسی نے۔"

شوبی بولی۔ "ہمارا بل بھی تو آیا ہوا ہے۔"

ماں غصے میں بھڑک اٹھی۔ "آیا ہے تب تو نے مجھے کیوں نہیں دیا۔ تاریخ گزر گئی ہوگی شاید۔ پتا نہیں کیا کیا جائے تم سب کے ساتھ۔ اتنی بڑی ہوگئی ہو۔"

سرکار صاحب بولے۔ "ارے اسے کیوں صبح ہی صبح ڈانٹ رہی ہو۔ کیا ہوا، اگر وہ بھول گئی۔ لاؤ مجھے دو۔ میں جمع کرادوں گا۔"

سرکار صاحب ایک اہم سماجی کارکن تھے۔ محلے میں ان کی عزت تھی۔ ٹھنڈے مزاج کے تھے اور سر کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے انہیں کوئی جڑی بوٹیوں والا تیل استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بل لایا گیا۔

مگر بیگم نے کیا دیکھا۔ انہیں یقین نہیں آیا۔

85 ٹاکا۔ ’’دیکھنا بیٹی 85 ہے نا۔‘‘

بل کو دیکھے بغیر سرکار صاحب نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ ’’کیا کہا۔ بنگلا میں نہیں کہہ سکتی ہو، ایٹی فائیو۔‘‘

’’یہی میں نے کہا۔‘‘ بیگم نے جواب دیا۔ ’’ایٹی فائیو ٹاکا۔‘‘

’’آج آخری تاریخ ہے۔‘‘ شومی بول پڑی۔

ماں بیٹی پر اتنی ناراض کہ لڑکی اگر اپنا چہرہ ہٹا نہ لیتی تو زوردار تھپڑ پڑتا۔

’’بے وقوف لڑکی۔‘‘ ماں نے کہا۔ ’’تم نے یہ مصیبت ہم سے چھپائے رکھی۔ ٹھہرو اور دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے.......... پھر سے بل کا حساب لگا کر دیکھو۔ غلطی کو درست کراؤ اور بل جمع کر دو۔‘‘

سرکار صاحب فوراً مان گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ صبح کی مصیبت تمام دن ختم نہیں ہوگی۔ انہیں اپنی بیگم سے بتانے کا موقع نہیں ملا کہ وہ خود مصیبت میں ہیں اور انہیں بیگم کو ہر بات بتائے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔ آخر وہ امن پسند انسان تھے۔ وہ بلا سوچے سمجھے یا الٹے تلٹے کام کرنے کے عادی نہیں تھے۔

ہر کام انہوں نے سوچ سمجھ کر کیا۔ کوئی بات نہیں اگر ان کی بیگم میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ وہ ان کی شادی کے جہاز کی ملاح تھیں۔ جہاز کو ان کے چلائے بغیر سرکار صاحب اپنے آپ کوئی کام نہیں کر سکتے تھے اور ان ہی کے ساتھ کیا، تمام مردوں کے ساتھ یہی بات ہے۔ دوسرے مرد بزدل تھے جو قبول نہیں کرتے تھے جبکہ سرکار صاحب اس بات کے قائل تھے۔

اسی طرح ایک اور شخص ایک اور مصیبت کھڑی کرنے آ گیا۔ ’’یہ مکان کس کے نام ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’کس کے نام پر......؟‘‘ بیگم اپنے بڑے بیٹے کو مدد کے لیے تلاش کرنے لگیں۔ لیکن وہ تھا کہاں۔ صرف ایک مرتبہ چہرہ دکھایا تھا۔ پھر سونے چلا گیا۔ اب دن بھر اسے جگائے رکھنا ناممکن تھا۔

بیگم اس شخص کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ’’تم کون ہو؟‘‘

’’میں ایجنٹ ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ایجنٹ؟ تمہارا مطلب ہے بروکر۔‘‘

’’میں بروکر کیوں ہونے لگا؟ ہم لکھت پڑھت سے کام نہیں کرتے ہیں۔ سب کام زبانی اور بھروسے پر ہوتا ہے۔ ہم آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ٹھیک۔ تو تم میرے لیے دکان سے سودا سلف لا دو گے؟‘‘

’’بے شک۔ لیکن میڈم! یہ مکان آپ کے نام پر ہے نا؟‘‘

’’شاید...... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اس مکان کی مالکن نہ ہوئی تو تم میرا کوئی کام نہیں کرو گے؟‘‘

’’نہیں، یہ بات نہیں ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’کیا میں دومنٹ کے لیے بیٹھ سکتا ہوں؟ میں ہر بات سمجھا دوں گا۔ اگر آپ اس مکان کی مالکن ہیں، تب ہم آپ کو کرائے داروں سے نمٹنے کی پریشانی سے آزاد کر دیں گے اور اگر آپ کرائے دار ہیں تو مالکِ مکان کی زیادتیوں کا سامنا کرنے میں آپ کی مدد کریں گے۔‘‘

بیگم نے گردن ہلا دی۔

وہ بولتا رہا۔ ’’دونوں صورتوں میں ہم پورا کام کریں گے۔ فرق صرف رقم کا ہوگا، جو آپ ہمیں ادا کریں گی۔ ہم پہلے کرایہ داروں کا کام کرتے ہیں۔ ان سے ہم بیس سے پچیس ٹاکا فی سیکڑہ لیتے ہیں اور مالکِ مکان سے پینتیس تا پچاس ٹاکا لیتے ہیں۔‘‘

’’ہوں اور کیا کیا کرتے ہو؟‘‘

’’اگر آپ ہمیں عدالت میں لے جانا چاہیں گی یا آپ کا وکیل بننا یا کرایہ داروں سے جھگڑا کرنے کے لیے کچھ مواد چاہیں گی تو ہم ہر کام کریں گے۔ بات یہ ہے کہ ہم آپ کے لیے کم کرائے کا مکان تلاش کر دیں گے اور اس مکان کو زیادہ کرائے پر اٹھوا دیں گے۔‘‘

یہ سب سن کر بیگم کو بڑا تعجب ہوا۔ ’’یہ کیا مصیبت ہے؟‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’شومی! بڑے بھیا کو بلا کر لاؤ اور کہو کہ شاپنگ بیگ لیتا آئے۔ ایک بھلا آدمی مل گیا ہے۔ یہ میرے بھولے بیٹے کو سودا خریدنا سکھائے گا۔‘‘

شومی نے دوسرے کمرے سے کہا۔ ’’بھیا ورزش کے بعد نہانے گئے ہیں۔‘‘

بیگم نے اس شخص سے کہا۔ ’’اس کا مطلب ہے ایک گھنٹا اور۔ تم کل آ سکتے ہو۔ تم اپنے اور کاموں میں اس شاپنگ کو بھی شامل کر لو۔ اس طرح ہر ایک کا بھلا ہوگا۔‘‘

اس شخص نے اصرار کیا۔ ’’یہ مکان ہے کس کا؟‘‘

اب بیگم بھڑک اٹھی۔ ’’میرے باپ کا۔ کس کا مکان؟ تیرا تو نہیں ہے۔ نکل جا۔ میں کہتی ہوں دور ہو جا۔‘‘ نوجوان خاموشی سے چلا گیا۔

اتنی ساری مصیبتیں لیکن ابھی تو اور مصیبتیں آنی تھیں۔ ابھی تو صرف دوپہر ہوئی تھی اور ہونے کو تو آدھی رات تک بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

شومی نے یاد دلایا کہ ہفتہ ہے۔ دو بجے سہ پہر تک سب کچھ بند ہو جائے گا۔ کل اتوار ہے اور کل بھی سب بند رہے گا۔ اس لیے شومی کی دوست کی شادی کا تحفہ آج ہی خرید اجائے اور اسے بیس ٹا کا چاہیے۔

''بیس ٹا کا؟ کیا پیسے درخت پر لگتے ہیں؟ آج صبح جو نقصان ہوا ہے...... میں کوئی پیسہ تجھے نہیں دوں گی۔''

لیکن انہیں پندرہ ٹا کا دینے پڑے کیونکہ بچے بغیر کچھ لیے جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اتنے میں گھر کے سربراہ گھر میں داخل ہوئے۔ لنگڑاتے ہوئے۔

''اوہو۔ آپ کے گھٹنے کو کیا ہوا؟'' بیگم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس بال بال بچ گیا۔''

''مطلب؟''

''مطلب... رکشا۔''

''رکشا؟ آپ کا مطلب ہے رکشا الٹ گیا؟'' بیگم روتی روتی سی ہو گئیں۔

''اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ رکشا ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ دیکھتی نہیں ہو، میں ٹھیک ہوں۔ صرف گھٹنا چھل گیا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کو کار خرید لینا چاہیے۔'' بیگم نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ نہ ہوتے تو میں کیا کروں گی؟''

''ٹھیک ہے ابو۔ آپ کو کار خرید لینی چاہیے۔'' بیٹے نے کہا۔

سرکار صاحب بولے۔ ''تم سب کو کیا ہو گیا ہے۔ جیسے کار ہو گی تو کسی کو کچھ نہیں ہو گا۔ قصور رکشے والے کا تھا اور کار چلانے والے شریف آدمی کی خواہ مخواہ پٹائی ہو گئی۔ وہ تو پولیس آ گئی۔ ورنہ پتا نہیں بے چارے کا کیا حال ہوتا۔''

بیگم نے کہا۔ ''بکواس...... رکشے والے اور شریف آدمی دونوں کو جیل میں ڈال دینا چاہیے۔''

اسی عرصے میں شومی والد کے گھٹنے پر ملنے کے لیے آیوڈیکس لے آئی۔ بیگم نے بیٹے کو ڈاکٹر کے لیے بھیج دیا لیکن بیٹا جلد ہی واپس آ گیا۔

''کیا ہوا؟ واپس کیوں آ گئے؟''

''بری خبر۔''

''کیسی بری خبر۔'' ماں نے پوچھا۔ ''کون مر گیا؟ پچھلے دو مہینوں سے میں بری خبریں ہی سن رہی ہوں۔ لیکن دوستوں اور ملاقاتیوں کے بارے میں نہیں۔''

''نہیں۔'' بیٹے نے کہا۔ ''مرا کوئی نہیں ہے۔ میرے دوست نے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔''

''طلاق؟ کیسی ذلت کی بات ہے۔''

پہلی مرتبہ سرکار صاحب پریشان نظر آئے۔ ''پورا ملک ہی بکھرتا جا رہا ہے۔''

''اسی لیے میں شادی نہیں کر رہا ہوں۔'' بیٹے نے کہا۔ ''شادی کا مطلب ہے طلاق۔''

ماں نے کہا۔ ''یہ کیا منطق ہے۔ روزگار کا مطلب غلامی۔ تو تم آزاد زندگی کے مزے اڑاؤ۔ میں سب دیکھ رہی ہوں جو تم کر رہے ہو۔ جوانوں سے تو کوئی آج کل حساب نہیں مانگتا۔''

بیٹا بولا۔ ''آپ پھر شروع ہو گئیں۔ اس لیے میں گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے تھوڑا سکون چاہیے۔''

شومی چلائی۔ ''بھیا جاؤ مت۔ پہلے کھانا تو کھا لو۔''

ماں نے رائے زنی کی۔ ''ایمان کی بات ہے۔ صرف میری بیٹی شومی محنتی ہے۔''

بیٹا بولا۔ ''مجھے نہیں چاہیے سادہ چاول اور دال۔''

شومی نے کہا۔ ''صرف چاول دال کیوں۔ انڈا اور آلو کا بھرتا بھی تو ہے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''آلو اور انڈے تمہیں کہاں سے ملے؟''

شومی نے بتایا۔ ''پڑوس کے رجب بھائی سے۔''

ماں کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ گھور کر بیٹی کو دیکھا۔ سانولی بیٹی تو جیسے چمکنے لگی۔ رہنے دو جو چاہیں کریں۔ انہوں نے سوچا۔

شام کو دن بھر کی مصیبتوں کا زور کم ہو جانے کے بعد بیگم کھلی چھت پر آ بیٹھیں۔ وہ ہر شام کو یہاں بیٹھتی تھیں۔ یہ ان کی عادت تھی۔ رات کے کھانے سے پہلے وہ یہاں کچھ دیر آرام کرتیں۔

سرکار صاحب بھی گنگناتے ہوئے آ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایسا وہ بہت کم کرتے تھے کیونکہ معروف آدمی تھے۔ محلے کی سماجی سرگرمیوں سے انہیں فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔

بیگم نے چونک کر پوچھا۔ ''آج رات باہر نہیں گئے؟''

سرکار صاحب نے کہا۔ ''کل میں دیر سے آیا اس لیے کچھ بتانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ سامنے والا ایک منزلہ مکان دیکھ رہی ہو؟''

''ہاں دیکھ رہی ہوں۔ وہ تو علی صاحب کا مکان ہے۔''

''ہاں اس مکان میں ایک نیا کرائے دار آیا ہے اور اس کے آنے سے علی صاحب کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیوں...... علی صاحب کے ساتھ کیا ہو گیا؟ وہ تو اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی ہیں۔ انہیں کسی کے معاملات میں دخل دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''مسئلہ علی صاحب کے ساتھ نہیں...... کرائے دار کے ساتھ ہوا ہے۔''

''کیوں...... کیا وہ مکان کا کرایہ نہیں دے پاتے؟''

''بات کرائے کی نہیں۔ وہ کرایہ بھی پابندی سے دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ انہیں یہاں رہنے دیا جائے۔''

''کیوں؟'' بیگم نے بلند آواز میں پوچھا۔

''یہ ایک بڑی بدنامی کا معاملہ ہے۔''

''بدنامی! وہ بے چارہ دو بچوں کا باپ ہے۔ وہ کس طرح کوئی الٹی سیدھی حرکت کرسکتا ہے۔''

''بات بچوں کی نہیں ہے۔ انہوں نے تو شاید شادی بھی نہیں کی ہے۔'' سرکار صاحب نے بتایا۔

''پاگل تو نہیں ہوگئے ہیں۔ ایسے شریف آدمی کے لیے ایسے خیالات دماغ میں آئے کیسے؟''

''تو پھر وہ نکاح نامہ کیوں نہیں دکھاتے؟''

''نکاح نامہ؟...... آپ کے پاس ہے؟ کیا آپ دکھا سکتے ہیں؟ ہم جو پچھلے تیس برسوں سے ساتھ رہ رہے ہیں تو کیا ثبوت ہے کہ ہم میاں بیوی ہیں؟''

''کیوں؟ کون نہیں جانتا کہ یہ سچ ہے...... اور......''

بیگم نے سرکار کو جملہ پورا کرنے نہیں دیا اور کہا۔

''آپ کو کیسے پتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''لوگ کہہ رہے ہیں۔''

''کون لوگ؟''

''علی صاحب نے نام تو نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ محلے والے کہہ رہے ہیں کہ انہیں یہاں نہ رہنے دیا جائے۔''

''کیا انہوں نے خود سنا ہے؟''

''ہاں۔''

''کرایہ دار بے چارہ کیا کہتا ہے۔''

''اس نے کہا کہ شادی ہم دونوں نے کی ہے اور وہ ہر ایک کو نکاح نامہ کیوں دکھاتے پھریں۔ اگر ہم نے شادی کی ہے تو دوسروں کو کیا اعتراض۔''

کچھ دیر بعد سرکار صاحب بولے۔ ''مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔ یہ شریف آدمی تیز مزاج ہے۔ ایک ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے جہاں کوئی کسی کی پرائیویٹ زندگی میں نہ دخل دیتا ہے نہ پریشان کرتا ہے۔ لیکن کیا کوئی صرف اپنے مکان یا دفتر میں رہ سکتا ہے؟ ان سے نرمی سے گفتگو کرنی پڑتی ہے، ان کے ساتھ چائے پینی ہوتی ہے اچھی بری خبروں کا تبادلہ کرنا ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں کرتا۔ بالکل غیر مجلس آدمی ہے۔''

بیگم نے کہا۔ ''چھوڑیں بھی۔ یہ شہر تو گاؤں سے بھی بدتر ہے۔ ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ آپ محلے والوں سے بات کیوں نہیں کرتے کہ اس بے چارے کی جان چھوڑیں۔''

''میں نے کل بات کی تھی۔ لیکن کوئی بات کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے بے چارے علی صاحب بہت پریشان ہیں۔ کل تقریباً روتے ہوئے مجھ سے پوچھ رہے تھے..... سرکار صاحب! بتاؤ، میں کیا کروں۔''

بیگم نے کہا۔ ''کیا کرائے دار کو نکالنا اتنا آسان ہے؟ کیا وہ عدالت نہیں جائیں گے؟''

''نہیں کیونکہ وہ بہت خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ لوگ ان کے گھر پر اینٹ اور پتھر پھینک رہے ہیں۔ وہ ان حملوں کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہر رات بھوت بن کر ڈرایا جاتا ہے اور اب یہ رسوائی۔''

''ہاں یہ تو حد ہی ہو گئی۔''

''کل علی صاحب آخری کوشش کریں گے کہ وہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ورنہ علی صاحب شاید قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ حالانکہ وہ دل سے نہیں چاہتے لیکن محلے والوں کی وجہ سے مجبور ہو گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی چلے جائیں گے۔ سنا ہے انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا ہے۔''

اچانک بیگم کو احساس ہوا کہ اور دنوں کی طرح وہ کرائے دار اور اس کے گھر کے لوگ دکھائی نہیں دیے۔ بچے بھی نظر نہیں آئے۔ مکان پر خاموشی ہے یا پھر وہ مصروف ہیں۔ کس بات نے انہیں بدل دیا ہے؟ ان کا خیال کرتے ہوئے بیگم کے دل میں امیدیں جاگ اٹھیں۔ اب بھی دنیا میں پیار محبت اور مصیبتوں سے آزاد خوشی موجود ہو سکتی ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں ان کی پریشانیوں کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔ وہ کسی کو اجازت نہیں دیں گی کہ وہ اس محبت کرنے والے جوڑے کے گھونسلے کو نوچ پھینکیں۔

اگلے دن سب نے حیرت سے سنا کہ سرکار صاحب کی بیگم اس جوڑے کے گھر گئیں اور کھل کر برس پڑیں۔

''تجھے کیا معلوم۔ میں تیری دور کی خالہ ہوں بے شرم لڑکی۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''میری خالہ؟'' کرائے دار کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، تیری خالہ۔ اب میں سارے رشتے داروں کی دیکھ بھال تو نہیں کر سکتی۔ تجھے کہاں سے یاد ہو گا۔ میں تیری شادی میں موجود تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے اچھا تحفہ نہ دیا ہو۔ کیا اس لیے تو اپنی خالہ سے نہیں ملی؟''

''خالہ!'' لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ تیرے خالو باہر گئے ہوئے تھے اور تیرا شوہر صرف ایک دن دیکھنے سے تو مجھے جان نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں تجھے باہر نکال دوں گی، ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دیکھتی ہوں اب کوئی آکر کیا کہتا ہے۔''

ان کے گھر واپس آنے پر سرکار صاحب بولے۔ ''تم نے پہلے نہیں بتایا کہ وہ تمہاری بھانجی ہے۔''

بیگم نے کہا۔ ''میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میں پہلے ہی اپنی مصیبتوں میں گرفتار رہی۔ اب کہاں بھانجے بھانجیوں کی مصیبتیں جھیلتی رہوں۔''

''تو پھر ایسا کیوں کیا؟''

''جب ضرورت پڑتی ہے تو کودنا پڑتا ہے۔ آپ کو کیا پتا اس معاشرے میں کیسے لوگ ہیں جو کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔''

سرکار صاحب بولے۔ ''سچ سچ بتانا۔ کیا وہ تمہارے رشتے دار ہیں...؟ کیا تم جانتی ہو انہیں؟ تم کوئی غیر مذہبی کام تو نہیں کر رہیں؟''

''غیر مذہبی؟ مت ڈراؤ مجھے اپنے مذہب سے۔ بلیک مارکیٹنگ، نفع خوری، سود، کسی کی بیٹی کی شادی توڑنا، یا کسی کو بے روزگار کرنا، میرٹ کو تسلیم نہیں کرنا، لوگوں کے صحیح حقوق سے انکار، کہاں ہے مذہب ان سارے کاموں میں۔ اللہ کو انصاف کرنے دو۔ سماجی ورکر ہوتے ہوئے کیا آپ کھلا ذہن نہیں رکھ سکتے؟''

سرکار صاحب نادم ہوتے ہوئے باہر چلے گئے مگر دل میں وہ اپنی بیگم کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ خود بھی کسی کا گھر برباد ہوتا دیکھ کر بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ مصیبت دور ہو۔

انہوں نے بیگم کو کہتے سنا۔ ''کوئی بھی کسی کے مکان میں امن کا چراغ نہیں جلا سکتا۔ بلکہ ہر کوئی اسے بجھانا چاہتا ہے۔ مجھے پتا تھا جب صبح سویرے پلیٹیں ٹوٹی تھیں۔ تبھی میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ لوگ دنیا کا امن غارت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ سن رہے ہیں۔ اب سے یہ لڑکی نہ صرف میری بھانجی ہے بلکہ میری لے پالک بیٹی بھی ہے۔ سب سے کہہ دیں کہ اب شرارتیں کرنے سے باز آجائیں۔''

سرکار صاحب کے قدم رک گئے۔ انہیں احساس ہوا کہ ان کی تعلیم یافتہ، غائب دماغ اور وہمی بیوی کا دل کتنا خوب صورت ہے۔

شمسِ عرفان

ضیا تسنیم بلگرامی

اللہ اپنے خاص بندوں کی آمد کی پہلے سے ہی خبر کردیتا ہے۔ اسی تناظر میں آپ کی پیدائش کا بھی بہت سے لوگوں کو انتظار تھا۔ اس بات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کے یہاں آپ کا کتنا بلند مقام تھا... یہ رفعت و بلندی جس کے مقدر میں لکھ دی جائے سمجھو اسے زندگی کے پل پل کا کھرا حساب دینا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر آپ کو بھی آزمائشوں نے گھیرا لیکن... آپ کا حوصلہ آپ کی ڈھال بن گیا... پھر کیسے وہ ارفع مقام آپ سے دور رہتا۔

ایک عام انسان کے روپ میں اللہ کے ایک ولی کا منفرد اور خاص انداز

غزنی کے قصبے کلال گو میں مصری خان نامی ایک سردار کو اس لیے خصوصی شہرت حاصل تھی کہ اسے بیک وقت دین اور دنیا کی سعادت حاصل تھی۔ مصری خان کا بیٹا موکل خان افغانستان کے مشہور فاتح احمد شاہ درانی کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ ان دنوں مہمندزئی قبیلے کے بزرگ اور باکمال درویش گلزار محمد خان کے کشف و کرامات کا بڑا شہرہ تھا۔ موکل خان دنیا میں رہتے ہوئے بھی دین کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ وہ گلزار محمد خان کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ انہیں مرید کرلیا جائے۔

درویش گلزار محمد خان نے مراقبے میں دیکھا کہ ارادت مند ایک اعلیٰ منصب دار ہے تو آنکھیں کھول دیں اور پوچھا۔ ”کیا دنیا سے جی بھر گیا؟“

موکل خان نے جواب دیا۔ ”حضرت بابا، دنیا سے جی تو نہیں بھرا لیکن اب میں اپنے رب سے بھی جی لگانا چاہتا ہوں اور یہ

آپ کی توجہ کے بغیر ناممکن ہے۔"
درویش نے کسی قدر تامل سے کہا۔"لیکن موکل خان! مرید ہوجانے کے بعد میں تمہیں یہاں اپنے آس پاس نہیں رکھوں گا کیونکہ یہاں تمہاری کوئی ضرورت نہیں، تمہیں ہندوستان جانا پڑے گا۔"
موکل خان نے بلاتامل جواب دیا۔"میں ہر وقت حاضر ہوں پیرومرشد......آپ موقع تو دیں۔"
درویش نے کہا۔"سادہ لوح نوجوان! کیا میں جھوٹا ہوں، اگر تو ہندوستان جانا پسند کرتا ہے تو میں تجھ کو مرید کرلوں گا۔"
موکل خان نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور اپنے پیرومرشد کے قدموں میں بیٹھ گئے۔
کچھ دیر بعد موکل خان کو مرید کرلیا گیا۔ شیرینی تقسیم ہوئی، پیرومرشد گلزار محمد خان نے اپنے مرید موکل خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مریدوں سے کہا۔"آج میں نے ایک مضبوط اور جاندار شخص کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرلیا ہے۔ موکل خان احمد شاہ درانی کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب دار ہے۔ ایک اتنے بڑے دنیادار کا اپنے مرشد کی رضا کی خاطر اپنے منصب کو چھوڑ دینا قابلِ داد اور قابلِ تحسین ہے کیونکہ یہ احمد شاہ درانی کے دربار میں رہ کر میرے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا تھا۔"
کافی دیر بعد جب تخلیہ ہوگیا اور آہستہ آہستہ کرکے سارے مرید چلے گئے تو موکل خان نے اپنے پیرومرشد سے عرض کیا۔
"حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک سوال کرلوں؟"
پیر نے جواب دیا۔"اپنے دل میں کوئی بات نہ رکھ، جو پوچھنا ہے پوچھ لے۔"
موکل خان نے سوال کیا۔"کیا میرے ہندوستان چلے جانے میں کوئی خاص راز ہے؟ اور یہ کہ میں وہاں جاکر کروں گا کیا؟"
درویش گلزار محمد نے جواب دیا۔"وہاں کئی نسلوں بعد تیرے نسب سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو تیرے خاندان کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔ یہ تیرے اور تیرے نسب و نام کا مقدر ہے۔"
موکل خان نے پیرومرشد کی بات کو گرہ میں باندھ لیا اور انہوں نے احمد شاہ درانی کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کی راہ لی۔ روشن ضمیر پیر نے موکل خان کی تعلیم وتربیت کے لیے اپنے دو خلیفہ شیر خان غازی اور حاجی مڈکی کو ان کے ساتھ کردیا۔ موکل خان پنجاب میں داخل ہوئے اور ضلع ہوشیارپور میں جہاں جیلیوں کی زمین پر آباد ہوگئے۔
موکل خان سے سلسلہ چل نکلا۔ موکل خان کا وصال ہوا تو حریز خان کو اپنا جانشین چھوڑا۔ حریز خان کی جگہ ان کے بیٹے غلام محمد نے سنبھال لی اور غلام محمد اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے بیٹے شیر محمد خان نے اپنے کنبے کی کفالت کی۔ انہوں نے ریاست منڈی میں ملازمت اختیار کرلی۔ شیر محمد خان کی عمر بتیس سال چھ ماہ کی ہوئی تو ان کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ 1204ھ کا واقعہ ہے۔ بچہ اتنا حسین تھا کہ دیکھنے والوں کی بچے کے چہرے پر نظر نہیں ٹکتی تھی۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت بچے کو دیکھتے ہی رہیں۔ باپ کو بچے کے نام کی فکر تھی۔ آخر ایک دن نام القا ہوگیا اور نومولود کا نام دیدار بخش رکھ دیا گیا۔ پہلی بار نام رکھنے میں خاندانی روایت کو یکسر نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اصل نام میں --- ہر نام کے ساتھ خان ضرور لگتا تھا لیکن اب خان کی جگہ بخش نے لے لی تھی۔
دیدار بخش دل کا سرور اور آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا کہ پانی کی طرح بہتے ہوئے پُرسکون تالاب میں قدرت نے ایک پتھر مارا اور شیر محمد خان رحلت فرما گئے۔ اس وقت دیدار بخش کی عمر صرف ڈھائی سال تھی۔ بیوی کو اپنے شوہر کی موت کا بڑا غم تھا۔ ابھی لوگ ان کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ننھے دیدار بخش بہ عارضہ چیچک بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ علاج معالجہ بھی ہوتا رہا لیکن ہر وہ شخص جو دیدار کی حالت قریب سے دیکھ چکا تھا، ناامیدی ہی ظاہر کرتا تھا۔
آخرکار یہ ننھا پودا دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا گیا اور دیدار بخش کا انتقال ہوگیا۔ گھر میں ایک کہرام سا برپا ہوگیا۔ لوگوں نے دیدار بخش کو چھپانے کی کوشش کی مگر یہ راز، راز نہیں رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر دیدار بخش کی ماں نے اپنے لاڈلے کی لاش دیکھ لی تو یہ صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجائے گا اور بہت ممکن ہے کہ ماں پر بھی دل کا دورہ پڑ جائے اور وہ چل بسیں۔ دیدار بخش کی لاش ان سے چھپادی گئی۔ ماں اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ ایک ایک کی خوشامد کرتی پھرتی تھی کہ خدارا آخری بار اس کا دیدار توکرادو ورنہ یہ حسرت زندگی بھر کے لیے رہ جائے گی۔
غم گساروں نے کہا۔"بی بی! جو ہونا تھا ہوچکا۔ مشیتِ ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ صبر کرو کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"
عزیز رشتے دار بچے کی تجہیز وتکفین میں مصروف تھے۔ ماں نے کہا۔"میں یہ چاہتی ہوں کہ تدفین سے پہلے میرے بچے کی

شکل دکھادی جائے۔''

لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بالاتفاق یہ طے پا گیا کہ بچے کی شکل ضرور دکھا دینی چاہیے۔ کفن میں لپٹا ہوا بچہ ماں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ماں نے حاضرین سے درخواست کی کہ کچھ دیر کے لیے سب باہر چلے جائیں تاکہ وہ اپنے بچے کو جی بھر کر دیکھ سکیں۔ لوگ باہر چلے گئے۔ ماں نے اٹھ کر پہلے تو دروازے کو اندر سے بند کرلیا اس کے بعد بچے کو گود میں لے کر دوسرے دروازے سے نکل گئی اور سیدھا درویش نادر علی شاہ کے پاس چلی گئی۔ یہ بزرگ اپنے غیر معمولی تصرفات اور کرامات میں غیر معمولی شہرہ رکھتے تھے۔ اس وقت شاہ صاحب آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ انہماک اور خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ کون آیا اور کون گیا، خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ ماں نے کفن اتار کر برہنہ بچہ نادر علی شاہ کے زانو پر رکھ دیا اور سامنے سے ہٹ گئیں۔ شاہ صاحب کے خادم نے انہیں اس حرکت سے منع کرنا چاہا لیکن اس خیال سے چپ رہا کہ اس کے بولنے سے شاہ صاحب کے مراقبے میں فتور پیدا ہوجائے گا لیکن وہ جیسے ہی وہاں سے ہٹیں، خادم نے ان کا راستہ روک لیا، پوچھا۔ ''بی بی! یہ کیسے شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں شیر محمد خان کی بیوہ اور اس بچے کی ماں ہوں۔ شوہر کے بعد بیٹا بھی چھین لیا گیا۔ اب میں اپنے دیدار بخش کو شاہ صاحب کے حوالے کیے جارہی ہوں۔ وہ اس کا جو چاہیں کریں۔ دفن کرادیں، گھوڑے پر پھکوادیں، اپنے پاس رکھیں، جو جی چاہیں کریں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔''

خادم نے کہا۔ ''بی بی! یہ آپ نے کیا غضب کردیا کہ مردہ بچے کو شاہ صاحب کے زانو پر رکھ آئیں۔''

اتنے میں شاہ صاحب نے خادم کو آواز دی۔ خادم نے خاتون سے کہا۔ ''بی بی! ابھی جانا مت، میں ذرا شاہ صاحب کی بات سن لوں کیا فرماتے ہیں؟''

خادم شاہ صاحب کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ خادم نے پوچھا۔ ''جی شاہ صاحب! فرمایئے میں حاضر ہوں۔''

شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''یہ میرے زانو پر گیلی گیلی کیا چیز رکھی ہے؟''

غلام نے ڈرتے ڈرتے سب کچھ بتادیا۔ آپ نے بے پروائی سے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ مرحوم بچہ دیدار بخش ہے نا؟ یہ اس کو کیا ہوگیا؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! میں نے عرض جو کیا کہ شیر محمد کی بیوہ کا یہ اکلوتا بیٹا تھا جو چیچک میں رخصت ہوگیا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے مگر دیدار بخش تو ایک بزرگ ہستی کا باپ ہے۔ یہ مر کس طرح گیا؟'' پھر خود ہی فرمایا۔ ''یہ مرا نہیں ہے سکتہ ہوگیا ہوگا، اگر یہ مرگیا تو مشیتِ ایزدی کس طرح پوری ہوگی؟'' پھر سوال کیا۔ ''دیکھ، یہاں آس پاس کوئی گڑھا ہے جس میں پانی بھی ہو۔''

خادم نے جواب دیا۔ ''جی شاہ صاحب! چھوٹا سا گڑھا ہے تو سہی، اس میں کچھ پانی بھی بھرا ہوا ہے۔''

شاہ صاحب نے حکم دیا۔ ''تو پھر ایسا کرو کہ دیدار بخش کو پانی میں ڈال دو اور اس سے کہہ دو کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ بہت زیادہ سولیے۔ اب جاگ بھی جاؤ۔''

خادم نے بچے کو اٹھا کر پانی میں ڈال دیا اور خاموشی سے پاس کھڑے ہو کر اس کا مشاہدہ کرنے لگا۔

دوسری طرف شاہ صاحب سجدے میں گر گئے اور رو رو کر فرمایا۔ ''میرے مولا! میں نے لوحِ محفوظ میں دیدار بخش کو زندہ اور صاحبِ اولاد دیکھا ہے پھر یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ دیدار بخش تو ایک عظیم شخص کا باپ ہے۔ اگر یہ دم سادھے قبر میں اتر گیا تو پھر وہ عظیم اور بزرگ شخص کس طرح آئے گا؟''

شاہ صاحب گڑگڑا رہے تھے اور خادم دیدار بخش کا معائنہ کررہا تھا۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ دیدار بخش کا ایک انگوٹھا حرکت میں ہے پھر پورے ہاتھ کو حرکت ہوئی۔ اس کے بعد دونوں پاؤں سکیڑ لیے اور آخر میں آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔

خادم نے دیدار بخش کو گود میں لے لیا اور شاہ صاحب کے زانو پر بٹھادیا۔ شاہ صاحب مسکرائے لیکن ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ پوچھا۔ ''اس کی ماں کہاں ہے؟''

خادم نے جواب دیا۔ ''باہر موجود ہے۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اس کو بلاؤ۔''

خادم دیدار بخش کی ماں کو بلا لایا۔ انہوں نے اپنے زندہ بیٹے کو شاہ صاحب کے زانو پر بیٹھے پایا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

پوچھا۔ ''کیا یہ دیدار بخش ہے، میرا بیٹا، میرا لاڈلا؟''
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''بی بی! زیادہ باتیں نہ کر اور اس کو اپنے گھر لے جا۔''
ماں نے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! اب یہ آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اس کو آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔ میں اپنے گھر لے جا کر کیا کروں گی؟''
شاہ صاحب نے سکوت اختیار فرمایا۔ اس کے بعد کہا۔ ''اچھا اگر یہ بات ہے تو مجھ کو یہ بات بھی منظور ہے۔ میں ہی اس کی پرورش کرلوں گا۔''
جہاں خیلیوں میں جب نادر علی شاہ کی اس کرامت کا چرچا ہوا تو ہر کوئی ان کی زیارت کو پہنچنے لگا۔ شاہ صاحب دیدار بخش کی پرورش خود ہی کرنے لگے۔

☆☆☆

دیدار بخش کی پرورش اور تعلیم و تربیت نادر علی شاہ فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ جب یہ چوبیس سال کے ہوگئے تو شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت اور دستارِ فضیلت سے سرفراز فرمائے گئے۔ نادر علی شاہ ایک سو پچیس سال کی عمر میں وصال فرما گئے۔ دیدار بخش غمگین اور دل برداشتہ کشمیر چلے گئے اور وہیں ملازمت کرلی تینتیس سال کی عمر میں ان کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوگئی۔ ان مجذوب کا نام احمد شاہ تھا۔ دیدار بخش کو جب بھی چھٹی ملتی، مجذوب احمد شاہ کی خدمت میں چلے جاتے۔
ایک دن احمد شاہ نے آنکھیں کھول کر دیدار بخش کی طرف دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا۔ ''دیدار بخش! کیا تو نے شادی کرلی؟''
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ''ابھی تو شادی نہیں کی میں نے۔''
احمد شاہ نے فرمایا۔ ''پھر اپنے وطن واپس جا اور شادی کرلے کیونکہ جس قطب کو آنا ہے، وہ ضرور آئے گا اور اس کے لیے شادی بہت ضروری ہے۔''
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ''حضرت! شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ جو وقت خدا کی یاد میں بسر ہوجائے بہت غنیمت ہے۔ شادی کے بعد انسان بیوی بچوں میں پھنس کر خدا کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے۔''
احمد شاہ نے اصرار کیا۔ ''کچھ بھی سہی، شادی تجھ کو کرنا ہی پڑے گی۔''
دیدار بخش مجبور ہوگئے اور کشمیر کے راجا سے رخصت لے کر وطن روانہ ہوگئے۔ دورانِ سفر دینا نگر نامی گاؤں میں ان کی ملاقات ایک اور درویش سے ہوئی۔ انہوں نے دیدار بخش کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ''کیا تو شادی کرنے جارہا ہے؟''
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ''ارادہ تو یہی ہے لیکن پتا نہیں شادی ہوگی بھی یا نہیں اور پھر یہ کہ مجھ سے شادی کون کرے گی؟''
درویش نے کہا۔ ''میاں جو تم نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ ضلع ہوشیار پور جارہے ہو نا؟''
دیدار بخش نے جواب دیا۔ ''ہاں! وہیں جارہا ہوں۔''
درویش نے انہیں سمجھایا۔ ''ہوشیار پور کے موضع میانی سے پرے جلال خان نامی ایک بستی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں تمہاری شادی ہوگی۔ تیری بیوی کا نام زہرہ خاتون ہوگا۔ اس کے بطن سے وہ ولی پیدا ہوگا جس کی کئی درویش بشارتیں دے چکے ہیں۔''
دیدار بخش سیدھے بستی جلال خان پہنچ گئے۔ اس بستی میں وہ لوگ آباد تھے جن کی رشتے داریاں جہاں خیلاں والوں سے چلی آرہی تھیں۔ یہاں پر دیدار بخش کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گامن خان نامی ایک معزز شخص نے دیدار بخش کی بڑی خاطر مدارات کی اور خود ہی اپنی بیٹی زہرہ خاتون کا رشتہ پیش کیا۔ دیدار بخش سناٹے میں رہ گئے۔ انہوں نے گامن خان سے کہا۔ ''جناب! مجھے آپ سے اتفاق ہے اور میں آپ کی فرزندی میں آنے کو تیار ہوں لیکن یہ تمام باتیں بڑوں کی طرف سے طے پائیں گی۔ میں اپنے خاندان میں واپس جارہا ہوں، وہ لوگ رشتہ مانگنے آئیں گے۔''
گامن خان کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا، راضی ہوگئے۔ دیدار بخش جہاں خیلاں واپس آگئے اور اپنے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کی غرض سے بستی جلال خان بھیج دیا۔ رشتہ منظور ہوا اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ آخر دیدار بخش جہاں خیلاں والوں کے ساتھ مقررہ تاریخ پر بستی جلال خان پہنچ گئے۔ یہ بستی جہاں خیلاں سے تیس میل کے فاصلے پر آباد تھی۔ شادی بخیر و خوبی انجام پاگئی۔
انہی خاتون سے بروز دوشنبہ 17 شوال 1237ھ (1822ء) ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام قادر بخش رکھا گیا۔ دیدار بخش اس بچے میں وہ ساری باتیں محسوس کررہے تھے جو انہیں مختلف درویشوں کی پیش گوئیوں سے معلوم ہوتی رہی تھیں۔
قادر بخش پانچ سال کے ہوئے تو انہیں قرآن پاک کی تعلیم دی جانے لگی۔ دیدار بخش اپنی ملازمت پر واپس کشمیر چلے گئے

لیکن جانے سے پہلے اپنی بیوی کو بطورِ خاص نصیحت کی کہ ان کی عدم موجودگی میں بھی قادر بخش کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے۔ قادر بخش نے دو سال کی مدت میں قرآن پاک کو ختم کیا۔ اب یہ سات سال کے تھے۔ دیدار بخش نے کشمیر سے آکر بیٹے کی کامیابی پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ انہیں اپنے بیٹے میں وہ تمام آثار نظر آرہے تھے، جن کا ایک عرصے سے تذکرہ ہوتا آرہا تھا۔ انہوں نے کشمیر واپس جانے سے پہلے اپنے سات سالہ بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے قادر بخش! میں اپنی ملازمت پر واپس کشمیر جا رہا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ بہر حال میں تم سے یہی کہوں گا کہ اپنی تعلیم پر خاص توجہ دینا اور میری روح کو شرمندہ نہ ہونے دینا۔''

دیدار بخش واپس کشمیر چلے گئے اور کچھ دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین بھی کشمیر ہی میں ہوئی اور وہاں یہ پنجابی پیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ قادر بخش پر اپنے باپ کی وفات کا بڑا اثر ہوا مگر تعلیم کی حصول یابی میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ اردو، فارسی اور دینی تعلیم میں خاص ملکہ حاصل کر چکے تھے۔ پھر وہ کھیتی باڑی میں مصروف ہو گئے۔

جب چودہ سال کے ہوئے تو معلوم نہیں کس بات پر ان کا دل اپنے آبائی گاؤں سے اکتا گیا اور وہ جہاں خیلاں کی سکونت ترک کر کے تن تنہا لدھیانہ میں جا بسے اور انگریز فوج میں ملازم ہو گئے۔ انہی دنوں انگریزوں اور افغانوں میں جنگ چھڑ گئی اور انگریزوں نے کابل پر چڑھائی کر دی۔ قادر بخش کو بھی کابل جانا پڑا۔ جنگ ختم ہوئی۔ انگریز فوجیں واپس ہوئیں لیکن قادر بخش انگریزوں کی ملازمت چھوڑ کر کابل ہی میں رہ گئے۔ یہ پانچ سال تک کابل میں رہے۔ ان کا دل دنیا سے اکتا چکا تھا۔ یہ اکثر روتے رہتے۔ ان کا دل بے حد گداز تھا۔ ان دنوں کابل میں قادری سلسلے کے شاہ عنایت اللہ کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ ان کے پاس پہنچے اور ان کی مریدی اختیار کر لی۔ شاہ عنایت اللہ نے انہیں اپنا خلیفہ بنا کر رخصت کر دیا۔ یہ پشاور کی راہ سے واپس آئے اور کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا۔ لاہور سے تنگھ شریف پہنچے اور اپنے عہد کے یگانہ روزگار صوفی شاہ سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ تھے۔ قادر بخش ان کی نسبت اور خلافت لے کر کشمیر چلے گئے۔ باپ کے مزار پر حاضری دی۔ فاتحہ پڑھی اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''بادا جان! آپ اس وقت ہم میں موجود نہیں ہیں ورنہ آپ خود ملاحظہ فرماتے کہ میں نے آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دیا۔''

یہاں سے فارغ ہوئے تو سید احمد نامی درویش کی خدمت میں حاضری دی۔ یہ سہروردیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔ قادر بخش نے ان سے بھی خلافت حاصل کر لی۔ یہاں سے جالندھر پہنچے۔ ان دنوں جالندھر اور اس کے آس پاس دور دور تک حاجی محمود کا بڑا چرچا تھا۔ قادر بخش بھی ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست محمد بخش سے پوچھا۔ ''بھائی میرے! کسی ایسے شخص کا نام بتا جس کی مریدی پر میں فخر کر سکوں۔''

محمد بخش نے جواب دیا۔ ''بھائی قادر بخش! یہاں تو حاجی محمود ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جو خدا کا نام لینا سکھا دیتے ہیں۔ اگر چاہو تو ان سے ملاقات کر لو۔''

قادر بخش نے کہا۔ ''تب تو پھر تو مجھ کو ان کے پاس لے چل۔ میں ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

محمد بخش انہیں ساتھ لے کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گیا۔ قادر بخش کی حاجی محمود پر جیسے ہی نظر پڑی، ان کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کچھ دیر بعد حاجی محمود نے مراقبے سے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا۔ ''یہ تو کیوں رو رہا ہے؟ تجھے یہ ہو کیا گیا ہے؟''

قادر بخش نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! میں نے یہاں آتے ہی اپنے آپ میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوتے محسوس کر لی ہیں۔ میں آپ کی صحبت میں رہنا اور کچھ وقت دینا چاہتا ہوں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ میں ملازم ہوں اور ملازم ہونے کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضری دینا مشکل ہے مگر اب جبکہ میں آ گیا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔''

حاجی محمود نے جواب دیا۔ ''بچے تو گھبراتا کیوں ہے۔ تیرا ہر کام ہو جائے گا، کوئی کام رکے گا نہیں۔ ادھر تو نیت کرے گا، دوسری طرف تیرے کام بنیں گے۔''

قادر بخش نے عرض کیا۔ ''حضرت! تسلیوں سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو آپ سے کچھ لے کر رہوں گا۔''

حاجی محمود نے فرمایا۔ ''اچھا، پہلے اللہ کا نام تو سیکھ لے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔''

قادر بخش حاجی محمود کی خدمت میں رہنے لگے۔ یہاں پیر و مرشد نے اپنے ارادت مند کی تربیت شروع کر دی اور کچھ ہی دنوں میں وہ اثر ظاہر ہوا کہ خود حاجی محمود کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے قادر بخش سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، تجھ کو اپنے پیر و مرشد مولوی محمد شریف کے پاس لے چلوں۔''

قادر بخش نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں آپ کا بندۂ بے دام ہوں۔ جہاں فرمائیں گے، آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''
حاجی محمود، قادر بخش کو اپنے پیر و مرشد کے پاس لے گئے اور استدعا کی۔ ''قادر بخش کو اپنا مرید فرمالیں۔''
مولوی محمد شریف نے قادر بخش کو بڑی توجہ کی نظر سے دیکھا۔ ''لیکن حاجی محمود! میں تو اس میں کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں۔''
حاجی محمود نے دوبارہ درخواست کی۔ ''حضرت! میری استدعا ہے کہ قادر بخش کو آپ مرید کرلیں۔''
مولوی صاحب نے فرمایا۔ ''لیکن اس میں تو پہلے ہی سے بزرگی کے آثار ہیں اور اس بزرگی میں تیرے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو میں کیا مرید کروں، یہ تو تیرا پہلے ہی مرید ہو چکا ہے۔''
حاجی محمود نے لجاجت سے کہا۔ ''حضرت! آپ کی موجودگی میں بھلا......''
مولوی شریف نے سختی سے حکم دیا۔ ''بھلا ولا کچھ نہیں۔ تو مرید کر، میرے سامنے مرید کر۔ میں اسی میں خوش ہوں۔''
حاجی محمود نے اپنے پیر و مرشد کے حکم پر قادر بخش کو مرید کرلیا۔ اب مرید نے اپنے پیر و مرشد کی چوکھٹ کو مستقلاً پکڑلیا۔ دنیاداری سب چھوٹ گئی۔ حاجی محمود نے پوچھا۔ ''کیا تو اپنے کام پر واپس نہیں جائے گا؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''اب میں اس در کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔''
حاجی صاحب نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے تو بین بہت اچھی بجاتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''کبھی بین بجایا کرتا تھا پیر و مرشد۔ لیکن اب آپ کی صحبت اور تربیت کے طفیل ایک اور ہی بین بجانے لگا ہوں۔''
حاجی صاحب نے اصرار کیا۔ ''ذرا مجھ کو تو سنا بین۔''
مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھ کو شرمندہ نہ کیجیے۔''
حاجی صاحب نے مزید اصرار نہیں کیا، فرمایا۔ ''اچھا تیری مرضی۔''
اب قادر بخش کا یہ حال ہو چکا تھا کہ کسی وقت بھی اپنے پیر و مرشد سے جدا ہونے کو تیار نہ ہوتے۔ ان کی ماں ابھی بقید حیات تھیں اور بیٹے کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتیں۔ کچھ دنوں تک تو بیٹے کی غیر حاضری کا کوئی خاص سبب نہیں معلوم ہو سکا لیکن جب تجسس بڑھا تو یہ بات بھی ان کے علم میں آگئی کہ بیٹے نے حاجی محمود کے ہاتھ پر بیعت کر کے درویشی اختیار کرلی ہے۔ یہ دل ہی دل میں مشتعل اور آگ بگولا حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گئیں، اپنے بیٹے کو حاجی محمود کی خدمت میں مؤدبانہ بیٹھا دیکھ کر وہ گرم ہوگئیں۔ بیٹے سے پوچھا۔ ''بیٹے قادر بخش! تو نے کیا حال بنایا ہے۔''
قادر بخش نے پوچھا۔ ''ماں! کیا میرا حال برا نظر آرہا ہے آپ کو؟''
ماں نے کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں ہے بیٹے۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ تو نے درویشی کیوں اختیار کرلی؟ اس میں کیا راز ہے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''ماں! یہ دنیا مسافر خانہ ہے پھر میں اس سے دل لگا کر کیا کروں؟''
ماں نے عاجزی سے کہا۔ ''لیکن بیٹے میرے تو بڑے ارمان ہیں۔ وہ کس طرح پورے ہوں گے؟''
قادر بخش نے جواب دیا۔ ''ماں! دنیا کے جال میں مت پھنسیے۔ جو اس جال میں پھنسا، اس کا برا حال کردیتی ہے دنیا۔ فکر وہاں کی کیجیے گا جہاں مستقل رہنا ہے۔''
ماں، بیٹے کی باتوں سے زچ ہو کر حاجی محمود کی خدمت میں پہنچ گئیں اور کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا کردیا؟''
حاجی محمود نے پوچھا۔ ''میں نے کیا کردیا؟''
ماں نے جواب دیا۔ ''آپ نے میرے بیٹے کو درویش بنالیا۔ آخر کیوں؟''
حاجی صاحب نے فرمایا۔ ''تیرے بیٹے کو میں نے درویش نہیں بنایا۔ اس کو تو اللہ نے پہلے ہی سے درویش بنا رکھا تھا۔ میں نے تو بس ذرا سی جلا دے دی ہے اس کی درویشی میں۔''
ماں کو رونا آگیا۔ بولیں۔ ''لیکن میں اب کیا کروں؟''
حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ''بیٹے کی اختیار کردہ راہ پر تو بھی چل پڑ۔ بس اسی میں نجات ہے۔''
ماں پر مایوسی کا اتنا غلبہ تھا کہ اس کے زیر اثر بولیں۔ ''میں آپ کی مریدی کا حلقہ اپنے گلے میں ڈالنا چاہتی ہوں۔''
حاجی محمود نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا اور قادر بخش کی ماں بھی حاجی صاحب کے مریدوں میں داخل ہوگئیں۔ قادر بخش کو جب یہ خبر ملی تو وہ دیوانہ وار ماں کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سینے سے لگا کر رونا شروع کردیا۔ قادر بخش کے گریہ نے ماں کو بھی متاثر

کیا اور وہ بھی رونے لگیں۔

ایک دن حاجی محمود نے قادر بخش کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا "اب کہیں ملازمت کرلو۔"

قادر بخش نے جواب دیا۔ "حضرت! اگر میں ملازمت کروں گا تو اس سے میری عبادت اور ریاضت میں فرق آجائے گا۔"

حاجی صاحب نے سختی سے فرمایا۔ "یہ میری ہی نہیں، تیری ماں کی بھی خواہش ہے۔"

قادر بخش نے عاجزی سے کہا۔ "آپ لوگ مجھے دنیاداری میں پھنسانا چاہتے ہیں۔"

حاجی صاحب نے نرمی سے سمجھایا۔ "قادر بخش! میں تجھ کو ایک ایسی ملازمت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں لوگوں کی خدمت کا موقع ملے گا اور اگر تو اس جگہ اپنے زہد اور تقویٰ پر قائم رہا تو تیرے درجات بلند ہوں گے اور وہاں کا تیرا ہر نیک عمل ثواب اور بزرگی میں اضافے کا سبب بنے گا۔"

قادر بخش نے پوچھا۔ "ایسی کون سی ملازمت ہے پیر و مرشد؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا۔ "پولیس کی ملازمت۔ پولیس کی ملازمت تیرے لیے آزمائش ثابت ہوگی۔ اگر تو نے اس ملازمت میں خود کو سنبھالے رکھا تو تجھے وہ مقام حاصل ہوجائے گا کہ دوسرے ایک عمر کی ریاضتِ شاقہ کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہیں کرسکتے۔"

مرشد کا حکم اور ماں کی خواہش پر قادر بخش مجبور ہوگئے۔ انہوں نے محکمۂ پولیس میں ملازمت کرلی اور راہوں نامی ایک قصبے میں تعینات ہوگئے۔ ان کی عادات اور اطوار پولیس والوں سے مختلف تھیں۔ محکمے کے لوگ ان کی ایمان داری، خدا ترسی اور خدمتِ خلق سے تنگ آگئے۔ قادر بخش ہمیشہ مجرموں اور بے گناہوں سے ایک جیسا سلوک نہیں کرتے تھے۔ جب تک کسی کا جرم ثابت نہیں ہوجاتا، اس کے خلاف کوئی ضابطے کی کارروائی نہ کی جاتی۔ کسی بے گناہ کو ستایا نہ جاتا۔ رشوت نام کی کسی چیز کا آپ کو گویا علم ہی نہ تھا اور زندگی بڑی عسرت میں بسر ہورہی تھی۔

انگریز ان کی دیانت داری اور ایمان داری سے اتنے خوش ہوئے کہ وہ ڈپٹی انسپکٹر بنادیے گئے اور کچھ عرصے بعد انسپکٹر بن گئے۔

راتوں کو تہجد گزاری اور شب بیداری کا سلسلہ جاری تھا۔ ان کے روحانی تصرفات نے ارادت مندوں کو ان کے اردگرد جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ محکمۂ پولیس کے لوگوں کو بھی آپ کے مقام کا کسی حد تک اندازہ ہوگیا تھا۔ ایک رات تقریباً ایک بجے انہوں نے اپنے مرید امیر خان کو آواز دی، پوچھا۔ "امیر خان! کیا سوگئے؟"

امیر خان فوراً ہی ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بولے۔ "جی میں بیدار ہوں، کوئی حکم؟"

آپ نے فرمایا۔ "سلیمان خان جمعدار کو بلاؤ۔ ابھی ابھی میرے حلقے سلیم پور میں ایک قتل ہوگیا ہے۔"

امیر خان نے پوچھا۔ "حضرت! کیا کوئی بلانے آیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی میں مراقبے میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ یاسین اور اکرم اپنے چچا کے بیٹے قربان علی کو قتل کررہے ہیں۔ ان دونوں نے مقتول کو دریا کے کنارے ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور اپنے گھر میں جاکر سوگئے۔"

امیر خان نے سلیمان خان کو بلادیا۔ آپ نے سلیمان خان کو ہدایت کی۔ "سلیمان خان! تم چند سپاہیوں کو لے کر دریا کے کنارے اس جھاڑی کے پاس پہنچ جاؤ جو شیشم کے ایک پیڑ تلے ہے۔ اس جھاڑی میں قربان علی کی لاش پڑی ہے۔ اس کو اپنے قبضے میں کرو اور پھر مقتول کے چچازاد بھائی اکرم اور یاسین کے پاس جاؤ اور انہیں گرفتار کرکے میرے پاس لے آؤ۔"

سلیمان خان کو حکم ماننے میں تامل ہوا، پوچھا۔ "حضرت! کیا کسی نے پرچہ چاک کرایا تھا اس قتل میں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں جو کہہ رہا ہوں۔ پرچہ بعد میں چاک کردیا جائے گا۔"

سلیمان خان اپنے ساتھ چند سپاہیوں کو لے کر مذکورہ جھاڑی میں پہنچا تو وہاں قربان علی کی لاش مل گئی۔ ان سب کو بڑی حیرت ہوئی مگر ابھی قاتلوں کی گرفتاری باقی تھی۔ سلیمان مقتول کے چچازاد بھائی اکرم اور یاسین کے پاس پہنچا اور دونوں کو گرفتار کرکے قادر بخش کے پاس لے آیا۔ اس عجیب و غریب واقعے نے ہر کسی کو ششدر اور حیرت زدہ کردیا۔ انہوں نے قاتلوں سے پوچھا۔ "مقتول نے تم دونوں کا کیا بگاڑا تھا؟ اس کو کیوں قتل کیا؟"

اکرم نے جواب دیا۔ "میں نے اس کو قتل نہیں کیا۔ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا جارہا ہے۔"

یاسین نے کہا۔ "میں بھی اپنی بے گناہی کا اعلان کرتا ہوں۔ میں تو مقتول کا چچازاد بھائی ہوں پھر میں اس کو کیسے قتل کرسکتا تھا؟"

آپ نے دونوں سے کہا۔ "دیکھو جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تم دونوں مقتول کی زمین ہتھیانا چاہتے تھے اس لیے اس کو

قتل کر دیا اور اب زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ تم دونوں اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف قتل کے منصوبے بنا رہے ہو۔''
اکرم کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ ''نہیں حضرت! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔''
یاسین نے اکرم کو بھڑک دیا۔ ''تو غلط کہہ رہا ہے۔ تو نے ایسا ضرور سوچا ہوگا لیکن وہ تو خیریت یہ گزری کہ خواجہ قادر بخش انسپکٹر نے اس کا انکشاف کر دیا۔''
اکرم نے کہا۔ ''اب زبان نہ کھلواؤ۔ قربان علی کے قتل کا منصوبہ بھی تم ہی نے بنایا تھا۔ مجھ کو تو اس میں مجبوراً شریک ہونا پڑا ہے اور اب میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔''
یاسین نے زیادہ گرمی دکھائی، غصے میں بولا۔ ''اب زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ قربان علی کی پشت سے اس کی گدی پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ کس نے رسید کیا تھا؟''
اکرم نے اشتعال میں بکنا شروع کر دیا۔ ''بے شک میں نے گنڈاسے سے اس کی گدی پر حملہ کیا تھا لیکن میرا وار اوچھا پڑا تھا۔ قربان علی کا پیٹ تو تم نے چاک کیا تھا۔''
خواجہ قادر کا مرید امیر خان اور پولیس کے سلیمان خان اور سپاہی حیرت زدہ تھے کہ دونوں کتنی آسانی سے اقبالِ جرم کر رہے ہیں۔ ان کے اس یقین میں زیادہ مضبوطی آ گئی کہ خواجہ قادر صاحب کمال روحانی شخص ہیں۔
دونوں قاتلوں پر مقدمہ چلا اور انہیں موت کی سزا سنا دی گئی۔ لیکن محکمۂ پولیس کا ایک ایک فرد خواجہ قادر کا قائل ہو چکا تھا۔ محکمے میں ایسے بھی لوگ تھے جو ان کے روحانی تصرفات کے قائل نہیں تھے۔ وہ آپس میں باتیں کرتے تو خواجہ قادر کا مذاق اڑاتے اور کہتے۔ ''جناب! انسپکٹر صاحب کو اس قتل کے بارے میں کسی نے سب کچھ ضرور بتا دیا ہوگا۔ ورنہ انہیں اتنی بہت ساری باتیں کشف سے نہیں معلوم ہو سکتیں۔''
کوئی دوسرا کہتا۔ ''ہاں، کسی نہ کسی نے مخبری ضرور کی ہوگی۔''
اس واقعے کو گزرے ایک سال کا عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک رات وہ مراقبے سے نکل کر باہر آ گئے اور سلیمان خان کو حکم دیا۔ ''گھوڑا تیار کرو میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔''
سلیمان خان نے پوچھا۔ ''حضرت جی، جانا کہاں ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''ساہوکار اللہ دتہ کے گھر۔''
سلیمان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا آج ساہوکار کو بھی کسی نے قتل کر دیا ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں بلکہ ساہوکار کے گھر چوری ہو گئی ہے۔ بہت بڑی چوری ہوئی ہے اور میں نے چوروں کو پہچان لیا ہے۔''
سلیمان خان نے کہا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہاں آپ کیوں جائیں، ہمیں حکم دیجیے۔ چوروں کے نام اور پتے بتا دیجیے ہم ساہوکار سے چوری کی تصدیق کر کے چوروں کو پکڑ لائیں گے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا چلو، یوں ہی سہی۔ ذرا جمعدار غلام محمد کو بھی بلوا لو کیونکہ وہ ساہوکار سے بھی واقف ہے اور چوروں کو بھی پہچانتا ہے۔''
سلیمان نے اسی وقت غلام محمد جمعدار کو بلوا لیا۔ آپ نے غلام محمد کو حکم دیا۔ ''غلام محمد! تو سلیمان خان اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر ساہوکار اللہ دتہ کے گھر چلا جا اور اس سے پوچھ کہ تیرا کیا کیا سامان چوری ہوا ہے۔ سامان کی فہرست تیار کر کے سکندر، رحمت اور ننھا کے گھروں پر چلا جا، یہ تینوں راج ہیں۔ مکان بناتے ہیں۔ یہی تینوں چور ہیں۔ سکندر کے گھر کے باہر بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ تینوں نے چوری کا مال اسی بھوسے کے انبار میں چھپایا ہے۔ وہاں سے سامان برآمد کر کے ساہوکار کی فہرست سے ملا لو اور تینوں چوروں کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔''
سلیمان خان اور غلام محمد جو کچھ سن رہے تھے، اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن ان کے کمالات اور تصرفات ثابت ہو چکے تھے۔ اس لیے مجبوراً ساہوکار اللہ دتہ کے گھر پہنچ گئے۔ ساہوکار نے پولیس کو اپنے در پر دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟''
غلام محمد نے جواب دیا۔ ''انسپکٹر خواجہ قادر بخش نے۔''
ساہوکار نے پوچھا۔ ''مگر کس لیے؟''
غلام محمد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''وہ فرماتے تھے کہ انہوں نے مراقبے میں دیکھا ہے کہ تمہارے گھر میں چوری ہو گئی ہے،

بہت بڑی چوری۔''

ساہوکار رونے لگا۔ ''مگر اس چوری کی خبر انہیں کس نے دی؟ میں تو برباد ہوگیا، تباہ ہوگیا، لٹ گیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔''

غلام محمد نے کہا۔ ''تم اپنے مسروقہ مال کی ایک فہرست تیار کرادو، چور ابھی پکڑے جائیں گے اور تمہارا سامان بھی برآمد ہوجائے گا۔''

ساہوکار نے مسروقہ مال کی فہرست تیار کردی۔ اس کے بعد غلام محمد اور سلیمان خان سپاہیوں کے ساتھ دریاپور نامی بستی میں گئے کیونکہ سکندر، رحمت اور نتھا راج اس بستی میں رہتے تھے۔ تینوں اپنے اپنے گھروں میں سونے کی کوشش کررہے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے دروازوں پر پولیس دیکھی تو پریشان بھی ہوئے اور خوفزدہ بھی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کی مخبری کس نے کردی۔ غلام محمد اور سلیمان خان نے ان تینوں کو گرفتار کرلیا اور سکندر کے دروازے پر بھوسے کے انبار میں سے چوری کا مال برآمد کرلیا۔ چوروں کو سامان سمیت انسپکٹر خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ یہ لوگ صبح تک حوالات میں رہے۔

صبح کو ساہوکار اللہ دتہ کو بھی بلوالیا گیا۔ تینوں چور آپس میں شک وشبہ کررہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہی میں سے کسی نے مخبری کرکے پکڑوادیا ہے۔ تینوں آپس میں جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے کو الزام دینے لگے۔

غلام محمد نے ان تینوں سے کہا۔ ''ارے احمقو! تم آپس میں بلاوجہ جھگڑ رہے ہو۔ جب تک ہمارے درمیان انسپکٹر خواجہ قادر بخش موجود ہیں، ہمیں کسی کی مخبری کی ضرورت ہی نہیں۔''

چور ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ غلام محمد نے کہا۔ ''ایک دوسرے کی شکل کیا دیکھتے ہو۔ تم لوگ اندھے ہو کہ اپنے علاقے کے باکمال روحانی شخص کو نہیں جانتے۔''

اتنے میں ان کے درمیان خواجہ قادر بخش بھی پہنچ گئے۔ ساہوکار انہیں دیکھتے ہی ادب سے کھڑا ہوگیا۔ آپ نے چوروں سے پوچھا۔ ''تم چوریاں کیوں کرتے ہو؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''حضرت! عادت سی پڑگئی ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ عادت چھوڑ دو کیونکہ اس عادت سے دین اور دنیا دونوں برباد ہورہے ہیں۔''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''کوشش تو بہت کی مگر کامیابی نہیں ہوتی۔''

آپ نے تیسرے سے پوچھا۔ ''اور تم کیا کہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اب ان دونوں کے بعد میں کیا کہوں؟ اپنا بھی وہی حال ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''دیکھو، میں اس وقت یہاں کا انسپکٹر پولیس ہی نہیں، مصلح بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ سدھر جاؤ کیونکہ جس طرح میں اپنے محکمے کے افسران کے روبرو جواب دہ ہوں، اسی طرح دوسری دنیا میں اپنے رب کے سامنے بھی جواب دہ ہوں۔ اگر میں تم لوگوں کی اصلاح میں کامیاب ہوگیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں دین اور دنیا میں سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔''

آپ کی تقریر کا تینوں پر بڑا اثر ہوا، ایک نے کہا۔ ''اس چوری کے مقدمے میں ہمیں سزا تو ہوہی جائے گی۔ ہمیں سزا کاٹ لینے دیجیے۔ اس کے بعد ہم اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر تم تینوں اسی وقت توبہ کرلو تو میں اس مقدمے کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ یہیں رفع دفع کردوں گا۔''

ایک چور نے ساہوکار کی طرف دیکھا۔ ''آپ اگر معاف بھی کردیں گے تو یہ ساہوکار ہمیں کیوں معاف کرنے لگا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس سے بھی معافی دلوادوں گا۔''

تینوں چوروں کے چہروں پر بشاشت دوڑ گئی۔ تقریباً ایک ساتھ جواب دیا۔ ''اگر ایسا ہوگیا تو ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ چوری سے توبہ کرلیں گے۔''

آپ نے ساہوکار کی طرف دیکھا۔ ''بول! تو کیا کہتا ہے؟''

ساہوکار نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں کیا کہوں گا۔ میں تو آپ کی منشا اور حکم کا تابع ہوں۔ جو فرمائیں گے، اس پر عمل کروں گا۔ میرا سارا سامان تو ل ہی چکا ہے۔ اس کے سوا مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

آپ نے ان تینوں کو رہا کردیا۔ فرمایا۔ ''اب تم جاسکتے ہو مگر یاد رکھو۔ تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، اس سے منحرف ہرگز نہ ہونا۔''

سپاہیوں نے آپ کے حکم پر انہیں رہا کردیا۔ ساہوکار نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ تینوں چور وہیں بیٹھے رہے۔

اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔
آپ نے ان سے کہا۔ ”اب تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ، اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے وعدے پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔“
ایک نے عرض کیا۔ ”حضرت! ہم تینوں نے ابھی ابھی یہاں یہ مشورہ کیا ہے کہ آپ کے حکم پر عمل کس طرح کیا جائے۔ آخر یہی طے پایا کہ اس در کو چھوڑ کر کہیں اور جانا فضول ہے۔ اب آپ ہمیں اپنا بنا لیجیے تاکہ ہماری آخرت سدھر جائے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”جیسی تمہاری مرضی، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
چنانچہ تینوں چور توبہ کر کے آپ ہی کے پاس رہ گئے اور انہوں نے اتنی عبادت و ریاضت کی کہ بعد میں ان کا شمار بھی اہلِ اللہ میں ہونے لگا۔

☆☆☆

آپ تھانہ راہوں کے باہر کھڑے تھے کہ ایک طرف سے شور و غل بلند ہوا۔ سامنے سے ایک گھوڑا سرپٹ بھاگا چلا آرہا تھا اور لوگ چیخ چیخ کر راہ گیروں کو خبردار کر رہے تھے کہ ہوشیار خبردار گھوڑا سرکش ہے لوگوں کو زخمی کر رہا ہے۔
آپ گھوڑے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اپنی انگشت شہادت اس کی طرف اٹھا کر فرمانے لگے۔ ”گھوڑے، یہ کیسی سرکشی ہے کہ بے گناہوں کو زخمی کر رہا ہے۔ بہت بھاگ دوڑ کر لی۔ اب رک جا اور آرام کر، ذرا سستا لے۔“
گھوڑا آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف ہجوم کیا اور اس حیران کن منظر کو دیکھنے لگے۔ آپ گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور گھوڑا نہایت فرماں برداری سے اپنی دم کو بار بار ہلا رہا تھا۔ آپ نے مزید فرمایا۔ ”میری بات سمجھ لی؟ اب تو سرکشی نہیں کرے گا۔ کبھی بھی نہیں۔“
اور اس کے بعد واقعی کسی نے بھی اس گھوڑے کو سرکشی اختیار کرتے نہیں دیکھا۔
ایک مولوی پیر محمد جو بیس میل دور سے مدرسے میں بچوں کو پڑھانے آیا کرتے تھے۔ صبح فجر کے بعد وہ اپنے گھر سے چل دیتے تھے اور شام کو مغرب کے وقت اپنے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ سواری کے لیے ان کے پاس ایک تیز رفتار گھوڑی تھی۔
ایک دن دوپہر کو اپنے گھر جو جانے لگے تو آپ نے فرمایا۔ ”پیر محمد! ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر۔ سنتا ہوں، راہ میں درندے گھومتے دیکھے گئے ہیں۔“
پیر محمد نے جواب دیا۔ ”آج تک تو کوئی درندہ دیکھنے میں آیا نہیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”ٹھیک ہے، پھر بھی ذرا ہوشیاری سے سفر کیا کر، احتیاط بڑی اچھی چیز ہے۔“
پیر محمد نے جواب دیا۔ ”آپ فرماتے ہیں تو میں ضرور احتیاط کروں گا۔“
اس دن پیر محمد نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے سفر کیا۔ وہ اپنی گھوڑی کو بھگا رہے تھے اور اپنے گرد و پیش بھی دیکھتے جاتے تھے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ مولوی پیر محمد جب اس ندی کے قریب پہنچے تو انہوں نے ایک چیتے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مولوی پیر محمد چیتے کو دیکھتے ہی بدحواس ہو گئے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ سمجھ میں ہی کچھ نہ آتا تھا کہ گھوڑی کو بھگا کر کس طرف لے جائیں۔ آخر بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ ”خواجہ قادر بخش پیر و مرشد! جب اتنی خبر دی تھی کہ راہ میں کوئی درندہ مل سکتا ہے، اب جبکہ وہ مل ہی چکا ہے، اس سے میری حفاظت بھی فرمائیے۔“
چیتا جست لگانے کی فکر میں تھا۔ مولوی پیر محمد نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور کلمہ پڑھنے لگے۔ اسی لمحے انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی آواز سنی۔ ”پیر محمد! اپنی گھوڑی کو بھگا لے جا۔ میں نے چیتے کو پکڑ لیا ہے۔“
مولوی پیر محمد نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ خواجہ بخش نے چیتے کو پکڑ رکھا ہے۔ اس کے دونوں کان ان کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں۔ ”پیر محمد! دیر نہ کر، میں نے اس کو پکڑ لیا ہے۔ تو فوراً ہی چلا جا۔“
پیر محمد نے گھوڑی کو بے اختیار بھگایا اور آناً فاناً اس خطرے کی جگہ سے نکل گئے۔ دوسرے دن جب وہ صبح مدرسے میں پہنچے تو خواجہ قادر بخش کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! اگر آپ نے مدد نہ کی ہوتی تو کل میں چیتے کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوتا۔“
آپ نے پوچھا۔ ”میں نے تیری کیا مدد کی تھی جس کا تو شکریہ ادا کر رہا ہے؟“
پیر محمد نے پورا واقعہ دہرا دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”تجھ کو دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے چیتے کے کان نہیں پکڑے تھے۔“
پیر محمد نے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! اگر وہ فریبِ نظر یا دھوکا تھا تو پھر میں جو کچھ بھی دیکھتا ہوں، سب کچھ فریبِ نظر اور دھوکا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ''ایسا ممکن تو ہے کیونکہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کو درندوں پر بھی فائق اور برتر رکھا ہے۔ یہ بھی ان برگزیدہ انسانوں کے تابع ہوتے ہیں۔''

مولوی پیر محمد نے آپ کے ہاتھوں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیا اور کہا۔ ''حضرت! اس انکسار کو میں کیا کہوں۔ آپ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنی ذات اور صفات کی نفی کر دیتے ہیں۔''

آپ نے خاموشی اختیار کر لی اور نظریں جھکا لیں۔ ان کے ایک مرید الٰہی بخش جو محکمے میں ملازم بھی تھے، نے ایک دن کسی معاملے میں دس روپے رشوت میں لے لیے۔ روپے جیب میں ڈالے ہی تھے کہ الٰہی بخش کے گال پر ایک تھپڑ لگا اور کانوں میں آواز گونجنے لگی۔ ''ارے مردود! رشوت لیتا ہے، ذلیل کتے۔ اس لیے اس محکمے میں ملازمت کی تھی؟''

الٰہی بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ خوف زدہ ہو کر روپے واپس کر دیے اور شرمندہ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ کام سے فراغت پانے کے بعد خواجہ قادر بخش کی خدمت میں پہنچے۔ سلام کیا اور مصافحے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیے لیکن آپ نے منہ پھیر لیا۔ الٰہی بخش قدموں میں گر کر رونے لگے، عرض کیا۔ ''پیر و مرشد! بس ایک بار معاف کر دیجیے۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو نے بیعت ہوتے وقت اللہ اور مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ نواہی شرعیہ سے مجتنب اور محترز رہوں گا لیکن افسوس کہ تو نے اس وعدے کا پاس نہیں کیا۔''

الٰہی بخش نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد! میں نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھی مل گئی۔ میں نے وہ روپے اسی وقت واپس کر دیے۔ اب خدا کے لیے مجھ کو معاف فرما دیجیے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خدا نے مجھے خبر دی۔ میں نے تمہیں روک دیا۔''

الٰہی بخش نے شرمندگی سے دوبارہ بیعت کی اور وعدہ کیا کہ اب آئندہ ایسی حرکت سرزد نہیں ہوگی۔ آپ نے ان کے حق میں دعا کی کہ خدا تجھے بیعت پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے محکمۂ پولیس میں ملازمت کے دوران لوگوں کی بڑی خدمت کی اور گم کردہ راہ لوگوں کی اصلاح فرماتے رہے۔ آپ اس بھٹی میں کندن ہو چکے تھے۔ آخر ایک دن آپ کے پیر و مرشد حاجی محمود نے انہیں بلایا اور انہیں حکم دیا۔ ''قادر بخش! اب ملازمت چھوڑ دے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا فوراً ہی، اسی وقت؟''

حاجی صاحب نے جواب دیا۔ ''ہاں فوراً ہی، اسی وقت۔''

آپ نے اسی وقت استعفا دے دیا اور پیر و مرشد کے حکم پر اپنے آبائی وطن جہاں خیل چلے گئے۔ آپ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ دور دور سے لوگ شرفِ ملاقات اور شوقِ بیعت کی خاطر آپ سے ملتے اور پھر یہیں کے ہو رہتے۔ آپ لوگوں کی مشکلوں اور الجھنوں کا علاج بھی بتا دیتے تھے۔ یہاں بھی غرض مندوں اور حاجت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب محمد بخش تھے۔ ان پر آپ کی خصوصی توجہ رہتی تھی۔ ایک دن وہ بے خبر سوئے ہوئے تھے کہ کسی نے ان پر گھڑوں پانی ڈال کر جگا دیا۔ جب وہ گھبرا کر اٹھے تو انہیں کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ بیوی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! یہ مجھ پر پانی کس نے ڈال دیا؟''

بیوی نے شرابور شوہر کو حیرت سے دیکھا اور جواب دیا۔ ''دروازے تو اندر سے بند ہیں، یہ پانی کون ڈال گیا؟''

محمد بخش نے کہا۔ ''اگر دروازے اندر سے بند ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانی تو نے ڈالا ہوگا کیونکہ تیرے علاوہ یہاں کوئی بھی نہیں۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''اگر پانی میں نے ڈالا ہے تو اس پانی کا برتن کہاں چلا گیا، میں تو ابھی یہاں سے ہلی بھی نہیں۔''

محمد بخش کو ہوش آیا تو واقعی یہ دیکھا کہ کمرے میں پانی کا پیالہ تک نہ تھا۔ پھر یہ پانی کون ڈال گیا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا کوئی جواب نہ مل سکا۔ اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ ایک دن دونوں سو رہے تھے۔ سوتے سوتے ان کی آنکھ جو کھلی تو انہیں اپنے نیچے بستر کے بجائے ریت سی محسوس ہوئی۔ میاں بیوی دونوں ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نہ کمرا تھا، نہ گھر، نہ محلہ۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ زمین ٹٹولی تو نیچے ریت محسوس ہوئی۔ انہوں نے بیوی سے پوچھا۔ ''یہ ہم اس وقت ہیں کہاں؟''

بیوی بہت ڈری ہوئی تھی، جواب دیا۔ ''پتا نہیں کہاں ہیں اور یہاں ہمیں لایا کون؟''

محمد بخش نے اٹھ کر آس پاس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ دونوں دریائے بیاس کے ساحل پر پڑے ہیں۔ ابھی ان کی حیرت دور نہیں ہوئی تھی کہ کسی مرد کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ بیوی اور زیادہ ڈر گئی۔ شوہر نے تسلی دی۔ ''نیک بخت! مت گھبراؤ، میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چکر ہے؟''

یہ دونوں بمشکل اپنے گھر پہنچے اور بقیہ رات جاگ کر گزار دی اور علی الصباح پیرومرشد کی خدمت میں پہنچے اور دونوں واقعے بیان کر دیے، کہا۔ ''حضرت! میں بے حد پریشان ہوں۔ میری بیوی تو رات کے تصور سے ہی گھبرانے اور ڈرنے لگی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے اور کون ہمیں تنگ کر رہا ہے؟''

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول دیں اور قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھنے لگے۔ پھر انگوٹھے پر دم کر کے اس کو زمین پر ٹکا دیا اور اسے زور سے دبایا۔ اسی وقت کسی کے رونے اور فریاد کرنے کی آواز سنائی دی۔ ''حضرت! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں جلا، میں مرا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو ہے کون؟''

اسی وقت ایک شخص نمودار ہوا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ''حضرت! میں جن ہوں اور میرا نام زمان شاہ ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو اس غریب کو کیوں ستاتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اس شخص کو پسند کرتا ہوں اور از راہِ مذاق اس کو ستاتا ہوں۔''

آپ نے طیش میں فرمایا۔ ''تیری ہنسی اس کی مصیبت ہے۔ میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ رونے لگا اور کہا۔ ''اس بار آپ مجھ کو چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں آؤں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں آنے کو نہیں، ستانے کو منع کرتا ہوں۔''

اس نے وعدہ کیا۔ ''میرا وعدہ کہ میں آؤں گا ضرور لیکن اس کو ستاؤں گا نہیں۔''

آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ بشکل انسان محمد بخش کے پاس آیا اور کہا۔ ''بخدا میں نے اتنا بڑا بزرگ عامل نہیں دیکھا۔ مجھ کو تو ان سے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

کچھ عرصے بعد زمان شاہ، اس کی بیوی اور اس کے کئی رشتے دار خواجہ قادر بخش کے مریدوں میں شامل ہو گئے اور بیعت کر لی۔ جہاں خیل کی مسجد کے جنوبی گوشے میں آپ کا حجرہ تھا۔ یہیں آپ عبادت فرمایا کرتے تھے۔

عشا کا وقت تھا، اذان ہو چکی تھی۔ اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت آپ کے پاس خلیفہ رنگ علی شاہ اور بلاقی شاہ موجود تھے۔ دھواں دار بارش دیکھ کر آپ نے باہر کی طرف دیکھا، اسی وقت بجلی چمکی۔ آپ نے بجلی کی روشنی میں نورانی شکلوں کے چند انسان حجرے کے باہر دیکھے۔ آپ نے بلاقی شاہ سے کہا۔ ''بلاقی شاہ! ذرا دیکھنا تو اس بارش میں یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اور یہ بھی پوچھو کہ کس لیے آئے ہیں؟''

بلاقی شاہ نے بھی بجلی کی چمک میں ان نورانی شکل والے انسانوں کو دیکھ لیا اور یہ حجرے سے نکل کر ان کی طرف دوڑے۔ بلاقی شاہ پوچھ رہے تھے۔ ''ارے بھائی سنتا تو۔ تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟''

اسی وقت پیچھے سے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ حجرے کی پوری چھت ان کے پیرومرشد اور خلیفہ رنگ علی شاہ پر گر چکی تھی۔ بلاقی شاہ نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں موسلا دھار بارش میں حجرے کے آس پاس ایک مجمع لگ گیا۔ ان میں خواجہ قادر بخش کی والدہ بھی تھیں۔ ان کی حالت لوگوں سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ لوگوں نے ملبا ہٹایا تو اندر سے دونوں شہیدوں کی لاشیں نکلیں۔ انہیں عزت واحترام سے وہیں دفن کیا گیا۔ تاریخ شہادت 1272ھ، 1857ء ہے۔

آپ کو لوگ فرطِ عقیدت سے شمس العرفان کہتے تھے۔ عرفان کا آفتاب اور اس آفتاب کی روشنی نے ہوشیار پور اور اس کے گردونواح کو منور کر دیا تھا۔

''نوٹ پرانے اور استعمال شدہ ہونے چاہئیں۔''
میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''میرا اصرار یہی ہے کہ تمام نوٹ پرانے اور استعمال شدہ ہوں...... لازمی طور پر۔''

''یقیناً۔'' وہ بڑبڑایا۔ ساتھ ہی اپنے اس مخصوص خفیہ انداز میں مسکرانے لگا جس انداز میں وہ مجھ پر اثر انداز ہوا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے ہمیشہ اسی طرح ڈھکا ہوا لگتا تھا جیسے جنگ کے دنوں میں گاڑیوں کی ہیڈلائٹس پر بلیک آؤٹ شیلڈز ہوتی ہیں۔ اس چہرے، اس مسکراہٹ اور اس شہد جیسی مٹھاس بھری آواز کے ساتھ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ الفاظ ممکنہ طور پر پُرخلوص یا سچائی پر مبنی نہیں ہو سکتے تھے لیکن یقیناً کوئی ہر وقت تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔

مجھے اس کے بارے میں جتنا کچھ معلوم تھا، مجھے اس بارے میں بھی شبہ ہی تھا۔ مثال کے طور پر اس کا نام جو اس نے بڑبڑاتے ہوئے سلوین کیلسو بتایا تھا۔ یہ نام صحیح بھی ہو سکتا تھا اور غلط بھی۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ وہ میرے لیے دوستی کے جذبات رکھتا ہے، مجھے یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ بناوٹ پر مبنی ہے۔ ایسے موقع پرستوں سے میرا پہلے بھی کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا اور مجھے پلک جھپکتے میں یہ بات سمجھ میں آجاتی تھی کہ وہ چاپلوسی کر رہے ہیں جیسے کہ انشورنس کے سیلز مین یا چھوٹے سیاسی عہدوں کے امیدوار کیا کرتے ہیں اور پھر جس قوم کے لیے اس نے کام کرنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ بھی ممکنہ طور پر سچ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بلغاریہ کا نام لیا تھا۔

جو واحد سچ تھا صرف یہ تھا کہ وہ مجھ سے حقیقت میں

ایک چالباز فنکار کی مشکوک فنکاریوں کا احوال

کیسا لگتا ہے جب کوئی شروع سے آخر تک محنت کرے اور حاصل کچھ بھی نہ ہو... اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ بہت محتاط تھا وہ اور بھول گیا تھا کہ اس احتیاط نے اس کے گرد دائرہ تنگ کر دیا۔ اسے احساس ہی نہ ہو سکا کہ مجرم کی لڑکھڑاہٹ چال بگاڑ دے تو کوئی پردہ نہیں رہتا۔

لاینحل

ثمر عباس
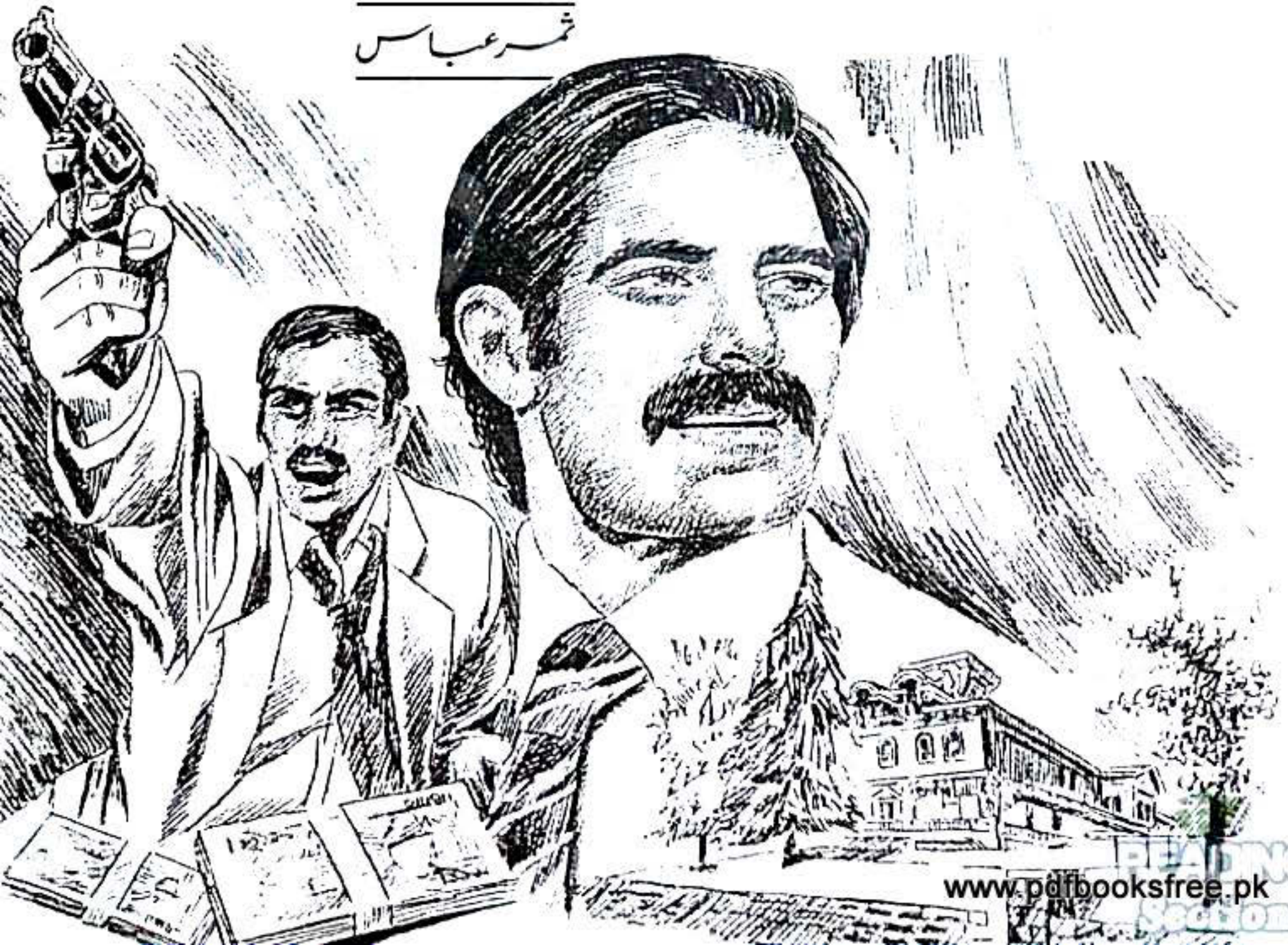
وہ خریدنے کا خواہش مند تھا جو میں اسے مکمل طور پر فروخت کرنے پر رضامند تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میری تمام شرائط پوری کردی جائیں۔

یہی وجہ تھی جو ہم یہاں آرلنگٹن کے لیے ایک نیم تاریک بار میں تیسری بار ملاقات کر رہے تھے۔ یہ جگہ چین برج سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

''اور نوٹ چھوٹی مالیت کے ہونے چاہئیں۔'' میں نے اس سے کہا۔ ہم بار کے ایک عقبی بوتھ میں ایک دوسرے کی جانب جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ ''کوئی بھی نوٹ بیس ڈالر مالیت سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے۔''

''اوہ!'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''یہ تو خاصا بھاری بھرکم پیکٹ بن جائے گا۔''

''زیادہ بھاری نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''دو پیکٹ ہوں گے۔ نصف رقم پہلے اور نصف رقم بعد میں۔''

''تمہاری بے اعتباری قطعی غیر ضروری ہے، مسٹر اسٹل مونٹ!''

''مجھے اپنا تحفظ بھی کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بے شک کرنا چاہیے۔ لازمی کرنا چاہیے۔''

''میں تمہیں نہیں جانتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کچھ کر سکتے ہو۔''

اس نے اپنے زرد رنگت والے ہاتھ احتجاج کے انداز میں اچکا دیے۔ ''کچھ بھی نہیں، مسٹر اسٹل مونٹ!'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں بھرپور یقین دلانا چاہتا ہوں۔ آخر کار میں تمہیں ناراض کرنے کے لیے ایسی کوئی حرکت کیوں کروں گا؟ یہ تو ہمارے درمیان ابھی پہلا سودا ہو رہا ہے۔''

''یہ ہمارے درمیان واحد سودا ہے۔'' میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے اور مجھے بھی کہ صرف ایک ہی اہم ترین فائل میری دسترس میں ہے۔ ایک بار کاروبار ہوگیا تو پھر میرے پاس بیچنے کے لیے اور کچھ نہیں ہوگا۔''

''وقتی طور پر ایسا ہی ہے مسٹر اسٹل مونٹ...... لیکن یقیناً مستقبل میں جب سرکاری نوکری میں تم کامیابی کے زینے طے کر کے اونچے عہدوں تک پہنچتے رہو گے تو ایسے اور کئی مواقع پیدا ہوتے رہیں گے جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے...... منافع بخش خدمات سرانجام دے سکیں گے۔''

میں اسے اس بات کا جواب بھی نہیں میں دینا چاہ رہا تھا لیکن آخری لمحے میں، میں احتراز کر گیا۔ اگر سلوین کیلسو کا واقعی یہ خیال تھا کہ میں مستقبل میں بھی اس کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہوں تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا مجھے ڈبل کراس کرنے یا میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کرنے کا امکان کم ہی ہوسکتا تھا۔

لیکن چاہے اسے میرے متعلق حقیقت کا علم نہیں، میں یقینی طور پر خود اپنے بارے میں حقیقت سے پوری طرح واقف تھا۔ سرکاری ملازمت میں کامیابی کا زینہ اس حد تک طے کرچکا تھا جس حد تک سول سروس سسٹم کے تحت میں پہنچ سکتا تھا۔ اب میں ایگزیکٹو لیول کے کنارے پر منڈلا رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میں اپنی ریٹائرمنٹ تک یہیں منڈلاتا رہوں گا۔

سرکاری نوکری میں اعلیٰ عہدوں کے حصول کے لیے دو چیزوں میں سے ایک کا پاس ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین صلاحیت یا سیاسی اثر و رسوخ اور میرے پاس ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔

آپ کے خیال میں، میں نے... اس کاروباری سودے کا قصد کیوں کیا؟ کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی غدار یا جاسوس ہوں؟ کیا میں یہاں اپنی خواہش کے مطابق آیا ہوں؟

نہیں ایسا نہیں ہے اس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ شاید ابھی آپ کی زندگی کے آگے بڑھنے کے مراحل..... آپ پر اثر انداز ہونا شروع نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخراجات دھیرے دھیرے لیکن بغیر رکے بڑھتے رہتے ہیں۔ جب تک آمدنی میں بھی ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے اور کوئی اپنے پیشے میں آگے بڑھتا رہتا ہے..... تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے لیکن جب آمدنی کا لیول رک جاتا ہے، جب کوئی اپنے پیشے میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے سے رک جاتا ہے تو پھر میرے دوستو! زندگی جہنم بن جاتی ہے۔

میں اپنی بیوی کو الزام نہیں دوں گا۔ میں اپنے بچوں کو الزام نہیں دوں گا۔ حتیٰ کہ میں اپنے آپ کو بھی الزام نہیں دوں گا۔ اس میں کسی کی دانستہ بدنیتی شامل نہیں ہے بلکہ میں قانونِ فطرت کا شکار ہوا ہوں جیسے آسمانی بجلی مجھ پر ٹوٹ پڑی ہو اور یہ اسی معاشی کشور پن کا حتمی نتیجہ تھا جو میں اس پستہ قد موٹے آدمی کے ہمراہ جو خود کو سلوین کیلسو کہہ رہا تھا، تیسری بار اس میلے کچیلے بار میں موجود تھا اور اس کی بار بار کی یقین دہانی میرے ذہن میں خطرے کی ہلکی سی گھنٹی بجا رہی تھی کہ میں اس معاملے کو یہیں پر چھوڑ کر یہاں سے بھاگ

کر گھر چلا جاؤں اور اس کی پیشکش کی رقم کو فراموش کر کے اپنی معمول کی زندگی کی جدوجہد کو جاری رکھوں۔

بہر حال، میں نے اپنے تمام نکات کو اپنے ذہن میں ایک بار پھر دہرایا۔ پرانے نوٹ...... چھوٹی مالیت کے نوٹ۔ ''اوہ ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک اور بات۔ جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

سلوین کیلسو کے ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ''کہو بھی دو مسٹر اسٹل مونٹ۔'' وہ بڑبڑایا۔

''نوٹ جعلی نہیں ہونے چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس نوعیت کے واقعات کے بارے میں سن چکا ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اس بات سے لاعلم ہوں کہ لوگوں کو ملک میں اسمگل ہونے والی جعلی کرنسی سے ادائیگی کی جاتی ہے۔ میں نے ٹریژری ڈیپارٹمنٹ میں تین سال کام کیا ہے اور یقین کرو کہ تم کسی بھی قسم کی جعلی کرنسی یا نقلی نوٹ مجھے چلانے کی کوشش نہیں کر سکتے۔''

میری ٹریژری ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والی بات تو سچ تھی لیکن جعلی کرنسی نوٹوں کی پرکھ کے معاملے میں مجھے کوئی خاص مہارت حاصل نہیں تھی کیونکہ وہاں میں نے صرف ایک فائل کلرک کی حیثیت سے کام کیا تھا جہاں تک میری معلومات تھیں مجھے اپنی تمام زندگی میں کبھی کوئی جعلی یا نقلی نوٹ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چونکہ سلوین کیلسو کو میرے بارے میں ان تفصیلات کا علم نہیں تھا اس لیے میں اس پر بھروسا کر رہا تھا اور بظاہر اس کے رویے سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ واقعی لاعلم ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر وہی مخصوص مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''ایسا کوئی امکان نہیں ہے مائی ڈیئر اسٹل مونٹ! معمولی سا بھی امکان نہیں۔ یہ چال تو جرمن چلا کرتے تھے۔ ہم اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔''

''میں تو تمہیں بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہوئی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں یقیناً رکھنی بھی چاہئیں۔'' اس نے اپنی بھاری بھرکم ہتھیلی میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ''ایک محتاط شخص سے کاروبار کرنا خوشی کی بات ہوتی ہے۔''

''آل رائٹ!'' میں نے کہا۔ ''اب پے منٹ کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟''

''کل سہ پہر۔'' اس نے میری جانب جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''جب تم چھٹی ہونے کے بعد دفتر سے نکلو تو پیدل پین سلوانیا ایونیو اور بارھویں اسٹریٹ کے ساؤتھ ایسٹ کارنر تک چلے جانا۔ وہاں کارنر کے قریب بارھویں اسٹریٹ کی سائیڈ پر تمہیں ایک سیاہ ٹیکسی پارک کھڑی دکھائی دے گی جس پر سرخ رنگ کے حروف ہوں گے۔ ٹیکسی کے داہنے ہاتھ پر فرنٹ دروازے کے ہینڈل کے عین نیچے سات کا ہندسہ نمودار ہوگا۔ ٹیکسی ایک عورت چلا رہی ہوگی جس نے ایک غیر معمولی قسم کا ہیٹ پہنا ہوا ہوگا۔''

''واشنگٹن میں تمام ٹیکسیاں غیر معمولی قسم کے ہیٹ پہنے ہوئے عورتیں ہی چلایا کرتی ہیں۔'' میں نے قدرے مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر سات کے ہندسے پر توجہ مرکوز رکھنا۔'' سلوین کیلسو نے کہا۔ ''تم اس ٹیکسی میں داخل ہو جانا اور کہنا... ڈمبرٹن ہاؤس، پلیز۔ اور پھر ٹیکسی اسٹارٹ ہو جائے گی اور تم اس میں موجود رہو گے۔''

''ڈمبرٹن ہاؤس؟'' میں نے کہا۔ ''ڈمبرٹن ہاؤس کہاں ہے؟''

''تمہیں اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔'' کیلسو نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم وہاں نہیں جا رہے ہو گے۔ ٹیکسی کی عقبی نشست کے فرش پر تمہیں ایک اٹیچی کیس رکھا ہوا ملے گا جس میں پہلی نصف رقم اور کیمرا ہوگا۔ اس کے لیے ایک ٹائپ کیا ہوا کاغذ بھی ہوگا جس پر کیمرے کے استعمال سے متعلق ہدایات موجود ہوں گی۔ تمہیں یہ خاص دھیان رکھنا ہوگا کہ قریب سے گزرنے والا کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے۔ رقم کے اصلی ہونے کے بارے میں تم اپنے طور پر پوری تسلی کر لینا اور یہ بھی یقین کر لینا کہ پوری رقم موجود ہے۔ پھر کیمرے کے استعمال کے بارے میں مکمل ہدایات اس وقت تک پڑھتے رہنا جب تک تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ تم اسے صحیح طریقے سے آپریٹ کر سکتے ہو پھر تم وہ کاغذ جس پر ہدایات درج ہوں گی ڈرائیور کے حوالے کر دینا اور اسے بتا دینا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو تا کہ وہ تمہیں وہاں پہنچا دے۔''

''بس اتنا ہی؟''

''کل تک کے لیے بس اتنا ہی ہے۔'' کیلسو نے کہا۔ ''اگلے روز جمعہ ہے۔ تم ان دستاویزات کی تصویریں اتار لینا جیسا کہ طے ہو چکا ہے۔ پھر پہلے کی طرح جب تمہارے دفتر کی چھٹی ہو جائے تو تمہیں وہی ٹیکسی ٹھیک اسی مقام پر کھڑی ہوئی ملے گی جہاں ایک دن پہلے ملی تھی۔ تم اس ٹیکسی میں داخل ہو جانا۔ کیمرا اور اٹیچی کیس تمہارے ہمراہ ہوں گے۔ اٹیچی کیس وہی ہوگا جس میں تمہیں پہلی پے منٹ ہوئی تھی۔ البتہ وہ اب یقینی طور پر خالی ہوگا۔ ٹیکسی تمہیں ایک ایسی جگہ لے

جائے گی جہاں کیمرے کی فلم کی تصدیق کی جائے گی اور دستاویزات کی تصاویر کی جانچ پڑتال ہوگی۔ اس کے بعد تمہیں تمہاری بقیہ رقم ادا کر دی جائے گی اور تم اپنی زندگی اپنے طور پر گزارنے کے لیے آزاد ہو گے جیسے پہلے گزار رہے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر جیسے کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔''

''میں آخری حصے کے بارے میں مزید تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے کیمرا کس جگہ واپس کرنا ہوگا اور دوسری پے منٹ کہاں ملے گی؟''

''یقیناً تمہیں تفصیل بتا دی جائے گی۔'' کیلسو نے کہا۔ ''پہلے مشروبات کا ایک اور دور ہو جائے۔ پلیز!''

ویل، ہمارے لیے فریش ڈرنکس آگئے۔ ہم اس دوران اس معاملے کی مزید تفصیلات ڈسکس کرنے لگے، حتیٰ کہ میں مطمئن ہوگیا۔ یا یہ کہنا چاہیے کہ مجھے جو کچھ مل رہا تھا اس پر قناعت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

پھر جب میں بار سے نکل کر بیتھیسڈا میں واقع اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا تو ظاہر ہے نروس ہونے کے ساتھ تناؤ کی کیفیت میں بھی تھا۔ میں نے گھر پہنچتے ہی کچن میں جا کر کچھ شراب معدے میں انڈیلی اور بیڈ پر چلا گیا جہاں میری بیوی سو رہی تھی۔

چونکہ میں نے گزشتہ چند برسوں سے یہ پختہ عادت بنا لی تھی کہ اکثر رات کو گھر آنے سے پہلے مقامی شراب خانے میں وقت گزارتا تھا، اس لیے مجھے اپنی بیوی سے کسی قسم کی وضاحت یا معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اگر اس کی آنکھ کھل بھی جاتی تو میری سانسوں کی بو اس بات کا واضح اشارہ ہوتی تھی کہ میں حال ہی میں کہاں وقت گزار کر آیا ہوں۔

میں رات بھر صحیح طور پر نہیں سو سکا۔ میری آنکھ بار بار کھل رہی تھی اور مجھے ہولناک خواب دکھائی دے رہے تھے جن میں عفریت میرا پیچھا کر رہے تھے اور میں دوڑتا پھر رہا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر مجھے بلوں کی عدم ادائیگی کا دکھڑا سننے کو ملا۔ میں معمول کے مطابق اپنے کام پر روانہ ہوگیا۔ میں نے اپنی کار ای اسٹریٹ پر پارکنگ گیراج میں معمول کے مقام پر کھڑی کر دی اور اپنے کام پر پہنچ گیا۔ میرے ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا اور سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میری یہ کیفیت شراب کے خمار کے مانند تھی لیکن گزشتہ شب میں نے اتنی زیادہ نہیں پی تھی کہ یہ علامات کثرتِ مے نوشی کا نتیجہ ہوتیں۔

نہیں، میری اس کیفیت کا سبب شراب نہیں تھی۔ یہ کیفیت پریشانی، خوف، شک و شبہ، شرم اور یقین و بے یقینی کی بنا پر تھی۔

ایک شخص کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے بل بوتے پر جو کچھ کرسکتا ہے، وہ کرتا ہے۔ میرے پاس اگر کوئی اہمیت کی شے تھی تو وہ ایک غیر اہم قومی راز تھا لیکن یہ راز کسی کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ مجھے اس کے عوض دس لاکھ ڈالر کا نذرانہ پیش کر رہے تھے اور یہ رقم میری قسمت بدلنے کے لیے کافی تھی۔

جبکہ میں بار بار خود سے یہی کہے جا رہا تھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے گنوانا سراسر حماقت ہوگی۔ صرف ایک بار...... زندگی میں ایسا موقع صرف ایک بار آتا ہے۔ بار بار نہیں آتا۔ اس لیے اس موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ جب کیلسو نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہونے جا رہی ہے۔

وہ دن ایک کھنچے ہوئے ربر بینڈ کے مانند گزرا اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ساڑھے چار بھی نہیں بجیں گے۔ وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی اور دن تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اپنے کام کے دوران مجھے تین بار اس الماری کے پاس جانے کا اتفاق ہوا جس میں وہ فائل رکھی ہوئی تھی جس کی نقول کے لیے کیلسو نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اسی دوران آرکائیو کے گارڈ ہیری نے مجھے ایک لطیفہ بھی سنایا جو مجھے مضحکہ خیز نہیں لگا۔ میں اور ہیری ایک دوسرے سے برسوں سے واقف تھے۔

آخر کار ساڑھے چار بج ہی گئے۔

میں پیدل چلتے ہوئے پین سلوانیا ایونیو اور بارھویں اسٹریٹ کے سنگم پر جا پہنچا اور وہ کار تلاش کر لی۔ میں کار میں جا بیٹھا اور کار بے مقصد واشنگٹن کی سڑکوں پر گھومنے لگی۔ میں اس دوران اٹیچی کیس میں موجود رقم کو چیک کرنے کے ساتھ ساتھ اسے شمار بھی کرتا رہا۔ تمام نوٹ پرانے اور چھوٹی مالیت کے تھے اور رقم بھی پوری تھی۔ یہ نوٹ میرے ہاتھوں اور میری آنکھوں کو بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔

پھر میں کیمرے کی جانب متوجہ ہوگیا۔ یہ کیمرا... بظاہر ایک سگریٹ لائٹر کے مانند تھا۔ اسے ہموار دستاویز کے عین اوپر تھامنا تھا تاکہ اس کی تیز روشنی دستاویز کو منور کردے۔ کیمرے کو دستاویز سے دس تا بارہ انچ اوپر رکھنا تھا اور ایسی ہی چند ضروری ہدایات تھیں۔

''میرا کام مکمل ہوگیا۔'' میں نے فارغ ہونے کے بعد غیر معمولی ہیٹ والی خاتون ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ''اب

مجھے ای اسٹریٹ پر یونیورسل پارکنگ گیراج لے چلو۔‘‘
’’ہدایت نامے والی شیٹ؟‘‘ اس عورت نے کہا۔
’’اوہ سوری!‘‘ میں نے کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔
اس نے مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں میری کار کھڑی تھی۔
جب میں گھر پہنچا تو رقم سے بھرا ہوا اٹیچی کیس میری کار کی ڈکی میں بہ حفاظت رکھا ہوا تھا۔ رات گئے جب میری بیوی گہری نیند سو گئی تو میں چپکے سے گیراج میں گیا اور تمام رقم اپنے کافی کے خالی ڈبوں میں منتقل کر دی۔ گزشتہ کئی برسوں سے میں کافی کے خالی ڈبے اپنی ورک بینچ کے اوپری طاق میں ڈھیر کرتا چلا آرہا تھا۔ ان میں سے چند ایک میں کیلیں، واشرز، نٹ بولٹ اور اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزیں جمع تھیں۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال تھا کہ باقی خالی ڈبے بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کام میں آجائیں گے۔
اور بالآخر اب یہ کام میں آگئے تھے۔ پانچ لاکھ ڈالرز کی رقم ان ڈبوں میں منتقل ہو چکی تھی اور خالی اٹیچی کیس واپس کار کی ڈکی میں پہنچ گیا تھا۔
دستاویزات کی تصویر کشی نہایت سہل کام تھا۔ میں وہ فائل اپنے دفتر میں لے گیا۔ ہیری نے اس بار بھی مجھے ایک لطیفہ سنایا تو اس کا دل رکھنے کی خاطر میں ہنس دیا تھا۔ اپنی میز پر پہنچ کر میں نے اپنا ڈیسک لیمپ آن کیا اور تیزی کے ساتھ تمام تصویریں اتار لیں۔
ان دستاویزات کی تعداد پانچ تھی۔ ان صفحات پر چند پر اعداد و شمار تھے، کچھ پر جدول تھے اور کچھ پر محض الفاظ اور کچھ پر تشخیص۔ یہ کاغذ ریت کے مانند خشک تھے اور دیکھنے میں ناکارہ اور فضول سے لگ رہے تھے۔ بلاشبہ بہت سوں کے لیے یہ بے معنی تھے اور میرے لیے بھی... بے معنی ہی تھے البتہ اس لحاظ سے میرے لیے ضروری تھے کہ میرے انتقامی فرائض کی انجام دہی کے دوران وقت بہ وقت مجھے ان کی ضرورت پیش آجاتی تھی۔
وہ چھوٹا سا کیمرا مجھے اپنی پتلون کی جیب میں دہکتے ہوئے انگارے کے مانند محسوس ہو رہا تھا جس کی تپش میری ران کو گرما رہی تھی۔ اس تمام سہ پہر میں اپنی گھڑی بار بار اپنے کان پر لے جا رہا تھا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا جیسے گھڑی رک گئی ہے۔ ابھی تو صرف...... ابھی تو صرف...... ابھی تو صرف......؟
بالآخر گھڑی نے ساڑھے چار بجا ہی دیے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور دفتر سے نکل گیا۔
وہی ٹیکسی عین اسی مقام پر موجود تھی لیکن اس مرتبہ جب میں خالی اٹیچی کیس لے کر اس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ عقبی نشست پر ایک اور پسنجر دوسرے کنارے پر پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔
میں قدرے ہچکچایا تو وہ بولا۔ ’’پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر اسٹل مونٹ۔ میں صرف تمہاری رفاقت کے لیے ہوں۔‘‘
وہ شخص خطرناک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ دبلے پتلے جسم کا مالک اور زرد رنگت والا ایک لڑکا سا تھا جسے دیکھ کر میرے ذہن میں بے ساختہ ’نحیف‘ کا لفظ ابھر آیا۔
میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور بولا۔ ’’رقم کہاں ہے؟‘‘
’’ہماری ڈرائیور کے برابر کی نشست پر۔‘‘ اس لڑکے نے کہا۔ ’’تم یہ خالی اٹیچی کیس وہاں پر رکھ سکتے ہو۔‘‘
میں نے اپنا خالی اٹیچی کیس فرش پر رکھ دیا اور آگے جھک کر دیکھا تو بالکل اسی سے ملتا جلتا ایک اور اٹیچی کیس سامنے کی سیٹ پر موجود پایا۔ ’’میرا خیال ہے کہ اب میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔‘‘ میں نے اٹیچی کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
’’اگر وہ کیمرا مجھے دے دو تو۔‘‘ اس نے جواب دیا۔
’’مجھے اس سے نجات حاصل کر کے خوشی ہوگی۔‘‘ میں نے اپنی جیب میں سے لائٹر نما کیمرا نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔
اتنے میں ٹیکسی چل پڑی اور پہلے کی طرح واشنگٹن کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ میں نے وہ نیا اٹیچی کیس اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس میں موجود رقم چیک کرنے اور گننے میں مصروف ہو گیا۔ پہلے کی طرح یہ تمام نوٹ بھی اصلی، پرانے اور چھوٹی مالیت کے تھے۔
ونڈر فل! ونڈر فل!
ٹیکسی آٹھویں اسٹریٹ نارتھ ایسٹ پر ایک پرانے سے بورڈنگ ہاؤس کے سامنے رک گئی۔ ’’یہاں انتظار کرو۔‘‘ اس نوجوان نے کہا اور ٹیکسی سے اتر کر اس عمارت میں چلا گیا۔
ایک طریقے سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس خاتون ڈرائیور سے بات چیت کروں کیونکہ خاموشی قدرے گراں گزر رہی تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میرا کچھ کہنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ یہ خاموشی ہی بہتر ہے۔
میں نے اس سودے کی تمام جزئیات پر نہایت باریک بینی سے اور بار بار غور کیا تھا۔ ایک ایک تفصیل کو مدنظر رکھا تھا۔ یہ معلومات جو میں فروخت کر رہا تھا وہ مخالف، دشمن یا مقابل کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھی... جو کوئی بھی ہو سکتے تھے...... لیکن ایک چھوٹی معمولی سی حد تک۔ اور یقیناً

اسے ان کے کیمپ میں موجود اسی قسم کے اسپائی نیٹ ورک کے ذریعے آسانی سے کاؤنٹر بیلنس کیا جاسکتا تھا۔
میں نے جو کچھ فروخت کیا تھا وہ مواد فیصلہ کن نہیں تھا۔ بلاشبہ میں اپنی باقی تمام زندگی خود کو مجرم محسوس کرتا رہوں گا لیکن اس قصور پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔
ادھر وہ خاتون ٹیکسی ڈرائیور بے حس وحرکت اپنی نشست پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں ونڈشیلڈ کے پار جمی ہوئی تھیں اور اس نے اپنے ہاتھ اطمینان کے ساتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہوئے تھے۔
لگ بھگ دس منٹ کے بعد وہ نوجوان عمارت کے دروازے پر نمودار ہوا اور چھوٹے چھوٹے دوڑتے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر ہمارے پاس آگیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور خاتون ٹیکسی ڈرائیور سے بولا۔ ''فائن!'' پھر وہ واپس پلٹ گیا۔
عورت بولی۔ ''کہاں جانا ہے؟''
''یونیورسل پارکنگ گیراج۔'' میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

میری وہ رات میرے کافی کے بقیہ خالی کینز میں رقم چھپانے میں بیت گئی۔
سنیچر کے روز میں نے نقد رقم کے عوض اپنی کار کے لیے ٹائروں کے نئے سیٹ کے علاوہ پاور سے چلنے والی ایک آری بھی خریدی۔
اتوار کے روز میں اپنی فیملی کو ڈرائیو ان لے گیا۔
پیر کی صبح میں نے دفتر فون کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں دفتر نہیں آسکوں گا۔ پھر میں شاپنگ کرنے نکل گیا۔ میں نے اپنے لیے دو نئے سوٹ، دھوپ کی عینک کی جوڑی، ایک عمدہ سی مچھلی کے شکار کی چھڑی اور اچھی سی اسکاچ وہسکی کے کیس کی خریداری کی۔ پھر اپنے بینک اکاؤنٹ میں تین ہزار ڈالرز کی رقم جمع کرائی اور گھر چلا آیا۔
میں نے اپنی بیوی کو یہی بتایا کہ میں نے دفتر میں ایک باکسنگ پول جیتا ہے۔ یہ میرا اصراف کا واحد موقع ہے۔
میں نے سوچ لیا تھا کہ آج کے بعد سے میں اپنی آمدنی میں پانچ سو، ہزار ڈالر کا اضافہ کرتا جاؤں گا اور یہ رقم میں اپنے کافی کے ڈبوں میں چھپائی ہوئی رقم سے باقاعدگی سے ہر ماہ نکالتا رہوں گا۔ اس طرح میرے طرزِ زندگی میں کافی فرق آجائے گا اور معاشی حالت میں بھی قدرے بہتری آجائے گی۔
مجھے برسوں کے بعد اب بہتری کا احساس ہونا شروع ہوا تھا۔
منگل کی شب انہوں نے آکر مجھے دھرلیا۔ وہ فیڈرل کے نہیں بلکہ اسٹیٹ کی پولیس کے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت کی۔
وہ مجھے سیدھا ایک دفتر میں لے گئے جہاں سادہ لباس میں سنجیدہ سے لوگ موجود تھے۔ تب ان میں سے ہلکے خاکستری بالوں والا ایک شخص جو پائپ پی رہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''لگ رہا ہے کہ تمہارے پاس اچانک ٹھیک ٹھاک رقم آگئی ہے، مسٹر اسٹل مونٹ!''
''رقم؟'' میں نے کہا۔
تب اس نے چھوٹی مالیت کے چند پرانے نوٹ میز پر سے اٹھا کر دکھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم نے یہ رقم سنیچر کے روز خرچ کی ہے...... بین فرینکلن شاپنگ سینٹر میں۔ اور یہ رقم تم نے کل ہی اپنے ذاتی چیکنگ اکاؤنٹ میں جمع کرائی ہے۔''
''یہ نوٹ جعلی ہیں؟''
وہ بولا۔ ''معاف کرنا، کیا کہا؟''
''انہوں نے آخر کار مجھے دھوکا دے دیا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمام وقت اس بات کا دھڑکا لگا رہا تھا...... جعلی نوٹوں کا لیکن میں نے سوچا تھا کہ پرانے نوٹ، استعمال شدہ نوٹ...... وہ کس طرح جعلی ہوسکتے ہیں؟ کیا تم لوگوں نے انہیں بھی پکڑلیا؟ سو تم انہیں بھی دھر چکے ہو؟''
اس پر وہ اپنے پائپ کا ایک بڑا سا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی ہے، مسٹر اسٹل مونٹ!''
''یہ نوٹ۔ یہ جعلی نوٹ ہیں نا، ٹھیک؟ جیسا کہ میرا خیال تھا کہ یہ جعلی ہوں گے۔ اور اسی بنا پر تم لوگ مجھ تک پہنچ گئے۔''
''یہ نوٹ۔'' اس نے وہ نوٹ اوپر اٹھالیے تاکہ میں انہیں اچھی طرح دیکھ سکوں۔ ''یہ نوٹ بالکل درست، قانونی طور پر قابلِ قبول اور جائز کرنسی نوٹ ہیں۔''
''لیکن......'' میں نے کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں اٹکنے لگے۔
''یہ تمام نوٹ اس دو کروڑ ڈالر کی رقم کا حصہ ہیں جو گزشتہ بدھ کو بالٹی مور میں ایک بکتر بند گاڑی میں ڈکیتی کی واردات کے دوران لوٹی گئی تھی۔ ان تمام نوٹوں کے نمبروں کا ریکارڈ محفوظ تھا، مسٹر اسٹل مونٹ۔'' اس شخص نے میری جانب جھکتے ہوئے ٹھوس اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ لوٹی ہوئی باقی رقم کہاں ہے، مسٹر اسٹل مونٹ؟''

راہِ نجات

ناہید سلطانہ اختر

بعض اوقات جذباتی لغزشیں زندگی کی ترتیب میں لرزش پیدا کردیتی ہیں۔ اگرچہ اسے اپنوں کے نظرانداز کیے جانے کا دکھ تھا مگر وہ اپنی ذات کو اپنوں سے اتنا دور کرلے گا... کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا اور جب کوئی مسافر جان بوجھ کر اپنے رستے سے ہٹ جائے اور انجانی راہ کے تماشوں میں گم ہوجائے تو ایسے میں اپنی منزل تو کہیں دور رہ ہی جاتی ہے مگر دوسرے ٹھکانے بھی عارضی ثابت ہوتے ہیں اور... یہ بات اجنبی فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں کو اس وقت سمجھ آتی ہے جب وہ اپنے غول سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اسے بھی بہت زعم تھا کہ بغاوت میں اٹھایا جانے والا یہ قدم اسے ایک خوب صورت منزل پر لے جائے گا لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ دیارِ غیر میں نہ دیے زیادہ دیر روشن رہتے ہیں اور نہ ہی یار زیادہ دیر ساتھ نبھاتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ہر گزرنے والا پل انسان کو اپنے انجام کی جانب دھکیل رہا ہوتا ہے مگر دنیا کے جھمیلوں میں ہم بھول جاتے ہیں کہ ایک دن ہمیں اپنے رب کی جانب لوٹنا ہے حتیٰ کہ اپنے انجام کو ترتیب دینے کی اس ترغیب کو بھی فراموش کردیتے ہیں جو اسے پیدائش سے قبل ہی دی جاتی ہے مگر... پیدائش کے بعد یہ فراموشی انسان کو خسارے کی طرف گامزن رکھتی۔

لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے مرکز سے ہٹ کر چلنے والے

شاطروں کا عبرت اثر ماجرا

موسم سرد تھا۔ مطلع ابر آلود۔ بینا اور ماریہ سنڈے سروس کے لیے چرچ جانے کو گھر سے نکل ہی رہی تھیں کہ ڈیوڈ کی آواز نے انہیں چونکنے اور پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کردیا، اس نے ماریہ کو پکارا تھا۔

''جی ڈاڈا۔'' ماریہ کی نظریں باپ پر تھیں۔ وہ اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی باپ کو پیار سے ڈاڈا کہا کرتے تھے۔

''کہاں جارہی ہو؟'' ڈیوڈ تیوری چڑھائے بیوی اور بیٹی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

ماریہ نے ماں کو اور ماں نے اسے دیکھا۔ ڈیوڈ کے تیور ان کے لیے نئے نہ تھے۔ بیوی اور بچوں پر نت نئی بندشیں لگانا تو جیسے اس کی عادت ہی بن چکی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس عادت میں شدت بھی آتی جارہی تھی۔ کبھی بینا کے اس کے میکے والوں سے ملنے پر پابندی تو کبھی بینا کے میکے سے فون آنے پر بچوں کو ان سے بات نہ کرنے دیتا۔ کبھی مقدس مریم کا مجسمہ طاق میں اس کی مخصوص جگہ سے اٹھا کر اِدھر اُدھر رکھ دیتا تو کبھی ماریہ کی گردن سے صلیبی لاکٹ اتروا دیتا۔ خود چرچ جانا تو اس نے عرصہ ہوا ترک کردیا تھا۔ بلکہ جمعے کو چوری چھپے نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاتا تو بڑے بیٹے فلپ کو بھی ساتھ لے جاتا اور اس بات پر بینا سخت جزبز ہوتی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ بینا کا مذہب کی طرف زیادہ رجحان ہوگیا تھا۔ وہ انتہائی باقاعدگی سے چرچ جاتی اور اپنے تینوں بچوں کو بھی تعلیمات کا پابند رہنے کی تلقین کرتی۔ اسے فلپ کے اپنے باپ کے ساتھ مسجد جانے کا پتا چلتا تو وہ اسے آہستگی سے سمجھانے بیٹھ جاتی۔

''ہم کرسچن ہیں بیٹا...... کیتھولک کرسچن...... ہماری عبادت کی جگہ چرچ ہے۔''

''ڈاڈا زبردستی لے جاتا ہے یار۔'' فلپ کچھ شرمندگی کچھ جھلاہٹ سے کہتا۔ کیونکہ ماں سے پیار اسے شرمندگی اور باپ سے محبت جھلاہٹ پر مجبور کردیتی تھی۔

''تو منع کیوں نہیں کردیتا۔'' بینا بیٹے پر آنکھیں نکالتی۔

''منع کرسکتا ہوں کیا...... ڈاڈا مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔''

''پیار پیار میں وہ تیرے کو مسلم بنا دے گا۔''

''ہاں ڈاڈا یہی تو بولتا ہے کہ وہ خود بھی مسلم ہے اس لیے میں اس کا بیٹا بھی مسلم ہوں۔''
''وہ پاگل ہے۔'' بینا بھبک اٹھی۔
''وہ پاگل ہے تو تم نے اس سے شادی کیوں کی؟''
''کیونکہ وہ بری طرح میرے پیچھے پڑ گیا تھا شادی کے لیے۔''
''تو اب بھگتو۔'' فلپ بے نیازی سے شانے اچکاتا۔
''بھگت ہی تو رہی ہوں۔''
بینا طاق میں دھری مورتیوں کے سامنے دست بستہ کھڑی ہو کر انتہائی خشوع و خضوع سے ڈیوڈ کے راہِ راست پر آنے اور بچوں کے نہ بھٹکنے کے لیے دعا مانگتی۔
سردی، گرمی، بارش، طوفان...... بینا کا اتوار کو چرچ جانا لازم تھا۔ پہلے ڈیوڈ اور تینوں بچے بھی ساتھ ہوا کرتے تھے مگر کافی عرصے سے ڈیوڈ نے نہ صرف خود چرچ جانا ترک کر دیا تھا بلکہ فلپ کے ماں کے ساتھ چرچ جانے پر بھی ناک بھوں چڑھانے لگا تھا لیکن آج تو وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔
''یہ چرچ نہیں جائے گی۔'' اس نے ایک نظر ماریہ کو دیکھ کر بینا سے کہا۔
''کیوں؟'' بینا نے تیوری چڑھائی۔
''بس!'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔
''بس کا مطلب؟''
''بحث نہیں...... سمجھی!'' ڈیوڈ نے بینا کا بازو اتنی سختی سے دبوچا کہ اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔
''ڈاڈا پلیز!'' ماں کو اذیت میں دیکھ کر ماریہ نے اس کا دفاع کرنا چاہا۔
''پرے ہٹ!'' ڈیوڈ نے اسے جارحانہ انداز میں دھکیلا تو وہ لڑکھڑائی اور دیوار سے جا ٹکرائی۔
''کیا کرتے ہو تم!'' بینا زور سے چلّائی۔ ''چرچ جانے سے روک رہے ہو اسے ...... ہم کرسچن ہیں...... عبادت کے لیے چرچ نہیں تو پھر کہاں جائیں گے؟''
''تجھے جانا ہے جا...... ماریہ نہیں جائے گی۔'' ڈیوڈ بولا۔
''ماریہ کیوں نہیں جائے گی۔'' بینا کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور احتجاج بھی۔
''اس لیے کہ ماریہ میری اولاد ہے۔'' ڈیوڈ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اپنا حق جتایا۔
''اس سے کسے انکار ہے۔''
''اسی لیے وہ چرچ نہیں جائے گی۔''
''اسی لیے!'' بینا نے معنی خیز لہجے میں اس کے الفاظ دہرائے۔
''ہاں...... میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی اولاد چرچ نہیں جاتی۔''
''تم بھول رہے ہو ڈیوڈ کہ...... برسوں پہلے تم اپنا مذہب تبدیل کر چکے ہو...... اب کرسچن ہو مسلمان نہیں۔''
''بکواس بند!'' وہ بلبلا کر دہاڑا۔
''غلط کہہ رہی ہوں تو بولو۔''
''بکواس بند کرتی ہے یا لگاؤں ہاتھ۔'' اس نے بینا کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ماریہ پھر درمیان میں آگئی۔
''تم مجھے مارو یا چیخو چلاؤ...... جو حقیقت ہے، ہے۔'' بینا نے بے دھڑک کہا۔
''ماریہ نہیں جائے گی چرچ۔'' ڈیوڈ نے آنکھیں نکالیں اور ماریہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''چل اپنے کمرے میں۔''
''میں تو جاتی ہوں...... سروس شروع ہو جائے گی۔'' بینا نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔
''ممی ٹھہرو...... میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔'' ماریہ ماں کی طرف بڑھی۔
ڈیوڈ نے اپنا بازو اس کے سامنے کر کے اس کا راستہ روک لیا اور اسے غصے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ بچی ہے کیا جو چرچ یا گھر کا راستہ بھول جائے گی۔''
بینا ٹھٹک کر پیچھے دیکھنے لگی تھی۔
''ممی کو اچانک چکر آ جاتا ہے ڈاڈا...... کہیں گر گئیں تو!''
''اچھا ہے گر جائے...... مر جائے۔'' ڈیوڈ نے بے رحمی سے کہا۔
''خدا کے واسطے ڈاڈا ایسے تو نہ بولیں۔'' ماریہ گڑگڑائی۔
''مجھے روگی تمہی نے بنایا ہے۔'' بینا نے اپنی انگلی ڈیوڈ کی طرف اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیسا ستم ہے کہ میری ماں، باپ، بہن، بھائی کوئی میرے گھر نہیں آ سکتا۔ نہ میں ان کے گھر جا سکتی ہوں...... چرچ نہ جاؤں تو شاید ان کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاؤں۔'' بینا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
''چلو ممی۔'' ماریہ بے باکی سے ماں کی طرف بڑھی مگر ڈیوڈ نے اسے ہاتھ گھما کر مارا اور دانت پیستے ہوئے غرایا۔ ''تیرا تو میں بندوبست کرتا ہوں۔''
بینا کو انجانے خوف نے آ لیا۔ خدا جانے اس کی اس

دھمکی میں کیا معنی پوشیدہ تھے۔ مصلحت کوشی سے اس نے ماریہ ہی کو آنکھیں دکھائیں۔ ”کیوں نہیں سنتی تو اپنے باپ کی بات...... جب وہ منع کر رہا ہے تو کیوں ضد کر رہی ہے تو میرے ساتھ جانے کی۔“

”تمہیں چکر جو آجاتا ہے ممی۔“

”میری فکر مت کر...... ابھی نہیں مرتی میں۔“ بینا نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ممی پلیز! میں ساتھ چلوں گی۔“

”اب مجھ سے مار کھائے گی تو۔“ بینا نے اسے گھورا اور پلٹ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔

ڈیوڈ نے ماریہ کو گھورا۔ دروازے کی چٹخنی اندر سے چڑھائی اور ماریہ کے پلٹ جانے تک دروازے پر پہرے دار بنا کھڑا رہا۔ ماریہ کے چہرے سے ناگواری اور جھنجلاہٹ ہویدا تھی۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑی رہی پھر باپ کی مرضی کے خلاف ماں کے ساتھ جانے کے لیے اس کے پیچھے جانے کو راستہ نہ پا کر واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

ماریہ اپنی اینگلو انڈین ماں، بینا اور پاکستانی نژاد باپ کی پہلی اولاد تھی جو کہ اب ڈیوڈ کہلاتا تھا مگر کبھی داؤد خان ہوا کرتا تھا۔ بینا اور ڈیوڈ نے ماریہ کو بے حد لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ممکنہ حد تک اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ کانوینٹ اسکول میں پڑھایا تھا۔ ان دنوں وہ ایک مشنری تعلیمی ادارے میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ فلپ اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ لوئیس، فلپ کی پیدائش کے بارہ سال بعد پیدا ہوا تھا۔ یوں لوئیس جسے پیار سے لوئی پکارا جاتا تھا انیس سالہ ماریہ سے تقریباً پندرہ سال چھوٹا تھا۔ ماریہ اور فلپ کے لیے لوئیس ایک کھلونے کی طرح تھا۔ دونوں بھائی بہن اس سے بہت پیار کرتے تھے مگر ڈیوڈ کو ماریہ دونوں بیٹوں سے زیادہ پیاری تھی۔ ہر معاملے میں وہ اسے فلپ اور لوئیس سے زیادہ اہمیت دیتا۔ اس کی بات کو شاذ ہی رد کرتا۔ آج سے پہلے اس نے ماریہ کو کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا مگر آج اس نے بیٹی پر ہاتھ اٹھا دیا تھا اور وہ بھی ماں کے ساتھ اس کے چرچ جانے کی ضد پر...... حالانکہ چرچ تو وہ خود بھی برسوں نہایت باقاعدگی سے جاتا رہا تھا۔ اس باقاعدگی میں تبدیلی لوئیس کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد رونما ہوئی تھی، پہلے اس نے چرچ جانا کم کیا اور بتدریج ترک ہی کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے بینا پر اس کے خاندان والوں سے ملنے جلنے پر پابندی بھی لگانا شروع کر دی۔ بینا کے رشتے دار اس سے ملنے کے لیے آتے تو وہ ناک بھوں چڑھاتا یا انہیں دیکھ کر گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔

اسے اپنے بچوں کا ننھیال والوں کی طرف مائل ہونا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ اس نے چوری چھپے مسجد جانا شروع کر دیا تھا جمعے کی نماز کے لیے وہ فلپ کو بھی اپنے ساتھ مسجد لے جانے لگا تھا۔ بینا معترض ہوئی تو اس نے اسے اپنے کام سے کام رکھنے کی تلقین کی۔ ماریہ کی اپنے کزنز سے دوستی اور بے تکلفی پر تو وہ اکثر ہی اعتراض کیا کرتا تھا۔ اب اس نے اس کے چرچ جانے پر بھی پابندی لگانا شروع کر دی تھی۔ آج تو انتہا ہی ہو گئی، اس نے ماریہ کو چرچ جانے سے روکنے کے لیے اس پر ہاتھ بھی اٹھا دیا تھا اور اس پر مستزاد اس کا یہ کہنا کہ تیرا تو میں بندوبست کرتا ہوں۔

بینا، چرچ میں اتوار کو ہونے والی عبادت میں شریک ہونے کے لیے ماریہ کے بغیر ہی چرچ جانے کو گھر سے تو نکل گئی تھی مگر اس کا دھیان مستقل ڈیوڈ کی اسی دھمکی میں اٹکا ہوا تھا۔ آخر کیا بندوبست کرنے جا رہا تھا وہ ماریہ کا۔ راستے بھر بینا کا ذہن مختلف خدشات میں الجھا رہا بالآخر اس نے خود کو تسلی دی کہ ڈیوڈ جو بیٹی سے غیر معمولی محبت کرتا تھا اس کے لیے کوئی غلط راستہ کیسے اختیار کر سکتا تھا۔

لیکن محبت تو ڈیوڈ نے خود اس سے بھی کی تھی اور اس حد تک کہ اس کو اپنانے کی خاطر اس نے اپنا دین، دھرم، ماں باپ کا دیا ہوا نام، اپنا گھر، خونی رشتے ناتے، دوست احباب سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

کوئی بائیس سال پرانی بات تھی۔ بینا ان دنوں ایک شوخ و شنگ نوجوان لڑکی ہوا کرتی تھی۔ شہر کے ایک چرچ سے متصل کرسچن کالونی میں ایک چھوٹے سے گھر میں وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ آس پاس اس کے بعض ننھیالی اور ددھیالی رشتے داروں کے گھر بھی تھے۔ اس کا باپ ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھا۔ اس سے بڑی ایک بہن تھی۔ اس کے بعد اوپر تلے دو بھائی، چار بہن بھائیوں میں بینا سب سے چھوٹی تھی۔ بینا کی بڑی بہن گریجویشن کے بعد چند ضروری مہارتیں حاصل کر کے ایک پیٹرولیم کمپنی کے ایم ڈی کی سیکریٹری کے طور پر ملازمت کر رہی تھی۔ بڑا بھائی موٹر کاروں کا مکینک تھا۔ چھوٹا ٹیلی فون آپریٹر لگا ہوا تھا۔ بینا ایف اے کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد مزید کتابی تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کے باعث اپنی بڑی بہن کے مشورے پر کمپیوٹر کورس کر رہی

تھی۔ اس کی بہن کا خیال تھا کہ کمپیوٹر کے استعمال میں دسترس حاصل کر کے بینا کو ملازمت کے حصول میں آسانی رہے گی۔ کمپیوٹر جاننے والی لڑکیاں بہت اچھے پیسے کما رہی تھیں۔ بینا اور اس کے گھر والوں کو اچھے پیسے دینے والی ملازمت ہی سے غرض تھی۔ لڑکی اچھی نوکری پر ہو تو رشتے بھی اچھے مل جاتے ہیں...... اچھے نہ سہی جلدی تو ضرور!

کمپیوٹر کی مہارت سکھانے والا ادارہ صدر میں....

ایک قدیم عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ بس اسٹاپ سے اس عمارت تک فاصلہ تقریباً دس منٹ کی تیز پیدل مسافت پر تھا۔ بینا کو وہاں آنے جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا پڑتا تھا۔

اسے مذکورہ ادارے آتے جاتے کوئی ڈیڑھ دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک روز جب وہ حسبِ معمول بس اسٹاپ سے انسٹی ٹیوٹ کی طرف جارہی تھی اس نے اپنے عقب میں کسی مرد کو ایک پرانا فلمی گیت بڑے سرتال میں گاتے سنا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنا ضروری سمجھا نہ مناسب۔ اس نے اپنی دادی سے سنا تھا۔ لڑکی کو سڑک پر پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ پیچھے والا سمجھتا ہے مجھے دیکھ رہی ہے اور سامنے سے آنے والا اس کی بے خبری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جان بوجھ کر ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال جو بھی گا رہا تھا اس کی آواز نہایت سرتال میں تھی۔ بینا نے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت تک پہنچنے کے بعد زینہ چڑھنے سے قبل بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اگلے دن پھر جب وہ بس سے اترنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ کی طرف جارہی تھی، اس نے پھر اپنے پیچھے کسی کو گانا گاتے سنا۔ وہ اس دن گزشتہ روز کی طرح طربیہ فلمی نغمہ گانے کے بجائے درد بھرا فلمی گیت گا رہا تھا

جب کوئی پیار سے بلائے گا تم کو ایک شخص یاد آئے گا......

آواز غضب کی تھی...... اس روز وہ اس کے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت تک اس کے پیچھے نغمہ الاپتا چلتا رہا۔ قدیم عمارت کے چوبی زینے پر قدم رکھنے سے قبل بینا نے گردن کو ذرا سا موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک گورا چٹا، دراز قامت، ہینڈسم اور خوش پوش نوجوان تھا۔ بینا نے اسے ایک نظر دیکھا اور تیزی سے زینہ چڑھنے لگی۔

تیسرے دن پھر وہی ہوا۔ بس اسٹاپ سے انسٹی ٹیوٹ تک کا راستہ زیادہ چہل پہل والا نہیں تھا۔ بینا اس روز بھی اسے کسی فلمی ہیرو کی طرح اپنے پیچھے پیچھے گانا گاتے سن کر راستے میں ٹھٹک گئی اور گردن موڑ کر قدرے ناگواری سے دیکھنے لگی۔

''سوری!'' بینا کو پیچھے دیکھتے پا کر اس کے گانے کو بریک لگ گئی تھی اور وہ ٹھٹک کر اس سے معذرت کررہا تھا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں......'' بینا نے غصے سے کہا۔

وہ کان کھجانے لگا۔

''ایڈیٹ!'' بینا نے اسے گھورا۔

''تھینک یو!'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

بینا جو اسے پھٹکار کر آگے بڑھنے کا سوچ رہی تھی، دو قدم پلٹی اور اس کے روبرو جاتھمی۔ ''زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں...... سمجھے۔''

''جی سمجھ گیا۔ سمجھ گیا میم صاحب۔'' بینا کی لمبی فراک کے دامن تلے اس کی فٹ بھر تک ننگی پنڈلیوں کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس نے بھولے منہ سے کہا۔

''بے شرم!'' بینا نے اس کی نگاہیں اپنی پنڈلیوں پر دیکھ کر غصے سے کہا۔

''اور کچھ میم صاحب؟''

''گیٹ لوسٹ۔''

''بیوٹی فل!''

''کیا!''

''یس...... یو آر ویری بیوٹی فل!''

بینا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا، ڈھٹائی کی انتہا تھی۔ سرِ راہ وہ اس سے ایسی بات کہہ رہا تھا۔

''یو آر میڈ!'' بینا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''جب سے آپ کو دیکھا ہے میم صاحب...... ہو تو گیا ہوں پاگل ہی۔'' وہ مسکرایا۔

''یو......''

''بولیں بولیں...... چپ کیوں ہوگئیں۔''

''وہ آرہے ہیں دو آدمی۔'' بینا نے سنسان راستے پر دو مردوں کو آگے دیکھ کر ان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''ذرا آجائیں نزدیک پڑواتی ہوں تمہیں جوتے۔''

''ہائے!'' اس نے اپنی انگلیاں نچائیں اور شوخی سے بولا۔ ''پھر ملیں گے۔''

لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ برق رفتاری سے اس سے آگے نکل گیا۔

کمپیوٹر پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے بینا بیشتر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ عجیب آدمی تھا۔ اپنے لفنگے پن سے قطع نظر خود اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ اور اسے بیوٹی فل کہہ رہا تھا۔ اس کی ماں تو اسے لاڈ اور ناگواری ہر دو

صورتوں میں ہی ''کالی'' کہا کرتی تھی۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ اس کی کالے پن کی حد تک سلونی رنگت میں بھی بلا کی کشش تھی جو اس کی تیزی اور طراری سے دو چند ہو جاتی۔

شاید ان دنوں بھی آج کل کی طرح موبائل فونز کا رواج عام ہوتا تو وہ نقلی ہیرو اپنا موبائل نمبر شاید اس کے راستے میں پھینک گیا ہوتا۔

اگلے روز ہفتہ واری تعطیل تھی۔ اس سے اگلے دن وہ پھر اس وقت اس کی راہ میں آ گیا جب وہ انسٹی ٹیوٹ سے گھر واپس لوٹ رہی تھی۔

''دیکھو...... وہ سامنے...... روڈ کے اس پار... کمپاؤنڈ میں میرا گھر ہے اتنی مار پڑے گی تمہیں کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔'' بینا نے کہا۔

''ہوش تو پہلے ہی گم ہیں۔'' وہ بے باکی سے بولا۔

''وہاٹ!''

''یس۔''

''مائی گاڈ!''

''ویسے آپ اپنی عمر کے مقابلے میں بہت ہوشیار دکھائی دیتی ہیں۔''

''مجھے بے وقوف سمجھنے کی غلطی بھی مت کرنا۔''

''توبہ توبہ۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''میرے دو بڑے بھائی ہیں...... تمہیں ایسی فٹ بال بنائیں گے کہ تم میرا پیچھا کرنا بھول جاؤ گے۔''

''آزما کر دیکھ لو۔''

بینا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمپاؤنڈ کی طرف چلی گئی۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔

بینا نے ماں کو بتانا ضروری سمجھا۔ ماں نے کہا۔ ''تم اس کے منہ نہ لگنا...... ایسے لفنگے دو چار دن تنگ کرتے ہیں پھر یہ دیکھ کر کہ لڑکی ایسی ویسی نہیں پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔''

''ڈیڈی کو بتاؤ نا آپ۔'' بینا نے ماں سے کہا۔

''نہ...... نہ...... مردوں میں جھگڑا ہو جائے تو بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔''

اگلے چند دن وہ بہت باقاعدگی سے اس کے پیچھے آتا اور بات کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر بینا نے ماں کی ہدایت کے مطابق اس کی ہر بات کے جواب میں خاموشی اختیار رکھی...... لیکن کب تک؟ ایک روز تنگ آ کر اس نے زبان کھول ہی دی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی روزانہ میرا پیچھا کرتے ہو۔''

''شکر ہے تم بولیں تو۔'' وہ ''آپ'' کے بجائے ''تم'' پر آ گیا۔

''فار گاڈ سیک!'' بینا نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔''

''تمہارے گھر کے سامنے ٹینٹ لگا دوں؟''

''جوتے پڑیں گے۔''

''مجنوں کو بھی پتھر پڑتے تھے۔''

''تم مجنوں کے چاچا ہو گیا؟''

''مجنوں میرا چاچا تھا۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''ایڈیٹ!''

''لو یو۔''

''وہاٹ!'' بینا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آئی لو یو۔'' اس نے بے باکی سے کہا۔

''گاڈ!'' بینا کی اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے تھی۔

دور سے ایک مرد اور عورت کو آتے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے گڈ بائی اور پھر ملنے کا کہا اور اڑنچھو ہو گیا۔

کافی دن یہ سلسلہ چلا۔ بینا بس اسٹاپ پر بس سے اترتی تو وہ جانے کہاں سے آ ٹپکتا اور اس کا پیچھا کرتے ہوئے موقع تاک کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتا۔ بینا طبعاً شریف لڑکی تھی۔ کبھی اس کی کہی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتی، کبھی اسے ڈانٹ دیتی۔ اس کے پیچھا کرنے کو اس کے لفنگے پن پر محمول کرتی۔ اس کا خیال تھا دو چار دن میں وہ سمجھ جائے گا کہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے اور اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دے گا لیکن ایسا ہونے کے بجائے وہ تو دن بہ دن پھیلتا ہی چلا گیا۔ ماں سے بینا کوئی بات نہ چھپاتی تھی۔ اس کے ''لو یو'' کہنے والی بات بتائی تو ماں جو چھوٹے دل کی کمزور عورت تھی گھبرا کر بولی۔

''گھر بیٹھ بینا...... تیرے باپ اور بھائیوں کو پتا چلا تو وہ اس سے لڑنے جا پہنچیں گے۔''

''گھر بیٹھوں گی تو بھی تو وہ پوچھیں گے نا کیوں بیٹھی ہے۔'' بینا بولی۔

''ہاں پوچھیں گے تو ضرور۔''

''اور پھر مجھے جاب کے لیے کوئی اسکل لینا تو ضروری ہے ممی...... آج کل کمپیوٹر کا دور ہے...... ہمارے انسٹی ٹیوٹ کی بڑی شہرت ہے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے بینا لیکن عزت پہلے...... کیا پتا کون ہے جو تیرا پیچھا کرتا ہے، لفنگے ہوتے ہیں ایسے لوگ...... ان کے گینگ بھی ہوتے ہیں، لڑکی کو کھینچ کر گاڑی میں ڈالا یہ جا وہ جا...... بعد کو لڑکی کے ساتھ اس کے گھر

والے بھی کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے۔''

''مجھے جاب بھی تو کرنی ہے ممی...... بغیر کوئی کام سیکھے جاب کہاں ملے گی۔''

''نرسنگ کرلے...... وہاں آرام سے ہاسٹل میں رہنا۔''

''نہیں ممی...... میں سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنا چاہتی ہوں...... دیدی کی طرح...... تم دیکھنا ایک دن میں کسی بڑے آدمی کی سیکریٹری لگی ہوں گی۔''

''میں بھی یہی سوچتی تھی...... مگر یہ ہے کون منحوس جو تیرا پیچھا کرنے لگا ہے۔''

''مجھے کیا معلوم۔''

''نام پتا تو معلوم ہونا چاہیے۔''

''تم کہتی ہو تو معلوم کرلوں گی۔''

''کیا!'' ماں نے چونک کر پینا کو دیکھا۔ ''کیسے معلوم کرے گی؟''

''اسی سے۔'' پینا کو مذاق سوجھا۔

''نہیں...... کوئی ضرورت نہیں...... وہ سمجھے گا فری ہو رہی ہے۔''

''تو پھر اس کا نام کیسے پتا چلے گا؟''

''کیا ضرورت ہے اس کا نام پتا کرنے کی۔''

''کیا کرتی ہو ممی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم خود ہی بول رہی تھیں اس کا نام پتا معلوم ہونا چاہیے۔''

''میں تو بس ایک بات کر رہی تھی۔''

''میں بھی بس بات ہی کر رہی ہوں...... کون سا سچ مچ اس سے اس کا نام پوچھنے جا رہی ہوں۔'' پینا مسکرا کر بولی۔

''احتیاط سے آیا جایا کر۔'' ماں نے ہدایت کی۔

''فکر مت کرو۔''

''اب تو مجھے فکر ہی رہا کرے گی...... جب تک تو گھر نہیں آجاتی میرا دل وہم میں رہتا ہے۔''

''میں نے تمہیں اس لیے تو نہیں بتایا ممی کہ تم پریشان ہو جاؤ۔''

''میں ماں ہوں پریشان ہونا لازمی ہے۔''

''تمہیں لارنس کی پریشانی کم ہے جو میری طرف سے بھی پریشان ہو کر اپنی پریشانی اور بڑھا لینا چاہتی ہو۔''

لارنس، پینا کے بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھا۔ غصیلا اور جنگجو، کمپاؤنڈ میں آئے دن اس کا کسی نہ کسی سے پھڈا ہوتا رہتا تھا ماں اس کی طرف سے ڈرتی رہتی تھی۔

''مجھے اسی کی طرف سے خطرہ ہے۔'' ماں نے پینا کی بات پر کہا پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''اسے اگر یہ بات پتا چل گئی تو وہ تو کچھ کہے سنے بنا ہی اس کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔''

''اچھا ہے...... ایسوں کا ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''تھانہ کچہری تیرا باپ بھگتے گا۔''

''باپ کیوں میں بھگتوں گی۔ بتادوں گی پولیس کو کہ یہ لفنگا میرا پیچھا کیا کرتا تھا۔''

''پولیس تو جیسے تیری سن ہی لے گی نا۔''

''ارے ممی...... ڈرتی کیوں ہو...... جو ڈر گیا وہ مر گیا...... اور میں مرنا نہیں چاہتی۔''

ماں نے پینا کو گھورا۔ اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اسے تسلی دینے کو بولی۔ ''میں اپنا دفاع کرسکتی ہوں۔''

''کبھی قد دیکھا ہے تو نے اپنا آئینے میں۔'' ماں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئینے میں قد نہیں چہرہ دیکھا جاتا ہے ممی۔'' پینا کو پھر مذاق سوجھا۔

''آئینہ بڑا ہو، لمبا ہو تو قد بھی دکھائی دے جاتا ہے۔''

''بائی دی وے کیا ہوا میرے قد کو۔''

''پانچ فٹ دو انچ اور دبلی پتلی اتنی کہ پھونک مارو تو جیسے اڑ ہی جائے، دیکھنے والے اسکول گرل سمجھتے ہوں گے اور اس پر تو دفاع کرنے کی بات کرتی ہے۔''

''میرے قد اور دبلے پن کا دفاع سے کیا تعلق؟''

''تو پھر کس سے تعلق!'' ماں نے اپنی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''ہمت سے...... حوصلے سے...... دفاع ہمت اور حوصلے سے کیا جاتا ہے ممی اور وہ مجھ میں ہے...... وہ بدمعاش بھی اگر اس غلط فہمی میں ہے کہ یہ چھوٹی، دبلی پتلی سی لڑکی ہے تو اسے پتا چل جائے گا۔''

''کیا پتا چل جائے گا؟''

''یہی کہ لڑکی بھولی نہیں۔''

''یسوع مسیح تیری حفاظت کرے۔''

''بس، بس، بس...... تمہاری دعائیں ساتھ ہوں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''میں تو تمام دن اپنے بچوں کے لیے دعا ہی کرتی رہتی ہوں۔''

''بس تو پھر پریشان بھی مت ہوا کرو۔''

''کیا کروں...... دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہوں...... یہ دل میرا، مجھے تم چاروں بہن بھائیوں کے

بارے میں دن رات فکر مند رکھتا ہے۔"

"مت رہا کرو فکر مند...... سب ٹھیک ہوگا۔"

"خداوند کی مہربانی سے۔"

☆☆☆

بینا نے تو ماں سے اس کا نام معلوم کرنے کی بات مذاقاً کہی تھی اس نے سچ مچ از خود اپنا نام بتا دیا۔

"میرا نام داؤد ہے۔" وہ اس روز اس کا پیچھا کرتے ہوئے قدم بھر کے فاصلے پر آ گیا تھا۔

وہ انجان بنی چلتی رہی۔

"تمہارا نام؟"

وہ ٹھٹک گئی اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر گڑگڑا کر بولا۔ "پلیز! مجھے غلط مت سمجھو۔" بینا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم چھوٹی ہو مگر......" اس نے شانے اچکائے اور بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مگر؟"

"میرا دل آ گیا ہے تم پر۔"

"مجھے اتنی چھوٹی بھی مت سمجھنا...... ایف اے کا امتحان دے چکی ہوں میں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"کیا!" وہ چونکی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایف اے کا امتحان دے چکی ہو...... کمپیوٹر سیکھ رہی ہو، فادر تمہارے آفس جاب کرتے ہیں...... تم لوگ دو بہنیں دو بھائی ہو...... تمہاری بڑی بہن جاب کرتی ہے۔ بڑا بھائی ورکشاپ جاتا ہے چھوٹا ٹیلی فون آپریٹر ہے اور کافی جھگڑالو لڑکا ہے۔"

بینا آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔ "تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

"جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے حالات کی خبر بھی رکھی جاتی ہے کہو تو تمہارا نام بھی بتا دوں......" وہ ایک لمحے کو رکا پھر اس نے کہا۔ "بینا مائیکل۔"

"او گاڈ!" بینا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

دونوں جوانوں کو قریب آتے دیکھ کر بینا پھر چلنے لگی۔ وہ قدم بھر پیچھے سے ہٹ کر اس کے پہلو بہ پہلو آتے ہوئے بولا۔ "چلتی رہو...... رکنے کی ضرورت نہیں...... اور نہ ہی مجھ پر غصہ کرنے کی...... شریف آدمی ہوں، لچا لفنگا نہیں۔"

"میں شور مچا دوں گی۔" بینا نے دھمکی دی۔

"کوئی فائدہ نہیں...... میں بھاگ لوں گا لیکن پھر آؤں گا۔"

"آر یو میڈ؟" بینا ٹھٹک گئی۔

"نو...... آئی ایم ان لو...... ایک چھوٹی سی...... سانولی سلونی لڑکی سے جس کا نام بینا مائیکل ہے۔"

"مسلم ہو؟" بینا نے کہا۔

"ہاں۔"

"میں کرسچن ہوں۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم کرسچن لڑکیاں فلرٹ کے لیے ایزی ٹاسک ہوتی ہیں۔"

"نو، نو...... ایسی کوئی بات نہیں۔"

"یہی بات ہے...... ہم اسکرٹ اور ٹراؤزر پہننے والی لڑکیوں کو تم جیسے لوگ نہ جانے کیا سمجھتے ہو۔"

"وہ نو...... یقین کرو...... پاگل ہو گیا ہوں میں تمہارے لیے۔"

"میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہارا پاگل پن۔"

"شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے۔"

"نان سینس۔"

"کیوں؟ نان سینس کی کیا بات ہے...... شادی کرنے سے زیادہ عقلمندی والی بات تو کوئی اور ہوتی ہی نہیں۔"

"جا کر کسی مسلمان لڑکی کو بے وقوف بناؤ۔"

"میں بالکل سیریس ہوں۔ آئی لو یو بینا...... آئی ریئلی لو یو...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی سلم لڑکی سے مجھے اتنی شدت کا عشق ہو سکتا ہے...... یقین کرو دن رات میرا دل تمہاری طرف ہی رہتا ہے...... رات کو بستر پر لیٹتا ہوں تو تم میرے خوابوں میں اتر آتی ہو...... تم مجھے نہ ملیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

بینا جو اپنی عمر کے مقابلے میں خاصی سمجھدار اور پُراعتماد لڑکی تھی بہرحال تھی تو ایک نوعمر، نوجوان لڑکی ہی...... ایک خوبرو، خوش پوش اور خوش گفتار نوجوان کو یوں گڑگڑاتے دیکھ کر اسے اپنے دل میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔

"میں کرسچن ہوں۔" اس نے ایک مرتبہ پھر مگر اس بار قدرے رساں لہجے میں جتایا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات کیسے نہیں؟"

"تم اہلِ کتاب ہو اور ہم مسلمان مردوں کو اہلِ کتاب عورت سے شادی کی اجازت ہے۔"

''پھر تم چاہو گے میں مسلمان ہو جاؤں...... میرے والدین کٹر کیتھولک ہیں۔''

''میں ان سے بات کر سکتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں..... ممی کو تو خیر میں بتا چکی ہوں کہ ایک لڑکا روز میرا پیچھا کرتا ہے، ڈیڈی کو پتا چلا تو......''

''تو کیا؟''

''وہ بہت غصیلے ہیں اور میرا دوسرے نمبر کا بھائی تو ڈیڈی سے بڑھ کر خونخوار ہے...... میرے دادا شکاری تھے۔ ان کی بندوق ابھی تک ہمارے گھر میں ایک کھونٹی پر لٹکی رہتی ہے اور وہ بھی لوڈڈ!''

''نو پرابلم...... اگر بندوق کی گولی مجھے لگ گئی تو شہیدِ عشق کہلاؤں گا۔'' بینا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''ایسی ظالم نظروں سے نہ دیکھو مر جاؤں گا۔''

''پلیز۔ پلیز! میرے پیچھے مت آیا کرو۔''

''ایک شرط ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''مجھ سے شادی کرلو۔''

''تم واقعی پاگل ہو۔''

''پہلے نہیں تھا...... ہو گیا ہوں۔''

''میرا انسٹی ٹیوٹ آنے والا ہے۔''

''میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا...... وہاں اس کھمبے کے نزدیک۔''

''کیوں؟ کیوں انتظار کرو گے؟''

''تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑنے جاؤں گا۔''

''نہیں...... پلیز ایسا مت کرنا...... ڈیڈی یا بھائیوں میں سے کسی نے دیکھ لیا تو......''

''تو کیا؟''

''تو مجھے گھر بٹھا لیں گے...... انسٹی ٹیوٹ آنے جانے سے بھی جاؤں گی۔''

''میں تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''پلیز۔ پلیز! چھوڑ دو میرا پیچھا۔''

''جاؤ تمہارا انسٹی ٹیوٹ آگیا ہے۔''

کلاس کے بعد جب وہ باہر آئی تو وہ اس کا منتظر تھا۔

''تم گئے نہیں؟''

''میں نے اب کہاں جانا ہے...... تمہارے گھر کے باہر ڈیرا ڈال دوں گا۔'' اس نے سرفروشانہ انداز میں کہا۔

اور اس نے ایسا ہی کیا بھی۔ آتے جاتے بینا کا پیچھا کرنے کے بجائے وہ صبح و شام مشن کمپاؤنڈ کے آس پاس منڈلاتا نظر آنے لگا۔ ماں نے کہا۔ ''اب تو تیرے ڈیڈی کو بتانا ہی پڑے گا۔''

بینا کے باپ اور بھائیوں نے پہلے تو اس سے سختی سے بات کی پھر مغلظات بکیں۔ ٹھکائی بھی لگائی۔ بینا کا اکیلے باہر آنا جانا بالکل ہی بند کر دیا گیا مگر وہ بھی ایسا ڈھیٹ نکلا کہ نہ گالیاں سن کر بے مزہ ہوا نہ مار کھا کر پسپا ہوا۔ بینا کا باپ اسے دیکھ کر زمین پر تھوکتا تو وہ بڑی نیازمندی سے سر جھکا دیتا۔ بینا کے بھائی اسے گھورتے اور گالیاں دیتے ہوئے گزرتے تو وہ مسکرا دیتا۔ کمپاؤنڈ کے رہائشی چند نوجوانوں سے اس نے یارانہ بھی گانٹھ لیا تھا جو اسے درون خانہ خبروں سے آگاہ رکھتے تھے۔

بینا کے باپ نے قریبی چرچ کے پادری سیموئیل بینجمن سے بات کی جن کی خاصی اثر ورسوخ والی شخصیت تھی۔ پادری نے علاقہ تھانہ کے ایس ایچ او سے بات کر کے داؤد کے خلاف پرچہ کٹوا دیا۔ پولیس نے چھاپا مارا اور داؤد کو کمپاؤنڈ کے باہر منڈلاتے دیکھ کر رنگے ہاتھوں گرفتار کیا اور اسے تھانے لے گئے۔ تھانیدار نے اپنی چھڑی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر کر کے کہا۔ ''اوئے! تیرے خلاف پرچہ ہوا ہے کہ تو مشن کمپاؤنڈ کی لیڈیز کو چھیڑتا ہے۔''

''سر! میں کمپاؤنڈ کی صرف ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس کے علاوہ میں نے کبھی کمپاؤنڈ کی کسی لڑکی، کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھا۔'' داؤد نے بے خوفی سے کہا۔

''ہوں! اسے تو دیکھا ہے نا۔''

''اس سے محبت کا تو اقرار کر چکا ہوں میں۔''

''اوئے!'' تھانیدار نے اپنی چھڑی کے سرے سے داؤد کی ٹھوڑی کو ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ ''تو مسلمان ہے؟''

''جی۔''

''کیسا مسلمان ہے تو!'' تھانیدار نے ایک ابرو اوپر ایک نیچے کرتے ہوئے داؤد کو کڑی نگاہوں سے دیکھا۔ ''تجھے محبت کرنے کے لیے کوئی مسلمان لڑکی نہیں ملی؟''

''سر! دل ہی تو ہے...... جس پر آجائے...... محبت مذہب دیکھتی ہے نہ سرحد۔''

''ہاہ!'' تھانیدار یکلخت بھبکا اور اپنی چھڑی زور سے اس کی ٹانگ پر مارتے ہوئے بولا۔ ''چھینٹی لگے گی تو تیری محبت پر خود حد لگ جائے گی۔''

''سر! چھینٹی لگانے سے پہلے میری صرف دو باتیں

سن لیں۔'' داؤد نے کہا۔
تھانیدار تن کر کھڑا ہو گیا اور گردن اکڑا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے داؤد کو حقارت اور استہزائیہ سے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سنا!''
''سر! محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔''
''اچھا!'' تھانیدار مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ تو ہو گئی پہلی بات، دوسری کیا ہے؟''
''سر! میرے تایا ابو چیف منسٹر ہاؤس میں افسر ہیں...... مجھ سے انہیں کوئی ہمدردی یا دلچسپی ہو یا نہ ہو...... اپنے چھوٹے بھائی کی بیوہ یعنی میری والدہ کی خاطر وہ خود یہاں آ پہنچیں گے مجھے چھڑوانے کے لیے۔''
''اچھا اچھا!'' تھانیدار کے تنے ہوئے جسم میں لچک اور ہونٹوں پر خفت آمیز مسکراہٹ ایک ساتھ ہویدا ہوئیں اور اس کی چھڑی جو مسلسل داؤد کی ٹھوڑی سے مس ہو رہی تھی یکا یک عمودی پوزیشن اختیار کر گئی۔ ''یہ بات تو تمہیں پہلے بتانی تھی نوجوان۔'' تھانیدار مڑا اپنی کرسی کی طرف بڑھا اور کرسی پر بیٹھنے سے قبل اس نے داؤد کو اپنے روبرو بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ داؤد میز کے دوسری طرف پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر تھانیدار کے روبرو بیٹھ گیا۔
تھانیدار نے بہ آواز بلند ہانک لگائی۔ ''فقیر محمد!''
نچلے درجے کا ایک باوردی اہلکار لپکا ہوا آیا۔ ''جی سر۔''
''دودھ پتی۔''
''اوکے سر۔''
''ہوں۔'' تھانیدار نے ہمہ تن داؤد کی جانب توجہ کی اور دل سوز لہجے میں گویا ہوا۔ ''ان لڑکیوں کے پیچھے خود کو خراب کیوں کرتے ہو نوجوان...... دل لگانے کے لیے اپنی ہم مذہب لڑکیاں ختم تو نہیں ہو گئیں۔''
''سر! وہ اچھی لڑکی ہے۔'' داؤد نے کہا۔
''ہو گی...... لیکن برخوردار ہے تو نان مسلم۔''
''مجھے اس سے محبت ہے سر...... مسلمان کرلوں گا اسے۔''
تھانیدار نے اسے گہری سوچ میں غلطاں آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ ''یار! اپنے تایا ابو جی سے کہہ کر تم نے میرا ایک کام کروانا ہے...... کام تو چھوٹا ہے مگر سفارش بڑی چاہیے۔''
''آپ بتائیے...... میں والدہ سے کہہ دوں گا...... ان کا بڑا احترام کرتے ہیں تایا ابو...... کبھی کوئی بات نہیں ٹالتے ان کی۔''
تھانیدار نے داؤد کو چائے پلائی۔ اپنا کام بتایا۔ اس کا فون نمبر لیا۔ اپنا اسے دیا اور باعزت رخصت کیا۔ داؤد جو بیوہ ماں کے چار بچوں میں سب سے آخری نمبر پر تھا اور تعلیمی میدان میں کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھانے پر تھرڈ ڈویژن میں بی کام کرنے کے بعد تایا کے اثر و رسوخ پر ایک نیم سرکاری ادارے میں ڈھائی تین سال سے اسسٹنٹ لگا ہوا تھا سرخرو پولیس اسٹیشن سے نکلا اور پھر مشن کمپاؤنڈ کے باہر اسی استقلال سے منڈلانے لگا۔
مشن کمپاؤنڈ میں بینا سے ایک مسلمان نوجوان کے چکر کی بات عام ہوئی تو کمپاؤنڈ کے اکثر مکینوں کی رائے یہ ٹھہری کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، بینا بھی ضرور ملوث ہو گی۔ داؤد کی ڈھٹائی اور کمپاؤنڈ میں اپنی رسوائی سے تنگ آکر بینا کے باپ نے گھر بدل لیا اور دوسرے علاقے میں جا بسا۔ داؤد نے وہاں بھی گھات لگا دی۔ بینا کے باہر آنے جانے پر مکمل پابندی لگ گئی۔ داؤد دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر جانے کے بجائے اس عمارت کے احاطے میں آکر کھڑا ہو جاتا جس کی دوسری منزل پر بینا اور اس کے گھر والے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ نیا محلہ تھا۔ بینا کے گھر والے نئے محلے میں کوئی بدمزگی اور بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ پادری تک بات پہنچا کر اور داؤد کو تھانے کی یاترا کروا کے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ تو وہاں سے بھی صاف نکل آیا تھا۔ سو بہت سوچ بچار کے بعد بینا کے باپ نے داؤد سے بھائی بندی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے گھر کے اندر بلایا گیا۔ بینا کے والدین اور بھائی اس کے ساتھ بیٹھے۔
''تمہاری اپنی کوئی بہن ہے؟'' بینا کے باپ نے داؤد سے پوچھا۔
''جی...... دو بہنیں ہیں۔''
''مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمہاری اپنی بہن کے پیچھے اس طرح پڑ جائے تو تم کیا کرو گے؟''
داؤد چپ رہا۔
''بولو!'' بینا کے باپ نے تقاضا کیا۔
داؤد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی بات کہیے۔''
''تم کیا چاہتے ہو؟''
''شادی...... بینا سے۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔
''یہ کیسے ممکن ہے؟'' بینا کا بڑا بھائی غصے سے بولا۔
''ناممکن کیوں ہے؟'' داؤد نے اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔
''تمہارا اور ہمارا مذہب جدا ہے۔''
''کیا فرق پڑتا ہے۔''

''کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔'' بینا کا بڑا بھائی غرایا اور چھوٹا اپنی قمیص کی آستین چڑھانے لگا۔

''تمہیں نہ پڑتا ہو شاید...... مگر ہمیں پڑتا ہے۔'' بینا کے بھائی نے کہا۔

''بیٹا۔'' بینا کی ماں نے مصلحتاً دبی زبان اور نرم لہجے میں مداخلت کی۔ ''ہم بیٹی والے ہیں...... تم اس طرح بینا کے پیچھے لگے رہے تو اس کی شادی میں مشکل ہو جائے گی۔''

''میں اسے پروپوز تو کر رہا ہوں آنٹی۔'' داؤد بولا۔

بینا کے بھائی نے کچھ کہنا چاہا مگر ماں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ دیا اور مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ سمجھ رہا ہوں۔''

''کیا سمجھ رہے ہو؟'' بینا کے باپ نے کہا۔

''یہی کہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے آپ بینا کی شادی مجھ سے نہیں اپنے ہی لوگوں میں کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا ہمارا ایسا سوچنا غلط ہے...... ہونا بھی یہی چاہیے۔'' بینا کے باپ نے کہا۔

''اور ہوگا بھی یہی۔'' بینا کا چھوٹا بھائی جو اپنی دونوں آستینیں چڑھائے بیٹھا تھا' داؤد کو ناگواری سے گھورتے ہوئے بولا۔

''تم چپ رہو...... ہم بڑے بات کر رہے ہیں۔'' بینا کی ماں نے چھوٹے بیٹے کی جنگجو فطرت کے باعث اسے ٹوکا۔

داؤد کی نظریں بینا کے چھوٹے بھائی کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں مگر اس نے اپنے اردگرد بیٹھے چاروں افراد کو للکارا۔ ''آپ لوگ کر کے دیکھ لیں۔ بینا کی آپ ایک نہیں سات مرتبہ بھی اپنے لوگوں میں شادی کر دیں گے تب بھی میں اس کا طلب گار رہوں گا۔ آپ جس گھر میں اس کی شادی کریں گے میں اسے آگ لگا دوں گا...... جس شخص کو بینا کا جیون ساتھی بنائیں گے' اسے برباد کر دوں گا...... قتل کر دوں گا اسے۔''

بینا کی ماں، باپ اور بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یکایک چھوٹا بھائی اٹھا اور زخمی شیر کی طرح داؤد پر جھپٹ پڑا۔ ''یو...... راسکل...... تم نے اگر بینا کی طرف دیکھا بھی تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

داؤد نے جو بینا کے دبلے پتلے اور پستہ قامت بھائی کے مقابلے میں قوی الجثہ تھا ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس سے چھڑایا اور اسے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ چمکارتے ہوئے بولا۔ ''ایزی...... ایزی منا...... میں تم سے لڑنا نہیں رشتے داری بنانا چاہتا ہوں۔''

''مائی فٹ!'' بینا کے بھائی نے اپنا دایاں پاؤں جوتے سمیت اٹھا کر زور سے فرش پر مارا اور داؤد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے غرایا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

بینا کے والدین اور بڑا بھائی جو بیچ بچاؤ کرانے کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے اب سراسیمہ نظر آتے تھے۔

''جا رہا ہوں۔'' داؤد نے بینا کے چھوٹے بھائی کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر پھر آنے کے لیے۔''

''بیٹھو بیٹا بیٹھو...... آرام سے بیٹھ کر بات کرو...... میں پانی لاتی ہوں۔'' بینا کی ماں جو آئندہ کسی طوفان کے احساس سے خوفزدہ دکھائی دیتی تھی داؤد کو ٹھنڈا کرنے کو بولی۔

''نہیں آنٹی...... پانی وانی کچھ نہیں۔'' داؤد نے رکھائی سے کہا۔ پھر روئے سخن بینا کے باپ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ اچھی طرح سوچ لیں انکل۔'' اس نے توقف کیا پھر پوچھا۔ ''آپ کا جواب لینے کے لیے میں کب آؤں؟''

''جواب تو میں دے چکا ہوں۔'' بینا کے باپ کی آواز دھیمی تھی۔

''مجھے ہاں میں جواب چاہیے۔'' داؤد کے تیور کڑی کمان کی طرح تھے۔

''ورنہ؟'' بڑے بھائی نے خشونت سے داؤد کو دیکھا۔

''ورنہ......'' داؤد کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ڈولنے لگی۔ ''وہ ہوگا جو ساری دنیا دیکھے گی۔''

بینا کی ماں سرتاپا لرز کر رہ گئی۔ ''دیکھو بیٹا'' اس نے مردوں کے بپھرے تیوروں کو اپنے تحمل کی لگام دینے کی کوشش کی۔ ''ہم اور تم دو مختلف راستوں کے مسافر ہیں...... ہر انسان ایک مخصوص مذہب کے ساتھ اس دنیا میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ واپس بھی جاتا ہے...... تم مسلم، ہم کرسچن بینا سے تمہارا رشتہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کوئی انہونی بات نہیں ہوگی...... بے شمار ہیں اس دنیا میں ایسے لوگ جنہوں نے مذہب مختلف ہونے کے باوجود آپس میں شادی کر رکھی ہے، آپ کی بیٹی اپنے مذہب پر رہے گی تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

بینا کی ماں نے لاچاری سے شوہر اور بیٹوں کی طرف دیکھا۔ اس کا شوہر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی متغیر رنگت بتا رہی تھی کہ اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔ ہائی بلڈ پریشر کی صورت میں اس کا

چہرہ اور کان اسی طرح سرخ ہوجایا کرتے تھے۔ دونوں بیٹے بھی شدید ہیجان سے دوچار نظر آتے تھے۔
''مائیکل! میرا خیال ہے تمہارا بلڈ پریشر اوپر جارہا ہے۔'' بینا کی ماں نے تشویش ظاہر کی۔
''مرنے دو...... مجھے مرنے دو۔'' بینا کے باپ نے اپنے سر کو پیٹتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہے مرجاؤں...... اس عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔'' اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔
''بیٹا! ابھی تم جاؤ...... ان کی طبیعت خراب ہورہی ہے۔'' بینا کی ماں نے داؤد کو التجائیہ نظروں سے دیکھا۔
''اوکے آنٹی۔'' اس پوری مجلس میں داؤد کو بینا کی ماں ہی واحد سمجھدار فرد محسوس ہوئی تھی۔
داؤد مزید کچھ کہے سنے بنا منظر سے نکل گیا۔ تینوں مردوں نے اسے دشمن کی نظر سے دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد بینا کے باپ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر پہلے دروازے کی چٹخنی چڑھائی پھر دوبارہ اپنی جگہ پر واپس آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''خدا جانے کس بات کی سزا مل رہی ہے ہمیں۔''
''خبیث...... کتا۔'' بینا کے بھائی نے داؤد کو مغلظات بکیں۔
بینا کی بڑی بہن جو بینا کے ساتھ کمرے میں تھی کمرے سے باہر نکل آئی۔ بینا دروازے سے کان لگائے کھڑی رہی۔
''دھمکیاں دے رہا تھا کہ جس گھر میں بینا کی شادی کروگے آپ لوگ، اسے آگ لگادوں گا...... اس شخص کو برباد کردوں گا، قتل کردوں گا۔'' بینا کی بہن ٹینا، داؤد کے الفاظ دہراتی صوفے پر آبیٹھی پھر اس نے باپ کو تسلی دی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں ڈیڈی...... جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں...... خدا کا نام لے کر بینا کی شادی اپنی کمیونٹی کے کسی لڑکے سے کردیں...... ممی! آپ کی دوست مسز جارج اپنے بیٹے کے لیے بینا میں انٹرسٹڈ ہیں نا۔''
''تھیں!'' ماں نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''اب تو سارے کمپاؤنڈ میں چرچا ہوچکا ہے کہ ایک مسلم لڑکا بینا کے پیچھے لگا ہے۔''
''آپ بات تو کر کے دیکھیں...... کیا پتا وہ راضی ہوجائیں۔''
''اب نہیں ہوگی بیٹا...... کوئی دوسرے کے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر اپنی اولاد کو خطرے میں نہیں ڈالتا۔''
''پھر بھی...... آزمالیں۔''
''نہیں...... میں مسز جارج کو اچھی طرح جانتی ہوں۔

وہ بڑی محتاط عورت ہے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی ہے۔''
''اچھا تو پھر کوئی اور دیکھ لیں۔''
''اتنا آسان ہے کیا...... ٹائم لگتا ہے، رشتہ دیکھنے میں...... شادی کی تیاری میں۔''
بینا کے بڑے بھائی نے جھنجلا کر زور سے میز پر مکا مارا۔ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔
''کیا ہوا؟'' ماں نے پوچھا۔
''یہ سب آپ کی بیٹی کا کیا دھرا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' ماں چونکی۔
''جب تک لڑکی کی مرضی نہ ہو کوئی لڑکا اس طرح اس کے پیچھے نہیں لگتا۔'' بینا کے بڑے بھائی کے لہجے میں تلخی تھی۔
''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ماں نے بینا کا دفاع کیا۔
''آپ کو کیا پتا!''
''مجھے معلوم ہے۔ میں اپنی بیٹیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''
''میں اس خبیث کا کام تمام کردوں گا۔'' چھوٹے بھائی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
''نہیں بیٹا نہیں۔'' ماں نے ہول کر کہا۔ ''ایسا سوچنا بھی مت، برے کام کا برا انجام...... اس کا کام تمام کر کے تم امان میں کب رہو گے۔''
''تو پھر اس عذاب سے کیسے جان چھوٹے گی؟''
''مرکے...... مر کر جان چھوٹے گی ہماری۔'' بینا کے باپ نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔
''کیوں اتنے ڈپریسڈ ہوتے ہو...... خداوند ضرور کوئی راستہ نکالیں گے ہمارے لیے اس مصیبت سے چھٹکارے کا۔'' بینا کی ماں نے شوہر کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

☆☆☆

راستہ بینا کے باپ ہی کو سوجھا۔
داؤد کو بلایا گیا۔ بینا کے والدین اور بھائیوں کے روبرو تھا وہ۔ مگر پچھلی مرتبہ کے برعکس بینا کے باپ اور بھائیوں کے تیور جارحانہ نہیں مفاہمانہ تھے۔
''ہماری ایک شرط ہوگی۔'' بینا کے باپ نے کہا۔
''جی بتائیں۔'' داؤد نے یک گونہ بے تابی ظاہر کی۔
بینا کے باپ نے پہلے معنی خیز نظروں سے بیوی اور دونوں بیٹوں کو دیکھا پھر اس کی نظریں داؤد پر جا ٹکیں۔ ''بینا سے شادی کرنے کے لیے تمہیں اپنا مذہب ترک کر کے ہمارے مذہب میں آنا ہوگا۔''
''یہ کیسے ممکن ہے؟'' داؤد نے چونک کر تیوری

چڑ جاتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ ممکن نہیں تو بینا سے تمہاری شادی بھی ممکن نہیں۔''

''بہت کڑی شرط ہے۔''

''سوچ لو۔''

داؤد کشمکش میں پڑ گیا۔ ''مجھے کچھ وقت دیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''کس لیے؟''

''سوچنے کے لیے۔''

بینا کے والدین اور بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں تشویش تھی۔ وہ سوچنے کے لیے وقت کیوں مانگ رہا تھا، انہیں تو اس کے فوری اور دو ٹوک جواب کی توقع تھی...... مسلمانوں کو انہوں نے اپنے مذہب کے معاملے میں نہایت زود حس دیکھا تھا...... اپنے دین کی خاطر تو وہ مارنے مرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ داؤد کو تو فوری انکار کر دینا چاہیے تھا۔

''کتنا وقت؟'' بینا کے باپ نے پوچھا۔

''تھوڑا وقت۔''

''ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔'' بینا کے باپ نے شاطرانہ لہجے میں کہا۔

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ''او کے!'' اس نے بینا کے والدین اور بھائیوں پر ایک نظر ڈالی اور مزید کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔

بینا کا باپ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بیوی اور بیٹوں کو دیکھتے ہوئے انتہائی قطعیت سے بولا۔ ''اب یہ نہیں آئے گا۔''

مگر وہ اگلے ہی دن موجود تھا۔

''مجھے منظور ہے۔'' اس کے جواب نے بینا کے گھر والوں کو دم بخود کر دیا۔ کیسا مسلمان تھا وہ جو ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کی خاطر اپنا دین ترک کر کے لڑکی کے دین میں جانے کو اتنی آسانی سے آمادہ ہو گیا تھا۔

''پھر سوچ لو۔'' بینا کے باپ نے کہا۔

''سوچ لیا ہے۔''

بینا کے گھر والوں کے لیے کوئی راہِ فرار نہ رہی۔

''ٹھیک ہے۔'' بینا کے باپ نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ ''ہم اپنے چرچ کے پادری صاحب سے بات کر کے تمہیں بتا دیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے اور کس طرح۔''

''مگر زیادہ وقت نہ لگایئے گا۔'' داؤد نے کہا۔

پادری سے ملنے سے قبل بینا کی ماں نے بینا سے بات کرنا ضروری سمجھا۔ اب تک جو کچھ ہو چکا تھا بینا اس سے باخبر تھی۔ تازہ ترین صورتِ حال سے اسے آگاہ کر کے ماں نے پوچھا۔ ''تیری کیا مرضی ہے؟''

''میری کوئی مرضی نہیں۔'' بینا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''دونوں بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ میری بھی انوالومنٹ ...... لیکن، آپ جانتی ہوں گی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے بینا۔ مجھے اپنے بچوں پر پورا بھروسا ہے...... میں تمہیں دوش نہیں دے رہی تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتی ہوں...... وہ بدبخت تو اپنا مذہب چھوڑنے کو بھی تیار ہو گیا ہے، مجھے خوف یہ ہے کہ تیرا باپ اور بھائی طیش میں آ کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھیں۔''

''مجھے قربان کر کے اگر تمہارا یہ خوف دور ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔'' بینا کی آواز بھرا گئی اور ماں کا دل بھر آیا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کی بیٹی کس عذاب میں پڑ گئی تھی۔

بینا کا باپ اس کی ماں کے ہمراہ اپنے چرچ کے پادری سے ملا۔

''فادر!'' بینا کی ماں نے اپنی نم ناک آنکھوں کو مٹھی میں دبے ٹشو پیپر سے دھیرے دھیرے تھپتھپاتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''ہماری بیٹی کی کوئی انوالومنٹ نہیں...... وہ بدبخت آپ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے...... ہمارا خیال تھا اپنا مذہب ترک کرنے کی شرط پر وہ بھاگ لے گا لیکن وہ تو......''

بوڑھا پادری تدبر سے مسکرایا اور بینا کی ماں کو تسلی دینے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ناحق پریشان ہو رہی ہو...... یہ تو خوش ہونے کی بات ہے...... سعادت کی بات۔''

بینا کی ماں اور باپ دونوں ہی پادری کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''میرے بچو! مسلمان اپنا مذہب آسانی سے ترک نہیں کرتے...... غیر مذہب عورت سے رشتۂ ازدواج قائم بھی کریں تو ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ رشتۂ زوجیت میں آنے والی عورت ان کا مذہب اختیار کرے...... اور اگر عورت اس پر آمادہ نہ ہو تو وہ کم از کم اپنی اولاد کو تو اپنے ہی دین کا پیروکار دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہاری بیٹی سے شادی کا خواہش مند وہ شخص اگر یہ سب کرنے کے لیے تیار ہے... تو ہم سب کو اس پر خوش ہونا چاہیے...... نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا ارادہ بدل لے اسے چرچ لے کر آؤ تاکہ اس کے بپتسمہ کی رسم کی تیاری کی

جائے...... میں اس کے لیے دعا کروں گا۔‘‘

پادری کی رضامندی نے بینا کے والدین کا حوصلہ بڑھایا۔

☆☆☆

داؤد ایک متوسط گھرانے کا نوجوان تھا۔ اس کا باپ عالم جوانی میں فوت ہوگیا تھا۔ ماں سادہ سی گھریلو عورت تھی۔ داؤد سمیت چار بہن بھائی تھے۔ دو بہنیں دو بھائی۔ داؤد تیسرے نمبر پر تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد داؤد کی ماں نے اپنے چاروں بچوں کی پرورش کا بیڑا اٹھایا۔ وہ معمولی پڑھی لکھی عورت تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس نے دوسروں کا دستِ نگر بننے کے بجائے اپنے بچوں کو خودداری سے پالنے کے لیے مشقت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ وہ اجرت پر سلائی کرتی، کاغذی اور مخملیں پھولوں کے گلدستے بنا کر دکانداروں کو فروخت کرتی۔ اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس نے دن رات محنت کی تھی اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے گریز کیا تھا۔ اس کی اسی خودداری کی وجہ سے داؤد کے ددھیال والے اسے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ داؤد کا تایا جو سرکاری افسر تھا اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کی خودداری کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی نہ کسی بہانے حسبِ توفیق اس کے دامے، درمے، سخنے اعانت کرتا رہتا تھا۔

داؤد کی ماں میں بے شمار خوبیاں تھیں لیکن اکثر ماؤں کی طرح ایک کمزوری بھی تھی اس میں۔ چاروں بچوں میں اسے اپنے بڑے بیٹے سعود سے جو اس کی پہلی اولاد تھا اتنی محبت تھی کہ اس محبت میں وہ اکثر اپنے باقی تین بچوں کے حق میں ڈنڈی مار جاتی تھی۔ کھانے پینے کی ہر اچھی چیز وہ باقی تینوں بچوں سے چھپا کر اکثر سعود ہی کو دے دیتی۔ نئے کپڑے، نیا جوتا، نئی کتابیں، نیا بستہ ہمیشہ سعود کو ملتا۔ اس کے چھوٹے ہو جانے والے کپڑے داؤد کو پہننے کو ملتے‘ اس کے جوتے تنگ ہو جاتے تو ماں داؤد کو دے دیتی۔ سعود کو نئے جوتے مل جاتے۔ سعود کی پرانی کتابیں اور پرانا بستہ داؤد یا کسی بہن کے حصے میں آتا اور سعود کو نئی کتابیں نیا بستہ خرید کر دیا جاتا۔ دونوں بہنوں نے ماں کے اس جانبدارانہ رویے سے خاموش مفاہمت کرلی تھی مگر داؤد کو ہمیشہ ماں کے اس رویے کے خلاف گلہ اور سعود کے مقابلے میں کمتری کا احساس رہا جس کا وہ اکثر و بیشتر برملا اظہار بھی کر دیا کرتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ماں کی زبان سے بڑے بھائی کی جا، بے جا تعریف سن سن کر وہ اتنا بیزار ہوگیا تھا کہ اس نے اسکول، کالج میں بھی بڑے بھائی کی طرح اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمیشہ ایک معمولی درجے کا طالبِ علم رہا۔ ماں تعلیم کے معاملے میں ہمیشہ اس کا تقابل سعود سے کرنے کی کوشش میں رہا کرتی تھی۔ اس نے داؤد کو سمجھانا بجھانا ہوتا تو وہ اپنی بات عموماً اس طرح شروع کرتی ’’داؤد! بڑے بھائی کو دیکھو......‘‘ بڑے بھائی کی مثال داؤد کو ماچس کی تیلی کی طرح لگتی۔ وہ اکثر چڑ کر گھر سے باہر نکل جاتا اور تادیر بلا مقصد اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا۔

سعود نے انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی۔ داؤد بہ مشکل بی اے پاس کرسکا تھا۔ تایا نے مرحوم بھائی کی محبت اور بیوہ بھاوج کے احترام میں داؤد کو ملازمت دلوادی تھی۔ دفتری اوقات کے بعد داؤد اکثر گھر سے باہر اِدھر اُدھر ہی وقت گزار دیتا۔ آوارگی اس کی سرشت میں شامل ہوگئی تھی، اسی آوارہ گردی میں اسے بینا نظر آگئی تھی اور بینا میں خدا جانے اس نے ایسا کیا وصف دیکھا تھا کہ بوٹے سے قد، معمولی نک سک اور گہری سانولی رنگت کی اس لڑکی کی محبت کا وہ دن بہ دن اسیر ہوتا چلا گیا تھا۔ سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، گھر میں، گھر سے باہر، دفتر میں کام کے دوران اور دفتر سے چھٹی کے بعد اسے بس اسی کا خیال رہتا تھا۔ اسے اس بات کی چنداں پروا نہیں تھی کہ جس لڑکی کی محبت میں وہ پاگل ہوئے جارہا ہے وہ اس کے بارے میں کیا جذبات رکھتی ہے۔ اس کی محبت میں وہ اس حد تک پاگل اور عاقبت نااندیش ہوگیا تھا کہ اسے اپنانے کی خاطر وہ اپنی عاقبت سے بے نیاز اپنا دین ترک کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔

چرچ میں اس کا بپتسمہ ہوا اور بوڑھے پادری نے ضروری رسمی کارروائی کے بعد چرچ کے رجسٹر میں اس کے کوائف کا اندراج کرلیا، اب وہ داؤد نہیں ڈیوڈ تھا، کیتھولک عیسائی فرقے کا پیروکار۔

بینا سے اس کی شادی ہوگئی۔

☆☆☆

ماں کو پتا چلا تو وہ دل تھام کر رہ گئی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ کس گناہ کی سزا ملی تھی اسے۔ اپنے پرائے سب تھوتھو کر رہے تھے کہ داؤد عیسائی بن گیا تھا۔ بیوہ ماں اور بھائی بہنوں کے لیے یہ سانحہ اس کے باپ کی موت سے بھی بڑا سانحہ تھا۔ ماں نے صاف کہہ دیا۔ ’’تو میرے لیے مرگیا ہے داؤد۔‘‘

’’میں تو پہلے بھی تمہارے لیے مرا ہوا ہی تھا...... تمہیں اپنے بڑے بیٹے کے سامنے کبھی میں بھی دکھائی دیا؟‘‘ داؤد نے دو جملوں میں اپنی گزشتہ زندگی کی تلخی ماں

کے سامنے بیان کردی۔ اس نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا مگر جو کیا وہ نہایت غلط تھا۔ خدا نے اسے بہترین دین میں پیدا کیا تھا اور وہ اس دین سے پھر گیا تھا۔

ماں، بھائی، بہنوں اور دیگر رشتے داروں نے داؤد سے مکمل قطع تعلق کرلی۔ اب اس کا سارا تعلق بینا، اس کے گھر والوں اور دوسرے ر   داروں سے تھا۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے وہ ان کے طور طریقے اپنا رہا تھا۔ بینا اور اس کے گھر والوں کے ساتھ وہ باقاعدگی سے چرچ جاتا۔ عبادت کا طریقہ سیکھتا۔ ان کے عقائد کی پیروی کرتا۔ ان کی رسوم میں شریک ہوتا۔ ان کی غمی، خوشی منانے کے ڈھنگ سے آشنا ہونے کی کوشش کرتا۔ دن بہ دن وہ ان کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی ماں اور بہن بھائی یاد آتے تو وہ انہیں بھلانے کی کوشش کرتا۔ انہوں نے بھی تو اسے دھتکار دیا تھا۔ کیا عجب کہ بُھلا بھی دیا ہو ورنہ کبھی تو ان کی پکار سنائی دیتی۔ اسے کون بتاتا کہ اپنے دین سے روگردانی کے بعد اس کا نام ماں اور بھائی بہنوں کے لیے داغ بن گیا تھا اور اس کی بازگشت سنتا کون پسند کرتا ہے بھلا۔

☆☆☆

بینا اور ڈیوڈ کی شادی کے دوسرے برس ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی جس کا نام ماریہ رکھا گیا۔ ماریہ کی پیدائش کے ایک برس بعد فلپ دنیا میں آیا۔ پھر کئی سال کے وقفے سے لوئیس پیدا ہوا۔

اپنے والدین بالخصوص ماں کے اثر سے بینا ایک مذہبی عورت رہی۔ وہ نہایت باقاعدگی سے چرچ جاتی۔ انتہائی خشیت اور انہماک سے عبادت کرتی۔ اپنے گھر کے ایک کمرے میں اس نے ایک طاق میں اپنا معبد بنا رکھا تھا۔ اب اسے ڈیوڈ سے پیار ہوگیا تھا۔ ڈیوڈ نے اس کی خاطر اپنا گھر، ماں، بہن بھائی، رشتے دار اور سب سے بڑھ کر اپنا دین چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اس کے خاندان کا حصہ تھا۔ اسی چرچ سے وابستہ تھا جس کی وہ خود اور اس کے گھر والے اور دوسرے رشتے دار پیروکار تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کر ان کی مذہبی رسومات میں شریک ہوتا۔ ان کی غمی خوشی میں پیش پیش رہتا۔ تہواروں پر اس کا جوش وخروش دیدنی ہوتا۔ کرسمس کی تیاری وہ نومبر ہی میں شروع کردیتا۔ اپنے فلیٹ میں نیا رنگ وروغن کراتا۔ گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں کے لیے نئے نہ سہی لنڈا بازار سے ہی خوشنما پردے، فرش پر بچھانے کے لیے غالیچے، گھر سجانے کے لیے آرائشی سامان، بینا اور بچوں کے لیے نئے کپڑے، کرسمس ٹری، اپنے مخصوص لباس میں ملبوس فادر کرسمس اور کرسمس پر گھر آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے وہ اپنی جیب خالی کر دیتا۔ پچیس دسمبر کی شب کرسمس کیرول کے لیے وہ گھر گھر جھانکتا پھرتا۔ بینا اور اس کے گھر والے خوش ہوتے کہ اس کے بارے میں ان کے تمام خدشات جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔

ڈیوڈ کے داؤد سے ڈیوڈ بن جانے کا قصہ اس کے دفتر میں بھی زبان زد عام تھا۔ اپنے دین کے سلسلے میں زیادہ کٹر قسم کے مسلمان ساتھی اسے قابلِ نفرین وملامت سمجھتے تھے۔ جو بے تکلف تھے وہ اکثر اس پر کڑی تنقید کرتے۔ اسے آخرت کے انجام سے ڈرانے کی کوشش کرتے۔ داؤد کبھی ان سنی کردیتا۔ کبھی جواب بھی دے دیتا۔ اس کا خجالت آمیز جواب اکثر یہی ہوتا کہ مذہب خدا اور بندے کا براہ راست معاملہ ہے لہٰذا کسی کو اس میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ بینا سے شادی کے برسوں بعد ایک دن اس کے ایسے ہی جواب پر دوسرے شہر سے ٹرانسفر ہوکر آئے ایک ساتھی نے اس کی بات پر ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''داؤد صاحب......''

''ایکسکیوزمی افتخار صاحب۔'' دوسرے ساتھی نے مداخلت کی۔ ''آپ ان کا نام ہمیشہ ہی غلط کیوں لیتے ہیں...... یہ داؤد نہیں ڈیوڈ ہیں۔''

''میں اپنی زبان گناہ گار نہیں کرنا چاہتا، انہیں اللہ پاک نے داؤد پیدا کیا تھا میں ڈیوڈ کیوں کہوں۔'' پہلے نے کہا۔

''صاحب اب تو برسوں ہوگئے انہیں داؤد سے ڈیوڈ ہوئے۔'' دوسرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''قرن بھی گزر جائیں تو یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے بہترین دین، بہترین امت میں پیدا کیا تھا۔ اس کرم پر اگرچہ ساری زندگی بھی پیشانی کے بجائے اپنی آنکھوں کے ڈھیلوں سے زمین پر شکر کے سجدے کرتے رہتے تو بھی کم تھا۔''

''بے شک!'' منظر میں موجود تمام ساتھیوں نے تائید کی۔

''ایسی باتیں نہ کریں۔'' داؤد نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے اور ساتھیوں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''کام کریں کام۔'' اس نے سر کو جھٹکا اور بڑبڑایا۔ ''دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں آتا لوگوں کو۔''

افتخار صاحب بھی پسپا ہونے کے موڈ میں نہ تھے۔ داؤد کو آئینہ دکھاتے ہوئے انہوں نے بے جھجک کہا۔ ''آپ

کی اگلی نسلوں کا وبال بھی آپ کے سر رہے گا داؤد صاحب۔"
داؤد نے بے ساختہ چونک کر افتخار صاحب کی طرف دیکھا اور تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔"مائنڈ یور اون بزنس مسٹر افتخار۔"
"بائی دی وے کس وبال کی بات کر رہے ہیں افتخار صاحب؟" ایک دوسرے ساتھی نے باقیوں کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لے کر موضوع گفتگو کو ہوا دینے کی کوشش کی۔
"ان کے مسلمان نہ ہونے کا وبال۔" افتخار صاحب نے کہا پھر اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔"داؤد صاحب کی ذرا سی بھول سے ان کی اگلی نسلوں میں نہ جانے کتنے بہت سے افراد دائرۂ اسلام سے باہر رہیں گے...... حالانکہ وہ مسلمان بھی ہو سکتے تھے بلکہ انہیں مسلمان ہی ہونا چاہیے تھا۔"
"داؤد صاحب کے بچے تو چرچ جاتے ہوں گے۔" ایک ساتھی نے پھبتی کسی اور داؤد کو چھیڑنے کو اس سے اتنی بات کی تائید چاہی۔"کیوں داؤد صاحب؟"
داؤد نے بلبلا کر پہلو بدلا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔"آپ کو کوئی تکلیف ہے؟"
"ان بے چارے کو کیا تکلیف ہونی ہے داؤد صاحب...... تکلیف تو آپ کو ہوگی۔" افتخار صاحب نے نہایت بے باکی سے کلمۂ حق جاری رکھا اور اپنی نگاہیں داؤد پر مرکوز رکھتے ہوئے بولے۔"آپ نے اچھا نہیں کیا...... نہ اپنے ساتھ...... نہ اپنی اولاد کے ساتھ۔ نہ آئندہ نسلوں کے ساتھ...... ذرا سوچیے تو کتنا بڑا احسان کیا تھا رب کریم نے آپ کو اپنے آخری، مکمل اور بہترین دین میں پیدا کر کے اور آپ نے اس احسان کے جواب میں شکر گزاری کے بجائے کیا ظلم کیا اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے ساتھ! بیٹی کو کسی عیسائی سے بیاہیں گے۔ بہوئیں چرچ سے رخصت کر کے لائیں گے۔" افتخار صاحب کے لہجے میں دل سوزی تھی۔
بات بہ ظاہر آئی گئی ہو گئی...... مگر داؤد کے دل میں پھانس بن کر چبھ گئی۔ پھانس کتنی ہی چھوٹی ہو جب تک نکل نہ جائے چبھتی رہتی ہے۔ داؤد کو اپنی جوانی کی دیوانگی کا پچھتاوا دن بہ دن بڑھنے لگا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ اسے بینا سے دل نہیں لگانا چاہیے تھا اور اگر لگ ہی گیا تھا تو اپنا دین ترک کر کے اس کا مذہب اختیار کرنے کے بجائے اسے اپنا دین اختیار کرنے کی ترغیب دینی چاہیے تھی۔ کتنا بڑا احمق اور عاقبت نااندیش تھا وہ۔ مکمل اور بہترین کو کون ترک کرتا ہے۔ اسلام مکمل دین ہے۔ اللہ نے اسے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا کر کے اس پر اپنی انتہائی رحمت کی تھی اور وہ اپنی عاقبت نااندیشی سے گمراہ ہو گیا تھا۔ ماں، بہن، بھائی، رشتے دار سب اس کا معاشرتی بائیکاٹ کر کے اس سے دور ہو گئے تھے۔ ماں سے اسے بڑے بھائی کے حق میں جانبداری کا کتنا ہی گلہ سہی، تھی تو اس کی ماں۔ وہ بیمار ہوتا تو ماں کی انگلیوں کا لمس اس کی تکلیف میں تریاق کا کام کرتا۔ بڑے بھائی سے اسے کیسی ہی رقابت کیوں نہ سہی بہن بھائیوں سے وہ بہت سی ایسی باتیں بھی تو شیئر کر لیا کرتا جو کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔ رشتے داروں میں ہر رشتے کی ایک خوب صورتی، نزاکت اور اہمیت تھی۔ بینا سے شادی کے بعد وہ اپنے سارے پرانے رشتے کھو بیٹھا تھا۔ بینا سے شادی کے بعد نئے سسرالی رشتے بن گئے تھے مگر بہت سے موقعوں پر اس نے ان نئے رشتوں کی بھیڑ میں خود کو اکیلا سمجھا تھا۔ بینا اس کے لیے اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی مگر بینا کی جگہ کوئی مسلمان عورت ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھانس رہ رہ کر رڑکتی اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتی۔ واقعی اسے تو خدا نے بہترین دین پر پیدا کیا تھا، اس نے اپنی عاقبت خود خراب کر لی تھی۔
داؤد نے سسرالی رشتہ داروں سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ ان کے ساتھ اس کے رویے میں سرد مہری در آئی۔ کسی مسجد کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں چبھن سی ہوتی۔ خدا کے گھر سے تعلق توڑ لیا تھا اس نے اپنا۔ وہ بینا اور بچوں کے اپنے رشتے داروں سے ملنے جلنے پر معترض رہنے لگا۔ پھر رشتے داروں سے تعلقات پر بہانے بہانے سے پابندیاں عائد کرنے لگا۔ چوروں کی طرح ایک روز ایک مسجد میں بھی داخل ہو گیا۔ ہیبت محسوس ہوئی لیکن جی کڑا کر کے نماز کے لیے بھی کھڑا ہو گیا۔ جھجک ٹوٹی تو چوری چھپے بار بار مسجد جانے لگا۔ ایک روز ہمت کر کے نورانی صورت والے ایک باریش امام مسجد کے سامنے اعتراف خطا بھی کر لیا۔ انہوں نے سنا پھر تدبر سے بولے۔
"اللہ اپنے بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے۔ اس کے حضور گڑگڑا کر، رو کر، ندامت کے آنسو بہا کر اپنی خطا کی معافی طلب کرو۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔ تمہاری غلطی بہت بڑی ہے مگر اللہ رب العزت کی رحمت انتہائی وسیع ہے، وہ رحمٰن ہے رحیم ہے۔ تواب اور غفور ہے۔ اسی سے معافی مانگو اسی سے پناہ چاہو۔"
داؤد نے اللہ کے گھر سے اپنا رشتہ دوبارہ استوار

کرلیا۔ پہلے چوری چھپے مسجد جانا شروع کیا پھر علی الاعلان جانے لگا۔ جمعے کی نماز میں وہ بڑے بیٹے قلب کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا۔ قلب کو اس نے نماز کے لیے ایک خوب صورت ٹوپی بھی لاکر دی تھی۔ بینا نے اعتراض کیا تو وہ پہلے تو جھینپا لیکن پھر اس نے اقرار کرلیا کہ وہ دوبارہ اپنے اصل دین کی طرف راغب ہوگیا ہے اور بچوں کو بھی اپنے ہی مذہب کا پیروکار بنانا چاہتا تھا۔

بینا نے کہرام مچا دیا۔ اپنے گھر والوں کو بتایا۔ وہ معترض ہوئے تو اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ اس کے اور اس کے بچوں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کریں۔

''بچے صرف تمہارے نہیں ڈیوڈ میرے بھی ہیں...... اور ہم دونوں خداوند یسوع مسیح کے نام لیوا ہیں...... میرے گھر والے ٹھیک تو اعتراض کرتے ہیں...... تم قلب کو مسجد کیوں لے جاتے ہو...... اصولاً تو تمہیں بھی نہیں جانا چاہیے۔'' بینا نے کہا۔

''بکواس مت کرو...... میری مرضی...... جہاں چاہے جاؤں...... تم کون ہوتی ہو مجھے اصول سکھانے والی...... یا مجھے قلب کو مسجد لے جانے سے روکنے والی۔'' داؤد غرایا۔

''قلب کرسچن ہے اس کا مسجد جانے سے کیا کام۔'' بینا نے جرح کی۔

''زیادہ بحث نہیں۔''

''بحث تو میرے گھر والے کریں گے اچھی طرح تم سے۔'' بینا نے اسے اپنے میکے والوں کا ڈراوا دینے کی کوشش کی۔

''میں انہیں اپنے گھر میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔''

داؤد نے بینا کے میکے والوں کے اپنے گھر آنے پر پابندی لگا دی۔ بینا اور بچوں کو بھی ان کے ہاں جانے سے روکتا۔ آئے دن داؤد اور بینا میں لڑائی جھگڑا رہنے لگا۔ بینا دن رات کڑھے جاتی۔ اس کی صحت متاثر ہونے لگی بچے تینوں ہی داؤد سے پیار کرتے تھے مگر قلب کچھ زیادہ ہی قریب تھا۔ وہ بینا سے کہتا۔ ''ڈاڈا اگر موسک جاتا ہے تو تم اتنا شور کیوں مچاتی ہو ممی...... موسک بھی تو ورشپ کی جگہ ہے۔''

''وہ مسلمانوں کی عبادت کی جگہ ہے ہماری نہیں۔'' بینا اسے سمجھاتی۔

''مجھے معلوم نہیں ہے کیا...... بچہ تھوڑی ہوں میں...... مجھے ایک بات بتاؤ۔ آپ چرچ کیوں جاتی ہو؟'' ایک روز قلب نے کہا۔

درست جواب

ایک مرتبہ فٹ بال اور ہاکی کی ٹیمیں ایک صاحب کی نگرانی میں غیر ملکی دورے پر روانہ ہوئیں۔ بدقسمتی سے دونوں ٹیمیں یکے بعد دیگرے میچ ہار گئیں۔

وہ صاحب جب وطن واپس تشریف لائے تو ایک دوست نے پوچھا۔ ''کیسے کیا پوزیشن رہی؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''بہت اچھی! ہاکی وہ جیت گئے، فٹ بال ہم ہار گئے۔''

مجبوری

پولیس افسر۔ ''تم نے اتنی چوریاں کیں مگر کسی کو اپنا ساتھی نہیں بنایا؟''

ملزم۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں انسپکٹر صاحب...... آج کل ایماندار آدمی ملتے ہی کہاں ہیں؟''

محبوبہ

نئے نئے پائلٹ نے دیکھا کہ ہوائی اڈے پر اس کی محبوبہ موجود ہے تو اس نے اس کو متاثر کرنے کے لیے اترنے سے پہلے جہاز کو دو چار عمدہ قلابازیاں کھلائیں اور پھر جب جہاز سے اتر کر فخر سے سینہ تانے وہ محبوبہ کے پاس آیا تو محبوبہ نے اس کے کمال کو نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، جلد ہی جہاز کو سیدھا اڑانا بھی سیکھ جاؤ گے۔''

مرسلہ۔ محمد ریاض عطار، لاہور

''عبادت کے لیے اور کیوں۔''

''آپ کو چرچ میں کبھی گاڈ دیکھنے کو ملا؟''

''تیرا دماغ خراب ہوا ہے...... گاڈ آج تک کس کو دیکھنے کو ملا ہے...... جو مجھے دیکھنے کو ملے گا۔'' بینا بولی۔

قلب مسکرایا۔ ''پھر آپ ڈاڈا سے کاہے کو لڑتی ہو...... گاڈ موسک میں بھی نہیں دکھائی دیتا...... جب خدا کو دیکھے بغیر ہی عبادت کرنی ہے تو موسک ہو یا چرچ کیا فرق پڑتا ہے...... گاڈ تو ادھر ملتا ہے ادھر۔'' قلب نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

''پاگل ہوگیا ہے تو بھی...... اپنے باپ کی طرح۔'' بینا نے اسے گھورا۔

فلپ مسکرا دیا۔ ''تم خود ہی تو بولتی ہو...... بیٹا باپ پر ہی جاتا ہے۔''

داؤد سے چوری چھپے بینا اپنے میکے والوں سے فون پر رابطہ رکھتی۔ ''وہ گمراہ ہو گیا ہے...... اپنے ساتھ فلپ کو بھی اپنے ہی راستے پر لگا رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو کر انہیں بتاتی۔

''دعا کرو بینا...... ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ خداوندا سے گمراہی سے بچائیں۔'' بینا کے گھر والے اسے دلاسا دیتے۔

بینا جو بھی لاابالی سی لڑکی ہوا کرتی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ایک سنجیدہ اور حساس طبع عورت کا روپ دھار چکی تھی۔ اپنے والدین بالخصوص ماں کے اثر سے مذہب سے قربت نے اسے ایک پکی کیتھولک پیروکار بنا دیا تھا۔ نیکی، بدی، گناہ اور ثواب کا تصور اس کے ذہن میں نہایت راسخ تھا۔ وہ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھنے والی عورت تھی۔ داؤد کا دوبارہ اپنے مذہب کی طرف راغب ہو جانا اسے مسلسل اذیت سے دوچار رکھنے لگا تھا۔ گھرداری کے کاموں میں بھی اس کا ذہن تمام وقت داؤد کی کایا پلٹ پر منتشر اور متفکر رہتا۔ مسلسل ذہنی دباؤ سے اس کی جسمانی صحت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اداس اور مضطرب رہنے لگی تھی۔ دل ہی دل میں داؤد کی راہ یابی کے لیے دعائیں مانگنے جاتی۔ داؤد کی ناپسندیدگی کے باوجود اس نے چرچ جانا ترک نہیں کیا تھا۔ وہ ماریہ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا طوفان اتوار کی عبادت میں شرکت کے لیے اس کا چرچ جانا لازم تھا۔ داؤد کے اثر سے فلپ ہتھے سے اکھڑ چکا تھا۔ بینا اسے چرچ جانے کو کہتی تو وہ ٹال جاتا۔ ماریہ البتہ باقاعدگی سے ماں کے ساتھ چرچ جاتی۔ داؤد روک ٹوک تو اس پر بھی کرنے لگا تھا مگر اس روز تو گویا وہ راستے کی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سختی سے کہہ دیا کہ ماریہ چرچ نہیں جائے گی۔

ماریہ کو گھر پر چھوڑ کر بینا کو اکیلے ہی چرچ جانا پڑا تھا۔

☆☆☆

چرچ میں بینا کی ملاقات اپنے میکے والوں سے ہوئی تو اس نے انہیں نئی افتاد سے آگاہ کیا۔ ''ابھی تک وہ فلپ اور لوئیس کو چرچ سے روکتا تھا۔ آج اس نے ماریہ کو بھی میرے ساتھ آنے سے روک دیا ہے۔ کہتا ہے ماریہ میری بیٹی ہے چرچ نہیں جائے گی...... وہ پاگل ہو گیا ہے۔ خود کو مسلمان کہتا ہے۔''

''ارے! یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' ماں کے لہجے میں تحقیر تھی۔

''آج تو وہ ماریہ سے کہہ رہا تھا...... تیرا تو میں بندوبست کرتا ہوں...... پتا نہیں کیا ہے اس کے من میں...... کیا بندوبست کرے گا وہ میری بچی کا۔'' بینا رونے لگی۔

''فکر مت کرو...... دعا کرو۔'' ماں نے بینا کو گلے سے لگا کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

بینا کو ماں کے گلے سے لگے اور روتے دیکھ کر پہلے اس کی بڑی بہن ٹینا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی ایک کزن ٹریزا بھی ان کی طرف آ گئیں۔

''کیا ہوا؟'' ٹینا نے تشویش ظاہر کی۔

''ارے وہی منحوس...... ڈیوڈ...... اس نے تنگ کر رکھا ہے اسے۔'' ماں نے کہا۔

''ڈیوڈ تو فیملی کے لیے روگ بن گیا ہے۔'' ٹینا کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''مجھے اپنی بچی کی فکر ہے۔'' بینا نے روتے ہوئے کہا۔

''بے ضمیر آدمی!'' ٹینا بڑبڑائی۔

''مجھے اذیت دے دے کر مار دے گا وہ۔'' بینا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

''ماریہ کو تم میرے پاس چھوڑ دو۔'' ماں نے بینا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''وہ اسے تمہارے پاس چھوڑنے دے گا بھلا...... تم لوگوں سے ملنے تک پر تو پابندی لگا رکھی ہے اس نے...... چرچ نہ آنا ہو تو میں تم لوگوں کو دیکھنے سے بھی ترس جاؤں۔''

''مر جائے وہ تو اچھا ہے۔'' ماں نے کوسا۔

''معاف کرنا آنٹی...... برا مت ماننا۔'' بینا کی خالہ زاد ٹریزا نے اس کی ماں سے کہا۔ ''آپ لوگوں نے اس آدمی سے بینا کی شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اپنا مذہب کون چھوڑتا ہے آنٹی...... مجھے تو اگر کوئی ساری دنیا کی دولت بھی دے تو میں ایسا نہ کروں...... بینا سے شادی کے لیے اس نے اپنا مذہب بدل لیا...... وہ مکار آدمی ہے...... اپنی غرض کا غلام بس...... جو شخص اپنے دین کے ساتھ مخلص نہیں، وہ بیوی بچوں سے کب وفا کرے گا۔''

''کیا کرتے بیٹا...... وہ بینا کا پیچھا جو نہیں چھوڑتا تھا۔''

''معاف کیجیے گا آنٹی۔'' ٹریزا نے دبی زبان سے کہا۔ ''خاندان والے تو ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ بینا کی شادی لو میرج تھی۔''

''نہیں ٹریزا...... ایسی کوئی بات نہیں...... اس کمبخت کی وجہ سے تو میری بچی اپنی تعلیم تک مکمل نہیں کر سکی...... کمپیوٹر کورس ادھورا چھوڑ کر گھر بیٹھنا پڑا اسے......

اس منحوس نے تو اس کا گھر سے نکلنا بھی مشکل کر دیا تھا...... خداوند جانتے ہیں کہ ایسا ہی تھا۔'' ماں نے ٹریزا کو صفائی پیش کی۔

ٹریزا جو بینا کی سب سے بڑی خالہ کی پہلی اولاد اور بینا کی بڑی بہن سے تقریباً آٹھ سال بڑی تھی، قدرے شرمندہ دکھائی دینے لگی۔ '' مجھے آپ کی بات کا پورا اعتبار ہے آنٹی...... میں تو خاندان والوں کی بات کر رہی تھی۔''

'' خاندان والوں کا کام تو بس باتیں بنانا ہے۔'' ٹینا ناگواری سے بولی۔

ٹینا کی ناگواری بھانپ کر ٹریزا نے بینا کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔ '' حوصلہ رکھو بینا...... مرد تو جیسا بھی پلے پڑ جائے ہم عورتوں کو گزارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

ٹریزا طبعاً امن پسند عورت تھی۔ اس کا شوہر الیکٹریشن تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے ایک بیٹی۔ ٹریزا نے شادی کے بعد بہت سخت زندگی گزاری تھی۔ شوہر کو کبھی کام مل جاتا کبھی نہ ملتا۔ لیکن جب سے دو بڑے بیٹے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوئے تھے ٹریزا کے حالات بدل گئے تھے۔ دونوں بیٹے فرانسس اور لارنس دبئی چلے گئے تھے۔ فرانسس ایک بینک میں کیشیر تھا، لارنس ایک کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ دونوں اچھا کماتے تھے۔ سب سے چھوٹا ڈیوس کھلنڈری طبیعت کا نوجوان تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد اس نے مزید تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ کہیں ٹک کر کام بھی نہ کرتا، کبھی کسی دکان پر سیلزمین لگ جاتا۔ کبھی گھروں میں اخبار رسالے ڈالنے کا کام شروع کر دیتا۔ کبھی اپنی انگریزی بول چال میں مہارت کے باعث کسی دفتر میں استقبالیہ کلرک بن جاتا، کبھی اس کے سر میں فوٹوگرافر بننے کا سودا سما جاتا۔ کچھ عرصہ ٹیکسی بھی چلاتا رہا تھا اور اس دوران ایک مسلمان ٹیکسی ڈرائیور سے اس کا ایسا گہرا یارانہ ہوا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوری چھوڑنے کے بعد بھی دونوں کا روزانہ ملنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے روزانہ سورج کا مشرق سے نکلنا۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا تھا۔ مسلمان بی اے پاس نوجوان تھا۔ ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت بھی کر رہا تھا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد آمدنی میں اضافے کی خاطر ٹیکسی بھی چلاتا۔ ٹریزا اور اس کا شوہر جو ڈیوس کے ایک جگہ ٹک کر کام نہ کرنے سے نالاں رہتے اسے اکثر اس مسلمان دوست کی مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کرتے۔

'' بیٹا کوئی تو کام دل لگا کر کرو...... آئے دن نیا کام۔'' ٹریزا دل سوزی سے ڈیوس سے کہتی۔

'' یہ کچھ نہیں کرے گا ٹریزا۔'' ٹریزا کا شوہر جوزف ہاتھ نچا کر نہایت وثوق سے کہتا۔

'' ایسا تو مت کہو جوزف...... کرے گا...... میرا بیٹا ضرور کوئی کام دل لگا کر کرے گا۔'' ٹریزا بیٹے کی حمایت میں بولتی۔

'' ارے ممی نوکری سے کیا دل لگانا...... دل لڑکی سے لگایا جاتا ہے۔'' ڈیوس ماں کی بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتا۔

'' تیرے کو لڑکی بھی نہیں ملے گی دل لگانے کو۔'' جوزف بیٹے کو گھورتا۔

'' کیوں؟ کیوں نہیں ملے گی لڑکی؟ کیا کمی ہے مجھ میں...... ہینڈسم ہوں، اسمارٹ ہوں۔''

'' لڑکی پیسا دیکھتی ہے پیسا...... خالی جیب والے کو کون لڑکی گھاس ڈالتی ہے۔''

'' ارے! تم دیکھنا ڈیڈی...... تمہارا یہ بیٹا کیسا نام کرے گا۔'' ڈیوس اترا کر کہتا۔

'' نام بھی کام سے ملتا ہے۔''

'' ہاں بیٹا کوئی اچھی نوکری پکڑو۔'' ٹریزا شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

'' نوکری انسان کو کیا دیتی ہے...... غلام بنا دیتی ہے دوسروں کا۔''

'' نوکری پیٹ بھرتی ہے انسان کا...... اسے گھر میں اور سوسائٹی میں عزت دلواتی ہے۔'' جوزف بیٹے کو گھورتا۔

'' ہاں!'' ڈیوس منہ لال کر کے ہنستا پھر باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ '' پیسا ڈیڈی پیسا!...... پیسا انسان کو عزت دلواتا ہے۔''

'' اور پیسا کہاں سے آتا ہے۔'' جوزف بیٹے کو گھورتا۔

'' پیسا!'' ڈیوس معنی خیزی سے مسکراتا پھر آنکھیں نچاتے ہوئے چٹکی بجا کر کہتا۔ '' پیسا دونمبری سے آتا ہے۔''

'' تو دونمبری بھی نہیں کر سکتا...... فرانسس اور لارنس کو دیکھتا ہے...... جب سے گئے ہیں گھر کے حالات ہی بدل دیے دونوں نے۔''

'' مجھے ان کی مثال نہ دیا کریں۔'' ڈیوس بھنا جاتا۔

'' کیوں! ان کی مثال تجھے بہت بری لگتی ہے۔'' ڈیوس کو تپانے میں جوزف کو جیسے تسکین ملتی۔

ڈیوس بکتا جھکتا، پاؤں پٹختا گھر سے نکل جاتا۔ باپ بیٹے کی یہ تکرار آئے دن کا معمول بنی ہوئی تھی۔

"یہ نالائق کبھی کچھ نہیں کرے گا۔" ڈیوس کے جانے کے بعد جوزف بیوی سے کہتا۔

"اچھا بابا نہ کرے..... تم اس کو اتنا برا بھلا کیوں کہتے ہو..... جوان اولاد ہے..... کسی روز کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھا تو تمہی سر پکڑ کر روؤ گے۔"

"کیا کرے گا۔" جوزف مجسم سوال بنا ٹریزا کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔

"کتنی مرتبہ کرو گے یہ سوال!" ٹریزا اسے شاکی نظروں سے دیکھتی۔ "جوان اولاد کو ہر وقت لعن طعن کرتے رہو تو اچھا نہیں ہوتا..... لڑکے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ غلط ہاتھوں میں پڑ جاتے ہیں..... نشہ کرنے لگتے ہیں..... طیش میں آکر بچے کبھی کبھی خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔"

"ہونہہ! یہ خودکشی کیا کرے گا..... خودکشی کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ٹریزا کو جوزف بہت بے رحم سا لگتا۔

"خدا کے واسطے جوزف ہر وقت اس کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔" دونوں ہاتھ جوڑ کر جوزف کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ٹریزا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

جوزف منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا۔

"سارا دن گھر میں بیٹھے رہتے ہو نا اس لیے تمہیں بات بڑھانے کا بہانہ چاہیے ہوتا ہے..... جاؤ، باہر جا کر کام کرو۔"

"کیوں کروں کام..... ساری زندگی تو کیا ہے..... تیرے بچے پال دیے۔ بیٹی کی شادی کر دی..... بیٹوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اب ان کا فرض ہے کہ میری خدمت کریں..... یہ میرے آرام کا وقت ہے۔" بھاری تن و توش کے حامل جوزف کو کرسی کے دو ہتھوں کے درمیان اپنا وجود سمیٹنا دوبھر لگتا۔

"یاد رہے ابھی تمہیں بیٹوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔"

"کروں گا..... سوائے تیرے اس نکھے بیٹے کے جس کا نام ڈیوس ہے۔"

"نکما نہیں ہے وہ..... بس جم کر کام نہیں کرتا۔"

ٹریزا بیٹے کی طرف داری میں بولتی۔

جوزف اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتا۔ "جس تیزی سے یہ نوکریاں چھوڑتا اور بدلتا ہے اگر اسی رفتار سے اس نے بیویوں کو بھی چھوڑنا اور بدلنا شروع کیا تو....."

"کیسی بات کرتے ہو جوزف..... اپنے بچوں کے لیے کوئی باپ ایسے بولتا ہے۔" ٹریزا ناگواری سے کہتی۔

"کوئی بولے نہ بولے میں تو بولتا ہوں۔"

"اچھا بابا۔" ٹریزا زچ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے ماتھے سے لگا دیتی۔ "تم مردوں سے ہم عورتیں کہاں جیت سکتی ہیں۔"

جوزف فاتحانہ انداز میں مسکراتا۔ ٹریزا چپ ہو جاتی۔

بینا کو دلاسا دیتے ہوئے اس کا یہ کہنا کہ مرد تو جیسا بھی ہو گزارہ عورت ہی کو کرنا پڑتا ہے اس کی فطرت کا عکاس تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کی حاکمیت تسلیم کرنے میں تامل سے کام نہیں لیتیں۔

☆☆☆

ماریہ پر چرچ جانے کی پابندی عائد کیے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک دن داؤد اپنے ہمراہ ایک نوجوان کو گھر لے آیا۔ اسے بینا سے متعارف کرایا۔ اس کا نام شاہ زیب تھا اور تعلق ہنزہ سے۔ اس کے گھر والے ہنزہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ بقول اس کے وہ بہت کم عمری میں ہنزہ سے اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ لاہور آ گیا تھا۔ حصول تعلیم کی لگن تھی۔ میٹرک پاس کیا۔ چھوٹی موٹی ملازمت کی۔ شام کے وقت ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے کر ایسوسی ایٹ انجینئرنگ ڈپلوما لیا۔ پھر کراچی آ گیا۔ بی ٹیک کیا اور ایک ریفائنری میں نوکری کر لی۔

داؤد سے اس کی واقفیت کیونکر ہوئی اس نے بینا کو کچھ نہ بتایا۔ البتہ داؤد نے اس کی خاصی آؤ بھگت کی۔ ماریہ سے چائے بنانے اور لے کر آنے کو کہا۔ ماریہ چائے لے کر آئی تو اسے شاہ زیب سے متعارف کرایا۔ ماریہ چائے رکھ کر چلی گئی تو وہ کافی دیر ماریہ کی تعریف میں رطب اللسان رہا۔ "بہت انٹیلی جنٹ ہے میری بیٹی..... مجھ پر گئی ہے۔" اس نے بینا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے شاہ زیب سے کہا۔ شاہ زیب دھیرے سے مسکرا دیا۔ بینا کو ماریہ کے بارے میں داؤد کی رطب اللسانی خاصی کھلی۔ پہلی مرتبہ گھر آنے والے ایک اجنبی نوجوان کے سامنے جوان بیٹی کی تعریفوں کے پل باندھ دینا، نامناسب اور معنی خیز امر تھا۔

شاہ زیب کے جانے کے بعد داؤد نے بینا سے پوچھا۔ "کیسا لگا لڑکا؟"

"کیا مطلب؟" بینا نے داؤد کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال داغا۔

"اکیلا لڑکا ہے..... آگے پیچھے کوئی جھنجٹ نہیں..... ماں باپ، بہن، بھائی سب ہنزہ میں رہتے ہیں۔ یہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہاں سے نکل آیا تھا۔ سیلفڈ ہے۔"

اپنا فلیٹ ہے اس کے پاس اور ریفائنری میں اچھی جاب۔ باہر جانے کا چانس بھی ہے...... ماریہ کے لیے بہت مناسب رہے گا۔''

بینا چونکی۔ ''ماریہ کے لیے؟''

''ہاں۔''

''مگر یہ تو شاید مسلمان ہے۔''

''ہاں...... شاید نہیں یقیناً مسلمان ہی ہے۔''

''مسلمان سے ماریہ کی شادی کیسے ہوسکتی ہے ڈیوڈ!'' بینا شاکڈ تھی۔

''کیوں نہیں ہوسکتی؟''

''کیونکہ...... ہم لوگ......''

''ہاں ہاں بولو...... رک کیوں گئیں۔'' وہ اس کے روبرو آ تھما اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

''ہم لوگ کرسچن ہیں۔'' بینا نے اسے خائف نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''ماریہ میری بیٹی ہے۔''

''ہاں تو تم بھی تو کرسچن ہو۔''

''بند کرتی ہے اپنی بکواس یا......'' داؤد نے بینا کو مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔

بینا جو ذرا دیر پہلے خوفزدہ بلی کی طرح سہمی ہوئی تھی یک لخت شیر ہوگئی۔ ''مارو...... بے شک مارو...... ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو میرے...... مگر میں اپنی بچی کی شادی کسی مسلمان سے نہیں ہونے دوں گی۔''

''دیکھتا ہوں یہ نہیں ہونے دے گی تو۔'' داؤد نے غرا کر کہا۔

دونوں کے درمیان تکرار بڑھتے دیکھ کر بچے جو اپنی اپنی جگہ پر دبکے سب کچھ سن رہے تھے لاؤنج میں نکل آئے۔

''کیوں لڑ رہے ہو آپ لوگ اتنا اونچا اونچا۔'' ماریہ نے ناگواری سے کہا۔

''...... '' بینا نے داؤد کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص تیری شادی ایک مسلمان سے کرنا چاہتا ہے۔''

ماریہ چونکی، ٹیڑھی نظروں سے باپ کو دیکھا پھر ماں کو تسلی دی۔ ''تم پریشان کیوں ہوتی ہو ممی...... میری شادی میری مرضی سے ہوگی...... کسی اور کی مرضی سے نہیں۔''

''مرضی تیری نہیں میری چلے گی۔'' داؤد نے اپنا سینہ ٹھونکا۔

''آپ زبردستی نہیں کر سکتے ڈاڈا۔'' ماریہ کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔

''بکواس بند کر۔'' داؤد دھاڑا۔

''آپ ممی کو تنگ کرنا نہیں چھوڑو گے تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

داؤد بیٹی کے نزدیک آ تھما اور اس کا بازو اتنی سختی سے دبوچا کہ اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔

''کیا! کیا انجام ہوگا؟'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''چھوڑو اس کا بازو۔'' بینا نے بیٹی کو تکلیف میں دیکھ کر کہا۔

داؤد نے اسے پرے دھکیل دیا۔

ماریہ کچھ دیر باپ کو دیکھتی رہی پھر اس نے بے خوفی سے کہا۔ ''میں بشپ سے کہوں گی مجھے، ممی کو اور میرے دونوں بھائیوں کو کسی بھی دوسرے ملک میں پناہ دلوا دیں کیونکہ تمہارے ساتھ ہم محفوظ نہیں ہیں۔''

داؤد نے ماریہ کا بازو چھوڑا اور زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

''اوہ! اوہ مائی گاڈ!'' ماریہ بلک اٹھی اور اپنا گال سہلانے لگی۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' داؤد نے کہا۔ بینا اور ماریہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

بینا جو پہلے ہی ذہنی دباؤ میں تھی اس رات دورۂ قلب سے دوچار ہوئی۔ رات کے پچھلے پہر اسے ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا۔ بینا کے گھر والوں کو خبر ہوئی تو وہ سب اسے دیکھنے کے لیے اسپتال آئے۔ ماریہ نے انہیں اپنی ماں اور باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑے اور اس کے سبب سے آگاہ کیا۔

''تم میری بیٹی کو ختم کر کے رہو گے۔'' بینا کی ماں اسپتال ہی میں داؤد پر بگڑ گئی۔ داؤد نے ان سے کافی بدکلامی کی اور ان کے جانے کے بعد ماریہ سے بولا۔

''تو کیا سمجھتی ہے تیری ماں کی اس ڈرامابازی سے میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔''

''کون سی ڈرامابازی ڈاڈا؟'' ماریہ نے کہا۔

''یہی اسپتال میں آ پڑنے کی۔''

''خدا کے واسطے ڈاڈا اب تو رحم کرو ممی پر...... ڈرامابازی ہوتی تو ڈاکٹرز انہیں سی سی یو میں کیوں رکھتے۔''

''لا ڈھیر سارا سنکھیا لا...... میں گھول کر پیتا ہوں پانی میں...... کل تو مجھے بھی سی سی یو میں دیکھے گی۔''

ماریہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔
''ایسے کیا دیکھتی ہے؟'' وہ غرایا۔
''آپ بہت بے رحم ہو ڈاڈا۔''
''گھورے گی مجھے تو دونوں آنکھیں انگلیوں سے نکال لوں گا۔''
''نکال لو...... نکال لو...... کم سے کم تم جیسے بے رحم آدمی کو تو نہیں دیکھنا پڑے گا مجھے...... میری ماں بستر پر پڑی ہے اور تم......'' ماریہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسپتال کی راہداری میں لوگ ٹھٹک گئے۔
''کیا ہوا؟''
''کچھ نہیں...... ماں بیمار ہے اس لیے رو رہی ہے۔'' داؤد نے بات بنائی۔
''خدا رحم کرے گا۔''
ماریہ کے رونے پر ٹھٹک جانے والے لوگ اپنے اپنے راستے پر ہولیے۔ ماریہ نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور باپ کو دیکھنے لگی۔ ''ڈاڈا! آپ کو ممی کے ساتھ یہ سب کچھ کرنا تھا تو آپ نے ان سے شادی کیوں کی تھی؟''
''غلطی ہوگئی تھی۔'' وہ بولا۔
بینا کو سی سی یو سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ ماریہ دن رات اس کے پاس تھی۔

☆☆☆

وہ بڑی اداس سی شام تھی۔ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے ملاقاتی جا چکے تھے۔ ماریہ ماں کے بیڈ کے نزدیک بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا دل بہت اداس تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اسپتال کی شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ غیر متوقع طور پر اس کی ماں کی کزن ٹریزا اپنے چھوٹے بیٹے ڈیوس کے ہمراہ بینا کی عیادت کو آپہنچی۔
گیٹ کیپر اندر آنے نہیں دے رہا تھا مگر ڈیوس نے اسے رام کر لیا۔ ٹریزا نے ماریہ کو بتایا۔
''اچھا ہوا آنٹی آپ آگئیں...... میرا دل آج بہت اداس تھا۔'' ماریہ نے کہا۔
''ماں بیمار ہے نا اس لیے...... فکر مت کرو ٹھیک ہوجائے گی۔'' ٹریزا نے ماریہ کو تسلی دی اور بینا کو جو غنودگی میں تھی ایک نظر دیکھتے ہوئے ماریہ سے آہستگی سے بولی۔
''ملاقات کے وقت میں اس لیے نہیں آئی کہ تمہارا باپ بھی موجود ہوگا...... برا مت ماننا...... تمہارا باپ ہے مگر مجھے اس سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔''
ماریہ شرمندہ سی ہوگئی۔
''ممی اس میں ماریہ بے چاری کا کیا قصور۔'' ڈیوس بولا۔
''میں اس کا قصور نہیں کہہ رہی بیٹا۔'' ٹریزا نے کہا۔
تب ہی بینا نے آنکھیں کھول دیں۔
''کیسی ہو بینا؟'' ٹریزا نے بینا کی طرف توجہ کی۔
''ٹھیک ہوں۔'' بینا کی آواز میں نقاہت تھی۔
ٹریزا اس کے سر کو بوسہ دینے کے لیے جھکی پھر سیدھی ہو کر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''جلدی جلدی اچھی ہو جاؤ۔''
بینا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کمزور سی آواز میں بولی۔ ''میں اب اچھی نہیں ہوسکتی ٹریزا...... مجھے دائمی روگ لگ گیا ہے...... ڈیوڈ کی صورت۔''
''خدا اسے ہدایت دے۔'' ٹریزا نے کہا۔
بینا کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''مجھ پر ایک مہربانی کرو۔'' اس نے ٹریزا سے التجائیہ لہجے میں کہا۔
''ہاں بولو...... میں تمہارے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔''
''ماریہ کو تم اپنے فرانسس کے لیے لے لینا ورنہ ڈیوڈ میری بچی کو مسلمان سے بیاہ دے گا۔''
ٹریزا دم بخود رہ گئی۔ بینا کے حالات کی وجہ سے اس سے ہمدردی اپنی جگہ مگر اس کی یہ بات اس کے لیے قطعاً غیر متوقع تھی۔
''تم پہلے ٹھیک ہو جاؤ پھر سوچیں گے۔'' ٹریزا نے ٹالنا چاہا۔
بینا نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ ''میں اب ٹھیک نہیں ہوں گی ٹریزا۔'' بینا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''ڈیوڈ نے مجھے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے...... میرا دل کہتا ہے میں نہیں بچوں گی۔''
''خدا پر بھروسا رکھو۔'' ٹریزا نے اس کا سر تھپتھپایا۔
بینا بلک بلک کر رونے لگی۔ وارڈ میں موجود دوسرے مریض چونک کر بینا کے بیڈ کی طرف دیکھنے لگے۔
''آہستہ ممی...... سب لوگ...... دیکھ رہے ہیں۔'' ماریہ نے ماں سے سرگوشی میں کہا۔
بینا نے دونوں ہونٹ باہم بھینچ لیے مگر اس کی آنکھوں میں امڈا سیلاب نہ رکا۔ ٹریزا اسے دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔
''مجھ سے وعدہ کرو ٹریزا کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔'' بینا نے روتے ہوئے کہا۔ ٹریزا شش و پنج میں پڑ

گئی۔ ''پلیز! پلیز ٹریزا۔'' بینا گڑگڑائی۔
''ممی! کیوں پریشان ہوتی ہو...... یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔'' ماریہ نے ماں کو سمجھانا چاہا۔
''تجھے نہیں معلوم...... تجھے نہیں معلوم ماریہ...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' بینا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔
''او کے...... او کے...... تم پہلے ٹھیک ہو جاؤ۔'' ٹریزا بولی۔
''وعدہ!'' بینا نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا۔ ''وعدہ کرتی ہو کہ تم ماریہ کو فرانسس کی دلہن بنالوگی؟''
ٹریزا نے بے بسی سے ڈیوس کی طرف دیکھا۔ ڈیوس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے صلاح دی کہ بینا کا دل رکھنے کو وعدہ کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔
''ٹھیک ہے۔'' ٹریزا نے کہا۔
''خداوند کو گواہ بنا کر وعدہ کرو ٹریزا۔''
''ٹھیک ہے بینا۔''
''ایسے نہیں...... مجھ سے وعدہ کرو...... مجھے زبان دو۔'' ٹریزا عجیب مشکل میں تھی۔
''وعدہ کرو ٹریزا۔''
''او کے بینا...... میں وعدہ کرتی ہوں...... زبان دیتی ہوں تمہیں۔''
''تھینک یو...... خدا تمہیں خوش رکھے۔'' بینا نے ٹریزا کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ ٹریزا کے لیے اس کی آنکھوں میں ممنونیت کا گہرا احساس تھا۔
اور اس رات بینا ایسی سوئی کہ پھر کبھی نہیں جاگی۔

☆☆☆

بینا کی تدفین کے موقع پر داؤد نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ اس کے میکے والوں سے غیر معمولی مروت سے پیش آیا۔ ان لوگوں نے اسے داؤد کی کایا پلٹ پر محمول کیا۔ موت اچھے اچھوں کو بدل کر رکھ دیتی ہے مگر داؤد کی یہ مروت عارضی ثابت ہوئی۔ بینا کی موت کا صدمہ کچھ کم ہونے پر جب اس کی ماں نے داؤد کے کان میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ اپنی زندگی کی آخری شام بینا نے ٹریزا سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ماریہ کو اپنی بہو بنائے گی تو داؤد ناگواری سے بولا۔ ''ماریہ میری بیٹی ہے۔ اس کی شادی وہاں ہوگی جہاں میں چاہوں گا۔''
''مگر یہ بینا کی خواہش تھی ڈیوڈ۔'' ماں نے کہا۔
''مرنے والوں کی خواہشیں ان کے ساتھ ہی دفن ہوجاتی ہیں۔''
''نہیں بیٹا...... روح زندہ رہتی ہے...... اسے سب معلوم رہتا ہے...... یہ تو جسم ہے جو زمین میں دفن ہوجاتا ہے۔''
''میں نے کہہ دیا نا ماریہ کی شادی میری مرضی سے ہوگی۔''
داؤد کے جارحانہ تیوروں نے بینا کی ماں کو چپ ہوجانے پر مجبور کردیا۔
داؤد نے پھر بینا کے زمانے والی حرکتیں شروع کردیں۔ بچوں کو ان کے ننھیال والوں سے ملنے سے منع کردیا۔ ان لوگوں کے اپنے گھر آنے پر پھر پابندی لگادی۔ بینا کے گھر والوں نے ماریہ سے ملنے کے لیے اس کے کالج اور دونوں لڑکوں کے اسکول آنا جانا شروع کیا تو اس نے ماریہ کو گھر بٹھالیا۔ لوئیس کو گھر کے نزدیک اور فلپ کو اپنے دفتر کے قریب اسکول میں داخل کرادیا۔ ان لوگوں نے لوئیس سے ملنے کے لیے ایک دو مرتبہ اس کے اسکول کا چکر لگایا تو اس نے لوئیس کو بھی اسکول سے اٹھالیا۔
''تو گھر میں اکیلی ہوتی ہے...... یہ تیرے ساتھ رہا کرے گا۔'' اس نے ماریہ سے کہا۔
''اس کی پڑھائی ڈاڈا؟'' ماریہ نے تشویش ظاہر کی۔
''اس کی پڑھائی کی مجھے زیادہ فکر ہونی چاہیے نہ کہ تجھے۔'' داؤد نے ماریہ پر آنکھیں نکالیں۔ وہ چپ ہورہی۔ اب تو اس کا دفاع کرنے والی ماں بھی اس دنیا میں نہ رہی تھی۔
بینا کے رشتے داروں نے بچوں کی خیر خبر لینے کے لیے داؤد کی عدم موجودگی میں بچوں سے ملنے کے لیے چوری چھپے اس کے گھر آنا شروع کیا تو داؤد کو پڑوسیوں سے اس کی بھی بھنک مل گئی۔ داؤد نے پڑوسیوں ہی کو اعتماد میں لیا اور اپنی عدم موجودگی میں گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جانے لگا۔ تالے کی ایک چابی ہمسایہ گھرانے کی ایک قابل اعتماد بوڑھی خاتون کو دے دی کہ بوقتِ ضرورت دروازہ کھولنے کے کام آسکے۔ داؤد کی ایما پر مذکورہ ہمسائی دن میں ایک دو مرتبہ تالا کھول کر ماریہ اور لوئیس کی خیر خبر لے لیتی۔ ماریہ فون کی سہولت سے بھی محروم کردی گئی تھی۔ فلپ صبح کو باپ کے ساتھ گھر سے جاتا اور شام کو اسی کے ساتھ واپس آتا۔ داؤد اسے اپنا سب سے وفادار اور قابل اعتماد بچہ سمجھتا تھا لیکن اسکول کے بعد ایسے ویسے لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جانے کے خیال سے وہ اسے اسکول سے چھٹی کے بعد اپنے دفتر ہی بلا لیتا۔ فلپ وہیں دوپہر کا کھانا کھاتا اور کسی خاموش گوشے میں بیٹھ کر پڑھتا لکھتا۔ یوں گھر واپسی کے

بعد اسے پڑھائی کی ضرورت نہ رہتی۔

☆☆☆

اس روز شاہ زیب جس سے بیٹا کی زندگی میں ماریہ کی شادی کا قصہ چھڑا تھا' دوبارہ گھر آیا۔ داؤد نے اس کی خوب خاطر تواضع کی اور بہت دیر اس کے ساتھ بیٹھا چیکے چیکے باتیں کرتا رہا۔ فلپ نے ماریہ کو آہستہ سے بتایا کہ اس نوجوان سے اس کی شادی کی بات طے کی جا رہی تھی۔ آئندہ ہفتے سادگی سے نکاح اور رخصتی۔

''کچھ کرو فلپ۔'' ماریہ روہانسی ہو کر بولی۔

''اچھا بھلا تو ہے...... ہینڈسم، اسمارٹ، اپنا فلیٹ۔'' فلپ نے ماریہ کو چھیڑا۔

''مر جاؤں گی مگر مرضی کی خواہش کے برخلاف کسی مسلمان سے شادی نہیں کروں گی میں۔'' ماریہ نے دوٹوک کہا۔

''بائی دی وے مرو گی کیسے...... ڈاڈا تو ڈور لاک کر کے جاتا ہے۔'' فلپ کو مذاق سوجھا۔

''زہر کھالوں گی۔''

''زہر کہاں سے آئے گا؟'' فلپ کی حس مزاح مسلسل پھڑک رہی تھی۔

''گردن میں پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹک جاؤں گی...... آگ لگالوں گی خود کو۔'' ماریہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''ایسا کرو بھاگ جاؤ۔'' فلپ مسکرایا۔

''کہاں؟''

''کہیں بھی۔''

''بے وقوف! ڈاڈا نانو لوگوں کو پھنسوا دیں گے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''کوئی اور طریقہ سوچو۔''

''میرا خیال ہے تم شادی کر ہی لو۔''

''کس سے؟''

''اسی سے جس سے ڈاڈا کرنا چاہتے ہیں۔''

فلپ کو زیر لب مسکراتا دیکھ کر ماریہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کان پکڑ لیا۔ ''میں پریشان ہو رہی ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے...... بی سیریس۔''

''او کے۔'' فلپ آلتی پالتی مار کر چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''ایک کام کرو پلیز۔'' ماریہ سرک کر اس کے نزدیک ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد رازداری سے بولی۔ ''کسی طرح نانو لوگوں کو اطلاع کر دو۔''

''کیا؟''

''یہی کہ ڈاڈا میری شادی کر رہا ہے۔''

''نہ بابا نہ۔'' فلپ نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ ''ڈاڈا کو پتا چل گیا تو وہ مجھے الٹا لٹکا دے گا۔''

''اور بہن چاہے سولی پر چڑھا دی جائے۔'' ماریہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''میں ڈاڈا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔''

''اچھا تو پھر مجھے کہیں سے موبائل لا دو...... میں نانو سے خود بات کرلوں گی۔''

''کہاں سے لا دوں موبائل...... تمہارے موبائل کے ساتھ ڈاڈا نے میرا موبائل بھی اپنے پاس رکھا ہوا ہے کیونکہ انہوں نے میرے موبائل پر نانو اور ٹینا آنٹی کی کالز دیکھ لی تھیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''ہاں لیکن میں تمہیں موبائل لا کر دے سکتا ہوں۔''

''کہاں سے؟''

''تھوڑے پیسے جمع ہیں میرے پاس...... دیکھوں گا کوئی سیکنڈ ہینڈ موبائل مل گیا تو لا دوں گا...... مگر ڈاڈا کو پتا نہ چلے۔''

''نہیں پتا چلے گا...... بلکہ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں میں وہ دے دوں گی تمہیں...... اچھے بھائی مجھے کل ہی لا دو۔''

''کوشش کرتا ہوں۔''

''تھینک یو...... تھینک یو سو مچ فلپ۔''

☆☆☆

فلپ نے ماریہ کو موبائل لا دیا۔ ماریہ نے لوئیس سے بھی مکمل رازداری برتی اور باپ کی عدم موجودگی میں لوئیس سے چھپ کر نانی کو فون کیا۔ نانی پریشان ہو گئی مگر اس نے ماریہ کو دلاسا دیا۔ ''کچھ کرتے ہیں بیٹا تم پریشان نہ ہو۔''

''جلدی!'' ماریہ نے بے تابی سے کہا۔

''ہاں ہاں...... جلدی ہی۔''

ماریہ کے ننھیال میں کھلبلی مچ گئی۔ بات ٹریزا اور اس کے گھر والوں تک بھی جا پہنچی۔ ڈیوس نے ماں کو اس کا بیٹا سے کیا ہوا وعدہ یاد دلایا۔ ''آپ کو بیٹا آنٹی سے اپنا وعدہ یاد ہے نا ممی؟''

''ہاں ہاں...... مجھے یاد ہے...... میں نے فرانسس سے بات بھی کر رکھی ہے۔''

''اب وعدہ پورا کرنے کا وقت آگیا ہے...... بلاؤ فرانسس کو اور کرو اس سے ماریہ کی شادی...... ایک بار

شادی ہوگئی تو ماریہ کا باپ کچھ نہیں کر سکے گا۔'' ڈیوس بولا۔

''مگر خیال رہے ٹریزا کہ ڈیوڈ بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ ہم لوگ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔'' ٹریزا کے شوہر جوزف نے کہا۔

''کیسی بات کرتے ہو ڈیڈ! وہ خبیث ہماری لڑکی کو یرغمال بنا کر بیٹھا ہے اور آپ بزدلی ظاہر کر رہے ہو۔'' ڈیوس کے تیور جارحانہ تھے۔

''بزدلی کے بچے!'' جوزف نے بیٹے کو گھورا۔ ''تھانہ کچہری ہوگئی تو تیری بہادری بھی دیکھ لوں گا...... جسے تو ہماری لڑکی کہہ رہا ہے وہ ڈیوڈ کی بیٹی بھی ہے...... سمجھا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... وہ اس کی بیٹی بھی ہے مگر وہ غلط کر رہا ہے۔ ماریہ کرسچن ہے اس کی شادی اس کا باپ ایک مسلمان سے کیسے کر سکتا ہے۔''

''کیونکہ وہ خود بھی کبھی مسلمان ہی تھا۔''

''مگر اب تو نہیں ہے۔''

''وہ تو ابھی کہتا ہے کہ مسلمان ہوں۔''

''غلط کہتا ہے...... جھوٹ بولتا ہے...... مکاری کرتا ہے۔'' ڈیوس ایک ہی سانس میں غصے سے بولا۔

''میں کسی اور کی خاطر رانسس کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔'' جوزف کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''ڈیڈ! مردانگی دکھانے کا وقت ہے مردانگی۔'' ڈیوس بولا۔

''جا...... تو دکھا دے۔''

''دکھاؤں گا...... دکھاؤں گا۔''

ٹریزا پریشان ہو کر ڈیوس کو دیکھنے لگی۔ چار بچے تھے اس کے...... لیکن اس ایک کی وجہ سے وہ کتنی فکرمند رہا کرتی تھی۔

☆☆☆

''آنٹی...... آنٹی۔'' ماریہ اپنے گھر کے عقبی حصے میں واقع صحن میں کھڑی پڑوسن آنٹی اور اپنے گھر کی مشترکہ دیوار کو تھپتھپاتے ہوئے اپنی آواز میں کمزوری پیدا کیے پکار رہی تھی۔

دیوار کے اوپر پڑوسن آنٹی کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ شاید کسی تپائی یا کرسی پر چڑھی ماریہ کے گھر کے صحن میں جھانک رہی تھیں۔ ''ہاں...... کیا بات ہے ماریہ؟''

''آنٹی میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''پتا نہیں...... پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔''

''تمہارے باپ کو فون کروں؟''

''نہیں نہیں...... وہ پریشان ہو جائیں گے۔''

''پھر؟''

''مجھے ڈاکٹر کے ہاں لے چلیں۔''

''تمہارے باپ کی اجازت کے بغیر!''

''جب وہ آئیں گے تو میں انہیں بتادوں گی آنٹی کہ میری طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی...... اف! اف اللہ! بہت درد ہو رہا ہے...... میں مر جاؤں گی۔'' ماریہ نے دونوں پہلوؤں کو ہاتھوں سے پکڑ کر نحیف سی آواز میں کہا۔

''آ رہی ہوں...... آ رہی ہوں۔'' پڑوسن نیچے اتر گئی۔

دروازے پر پڑا تالا کھولنے کی آواز سنائی دی اور پڑوسن آنٹی گھر میں آ گئیں۔ ماریہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبوچے بستر پر بیٹھی تھی۔

''بہت درد ہے؟'' پڑوسن آنٹی نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''درد کی کوئی گولی لا کر دوں؟''

''لی تھی آنٹی...... کوئی فرق نہیں پڑا...... پلیز ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔'' ماریہ کراہتے ہوئے بولی۔

پڑوسن آنٹی شش و پنج میں پڑ گئیں۔ ''تمہارے ابا کو فون کر دیتی ہوں۔''

''ارے نہیں آنٹی...... وہ آفس چھوڑ کر کہاں آئیں گے...... ابھی تو قلب بھی اسکول سے ان کے پاس نہیں پہنچا ہوگا۔ ہم لوگ ڈاکٹر کو دکھا کر تھوڑی دیر میں واپس بھی آ جائیں گے...... اوہ! بہت درد ہو رہا ہے۔''

''اچھا! چلو...... میں اپنی چادر لے کر آتی ہوں، لوئی کو بھی ساتھ لو گی؟''

''اسے آپ ممتاز آنٹی کے پاس چھوڑ دیں...... تھوڑی دیر میں تو آ جائیں گے ہم لوگ۔''

ممتاز پڑوسن آنٹی کی بہو تھی۔ ''لوئی! آ بیٹا تو میرے ساتھ آ۔'' پڑوسن آنٹی لوئی کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

ماریہ اٹھی اور اس نے گھر سے باہر جانے کی تیاری کی۔

گھر سے نکلتے ہی گلی میں ایک ٹیکسی کھڑی مل گئی۔

ماریہ نے اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور سر پر نیلے رنگ کی کیپ ہونے کا اطمینان کیا اور پڑوسن آنٹی سے کہا۔ ''آنٹی ٹیکسی کھڑی ہے اسی سے پوچھ لیں۔''

پڑوسن آنٹی نے ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی۔ وہ بلاحجت ان کے مطلوبہ مقام تک لے جانے کو تیار ہو گیا۔

ماریہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ پڑوسن آنٹی بیٹھنے ہی جا رہی تھیں کہ ماریہ نے انہیں اپنی غلطی کا احساس دلایا۔ ''سوری آنٹی میں اپنا پرس تو لینا بھول ہی گئی۔ اسی میں پیسے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں میرا بٹوا ہے میرے پاس۔'' پڑوسن آنٹی نے کہا۔

''نہیں نہیں آنٹی جب میرے پاس پیسے ہیں تو آپ کیوں دیں گی، ٹیکسی کا کرایہ بھی دینا ہوگا...... ڈاکٹر کی فیس اور دوا بھی...... پلیز آپ لے آئیں، صوفے پر پڑا ہے میرا پرس۔''

''اچھا!'' پڑوسن آنٹی پرس لینے چلی گئیں لیکن جب وہ لوٹیں تو ٹیکسی کا دور دور تک کچھ پتا نہ تھا۔ پڑوسن آنٹی حواس باختہ ہو گئیں۔ سینہ پیٹنا اور ململا نا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں لوگ جمع ہو گئے۔

''ارے! ابھی لڑکی کو ٹیکسی میں بٹھا کر اس کا پرس لینے گھر گئی تھی واپس آئی ہوں تو ٹیکسی غائب!'' پڑوسن آنٹی ہاتھ مل مل کر لوگوں کو بتا رہی تھیں۔ لوگ سوال پر سوال کر رہے تھے اور پڑوسن آنٹی کو یہ خوف مارے دے رہا تھا کہ وہ ماریہ کے باپ کو کیا جواب دیں گی۔

پڑوسن آنٹی ہانپتی کانپتی گھر پہنچیں۔ بہو کو بتایا۔ بیٹے کو جو اپنے کام پر گیا ہوا تھا فون کیا۔ بیٹا الٹا انہی پر برس پڑا۔ ''تم اسے لے کر نکلیں کیوں، اب بھگتنا تھانہ کچہری...... اس کا باپ تو تمہی کو ملزم ٹھہرادے گا۔''

''ارے بیٹا! میں تو اسے ہمدردی میں لے گئی تھی...... بے چاری پیٹ کے درد سے تڑپ رہی تھی۔''

''اب تم تڑپو گی۔''

''تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا...... ارے میں تو نیکی کرنے نکلی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ بدمعاش ٹیکسی والا لڑکی کو لے کر اڑنچھو ہو جائے گا۔ ہائے کیا جواب دوں گی میں اس کے باپ کو...... وہ تو مجھے گولی مار دے گا۔''

''گولی! وہ جو نہ کرے...... کم ہوگا۔''

☆☆☆

ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔ عقبی نشست پر بیٹھی ماریہ انتہائی سراسیمہ نظر آتی تھی۔

''سسٹر! آپ پریشان نہ ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم ڈیوس کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔'' اس نے ماریہ کو تسلی دی۔ ماریہ ڈر رہی تھی۔ آگے خدا جانے کیا ہو۔ دوبارہ باپ کے ہاتھ آ گئی تو وہ جان سے مار دینے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ بہت غصہ ور آدمی تھا۔ فلپ اور لوئیس کو چھوڑ کر آنے پر اس کا دل بھی دکھ رہا تھا۔ لوئیس تو ماں کی موت کے بعد اسی سے چمٹ کر سوتا تھا۔ شاید اس کے ننھے سے دل نے اسے ماں کی جگہ دے دی تھی۔ فلپ کا لا کر دیا ہوا موبائل جس نے اسے اپنے ننھیال والوں سے رابطہ کرنے میں مدد دی تھی اس وقت بھی اس کے گریبان میں ''سائلنٹ'' موڈ پر پڑا تھا۔ اس سے جو کام لینا تھا وہ ڈیوس ماریہ کی نانی سے اس کا موبائل فون نمبر لے کر کر چکا تھا۔

یہ سارا منصوبہ جس کے تحت وہ گھر سے نکلی تھی، ڈیوس کے ذہن رسا کا کارنامہ تھا۔ ڈیوس جسے اس کا باپ اپنے دو بڑے بیٹوں کے مقابلے میں نکما گردانتا تھا، اکثر دل ہی دل میں اس امر پر دل گرفتہ ہوتا کہ اس کے گھر والے بالخصوص باپ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ وہ نہایت پھرتیلا، ذہین اور نڈر تھا۔ خطروں میں...... بے خطر کود پڑتا۔ لوگ ابھی سوچ ہی رہے ہوتے وہ کام نمٹا کر بھی آ جاتا۔ رہی یہ بات کہ وہ آج تک کسی جگہ ٹک کر کام نہیں کر سکا تھا تو اس کے خیال میں ابھی تک اسے اس کی منشا کا کام ہی نہیں ملا تھا۔ بہرحال فی الوقت تو اس کا اہم ترین مشن ماریہ کو اس کے باپ کے ظلم سے محفوظ و مامون رکھنا تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

ٹیکسی ایک جگہ رکی اور ڈیوس سرعت سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈیوس کو دیکھ کر ماریہ کی ہمت کچھ بندھی۔ ٹیکسی دوبارہ چل پڑی۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' ڈیوس نے ٹیکسی ڈرائیور سے جو اس کا دوست سلمان تھا، پوچھا۔

''نہیں۔''

''گڈ!'' اس نے کہا پھر گردن موڑ کر ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک ہو ماریہ؟''

''جی۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

ڈیوس نے ایک نظر اپنے سامنے آئینے میں ماریہ کے عکس پر ڈالی اور اسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆☆☆

''خدا تمہیں جزائے خیر دے ڈیوس کہ تم ماریہ کو وہاں سے نکال لائے لیکن بیٹا تمہیں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔'' ماریہ کے نانا نے کہا۔

ڈیوس چونکا۔ ''اور کہاں لے جاتا گرینڈ پا!''

''ڈیوڈ ہم لوگوں پر ماریہ کے اغوا کا الزام لگا سکتا

ہے۔'' ماریہ کی ممانی نے لقمہ دیا۔
''اس سے کچھ بعید نہیں...... وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''
ماریہ کی نانو بولیں۔
ماریہ دم بخود تھی۔ ٹیکسی نانو کے گھر کے باہر رکنے پر اس سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ نانو کے گھر میں سب لوگ اسے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو جائیں گے مگر وہاں تو اسے دیکھ کر سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔
''تمہیں چاہیے تھا ماریہ کو پولیس اسٹیشن لے جاتے۔'' نانا نے ڈیوس سے کہا۔
ماریہ نے چونک کر نانا کو دیکھا۔
''جو پہلے پرچہ کٹوا دے وہی مدعی۔'' نانا نے تجربے کی بات کی۔
''آپ ٹھیک بولتے ہو لیکن اچھی طرح سوچ لو آپ لوگ...... پولیس، تھانہ آسان نہیں ہوتا...... بات عدالت تک چلی جائے تو لمبی کہانی...... میں تو کہتا ہوں ماریہ کو آپ لوگ اپنے پاس رکھو میں ممی سے بولتا ہوں فرانسس کو فوراً بلائیں اور دونوں کی شادی کر دیں...... شادی کے بعد فرانسس اسے اپنے ساتھ لے جائے...... قصہ ختم۔''
''قصہ تو ابھی شروع ہوا ہے ڈیوس...... تمہارا کیا خیال ہے ڈیوڈ خاموش بیٹھا رہے گا، تم دیکھنا تو سہی...... وہ پولیس کو رپورٹ کرے گا...... ٹیکسی والے کا ایک جوان لڑکی کو لے کر بھاگ جانا چپ ہو کر بیٹھ جانے والی بات تو نہیں۔'' نانا نے کہا۔
''ڈیڈی ایک دم ٹھیک بول رہے ہیں۔'' ممانی نے تائید کی۔ ''اور میں شرطیہ کہتی ہوں ڈیوڈ کا شک ہم ہی لوگوں پر جائے گا...... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''
ماریہ شاکڈ تھی کہ وہ لوگ جن سے اس کا نہایت قریبی رشتہ تھا باپ کے حبسِ بے جا سے اس کے نکل آنے پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کرنے کے بجائے پریشان ہو رہے تھے۔
''جلدی کرو ڈیوس...... ماریہ کو یہاں سے لے جاؤ، ڈیوڈ اگر یہاں آ گیا تو اسے زبردستی اپنے ساتھ کھینچ کر لے جائے گا۔''
''چلو ماریہ۔''
ماریہ بادلِ ناخواستہ اٹھی اور دونوں گھر کے باہر کھڑی ٹیکسی میں آ بیٹھے۔
''پولیس اسٹیشن۔'' ڈیوس نے سلمان سے کہا۔

☆☆☆

پڑوسن کے بیٹے کا فون آنے پر داؤد خاصا پریشان سا گھر پہنچا تھا۔ پڑوسن کی تمام تر سابقہ احسان مندی فراموش کر کے وہ اسی پر برس پڑا۔ ''کیا ضرورت تھی اسے گھر سے باہر لے کر نکلنے کی۔''
''غلطی ہو گئی بھیا۔'' پڑوسن روہانسی ہو رہی تھی۔
''غلطی مجھ سے ہوئی جو میں نے تم پر بھروسا کیا۔''
''اپنے پاؤں سے جوتا اتارو اور برساؤ میرے سر پر۔'' پڑوسن کے بیٹے نے جبڑے بھینچ کر ماں کو گھورا۔
''ٹیکسی کس رنگ کی تھی؟'' داؤد نے بڑی بی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''پیلی۔''
''اور ڈرائیور؟''
''کالا۔''
''میں یہ نہیں پوچھ رہا...... جوان تھا یا بوڑھا؟''
''جوان ہی تھا۔''
''زبان؟''
''اے لو میں کوئی زبان کھلوا کر دیکھتی اس کی۔''
''میرا مطلب ہے اردو بول رہا تھا یا کوئی اور زبان؟''
''اردو۔''
''داؤد صاحب رپٹ لکھوائیں۔''
''رپورٹ تو میں لکھوا ہی دوں گا مگر یہ سمجھ لو کہ تفتیش تمہارے گھر ہی سے شروع ہو گی۔''
''میرے گھر سے۔'' پڑوسن کا بیٹا بے ساختہ چونکا۔
''ماریہ تمہاری والدہ کے ساتھ ہی تو جا رہی تھی...... یہ اسے ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا چھوڑ کر گھر کیوں واپس آ گئیں۔''
''اے بھیا بتایا تو ہے ماریہ کا پرس لینے۔'' بڑی بی رونے کو ہوگئیں۔
''مجھے کیا پتا کیا چکر ہے۔'' داؤد نے نہایت بے مروتی سے کہا۔
بیٹے نے ماں کو گھورا۔

☆☆☆

''اچھا! تو وہ تمہاری بیٹی ہے۔'' تھانیدار نے داؤد کو تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''جناب!'' داؤد نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔
''لڑکی بالغ ہے عاقل ہے۔ وہ بیان دے چکی ہے کہ تمہارے حبسِ بے جا کے خلاف اپنی مرضی سے گھر سے نکلی ہے نامعلوم ٹیکسی ڈرائیور کے خلاف اس کے اغوا کا پرچہ کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔''

''سر! اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے میرے سسرال والوں نے اغوا کر کے میرے خلاف ورغلا کر بیان دلوایا ہے۔''

''کل صبح لڑکی کو عدالت میں پیش کیا جائے گا...... تمہیں جو کہنا ہے اب عدالت میں کہنا۔''

''سر! آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔'' داؤد کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

تھانیدار نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''یہ ایک غیر معمولی کیس ہے...... مذہبی منافرت کا معاملہ...... میں مسلمان ہوں اور اپنے بچوں کو بھی مسلمان ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری مرحومہ بیوی کرسچن تھی۔ اس کی موت کے بعد میرے سسرال والے میرے بچوں کو اپنے مذہب پر چلانا چاہتے ہیں۔''

''تمہاری بیٹی کہتی ہے اس کی ماں سے شادی کے لیے تم نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔''

''بکواس کرتی ہے جناب...... یہ پٹی اس کی ماں کے گھر والوں نے پڑھائی ہے اسے۔''

تھانیدار نے داؤد کو گھونگا ہوں سے دیکھا۔

''میں مسلمان ہوں جناب...... اپنی اولاد کو دوسرے مذہب پر جاتے کیسے دیکھ سکتا ہوں...... دراصل میرے سسرال والے میری بیٹی کو ورغلا کر اس کی شادی اپنی برادری میں کرنا چاہتے ہیں۔''

''داؤد صاحب! لڑکی کا بیان ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ اب جو بات ہوگی عدالت میں ہوگی۔''

''میں ایک عزت دار آدمی ہوں، عدالت میں جانے سے میری رسوائی ہوگی اور وہ بھی اپنی ہی بیٹی کو اپنے خلاف عدالت کے کٹہرے میں دیکھ کر۔''

''مجبوری ہے۔''

''پلیز! اس معاملے کو یہیں رفع دفع کرنے کی کوشش کریں...... اسے ایک بار بلائیں تو میرے سامنے۔''

''وہ پولیس کی حفاظتی تحویل میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے آپ کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ بھی ہے۔''

''جھوٹ...... سراسر جھوٹ جناب...... بھلا کوئی باپ اپنی بیٹی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''مسٹر داؤد! یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ بڑے عجیب و غریب کیس آتے ہیں یہاں...... بارہ سالہ لڑکی اپنے پندرہ سالہ دوست لڑکے کے لیے اپنے ماں باپ اور چھوٹے دو بھائیوں کو کھانے میں زہر ملا کر موت کی نیند سلا سکتی ہے؟ مگر ایسا ہوا ہے۔''

داؤد بے چارگی سے تھانیدار کا منہ تکنے لگا۔ ''سر پلیز!'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ''مجھے ایک بار میری بیٹی سے ملوا دیں...... میں اسے سمجھا لوں گا۔''

''نو!'' تھانیدار کا لہجہ اور تیور دونوں دوٹوک تھے۔ ''اب عدالت میں ملنا اس سے۔''

☆☆☆

ڈیوس اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ماں کو اور ماں نے اس کے باپ کو بتا دیا تھا۔ جوزف اس پر آنکھیں نکالے گرج برس رہا تھا۔ ''کیا ضرورت تھی تجھے دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ پھنسانے کی۔''

''ڈیڈی! یار یہ ہماری فیملی کی لڑکی ہے۔ کسی کو تو آگے بڑھ کر کرنا چاہیے تھا اس کے لیے کچھ۔''

''اس کے نانا، ماموں، خالو مر گئے ہیں کیا۔'' جوزف چلایا۔

''یار! وہ ڈرپوک لوگ ہیں...... ڈیوڈ یہ کر دے گا...... ڈیوڈ وہ کر دے گا۔ ان لوگوں کی تو جان جاتی ہے ڈیوڈ سے۔''

''تو جیسے بڑا ہیرو ہے نا...... ہرکولیس کا باپ۔'' جوزف نے اسے بری طرح گھورا۔ ڈیوس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''پچھتا رہا ہوں تیرا باپ بن کر۔''

''اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔'' ڈیوس مسکرایا۔

''دفع ہو جا۔'' جوزف چلایا۔

''کائیکو اتنا چلاتے ہو جوزف۔'' ٹریزا نے مداخلت کی۔

''سر پکڑ کر روئے گی تو۔'' جوزف نے ٹریزا پر آنکھیں نکالیں۔ ''پڑی ہوگی کسی دن اس کی لاش سڑک پر۔'' اس نے ڈیوس کی طرف انگلی اٹھائی۔

''خدا نہ کرے۔'' ٹریزا نے ہول کر کلیجا تھام لیا۔

''ڈیوڈ کو تو جانتی ہے نا تو...... کیسا خبیث آدمی ہے...... ساری سسرال کو انگلی کا ناچ نچا رکھا ہے اس نے۔''

''اب وہ خود ناچے گا ڈیڈی۔''

''دیکھتا ہوں...... وہ ناچے گا یا تجھے نچائے گا۔''

''ارے ڈیڈ! ڈیوس کو نچانے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔'' ڈیوس نے اپنا ہاتھ نچایا۔

''بکواس مت کر...... شیخی خورا۔''

''یار! آپ کی لڑکی کو نکال کر لے آیا پھر بھی آپ مجھے شیخی خورا بولتے ہو۔''

''میری لڑکی کیوں ہوتی، جن کی ہے..... ان کی ہے۔''
''ایسا تو مت بولو یار..... آپ کی ہونے والی بہو ہے وہ۔''
''ہرگز نہیں..... دوسروں کے لیے میں اپنے بیٹے فرانسس کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔''
''مگر فرانسس تو ممی سے فون پر بول رہا تھا اس نے ماریہ کے لیے جیولری کپڑے سب خرید لیے ہیں۔''
جوزف نے بیوی کو دیکھا جیسے کہتا ہو یہ بات تو نے مجھے کیوں نہیں بتائی پھر ڈیوس کی طرف دیکھ کر گرجا۔ ''میں اسے منع کر دوں گا، تیری ماں بے وقوف تھی جو بیٹا کو زبان دے بیٹھی۔''
''وعدہ تو نبھانا چاہیے نا ڈیڈ۔''
ٹریزا ڈیوس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''تیرے ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیوس..... تجھے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ ڈیوڈ تو اپنے سسرال والوں کو چھوڑ کر ہم سے دشمنی باندھ لے گا۔''
''ڈرتی کیوں ہو ممی..... بہادروں کی طرح جینا چاہیے۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔''
''تو کافی ہے نا بہادری دکھانے کے لیے۔'' جوزف غرایا۔
''کوشش کر رہا ہوں۔''
''مرے گا۔''
''خدا نہ کرے۔'' ٹریزا نے پھر کہا۔
''ارے ڈیڈی! تم سے اچھا تو میرا دوست سلمان ہے جو مجھے مورل سپورٹ بھی دیتا ہے..... ہر جگہ میرے ساتھ بھی کھڑا ہوتا ہے۔''
''آئے وہ اب..... خبر لیتا ہوں اس کی بھی۔''
''ارے رے رے اس کو کچھ مت بولنا۔''
''کیوں! کیوں نہ بولوں کچھ..... ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا..... تیری اس سے دوستی کیوں ہے۔''
''اچھا لڑکا ہے ڈیڈی۔''
''کوئی اپنا نہیں ملا تجھے دوستی کرنے کے لیے۔''
جوزف نے ہاتھ نچایا۔
''اپنوں سے بڑھ کر ہے وہ۔''
''مسلمان ہے۔''
''تو کیا ہوا۔''
''تو کیا ہوا۔'' جوزف نے اس کی پھر نقل اتاری۔
''دیکھتا نہیں کیا ایک مسلمان ہی تو ہے جس نے سارے خاندان کو عذاب سے دوچار کر رکھا ہے۔ بیٹا بے چاری کو اذیت دے دے کر مار ڈالا اس نے۔''
''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ڈیڈی۔''
''ارے کھاتے وقت سب برابر ہو جاتی ہیں۔''
''بات پتے کی کرتے ہو یار۔'' ڈیوس نے شوخی سے گردن اور آنکھیں مٹکائیں۔
''اپنے ڈیڈی کی بات سمجھنے کی کوشش کر بیٹا۔'' ٹریزا نے کہا۔
''میں سب سمجھتا ہوں ممی۔''
''خاک سمجھتا ہے۔'' جوزف نے غصے سے کہا۔
ڈیوس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بجنے والے تھے سلمان کو آنا تھا۔
''پھر ملتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے باپ کو دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔
جوزف اور ٹریزا کی نگاہیں باہم ملیں۔
''اچھا نہیں کیا اس نے۔'' جوزف بولا۔
ٹریزا اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ڈیوس کوئی نہ کوئی پرابلم کھڑی کیے رکھتا تھا، اس کے اور جوزف کے لیے بھی کرکٹ گراؤنڈ میں کسی کے سر پر بلا مار کر آ جاتا، کبھی کسی منافع خور پھیری والے کی چھابڑی سرِ راہ الٹ کر گھر کے دروازے پر فریادرس کو لاکھڑا کرتا۔ کبھی کسی لڑکی کو چھیڑتے دیکھ کر کسی آوارہ نوجوان کی ٹھکائی لگا آتا اور اب..... یہ نئی افتاد! خدا جانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے جا رہا تھا۔
☆☆☆
ماریہ کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ داؤد بھی جو دادفریاد کے لیے عدالت پہنچا ہوا تھا۔ ڈیوس کو سلمان کے ہمراہ عدالت میں موجود دیکھ کر پہلے چونکا پھر معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔
''دیکھوں گا تجھے۔'' اس نے غرا کر کہا۔
ڈیوس مسکرا دیا۔ ''ارے انکل جتنا دیکھنا ہے آج ہی دیکھ لو پھر موقع ملے نہ ملے۔''
''یو.....'' داؤد نے دانت کچکچائے۔
''بولو بولو..... رک کیوں گئے۔''
''پہلے ذرا ماریہ سے نمٹ لوں پھر تجھ سے بھی نمٹوں گا۔''
مقدمہ شروع ہوا۔ داؤد خم ٹھونک کر مقابلے کے لیے آ گیا۔ ماریہ کو دوبارہ گھر واپس لانا اس کے لیے عزت اور موت زندگی کا سوال بن گیا۔ لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنے کے لیے اس نے من گھڑت قصے تراشنا شروع کر دیے۔ خود

کو معصوم اور مظلوم بنا کر پیش کیا۔ عدالت میں اپنی طرف سے اس نے ایک ایسے وکیل کو کھڑا کیا جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ شاذ ہی کوئی مقدمہ ہارتا تھا۔ داؤد نے اپنے رشتے داروں سے بھی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہر تدبیر کا نتیجہ اس کی توقع کے برعکس نکلا۔ لوگ اس کے من گھڑت قصوں پر دبے دبے مسکراتے۔ دفتر کے ساتھی اٹھتے بیٹھتے پھبتیاں کستے۔ بہ ظاہر ہمدردی کا اظہار کرنے والوں کی گفتگو کا ابتدائیہ بھی کچھ اس طرح ہوتا۔ ''داؤد صاحب ہم آپ سے کہتے تھے نا......'' یا کچھ اس طرح ''غلطی آپ کی ہے داؤد صاحب......'' یا پھر ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں......آپ کی کہانی کا انجام یہی ہونا تھا داؤد صاحب۔''

وکیل منہ مانگی فیس لینے کے باوجود مقدمہ جیتنے کی کوئی ضمانت نہ دیتا۔ ''کوشش پوری ہے داؤد صاحب لیکن...... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے......اللہ سے دعا کریں۔''

داؤد کی بدقسمتی کہ عدالت میں کرسی منصفی پر بھی وہ منصف بیٹھا جس کی دیانت اور بے تعصبی کی شہرت عام تھی۔

رہے رشتے دار تو ترک مذہب کے بعد داؤد ان کے نزدیک اچھوت بن چکا تھا۔ محلے دار اسے عجیب نظروں سے دیکھتے۔ جنہیں نہیں بھی معلوم تھا ان پر بھی اس کی اصلیت کھل گئی تھی۔ داؤد راندۂ درگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک اللہ کا در چھوڑ کر وہ دربدر بھٹکتا پھر رہا تھا، کوئی کندھا ایسا نہ مل رہا تھا جس پر سر رکھ کر وہ ندامت کے آنسو بہا سکتا۔

ماریہ کے ساتھ ڈیوس تھا اور ڈیوس کا مددگار سلمان۔ داؤد کے خوف سے ماریہ کے نانا اور ماموں تو میدان میں نہ کودے تاہم ڈیوس سے ان کا درپردہ مسلسل رابطہ رہا۔ ڈیوس نے اپنے گھر والوں بالخصوص باپ کی ہزار مخالفت کے باوجود پسپائی اختیار نہ کی۔ مقدمے کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے وہ ان دنوں ٹیکسی بھی چلا رہا تھا۔ ٹیکسی چلانے سے اسے آمدورفت میں بھی آسانی ہوگئی، پیسے بھی ملنے لگے۔ ٹیکسی چلانے میں نائن ٹو فائیو جاب کی سی پابندی بھی نہ تھی اور رات کو بالخصوص اچھی کمائی ہوجاتی، دن میں وہ کہیں بھی آنے جانے کے لیے آزاد ہوتا۔ ماریہ سے ملنے کے لیے دارالامان جانا بھی اس کی اہم ترین اور دل خوش کن مصروفیت بن گئی تھی۔ ماریہ سے ملنے کے لیے جانا اور وہ بھی اس کی ضرورت یا پسند کی کوئی چیز لے کر......اس کا مزہ اور نشہ ہی جدا تھا۔ عجیب گہما گہمی اور مقصدیت آگئی تھی اس کی زندگی میں جس نے اسے اپنے گھر والوں کی مزاحمت اور مخالفت سے بھی بے نیاز کردیا تھا۔

☆☆☆

دارالامان میں ماریہ شروع شروع میں تو بہت پریشان رہی۔ اس ادارے کا ماحول گھر کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ ماریہ کو فلپ اور لوئیس بہت یاد آئے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی تو ان کی یاد آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں اتر آتی۔

دارالامان میں مقیم عورتوں اور لڑکیوں کی اکثریت دکھی، استحصال زدہ اور معاشرے کی ستائی ہوئی تھی۔ البتہ بعض ایسی بھی تھیں جو اپنے اطوار سے خود غلط نظر آتی تھیں۔ ماریہ کی طرح ان سب کے مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت تھے۔ ہر لڑکی، ہر عورت کی اپنی کہانی تھی۔ مل کر بیٹھتیں تو ایک دوسرے کو اپنا دکھ درد سناتیں۔ انہیں تعمیری سرگرمیوں میں مصروف رکھنے کے لیے انتظامیہ نے ان کے لیے مختلف مصروفیات وضع کر رکھی تھیں۔ انتظامیہ انہیں خام اشیائے خوردونوش فراہم کردیتی۔ دارالامان میں مقیم عورتیں اور لڑکیاں باہم مل جل کر کھانا پکاتیں، کمروں کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتیں اور ان کاموں سے فراغت کے بعد مختلف مشاغل میں مصروف ہوجاتیں۔ بعض سلائی مشینوں پر سلائی کرتیں، بعض کڑھائی اور بُنائی کے کاموں میں لگ جاتیں۔ بعض دوسری دستکاریوں میں۔ دل بہلانے کو لوڈو اور کیرم جیسے ان ڈور گیمز بھی کھیلے جاتے، ریڈیو، ٹی وی سے نشر ہونے والے پروگرام بھی دیکھے اور سنے جاتے، ایک دوسرے کو پڑھایا بھی جاتا۔

دارالامان میں مقیم عورتوں اور لڑکیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے ادارے کا ایک اسٹاف تھا۔ میڈم نگہت آرزو ادارے کی نگرانِ اعلیٰ نہایت نفیس خاتون تھیں۔ دراز قامت، خوب صورت، خوش لباس، نرم مزاج، ہمدرد طبیعت اور شعائرِ اسلامی کی پابند۔ ان کی شخصیت میں وہ وقار تھا جو کم کم خواتین ہی میں دیکھنے میں آتا تھا۔ ان کی متانت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے لباس میں بے حجابی کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھنے کو نہ ملتی۔ بڑا سا دوپٹا ہمہ وقت ان کے سر پر رہتا۔ ان کی چال میں وقار تھا، اٹھنے بیٹھنے میں سلیقہ اور گفتگو میں تہذیب۔ وہ نہایت فعال تھیں۔ دارالامان کے گوشے گوشے پر ان کے قدموں کی چھاپ رہتی۔ صفائی ستھرائی دیکھنے کے لیے وہ بنفسِ نفیس ایک ایک کمرا جھانکتیں۔ غسل خانوں کا جائزہ لیتیں، کچن کو بہ نظرِ غور دیکھتیں۔ ان کا راؤنڈ شروع ہوتے ہی لڑکیاں اور عورتیں احتیاط کی تصویر بن

جاتیں۔ ہنسی دھیمی پڑ جاتی۔ قہقہے رک جاتے، دوپٹے سروں پر اوڑھ لیے جاتے۔ یہ میڈم آرزو کا خوف نہیں احترام تھا۔

میڈم بہت دھیمے لہجے میں بات کرتیں۔ شاذ ہی کسی کو ڈانٹتیں ڈپٹتیں، بدکلامی تو جیسے انہیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ خود کم بولتیں، دوسروں کو زیادہ سنتیں۔ راؤنڈ پر نکلتیں تو ہر لڑکی، ہر عورت سے اس کا حال چال ضرور پوچھتیں۔ انہیں ادارے میں مقیم تمام خواتین کے مسائل و معاملات کا بخوبی علم رہتا۔ ان سے مخاطب ہوتیں تو نہایت مشفق اور ہمدردانہ لہجے میں...... کوئی بات سمجھانی ہوتی تو دل سوزی سے سمجھاتیں۔ ''عورت کو ہمیشہ، ہر حال میں وقار کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' یہ بات وہ اکثر دہراتیں۔

اپنے ماتحتوں کے ساتھ میڈم نگہت کا رویہ بہت مشفقانہ ہوتا۔ کسی سے کوئی شکایت ہوتی تو دوسروں کے سامنے شرمندہ یا ذلیل کرنے کے بجائے اسے دفتر میں بلا کر سمجھاتیں۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہنے کی حتی الوسع کوشش کرتیں۔ ان کے ماتحت ان سے خوش رہتے۔ ان کا احترام کرتے، ان کی نظر کا اشارہ سمجھتے اور بہت کم انہیں شکایت کا موقع دیتے۔

میڈم نگہت آرزو خدا کا خوف رکھنے والی خاتون تھیں۔ پنج وقتہ نماز کی پابندی کرتیں۔ کبھی کسی باعث نماز کی ادائیگی میں دیر ہونے لگتی تو سہم کر کہتیں۔ ''آج اللہ تعالیٰ کے دربار میں لیٹ لگ جائے گی۔'' گناہ، ثواب کا تصور ان کے ذہن میں نہایت واضح اور گہرا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی نگرانی میں رہنے والی خواتین سے کہتیں۔ ''میں اپنی مرحومہ والدہ کو دعا دیتی ہوں کہ انہوں نے ہم بہن بھائیوں کو بچپن ہی سے مذہب کی طرف راغب رکھا۔ خدائے واحد پر پختہ یقین کو میں اپنے رب کی عطا، نبی کریم ﷺ کا احسان اور اپنی ماں کی مہربانی سمجھتی ہوں...... ماں انسان کی پہلی معلم بلکہ درس گاہ ہوتی ہے۔''

میڈم نگہت اپنی نجی زندگی میں بڑی مطمئن عورت تھیں۔ شوہر انجینئر تھے، تین بچے ایک بیٹی ڈاکٹر، دوسری انجینئر اور اکلوتا بیٹا بھی انجینئر' بڑی بیٹی کی شادی کر چکی تھیں۔ دو بچے ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ باون سالہ میڈم نگہت دیکھنے میں چالیس بیالیس سال کی نظر آتیں۔

اپنی متعلقہ وزارت میں بھی میڈم نگہت کو احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ ان کی دیانت داری اور امانت داری کی مثالیں دی جاتیں۔ ادارے کو ملنے والے تمام وسائل اگرچہ ان کے اختیار اور صوابدید پر ہوتے لیکن وہ کبھی ایک تنکے کی خیانت بھی نہ ہونے دیتیں، بلکہ اکثر اپنی جیب ہی سے ضرورت مند لڑکیوں اور عورتوں کی چپکے سے اعانت کر دیتیں۔ ان کی نگرانی میں رہنے والی سر پھری اور طرار قسم کی عورتیں بھی ان کے سامنے سر جھکا کر رہتیں۔ میڈم آرزو نہایت عجز سے کہتیں۔ ''یہ سب میرے آقا کا کرم ہے۔''

دارالامان آنے کے بعد ماریہ شروع کے دنوں میں انتہائی خائف رہی۔ اسٹاف سارا کا سارا مسلمان تھا۔ ادارے میں پناہ گزیں خواتین کی اکثریت بھی مسلمان تھی۔ اس سمیت تین خواتین کرسچن تھیں۔ پروین جو ظالم اور بدکماؤ شوہر کی ستائی ہوئی تھی۔ ایلزبتھ جسے اس کا بدکردار باپ جسم فروشی پر مجبور کرتا تھا۔ ایک نو مسلم لڑکی عائشہ تھی جس نے ایک مسلمان نوجوان سے شادی کرنے کے لیے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے خاندان والے اس کی اور اس کے مسلمان شوہر کی جان کے درپے تھے۔ ان کے خوف سے وہ عدالت کے ذریعے دارالامان میں پناہ لیے ہوئے تھی۔ شوہر اپنی جان کے خوف سے ادھر ادھر چھپتا پھرتا تھا تاہم اس سے رابطے میں رہتا۔

ماریہ کا خیال تھا ادارے کے مسلمان افراد اس سے متعصبانہ رویہ روا رکھیں گے۔ میڈم نگہت سے اسے بالخصوص بہت خوف محسوس ہوتا کہ کہیں اپنی دینی حمیت کی پاسداری میں وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس کے باپ کو اس تک رسائی نہ دے دیں۔ دن میں وہ میڈم کی نظروں سے چھپتی پھرتی، رات کو اس کی نیند اچاٹ رہتی، موہوم سی آہٹ پر چونک جاتی۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کا یہ خوف میڈم نگہت، ان کے ماتحت عملے اور دارالامان میں پناہ گزیں خواتین کے دوستانہ اور ہمدردانہ رویے کے باعث ختم ہوتا چلا گیا۔ نو مسلم لڑکی عائشہ سے جس کا سابقہ ہندووانہ نام لیلاوتی تھا جلد ہی اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ عائشہ بی اے پاس تھی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ اس کا شوہر عبداللہ ایک دیندار مسلمان گھرانے کا فرد تھا۔

میڈم نگہت نے ادارے میں مقیم خواتین کو ان کے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ماریہ کی طرح ایلزبتھ بھی کیتھولک کرسچن تھی جبکہ پروین ڈیفل میتھوڈسٹ فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔ پروین باقاعدگی سے اپنے مذہبی فرائض ادا کرتی جبکہ ایلزبتھ کبھی کبھار۔ ماریہ بین بین تھی۔

نو مسلم عائشہ نے ماریہ کو اپنی بپتا سناتے ہوئے بتایا

تھا کہ وہ ایک خوشحال کاروباری ہندو گھرانے کی لڑکی تھی۔ پڑوس میں مقیم مسلمان گھرانے کے ایک نوجوان سے اسے محبت ہوگئی۔ نوجوان کی شرط یہ تھی کہ اس کے خاندان میں شامل ہونے کے لیے اسے اسلام قبول کرنا ہوگا۔ لیلاوتی نے اپنے گھر والوں سے چھپتے چھپاتے اسلام قبول کرلیا اور دونوں کا نکاح ہوگیا۔ لیلاوتی جس کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا تھا کے گھر والوں نے اس کے سسرالی گھرانے پر چڑھائی کردی۔ سوئے اتفاق اس وقت اس کا شوہر گھر سے باہر تھا۔ گھر والے عائشہ کو زبردستی اپنے ساتھ کھینچ کر لے گئے۔ عائشہ کے سسرال والوں نے اس کے گھر والوں کے خلاف علاقے کے تھانے میں رپورٹ درج کرادی۔ پولیس نے عائشہ کو بازیاب کرایا اور عدالت میں پیش کردیا۔ اس نے عدالت میں اپنے گھر والوں کے خلاف بیان دیا اور ریاست سے اپنے اور اپنے شوہر کے تحفظ کی درخواست کی۔ عدالت نے اسے دارالامان بھجوادیا۔ مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت تھا۔ سسرال والوں نے اس کے والدین کی ہمسائیگی میں اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے علاقے میں رہائش اختیار کرلی تھی مگر اس کا شوہر اس کے باپ اور بھائیوں کی مسلسل دھمکیوں کے باعث اپنے گھر میں رہنے سے قاصر تھا۔ تاہم ہر سماعت پر عدالت میں حاضر ہوتا اور سماعت کے دوران چھپتا چھپاتا عدالت سے نکل جاتا۔ عائشہ سے فون پر رابطہ رکھتا اور کبھی کبھار ملنے بھی آجاتا۔ اس کی خواہش تھی کہ عائشہ ایک اچھی مسلمان بنے۔

اپنے شوہر کی ہدایت اور خواہش پر عائشہ نے دارالامان میں رہتے ہوئے قرآن مجید پڑھنا شروع کردیا تھا۔ بیگم جان نامی ایک خاتون جس کی عرفیت بیگم باجی تھی اپنے نشئی خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنی دو بچیوں کے ساتھ دارالامان میں مقیم تھی، عائشہ کو قرآن مجید کی تعلیم دیتی۔ بیگم باجی سے عربی زبان میں قرآن مجید کا سبق لینے کے بعد عائشہ اردو ترجمہ اور تفسیر خود پڑھتی۔ اس کے شوہر نے اسے متعدد جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کی تفسیر کا مکمل سیٹ بھی لاکر دیا تھا۔ اسلامی شعائر سے آگاہی کے لیے اس نے اسے چند مذہبی کتب بھی لاکر دی تھیں۔ عائشہ کا فارغ وقت زیادہ تر انہی کے مطالعے میں گزرتا۔ وہ باقاعدگی سے پانچ وقت نماز بھی ادا کرتی۔ رمضان کا مہینا آیا تو اس کا خشوع وخضوع دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عیدالفطر پر اس نے شوہر کی ہدایت کے مطابق سنت طریقے سے عید منائی۔

ماریہ نے جس سے عائشہ کی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی ایک روز بڑی رازداری سے پوچھا۔ ''تمہیں یہ سب عجیب نہیں لگتا؟''

''کیا؟'' عائشہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ماریہ کچھ ہچکچائی پھر بولی۔ ''ہر وقت یہ کتاب منہ سے لگائے رکھنا اور صبح سے رات تک پانچ مرتبہ مسلمان لڑکیوں کے ساتھ بے مقصد اٹھک بیٹھک کرنا۔''

''توبہ توبہ کیسی بات کررہی ہو ماریہ!'' عائشہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''یہ کتاب کسی انسان کی تصنیف نہیں، خدا کی نازل کردہ آخری الہامی کتاب ہے جس کے ذریعے خدا نے ہم انسانوں کو اپنی ہدایت اور راہنمائی مکمل کردی اور جسے تم اٹھک بیٹھک کہہ رہی ہو وہ مذہب اسلام کا ایک بنیادی ستون ہے۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو؟'' ماریہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟''

''تمہیں اپنی پسند کی شادی کے لیے اپنا مذہب تبدیل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ جذباتی فیصلہ ہے۔''

عائشہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''میں خوش ہوں ماریہ کہ مجھے ہدایت نصیب ہوئی۔''

''انسان کو ہمیشہ اس مذہب کے ساتھ رہنا چاہیے جس کے ساتھ وہ پیدا ہوا ہو...... آخر خدا کچھ سوچ سمجھ کر ہی تو پیدا کرتا ہوگا نا کسی انسان کو کسی مخصوص مذہب والے گھرانے میں۔''

''ایک بات کہوں برا مت ماننا۔'' عائشہ نے ماریہ کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہارے والد اسی مذہب پر رہنا چاہتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے انہیں پیدا کیا تھا تو تمہیں اعتراض کیوں؟''

ماریہ کو عائشہ سے اس قسم کی بات کی امید نہیں تھی شاید۔ وہ اس کا منہ دیکھنے لگی پھر ٹھنک کر بولی۔ ''میری ماں سے شادی کے لیے وہ کنورٹ جو ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنا پیدائشی مذہب ترک کردیا تھا۔''

''غلطی تو کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے ماریہ۔'' عائشہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

ماریہ مسکرائی۔ ''بہت چالاک ہو اپنی غلطی کو ہدایت نصیب ہونا کہتی ہو...... میرے باپ نے غلطی نہیں جرم کیا...... گناہ کیا...... میری ماں سے شادی کے لیے ڈھونگ رچایا۔''

''جرم اور گناہ دونوں کی معافی ہے...... جرم کتنا ہی گھناؤنا ہو جج اگر قائل ہوجائے کہ مجرم نے جرم ناگزیر حالات میں کیا تو وہ اسے معاف بھی کرسکتا ہے اور گناہ کتنا

ہی بڑا ہو خدا کی رحمت ہر گناہ سے بڑھ کر بیکراں ہے۔ خدا بندے کو معاف کرنے پر آئے تو شرک کے سوا اس کا ہر گناہ معاف کر دینے کی بشارت ہے۔''

''اپنا مذہب ترک کر دینے سے زیادہ گھناؤنی بھی کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟'' ماریہ نے جرح جاری رکھی۔

''لیکن اگر اپنی غلطی کا احساس ہونے پر تمہارے والد اپنے اصل دین کی طرف لوٹ گئے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے جبکہ وہ لوٹے بھی اس دین کی طرف ہیں جو بہترین دین ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' ماریہ نے ابرو چڑھائی۔

''مجھے ان کتابوں نے بتایا ہے۔'' عائشہ نے اپنے پلنگ کے سرہانے دھری دینی کتب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''ہر شخص اپنے دین کو اچھا کہتا ہے۔'' ماریہ نے طنز سے کہا۔

''لیکن اگر خدا کسی دین کے بارے میں بندوں سے کہے کہ آج ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔'' عائشہ نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولی۔ ''خدا نے یہ فضیلت صرف دین اسلام کو دی ہے۔''

''عجیب بات ہے۔'' ماریہ نے منہ بنایا۔

''کیا؟'' عائشہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم اس مذہب کی وکالت کر رہی ہو جسے قبول کیے تمہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور جو نہ تمہارے ماں باپ کا مذہب ہے نہ پیدائشی طور پر تمہارا۔''

''ہاں۔'' عائشہ مسکرائی۔ ''کیونکہ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہونے کے باوجود دین اسلام کی ابتدائی تعلیمات ہی نے بہت سی ایسی باتیں مجھ پر آشکار کر دی ہیں جن پر میں اسلام قبول کرنے سے قبل عمل کرتی تھی اور جو غلط تھیں۔''

''مثلاً؟'' ماریہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے نے میرے دل میں اس یقین کو جگہ دی کہ جو بے جان بت اپنی ناک پر سے مکھی اڑانے اور ابراہیم علیہ السلام کے ہتھوڑے سے اپنا بچاؤ کرنے پر قادر نہیں وہ عبادت کے لائق کیونکر ہو سکتے ہیں......''

''آگے کچھ مت بولنا عائشہ۔'' ماریہ نے نظر بگاڑ کر اسے ٹوکا۔

''تم غلط سمجھی ہو ماریہ...... میں خدانخواستہ کوئی بے ادبی نہیں کر رہی، یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اسلام میں شرک گناہ ہے۔ اللہ واحد ہے۔ اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ معبود ہے اور بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ کوئی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''لیکن ہم تو یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔

''دین اسلام اس کی نفی کرتا ہے ماریہ...... خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرانا شرک ہے اور شرک ایسا گناہ ہے جس کی معافی نہیں۔''

ماریہ نے عائشہ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا اور ناگواری سے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے ہم غلط ہیں؟''

''ناراض مت ہو ماریہ...... میں تو تمہیں اپنے دل کی بات بتا رہی ہوں، الحمدللہ جب سے دین اسلام قبول کیا ہے ایسا اطمینان اور سکون ہے دل میں کہ بیان نہیں کر سکتی...... یوں لگتا ہے جیسے پہلے اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ اسلام قبول کر کے روشنی میں آ گئی ہوں، دل بس اس بات پر ٹھہر سا گیا ہے کہ اللہ ہی اول ہے وہی آخر۔ جتنا سوچتی ہوں، غور کرتی ہوں اس کی بڑائی اور ہیبت دل پر چھائی جاتی ہے۔ میں اپنے گھر میں اپنی ماں سے سب سے زیادہ محبت کرتی تھی اور انہی کی ناراضگی کا سب سے زیادہ خوف بھی رہتا تھا کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے مجھ سے کہ ماں مجھ سے ناراض ہو جائے، محبت اور خوف کا یہ تعلق بھی عجیب ہے جس سے محبت ہوتی ہے اس کی ناراضگی کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ رات کو بستر پر لیٹتی ہوں تو یہی سوچتے سوچتے سو جاتی ہوں کہ جب یہ مان لیا کہ ہمارا خالق و مالک صرف اللہ ہے اور یہ کائنات صرف اسی کی ہے کوئی اس کی بادشاہی میں شریک نہیں تو دعا، امید، خوف، توکل اور اعتماد کا رشتہ صرف خدائے واحد کی ذات ہی سے ہونا چاہیے، کسی اور سے نہیں۔ اللہ ہی ساری مخلوق اور مخلوق کے تمام امور کا مالک و مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا جسے وہ دینا چاہتا ہے دیتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا اور جسے وہ نہ دینا چاہے کوئی دے نہیں سکتا۔ اپنے کسی بندے کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ بند کر لے تو اسے کوئی کھول نہیں سکتا اور جس کے لیے کھول دے کوئی بند نہیں کر سکتا۔ ایسی مالک و مختار ذات کے ساتھ کسی بے بس اور غیر مختار مخلوق کو شریک کیوں گردانا جائے...... یقین کرو ماریہ میری ساری امیدیں اب ایک اللہ ہی سے وابستہ ہو چکی ہیں۔ میں اسی سے لو لگائے رہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ خدا میری پریشانیاں ضرور دور کر دے گا۔''

''مانگتے تو ہم بھی اسی سے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔

''صرف ..... اسی سے مانگنا چاہیے۔'' عائشہ نے ''صرف'' پر بطور خاص زور دے کر کہا۔ ''کسی اور کو اس کی ذات میں شریک کیے بغیر۔''

اس رات جب ماریہ بستر پر لیٹی تو عائشہ کی باتوں کی بازگشت نے اسے گھیر لیا۔

☆☆☆

مقدمے کے دوران داؤد دن بہ دن تنہا سے تنہا ہوتا چلا گیا۔ ڈیوس کی مسلسل بھاگ دوڑ اور ادھر ادھر رابطوں کے باعث میڈیا نے اس کیس کو اتنی کوریج دی کہ وہ انگریزی محاورہ ''ٹاک آف دی ٹاؤن'' کی عملی تفسیر بن گیا۔ مقدمے کی ہر سماعت پر عدالت کے باہر ماریہ کی تصویر بنانے کے لیے فوٹوگرافروں کا ازدحام ہوتا۔ ''ماریہ داؤد کیس'' اخبارات کی گرم خبر بن گیا۔ مغربی ذرائع ابلاغ کو تو جیسے موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

عدالت میں داؤد کے اس موقف کے خلاف کہ وہ مسلمان تھا اور ہے ڈیوس چرچ سے دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ گواہوں کو عدالت میں لے آیا۔ پادری جس کے ہاتھوں اس نے مسیحیت قبول کی تھی نوے سال کا ہو چکا تھا، اس نے چرچ کا رجسٹر عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ داؤد رجسٹر میں درج کوائف سے منکر نہ ہو سکا۔ داؤد کو جائے فرار نہ رہی۔ ڈیوس اسے اپنا بدترین دشمن لگتا۔ وہ ماریہ کی پشت پناہی نہ کر رہا ہوتا تو ماریہ کی طرف سے مقدمے کی پیروی اتنے مدلل اور بھرپور انداز میں نہ ہو پاتی۔ ڈیوس تو نہ جانے کہاں کہاں سے اس کے خلاف گواہیاں اور ثبوت عدالت میں لے آیا تھا۔

مقدمے کی سماعت کے دوران ہی دو مغربی ممالک نے ماریہ کو اپنے ہاں پناہ دینے کی پیشکش کر دی۔

ڈیوس شکرگزار تھا سلمان کا جو اس کی دامے، درمے، سخنے ہر طرح مدد کر رہا تھا۔ کبھی وکیل سے ملنے کے لیے جانا ہوتا۔ کبھی ماریہ سے ملاقات کے لیے دارالامان کبھی ماریہ کے نانا، نانی اور ماموؤں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے نفسیاتی حربے استعمال کرنا ہوتے۔

''وہ پاگل آدمی ہے ڈیوس ..... کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' ماریہ کی نانی کہتی۔

''پاگل مت کہو ..... بدمعاش ہے بدمعاش ..... اور بدمعاش آدمی سے بچ کر رہنا ہی اچھا۔'' نانا جان فرماتے۔

''میرے کو تو اپنے بیوی بچوں کی فکر رہتی ہے۔ وہ بدمعاش انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔'' ماریہ کا بڑا ماموں جو اپنے والدین کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا بزدلی کا مظاہرہ کرتا۔

''ڈیوس! ماریہ کے کیس میں ہم لوگوں کو زیادہ انوالومت کرو۔ ڈیوڈ بڑا خطرناک آدمی ہے۔'' ممانی ارشاد فرماتیں۔

داؤد ان سب کے لیے ہوا بن گیا تھا یا شاید انہوں نے خود اسے ہوا بنا لیا تھا۔ ڈیوس ان کی باتیں سن کر، ان کی خودغرضی دیکھ کر دل ہی دل میں حیران ہوتا کہ یہ وہ لوگ تھے جن سے ماریہ کا نہایت قریبی رشتہ تھا۔ ان سے بہتر تو سلمان تھا۔ کبھی کبھی ڈیوس کو سلمان سے شرمندگی سی ہونے لگتی۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی ہر معاملے میں مدد کر رہا تھا۔ جب کبھی اسے پیسوں کی تنگی ہوتی سلمان ہی اس کی مدد کرتا۔ جب اسے ماریہ سے ملنے کے لیے دارالامان جانا ہوتا وہ سلمان ہی کو بتا کر جاتا۔ وہ بات جو وہ ماریہ سے نہ کہہ سکا تھا اس نے سلمان ہی کو بتائی تھی۔ ''مجھے اس سے پیار ہو گیا ہے یار۔''

''کس سے؟'' سلمان چونکا۔

''ماریہ سے۔''

''مگر......''

''مگر کیا؟''

''تمہاری ممی نے تو ماریہ کی ممی کو فرانسس کے لیے زبان دے رکھی ہے۔''

''زبان دی تھی مگر اب ممی کا ارادہ بھی بدل گیا ہے اور ڈیڈی نے فرانسس کو بھی اس قصے میں نہ پڑنے کا کہہ دیا ہے...... فرانسس کو تو تم جانتے ہو نا کیسا سیدھا سادہ ہے اس نے کہا او کے۔''

''تو راستہ صاف دیکھ کر تم نے لائن مار دی۔'' سلمان مسکرایا۔

ڈیوس جھینپ گیا۔ ''یہ بات نہیں...... بس وہ اچھی لگنے لگی ہے مجھے۔''

''اسے بتایا؟''

''نہیں یار۔''

''اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ وہ تو فرانسس ہی سے شادی کرے گی؟''

''نہیں کہے گی۔'' ڈیوس وثوق سے بولا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

''اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ جو میرے دل میں ہے وہی اس کے دل میں بھی ہے۔''

"واؤ!"

"ایک بات پوچھوں تم سے؟" ڈیوس نے ایک روز سلمان سے کہا۔

"پوچھو۔"

"سچ سچ بتانا۔"

"دوستوں سے جھوٹ بولنے والے دوست نہیں ہوتے۔"

"زبردست!" ڈیوس اچھلا پھر اس نے کہا۔ "تمہیں اپنے مذہب کے خلاف لڑی جانے والی اس عدالتی جنگ میں میرا ساتھ دینے پر کوفت نہیں ہوتی؟"

"یہ جنگ مذہب کے خلاف ہوتی تو تم مجھے اپنا دشمن پاتے ڈیوس مگر یہ جنگ مذہب کے خلاف نہیں ایک شخص کی بدعہدی کے خلاف ہے۔ ماریہ کے باپ نے پہلے ترک اسلام کر کے اللہ سے کیے ہوئے اس عہد کو توڑا کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں پھر ایک نیا عہد باندھا اور اب......" سلمان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی پھر کچھ توقف سے بولا۔ "کوفت مجھے اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک شخص کے انفرادی فعل نے تمہارے لوگوں کو اسلام کے ماننے والوں کے بارے میں کیسا کمزور اور ناقص تاثر دیا ہے۔ ایک مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی خاطر سر کٹا دے کسی چھوٹی یا بڑی دنیاوی غرض کے لیے ترکِ دین کسی مسلمان کا طریقہ نہیں۔"

"اگر عدالت نے ماریہ کے حق میں فیصلہ دیا تو......؟" ڈیوس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا؟"

"تمہاری اور میری دوستی برقرار رہے گی؟"

سلمان دھیرے سے مسکرایا۔ "اگر عدالت تمہاری کزن کے حق میں فیصلہ دیتی ہے تو یہ ایک مسلمان کی جیت ہوگی...... تمہیں فیصلہ دینے والے جج کی دیانت داری، بے تعصبی اور عظمت کو سلام کرنا ہوگا۔"

ڈیوس اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ کتنی گہری بات کی تھی اس نے!

☆☆☆

دارالامان میں پناہ گزین نومسلم عائشہ کا تاریکی سے روشنی کی طرف سفر تیزی سے جاری تھا، ہدایت کی روشنی...... اللہ تبارک وتعالیٰ جس بندے پر اپنا فضل وکرم کرنا چاہتا ہے اسے صراطِ مستقیم پر لگا دیتا ہے...... رب العزت اپنے بندوں میں سے جس کو راہِ راست دکھانا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے کہ یہی دینِ کامل ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

عائشہ پر رب کی رحمت ہوگئی تھی۔

عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا اور دارالامان میں ماریہ اور عائشہ کی دوستی دن بہ دن گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی تھی، ماریہ کی طرح عائشہ کا مقدمہ بھی عدالت میں زیرِ سماعت تھا، تاریخوں پر تاریخیں پڑ رہی تھیں۔ عائشہ کے گھر والے مقدمے کو طول دینے کے لیے تاخیری حربے آزما رہے تھے۔ عائشہ پنج وقتہ نماز کی پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز بھی پڑھنے لگی تھی۔ جب دارالامان میں مقیم دیگر خواتین گہری نیند میں ہوتیں وہ دبے پاؤں اٹھتی اور وضو کر کے اپنے رب کے حضور سربسجود ہو جاتی۔

ماریہ سے عائشہ کی دوستی اپنی جگہ لیکن جب مذہب کی بات چھڑ جاتی تو ماریہ دوستی کی مروت اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتی۔ ماریہ عیسائیت کو دنیا کا بہترین مذہب قرار دینے پر تل جاتی۔ عائشہ جو دین اسلام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماریہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات گنواتی، عائشہ رسولِ عربی محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر روشنی ڈالتی۔ ایک حیاتِ کامل تھی جس کا کوئی پہلو تشنہ نہ تھا۔ ہر رخ مکمل، ہر ادا بھرپور، اک شجرِ سایہ دار تھا جو اپنے سائے میں بیٹھنے والے ہر شخص کو... بلاتفریق اپنی چھایا سے فیض یاب ہونے کا موقع دیتا تھا۔ جو اس چھایا میں بیٹھ کر اٹھتا نہال ہو جاتا۔ حیاتِ بندگان کا کون سا پہلو تھا جو اس شمعِ فروزاں سے روشنی نہ پا رہا تھا۔

سبحان اللہ! کیا ہستی تھی پیغمبر ﷺ اسلام کی...... پوری زندگی ایک معجزہ...... دشمن سے لڑی جانے والی ایک جنگ کسی بھی معاشرے کے اعصاب چٹخا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے، برسوں حواس بحال نہیں ہو پاتے...... مدتیں لگ جاتی ہیں جنگ سے لگے گھاؤ بھرنے میں اور پیغمبر ﷺ اسلام کی ذات کا معجزہ یہ کہ غزوات پر غزوات...... کوئی اور دیا جل سکتا ہے اس چراغِ فروزاں کے سامنے:

کوئی اور مثال پیش کی جاسکتی ہے پوری انسانی تاریخ سے جو اس معیارِ سیرت پر پوری اترے۔

"یسوع مسیح کے بارے میں تمہارا اسلام کیا کہتا ہے؟" ایک روز ماریہ نے عائشہ سے پوچھا۔

"میرا اسلام!" ماریہ کو دیکھتے ہوئے عائشہ نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ الفاظ دہرائے جنہیں ادا کرتے ہوئے ماریہ کا لہجہ طنزیہ تھا پھر بولی۔ "یہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور پیغمبر ہیں۔ تمام پیغمبروں کی طرح انہوں نے بھی اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دی۔ لوگوں کو

حق کی تلقین کی، باطل سے روکا۔ خدا نے انہیں معجزات عطا فرمائے تھے۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے۔ مٹی کے پرندوں میں روح پھونک دیتے۔ مردوں کو زندہ کر دیتے۔ آسمان پر زندہ اٹھائے گئے، قیامت کے نزدیک دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور باطل قوتوں کے خلاف بندگانِ خدا کی راہبری فرمائیں گے۔''

''ارے واہ تم نے تو سبق اچھی طرح یاد کر رکھا ہے لیکن خداوند کا ایک اہم اعجاز بتانا تم بھول گئیں۔''

''وہ کیا؟''

''بن باپ کے پیدا کیے گئے۔''

''ہاں۔''

''کوئی دوسری مثال پوری انسانی تاریخ سے پیش کی جاسکتی ہے ایسی!'' ماریہ نے عائشہ کو لاجواب کر دینے والی نظروں سے دیکھا۔

''ان کی پیدائش بلاشبہ ایک معجزہ تھی۔'' عائشہ نے تحمل سے کہا۔

''اب بتاؤ......'' ماریہ نے اسے فاتحانہ انداز میں دیکھا۔

عائشہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''ماریہ...... اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بن باپ کے پیدا کر کے انسان کی تخلیق کی ہر جہت پر اپنی قدرت دکھانا تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے ماں اور باپ کے بغیر تخلیق فرمایا۔ حضرت حوا کو ماں کے بغیر مرد کی پسلی سے پیدا کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے بغیر صرف ماں کے وجود سے پیدا کر کے یہ ثابت کیا کہ رب اپنے بندے کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے تخلیق کے ہر طریقے پر قادر ہے۔''

ماریہ لاجواب ہو کر عائشہ کا منہ دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ڈیوس اس سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا۔ ملاقات کے کمرے سے اس کے جانے کے بعد ماریہ کمرے کی کھڑکی سے باہر اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک ڈیوس کی ٹیکسی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ دارالامان کی ایک خاتون اہلکار کی موجودگی میں ہونے والی اس ملاقات کے بعد وہ ملاقات کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ میڈم نگہت سامنے آگئیں۔

''کیسی ہو ماریہ؟''

''اچھی ہوں میم۔''

''ہاں اچھی تو خیر تم بہت ہو۔'' میڈم مسکراتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولیں۔ ''کزن سے ملاقات ہوگئی؟''

''یس میم۔''

''اچھا لڑکا ہے...... مجھے تمہارے لیے مخلص بھی دکھائی دیتا ہے۔''

ماریہ چپ رہی۔

''بہت ساتھ دے رہا ہے تمہارا۔''

''جی۔''

''کرسمس بھی آ رہا ہے...... کچھ تیاری کی تم نے؟''

''ڈیوس کپڑے اور جوتے وغیرہ ہی دینے آیا تھا میم۔''

''اچھا اچھا۔'' میڈم نگہت نے ان شاپنگ بیگز پر نظر ڈالی جو ماریہ اپنے ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔

''میں جاؤں میم؟''

''ایک بات سنتی جاؤ۔''

وہ ٹھٹک گئی۔

''جو ہمارا برے وقت میں ساتھ دے اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے...... تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟'' اپنے آخری فقرے پر میڈم نگہت معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

''آپ کا مطلب ہے ڈیوس؟''

''ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔

''ایک دانشور گزرا ہے خلیل جبران...... وہ کہتا ہے میں ان لوگوں کو بھول گیا جو میرے ساتھ کبھی ہنسے تھے لیکن میں نے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جنہوں نے میرے ساتھ آنسو بہائے۔''

اس کا دل دکھنے لگا۔ ڈیوس کے علاوہ کبھی کوئی نہیں ملنے آتا تھا اس سے، حالانکہ اس نے اپنے ملاقاتیوں میں اپنے نانا، نانی، ماموؤں اور خالہ کا نام بھی دے رکھا تھا۔ البتہ بھی کبھار ڈیوس کے ہاتھ چیزیں بھجوا دیتے تھے، جیسے آج بھی نانی نے اسے ایک ریڈی میڈ جوڑا اور خالہ نے ایک فیشن جیولری اور چوڑیاں بھجوائی تھیں۔ ڈیوس نے بتایا تھا کہ وہ اس کے باپ کے خوف سے اس سے ملاقات کے لیے آنے سے گریزاں رہتے تھے۔ ایسا بھی کیا خوف۔

''میم! میں نے ابھی پچھلے دنوں ایک ڈائجسٹ میں بہت پیاری کوٹیشن پڑھی۔''

''کیا؟'' میڈم نگہت ہمہ تن متوجہ ہوئیں۔

''میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور میرے برے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے۔''

''واہ! زبردست۔'' میڈم نگہت بے ساختہ پھڑک اٹھیں۔

☆☆☆

''کہاں جا رہا ہے؟'' جوزف کے سوال نے ڈیوس

کو رکنے پر مجبور کردیا۔
''کرسمس کا دن ہے یار..... آج تو پولیس والا مت بنو۔'' ڈیوس خوش دلی سے بولا۔
جوزف نے اسے کڑے تیوروں سے دیکھا۔ ''تیرے ساتھ ہر روز پولیس والا بننا میری مجبوری بن گئی ہے۔''
''اس مجبوری سے پیچھا چھڑاؤ..... او کے..... بائی۔''
''مجھے بتا کر جا۔''
''کیا؟''
''کہاں جارہا ہے؟''
''ماریہ کو کرسمس وش کرنے۔''
''مجھے معلوم تھا۔'' جوزف گرجا۔
''معلوم تھا تو پوچھا کیوں؟''
''کنفرم کرنا چاہتا تھا۔''
''او کے..... اب جاسکتا ہوں؟''
''مارا جائے گا کسی دن تو۔''
''یار! کچھ تو خوف کرو ڈیڈی..... آج تہوار کا دن ہے۔''
''اسی لیے ڈر رہا ہوں۔''
''کچھ نہیں ہوتا۔''
''کچھ نہیں ہوتا کے بچے..... اس کے باپ کو جانتا ہے نا تو۔''
''ہاں ہاں جانتا ہوں..... بہت اچھی طرح۔''
''ہمارا اس لڑکی سے اب مطلب کیا ہے..... میں نے تیری ماں کو بھی سختی سے منع کر دیا ہے اور فرانسس کو بھی سمجھا دیا ہے۔''
''لیکن مجھے آپ نہیں سمجھا سکتے..... میں کروں گا ماریہ سے شادی۔''
''کیا! کیا کہا تو نے؟'' جوزف اتنی زور سے دہاڑا کہ ٹریزا گھبرا کر کچن سے نکل آئی اور ان دونوں کے سامنے سوال بنی آکھڑی ہوئی۔
''کیا ہوا؟'' اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔
''اس سے پوچھ۔'' جوزف نے ڈیوس کی طرف انگلی اٹھائی۔
ٹریزا نے ڈیوس کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ چپ رہا۔
''تم ہی بتا دو نا۔'' وہ جوزف سے بولی۔
''یہ..... یہ بدمعاش بولتا ہے..... ماریہ سے شادی کرے گا۔'' جوزف نے ڈیوس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔
ٹریزا نے سٹپٹا کر ڈیوس کو دیکھا۔

''اپنی جان تو یہ ہتھیلی پر لیے ہی پھرتا ہے..... ہمیں بھی داؤ پر لگانا چاہتا ہے..... اتنا سب کچھ ہوجانے کے بعد وہ لڑکی بھڑ کا چھتا بن گئی ہے جو ہاتھ ڈالے گا کاٹا جائے گا۔''
''ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں ڈیوس..... اسی لیے میں نے فرانسس سے اس کی شادی کا خیال چھوڑ دیا۔''
''مگر میں فیصلہ کرچکا ہوں۔''
''جا..... جا کے کر..... اور پھر مزہ چکھ اس کے باپ کے انتقام کا..... تجھ سے تو وہ پہلے ہی جلا بیٹھا ہے..... بھون کر رکھ دے گا تجھے وہ۔''
ڈیوس نے باپ کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور دروازے کا رخ کیا۔
''ڈیوی!'' ٹریزا اس کے پیچھے لپکی مگر وہ ان سنی کر کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے نکل گیا۔

☆☆☆

ماریہ، پروین اور ایلزبتھ تینوں کو ان کی ساتھیوں نے کرسمس کی مبارک باد کے ساتھ چھوٹے موٹے تحائف بھی دیے۔ تینوں نے مل کر کرسمس کی خصوصی عبادت کی۔ مناجات گائی۔ ساتھیوں نے آپس میں چندہ کر کے بازار سے کھانے پینے کا کچھ سامان منگوالیا تھا۔ میڈم نگہت نے اپنی اور اپنے اسٹاف کی طرف سے کیک منگوا دیا تھا۔ عام تعطیل ہونے کے باوجود میڈم اس روز تینوں لڑکیوں کو کرسمس کی مبارک باد دینے بطور خاص دارالامان آئیں، ڈیوس ان کی موجودگی ہی میں کرسمس کیک لے کر ماریہ کو کرسمس کی مبارک باد دینے پہنچا اور اس روز اس نے پہلی بار ماریہ سے کہا۔ ''آئی لو یو۔''
ماریہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ ''تم نہ ہوتے ڈیوس تو کون میرا اتنا خیال رکھتا۔''
''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''کون سی بات؟'' وہ حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔
''آئی لو یو۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔
''آئی لو یو ٹو ڈیوس۔'' ماریہ نے نظریں جھکا کر اعتراف کیا۔
ڈیوس کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ ادارے میں مقیم لڑکیوں نے کرسمس کی شام یوں ملے گلے میں گزاری جیسے وہ صرف ماریہ، پروین اور ایلزبتھ کا تہوار نہیں ان سبھی کا تھا۔

☆☆☆

مقدمے کی طوالت ماریہ کو بیزار کیے دے رہی تھی۔

عجیب نظام تھا۔ جن مقدمات کا فیصلہ چند ساعتوں میں ممکن تھا وہ برسوں چلتے رہتے ہیں۔ تاریخ پر تاریخ پڑے جاتی اور مختلف وجوہ کی بنا پر تاخیر ہوئے جاتی ہے۔ کبھی وکیل صاحب غیر حاضر ہوتے۔ کبھی جج صاحب چھٹی پر ہوتے۔ کبھی مدعا علیہ غائب تو کبھی وکلا الیکشن میں مصروف۔ کارروائی برائے نام ہوتی۔ ریڈر فٹافٹ اگلی تاریخ ڈال کر فائلوں کا پلندا دیکھتے ہی دیکھتے نیچے سرکا دیتا اور لیجیے چھٹی ہوئی۔

عائشہ جو دارالامان حاملہ آئی تھی جلد از جلد اپنے شوہر کے گھر جانے کی آرزومند مقدمے کے جلد فیصلہ کے لیے اٹھتے بیٹھتے دعا مانگتی۔

ماریہ اور عائشہ ایک ہال کمرے میں کئی دوسری خواتین کے ساتھ سوتی تھیں، رات کے آخری پہر عائشہ تہجد کے لیے دبے پاؤں اٹھتی اور فجر کی نماز ادا کرنے تک جائے نماز پر ہی رہتی۔

اس رات ماریہ کی کروٹ بدلنے کے دوران آنکھ کھلی تو عائشہ اپنے بستر پر نہ تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ عائشہ تہجد کے لیے رات کے آخری پہر بستر چھوڑ ہی دیا کرتی تھی مگر گھڑی تو اس وقت پونے دو کا عمل دکھا رہی تھی۔ آنکھ کھلنے پر ماریہ کو کمرے کے باہر کسی کے دھیمی آواز میں بولنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر وہ دم سادھے پڑی رہی پھر اٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک پہنچی، باہر جھانکا۔ راہداری میں مصلے پر عائشہ دوزانو بیٹھی اپنا چہرہ بلند کیے آپ ہی آپ دھیمی آواز میں بول رہی تھی...... مگر کس سے!

ماریہ نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ وہ مچلنے والے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''دیکھیں...... مجھے اپنے گھر جانا ہے...... عبداللہ اور ان کے گھر والے میری وجہ سے پریشانی میں آئے ہوئے ہیں...... ان کی پریشانی دور کردیجیے۔ میں بھی تو عبداللہ کے بنا خوش نہیں ہوں...... پلیز! مجھے عبداللہ کے ساتھ رہنا ہے، آپ سن رہے ہونا؟''

ماریہ حیران ہوتی عائشہ کے نزدیک پہنچی۔ عائشہ نے آہٹ سن کر گردن موڑی اور اس کی طرف دیکھا۔

''کس سے باتیں کررہی ہو عائشہ؟'' ماریہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''اللہ سے۔'' عائشہ نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔

ماریہ اس کی سادہ لوحی پر کسی مدبر کی طرح مسکرادی۔

اس کے بعد زیادہ نہیں دو پیشیوں بعد ہی عائشہ کے مقدمے کا فیصلہ ہوگیا۔ عدالت نے اسے اس کے مسلمان شوہر کے ساتھ جانے کی ڈگری جاری کردی تھی۔

عائشہ بے حد خوش تھی۔ دارالامان سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے وہ تمام دینی کتب جو اس کا شوہر اسے لاکر دیتا رہا تھا، ادارے میں ہی مسلمان خواتین کے پڑھنے کو چھوڑ دیں۔

''عبداللہ کہتے ہیں جو بھی پڑھے گا ثواب ہمیں بھی ملے گا۔'' عائشہ نے کہا۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔

دارالامان سے جاتے ہوئے اس نے ماریہ کو اپنے گھر کا پتا بھی دیا۔ ''جب یہاں سے چلی جاؤ تو مجھ سے ملنے ضرور آنا۔'' اس نے کہا۔

''پتا نہیں کب جاؤں گی اور جاؤں گی بھی کہ نہیں۔'' ماریہ اداس ہوکر بولی۔

''اللہ پر بھروسا رکھو...... وہی ہماری مشکلات آسان کرتا ہے۔''

عائشہ چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد ماریہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی۔ ویسی قربت جیسی اسے عائشہ سے محسوس ہوتی تھی، کسی دوسری لڑکی کے ساتھ پیدا ہی نہ ہو پائی۔

ایک روز اس نے عائشہ کی چھوڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک دیدہ زیب مجلد اور ضخیم کتاب کو اٹھایا اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر کی جلد چہارم تھی۔

خدا جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لگا دیتا ہے۔

چنگاری تھی جو ماریہ کے دل میں سلگی اور دیکھتے ہی دیکھتے شرر بن گئی۔

عائشہ کی چھوڑی ہوئی کتابیں ہدایت کا سامان تھیں۔ ماریہ انہیں پروین اور ایلزبتھ سے چھپ چھپ کر پڑھتی اور جتنا پڑھتی اتنا ہی اسیر ہوئی چلی جاتی تھی۔ خدا کا اپنے رسول ﷺ سے خطاب اور بندوں سے ہم کلامی...... کہیں پیار سے، کہیں ڈانٹ ڈپٹ کر...... اور بار بار متنبہ کرنا کہ راہِ راست پر نہ چلو گے تو عذاب بھگتنے کے لیے تیار ہوجاؤ...... راہِ راست پر چلو گے تو وہ دائمی نعمتیں پاؤ گے جن کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں۔

☆ مسلمانوں تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو نازل کیا گیا ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ پر اور اس کی اولاد پر اور جو دیا گیا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور جو دیا گیا نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ نہیں تفریق کرتے ہم ان کے درمیان اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں (البقرۃ۔136)

☆ وہی ہے وہ ذات جس نے بھیجا اپنا رسول ﷺ

ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کردے اسے تمام ادیان پر خواہ یہ بات کتنی ہی ناگوار ہو مشرکوں کو (التوبہ۔ 33)

☆ بنالیا ہے انہوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اپنا رب اللہ کے سوا اور مسیح ابن مریم کو بھی جبکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر صرف یہ کہ عبادت کریں الٰہ واحد کی کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اس کے پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ کرتے ہیں (التوبہ۔ 31)

☆ نہیں ہے حکومت کسی کی سوائے اللہ کے اس نے حکم دیا ہے کہ نہ بندگی کرو تم کسی کی سوائے اس کے یہی ہے طریق زندگی سیدھا اور صحیح مگر اکثر انسان جانتے نہیں (یوسف۔ 40)

☆ کہا تھا مسیح نے کہ اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی جو رب ہے میرا بھی اور رب ہے تمہارا بھی۔ بے شک جس نے شرک کیا اللہ کے ساتھ سو حرام کردی ہے اللہ نے اس پر جنت اور ٹھکانا ہے اس کا دوزخ اور نہیں ہوگا ظالموں کا کوئی مددگار (المائدہ۔ 72)

☆ اب کون ہے جو انحراف کرے گا ملت ابراہیمؑ سے بجز اس شخص کے جس نے مبتلا کرلیا ہو خود کو حماقت میں (البقرۃ۔ 130)

☆ بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے (آل عمران۔ 19)

☆ اور جو اختیار کرنا چاہے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا یہ اس سے اور وہ ہوگا آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے (آل عمران۔ 85)

☆ یہی ہے دین راست اور درست لیکن بہت سے انسان اس بات کو نہیں جانتے (الروم۔ 30)

☆ پس حقیقت یہ ہے کہ جس کے لیے ارادہ کرتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس کے لیے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کو تو کر دیتا ہے اس کے سینے کو تنگ (الانعام۔ 125)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہا کرتی تھیں اللہ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور روکنا چاہے تو کوئی دے نہیں سکتا۔ وہی اول وہی آخر...... وہی واحد وہی یکتا...... وہی خالق وہی مالک...... نہ وہ کسی کا باپ نہ کوئی اس کا بیٹا...... وہ جسے چاہے تاریکی سے روشنی میں لے آئے۔

☆☆☆

بالآخر مقدمے کا فیصلہ ہوگیا۔ عدالت نے تمام حالات و واقعات، ثبوتوں اور شہادتوں کی روشنی میں ماریہ کے حق میں ڈگری جاری کردی۔ وہ بالغ تھی، عاقل تھی، خود مختار تھی۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ آپ کرنے کی مجاز تھی۔

داؤد نظریں نیچی کیے شرمندہ، دل شکستہ اور ٹوٹے قدموں کے ساتھ عدالت سے نکلا۔

ڈیوس بہت خوش تھا۔ سلمان اس کے ساتھ تھا۔

اب ماریہ کو دارالامان سے کہیں اور منتقل کرنے کا مرحلہ تھا۔

''نہیں بابا ہم ماریہ کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔'' ماریہ کی ممانی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ڈیوڈ تو ہمارے گھر کو آگ لگا دے گا۔''

ماریہ کے نانا اور نانی اپنی بہو کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ رکھتے تھے۔

ڈیوس نے اپنے گھر میں ماریہ کو لانے کی بات کی۔

''تیرا دماغ خراب ہوا ہے کیا۔'' جوزف بگڑ کر بولا۔

''کیوں ڈیڈی کیا حرج ہے۔''

''حرج کے بچے! ماریہ گھر سے بھاگی...... باپ کے خلاف تھانہ، کچہری گئی اتنے دن دارالامان میں رہی...... عدالت میں باپ اس کا مجرم بنا کھڑا رہا۔ میڈیا میں ڈیوڈ کی اچھی بھلی رسوائی ہوئی...... وہ چھوڑے گا کسی کو...... مجھے تو ڈر ہے کسی دن ہم سب کو ہی نہ بھون ڈالے...... انتقام میں آدمی پاگل ہوجاتا ہے...... کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''تمہارے ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیوس...... میں نے تو اسی لیے اپنے گھر میں اس لڑکی کو شادی کر کے لانے کا خیال ترک کردیا...... تم بھی جو کرسکتے تھے تم نے اپنا فرض سمجھ کر کردیا حالانکہ یہ پینا کے گھر والوں کا کام تھا، اب تم ماریہ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ۔''

''آپ لوگ پاگل ہو یار۔'' ڈیوس بولا۔

''پاگل تو ہے۔'' جوزف بھڑکا۔

''پتا چل جائے گا تجھے کہ پاگل ہم تھے یا تو۔''

ڈیوس ماں کی طرف مڑا اور کامل سنجیدگی سے بولا۔

''ممی! آئی لو ماریہ اور اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔''

''اخبار میں بڑا بڑا سا اشتہار چھپوادوں گا میں کہ اپنے ناخلف بیٹے ڈیوس سے میرا اور میرے بال بچوں کا کوئی تعلق نہیں...... وہ اپنے ہر فعل کا خود ذمے دار ہے۔''

ڈیوس طنز سے ہنسا اور کٹیلے لہجے میں بولا۔ ''تاکہ ڈیوڈ سے امان میں آجاؤ تم اور تمہارے بال بچے۔''

''ہاں تو غلط ہے کیا؟''

ڈیوس نے باپ کو کڑی نگاہوں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''خدا سے ڈرو۔'' پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا منظر سے نکل گیا۔

☆☆☆

ڈیوس کو پریشان دیکھ کر سلمان نے ماریہ کو اپنے ہاں رکھنے کی پیشکش کی۔

''نہیں یار اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں؟''

''ایک تو تمہارا گھر چھوٹا ہے...... تم لوگوں کا اپنا گزارہ مشکل ہے...... دوسرے میں نہیں چاہتا کہ تم اور تمہارے گھر والے کسی پریشانی میں پڑیں، ماریہ کے باپ کا مجھے پتا ہے آرام سے نہیں بیٹھے گا۔''

''دیکھ لیں گے یار...... جو ہوگا دیکھا جائے گا...... رہی گھر چھوٹا ہونے کی بات تو گھر کے سامنے ہی مسجد ہے۔ میں ویسے بھی دھندے کے بعد رات کو دیر ہی سے گھر آتا ہوں مسجد میں سو جایا کروں گا۔''

''نہیں نہیں سلمان یہ نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''تمہارے پہلے ہی مجھ پر کچھ کم احسانات ہیں کیا...... ماریہ کے کیس کے دوران تم نے جس طرح میرا ساتھ دیا ہے میں اس کا بدلہ کبھی نہیں اتار سکتا۔''

''بس بس آگے کچھ نہیں۔'' سلمان نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''ماریہ بھابی ہمارے گھر میں رہیں گی۔''

''بھابی!'' ڈیوس چونکا۔

''تمہارے ناتے میری تو بھابی ہی ہوں گی نا۔'' سلمان مسکرایا۔

''یو آر گریٹ!'' ڈیوس نے سلمان کو بے ساختہ اپنے گلے لگالیا۔

☆☆☆

ماریہ، سلمان کے گھر میں رہنے کا سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ اسے عائشہ کا خیال آیا جو دارالامان سے نکل کر اپنے گھر جانے کے تصور سے اتنی مسرور تھی کہ اس کے چہرے کی کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ اس کی باڈی لینگویج ہی تبدیل ہوگئی تھی۔

''ڈیوس!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں دربدر نہیں رہنا چاہتی۔''

''بس کچھ دنوں کی بات ہوگی ماریہ...... شادی کے بعد ہم کرائے پر مکان لے لیں گے۔''

''ڈیوس!'' ماریہ نے سر جھکا کر کہا۔ ''یہ عرصہ جو میں نے گھر سے نکلنے کے بعد گزارا میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی...... یہ میرا برا وقت تھا۔ اس وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے...... میری نانو اور ان کے گھر والوں کو اپنا بچاؤ عزیز رہا، میرا نہیں...... تمہارے گھر والے اپنے تحفظ کی خاطر میری مرحومہ ماں سے کیے گئے وعدے سے پھر گئے۔''

''مگر میں تو ہوں ماریہ۔'' ڈیوس نے جلدی سے کہا۔

''ہاں تم ہی ہو۔'' ماریہ بولی پھر اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ''اپنے برے وقت میں مجھے بہت سے اچھے لوگ نہ ملے ہوتے تو شاید میں اس بحران سے نکل ہی نہ پاتی۔''

''مثلاً کون لوگ؟''

''سب سے پہلے تو تم، پھر سلمان بھائی...... پولیس اسٹیشن کا ایس ایچ او...... میڈم نگہت، عائشہ اور دوسری لڑکیاں...... جو کرسمس میں نے ان کے ساتھ منایا وہ ہمیشہ میری یادوں میں رہے گا۔ فلپ، لوئیس اور اپنا گھر مجھے اس دن ٹوٹ کر یاد آرہے تھے مگر یہاں سب نے اتنی اپنایت دکھائی کہ بیان سے باہر...... اور ہاں ایک بہت اہم شخصیت عدالت کا جج جس نے کسی بھی موقع پر انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' ڈیوس نے تائید کی۔

''اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب مسلمان تھے۔''

ڈیوس نے چونک کر ماریہ کو دیکھا پھر بولا۔ ''اگر تم مسلمان کے گھر میں نہیں رہنا چاہتیں تو ایک آپشن اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''ہماری شادی ہونے تک تم چرچ میں رہ سکتی ہو...... میں پادری سے بات کرلوں گا۔''

ماریہ نے نظریں چرالیں۔

''ٹھیک ہے نا؟'' ڈیوس نے اس کی رضامندی چاہی۔

''نہیں ڈیوس۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیوں؟''

''ناراض مت ہونا...... اور نہ ہی اسے میری احسان فراموشی سمجھنا......'' ڈیوس کو اس کے لہجے میں پراسراریت سی محسوس ہوئی۔ ''مجھے تم سے ایک اہم بات کہنا ہے، میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔''

ڈیوس نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا اور غرایا۔ ''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا۔ جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔''

''ہاں میں جانتی ہوں۔'' اس کا لہجہ یقین سے عبارت تھا۔

گہرے صدمے کی کیفیت میں وہ چند ثانیے اسے ٹکٹکی

باندھے دیکھتا رہا پھر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔
''کیا... کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے؟''
''ایک خدا کی محبت... ایمان کی روشنی... عائشہ جو کتابیں چھوڑ گئی تھی ان کی روشنی میرے دل میں گھر کر چکی ہے ڈیوس... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ واحد اور یکتا ہے... کوئی اس کا شریک نہیں... زمین اسی کی ہے اور ساری تعریفیں اسی کے لیے ہیں۔ نہ تو وہ خود کسی سے پیدا ہوا نہ کوئی اس کا بیٹا ہے۔ وہ لوگوں کے شرک سے بالا ہے۔''
''مسلمانوں کے ساتھ رہ کر تم گمراہ ہو گئی ہو۔'' ڈیوس تلخ لہجے میں بولا۔
''نہیں۔'' ماریہ نے اس کی نفی کی۔ ''راہ پا گئی ہوں... صراطِ مستقیم کی۔''
''آئی لو یو ماریہ۔'' ڈیوس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔
''مجھے بھی تم سے محبت ہو گئی تھی ڈیوس لیکن...''
''لیکن؟''
''محبت قربانی مانگتی ہے... جس محبت نے میرے دل میں گھر کیا ہے اس کی راہ میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو قربان کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ کیا میں اس راہ کی خاطر اپنے دل میں تمہاری محبت کو قربان نہیں کر سکتی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے تمہاری محبت سے دستبردار ہونا ہوگا۔''
''اپنا اصل دین چھوڑنے کے بعد تم نے اپنے باپ کا انجام دیکھا؟'' ڈیوس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
''اب میں اپنے اصل دین پر ہی جا رہی ہوں... خدا کہتا ہے اس نے ہر انسان کو دینِ حنیف پر پیدا کیا ہے... دینِ حنیف یہی ہے... اسلام۔''
''سوچ لو۔'' ڈیوس نے کہا۔
''سوچ لیا ہے۔'' وہ یقین سے بولی۔
ڈیوس دیر تک سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ماریہ کو کہتے سنا۔ ''اگر تمہیں مجھ سے واقعی محبت ہے ڈیوس تو روشنی کے اس سفر میں تمہیں بھی میرے ساتھ آنا ہوگا۔''
ڈیوس چونک کر اسے الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔
''یقین کرو خسارے میں نہیں رہو گے... خدا نے ہر مسلمان کو خود ہی خسارے سے بچے رہنے کی دعا سکھا دی... وہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت اللہ کے حضور سر جھکا کر کہتا ہے۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا... راستہ ان لوگوں کا کہ انعام فرمایا تو نے ان پر... نہ کہ وہ جن پر غضب ہوا تیرا اور بھٹکنے والے۔''

☆☆☆

داؤد گھر کی ساری بتیاں بجھائے تاریکی میں پڑا تھا۔ روشنی کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی اسے۔ عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد سے وہ ڈپریشن میں تھا۔ کیسی ذلت اور رسوائی ہوئی تھی اس کی۔ اللہ واحد کا در چھوڑ کر کسے عزت ملی ہے جو اسے مل جاتی۔
کسی صورت دل کو قرار نہ آیا تو وہ بستر سے اٹھا اور وضو کر کے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ دو نفل کی نیت باندھی اور نفل ادا کر کے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔
''اے اللہ مجھ سے گناہ ہو گیا... مجھے معاف فرما۔''
وہ دیر تک گڑگڑاتا اور آنسو بہاتا رہا۔
دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر پہلے تو وہ چونکا۔ پھر اس نے اس آواز کو اپنے وہم پر محمول کیا۔ اس وقت کون آ سکتا تھا۔
دوبارہ دستک سنائی دی۔ اب یہ وہم نہ تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ گھر کے دروازے پر ماریہ، ڈیوس کے ساتھ کھڑی تھی۔
ماریہ کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ''سوری ڈاڈا۔''
''دفع ہو جا اب کیا لینے آئی ہے۔'' داؤد بھبکا۔
''وہ دولت لے کر آئی ہوں جو انمول ہے۔''
داؤد نے اسے گھور کر دیکھا اور یہ جانا کہ وہ ڈیوس کی بات کر رہی تھی۔
''ہم اندر آ سکتے ہیں انکل؟'' ڈیوس نے اجازت طلب کی۔
داؤد کچھ دیر ساکت کھڑا رہا پھر اس نے راہ دے دی۔ جھگڑا وہ جس قدر کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ مزید لڑنے کی ہمت نہ تھی اس میں... اس نے بتی جلا دی تھی۔
''الحمدللہ! ہم دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔'' ماریہ نے کہا۔
داؤد کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔
''میں ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں انکل۔'' ڈیوس نے بڑی عاجزی سے کہا۔
''تو کوئی ڈراما کر رہا ہے ڈیوس!'' داؤد نے اسے شک سے گھورا۔
''ڈیوس نہیں ڈاڈا... عبدالرافع'' ماریہ نے کہا۔
فلپ اور لوئیس جانے کب منظر میں در آئے تھے اور ہکا بکا ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔